اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No 662 G.P.O. Karachi-74200
Phone: (021)35895313 ,35802552, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

سنہری یادوں کا سفر

















یادیں سدا انسان کے ساتھ رہتی ہیں چاہے وہ خوشگوار ہوں یا

ناخوشگوار...... کبھی یہ دل میں کسک جگاتی ہیں تو کبھی امید کی کرنیں

پھیلاتی ہیں...... ایسی ہی خوب صورت باتوں اور حسین یادوں کا

ایک سفر آج سے تقریباً پچاس سال پہلے

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

کی صورت شروع ہوا۔ پاپولر ادب کی دنیا میں ایک قندیل روشن ہوئی جو دست بدست چلتی نکھرے اور معطر اجالوں کی پیامبر بنی...... بقول حبیب جالب

اسے بُجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لہو سے جو ہم چراغِ سحر

الحمدللہ ہم اب گولڈن جوبلی کی طرف گامزن ہیں

انہی سنہری یادوں میں آپ کا بھی روپہلا اور سنہرا خوب صورت ساحصہ کتنا ہے؟ ہمیں بھی بتائیں...... یہ سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین ہی کے لیے تو ہے۔

1...... ماہنامہ پاکیزہ سے پہلا تعارف......؟

2...... پاکیزہ تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں......؟

3...... سینئر یا دورِ حاضر کے پسندیدہ قلم کار کہ جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں......؟

4...... کوئی فرمائشی سلسلہ ہے تو ضرور بتائیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئینِ محترم! السلام علیکم!

سال 2021ء اپنے جلو میں بے شمار غم و خوشی، تکلیف و آرام اور رنج و مسرت کے لمحات لیے اپنے اختتام کی طرف محوِ سفر ہے۔

یہ شب و روز، یہ مہ و سال کی گردش ازل سے جاری ہے۔ انسان نے قدرت کی ہی عطا کردہ عقل سے کسبِ علم کر کے اسے بارہ مہینوں اور 365 دنوں میں سمیٹ دیا ہے۔ موسموں کا آنا جانا وقت گزرنے کا احساس دلاتا جاتا ہے۔

گزرتے سال کے حوالے سے باتیں تو کرنے کو بے حساب ہیں مگر ہم یہاں صرف محبت، خلوص، وفا، اپنائیت، انسیت، اخوت اور بھائی چارے کی بات کریں گے۔

دسمبر کے شمارے کو محبت نمبر کا عنوان دینا...... اگرچہ اس میں کوئی خاص حکمت نہیں۔ بس دل یہ چاہتا ہے کہ گزرتے لمحات سے صرف خوشیاں اور مسرتیں ہی کشید کی جائیں۔

تلخیاں، کدورتیں، نفرتیں، حسد، بغض و عناد کی بات ہی نہ کی جائے کیونکہ جس بات کا ذکر زیادہ ہو وہی ''ضرب'' ہوتی ہے۔ بہتر ہے مثبت طرزِ فکر، وسیع النظری، روشن خیالی اور خوش گمانی کا ہی پرچار کیا جائے تو منفی رویے خود بخود (-) منفی ہوتے چلے جاتے ہیں۔

محبتوں کو تقسیم کیجیے...... خوشیوں کو ضرب دیجیے...... گلے، شکوے منفی کیجیے......

اور صرف نیکیوں اور بھلائیوں کو جمع کرتے جائیے......

نتائج سو فیصدی مثبت ہوں گے۔

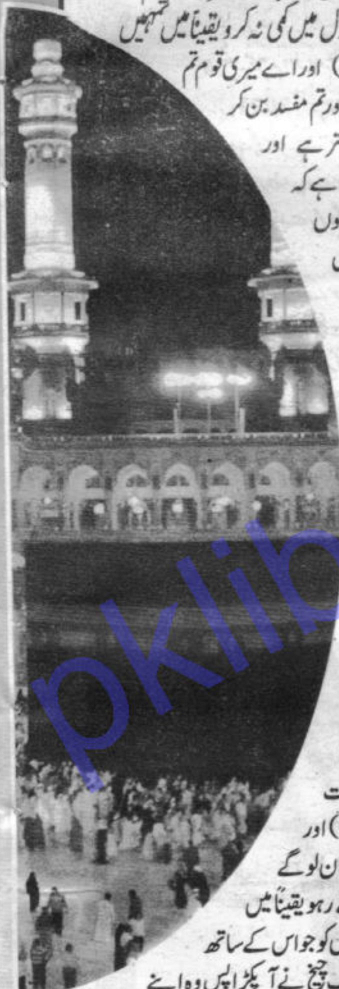
تمام اہلِ وطن کو بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ کا یوم ولادت مبارک ہو۔ دعا ہے کہ ہر محبِ وطن اپنے عظیم قائد کے زرّیں اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے ملک کی خوشحالی و نیک نامی کے لیے ہمہ وقت باعثِ فخر بنا رہے۔

مسیحی برادری سے تعلق رکھنے والے تمام پاکیزہ قارئین کو کرسمس کی خصوصی مبارک باد...... حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے پیغامِ محبت و یگانگت کو پھیلانے میں ہمیشہ اپنا، اپنا کردار نبھاتے رہیں۔

مدیرہ

نزہت اصغر

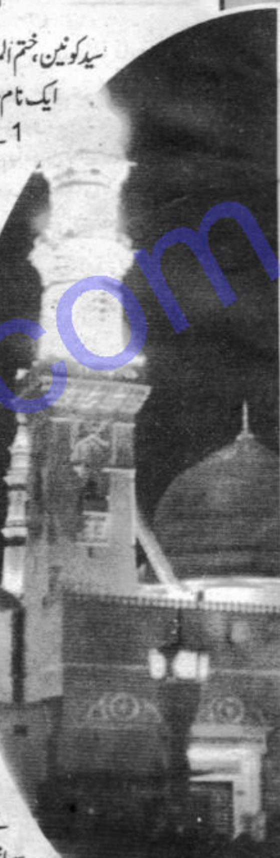
پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اس کے اوپر کے حصے کو نیچے کا حصہ کر دیا اور ہم نے اس (بستی) پر کنکروں والے پتھر تہ بہ تہ (تابڑتوڑ) برسائے (۸۲) جن پر تیرے پروردگار کی طرف سے نشان لگے ہوئے تھے۔ اور وہ (سزا) ظالموں سے کچھ دور نہیں (۸۳) اور مدین کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم! تم اللہ تعالٰی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے۔ اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو یقیناً میں تمہیں خوشحال دیکھتا ہوں۔ اور میں تم پر گھیرنے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (۸۴) اور اے میری قوم تم انصاف کے ساتھ ناپ اور تول پورا کیا کرو۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور تم مفسد بن کر زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو (۸۵) اگر تم مومن ہو تو اللہ تعالٰی کا بقیہ تمہارے لیے بہتر ہے اور میں تم پر کوئی محافظ نہیں ہوں (۸۶) وہ بولے اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ جس چیز کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے وہ چھوڑ دیں یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں جو ہم چاہیں ویسا کرنا (چھوڑ دیں) یقیناً تو بہت بردبار بہت بھلا ہے (۸۷) اس نے کہا اے میری قوم کیا تم نے دیکھا اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی دلیل پر ہوں، اور اس نے مجھے اپنی جناب سے اچھا رزق بھی دیا ہے۔ (تو کیا میں اس کی مخالفت کروں) اور میں نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت کر کے وہ کام کروں جس سے میں تم کو منع کرتا ہوں۔ میں تو جہاں تک مجھ سے ہو سکے اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ اور نہیں ہے میری توفیق مگر اللہ تعالٰی کے ساتھ اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں (۸۸) اور اے میری قوم میری مخالفت تمہیں (ایسا) مجرم نہ بنادے کہ تمہیں وہی (عذاب) پہنچے۔ جیسا کہ نوح کی قوم، یا ہود کی قوم، یا صالح کی قوم کو پہنچا تھا۔ اور لوط کی قوم (کا زمانہ) تو تم سے کچھ (زیادہ) دور نہیں (۸۹) اور تم اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ یقیناً میرا پروردگار بہت رحم کرنے والا محبت کرنے والا ہے (۹۰) وہ بولے اے شعیب جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے بہت زیادہ ہم نہیں سمجھتے، اور ہم تمہیں اپنے درمیان کمزور دیکھتے ہیں۔ اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ضرور ہم تمہیں سنگسار کرتے، اور تم ہم پر غالب نہیں ہو سکتے (۹۱) اس نے کہا اے میری قوم! کیا میرا قبیلہ تم پر اللہ تعالٰی سے بھی زیادہ عزت والا ہے؟ اور تم نے تو اسے پسِ پُشت ڈال رکھا ہے۔ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو میرا پروردگار اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے (۹۲) اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر عمل کرتے رہو۔ میں بھی کرنے والا ہوں۔ تم عنقریب جان لو گے کہ کس پر وہ عذاب آئے جو اسے رسوا کر دے گا۔ اور کون جھوٹا ہے۔ اور تم انتظار کرتے رہو یقیناً میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (۹۳) اور جب ہمارا حکم آ پہنچا ہم نے شعیب اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے نجات دے دی۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں ایک چیخ نے آ پکڑا پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (۹۴) جیسے کہ وہ اس میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ خبردار! مدین کے لیے اسی طرح ہلاکت ہے جیسی کہ ثمود (کی قوم) تباہ ہوئی (۹۵)



(سورۂ ھود ۱۱ پارہ ۱۲ آیات ۸۲ تا ۹۵)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ الرَّحْمَۃِ



سید کونین، ختم المرسلین، افضل الانبیا، رحمت اللعالمین حضرت محمد مصطفی ﷺ کے صفاتی اسمائے مبارک میں سے ایک نام سیدنا رسول الرحمۃ ﷺ بھی ہے۔ جس کے معنی ومفہوم رحمت والے رسول ﷺ کے ہیں۔

1۔القرآن: ا۔ترجمہ: اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (آیت ۱۰۷، سورۃ انبیاء)

(تفسیر روح البیان میں اس آیت کی تفسیر میں اکابر کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو نہیں بھیجا مگر رحمت مطلقہ، تامہ، کاملہ، شاملہ، جامعہ، محیطہ، برجمیع مقیدات، رحمت غیبیہ و شہادات علمیہ، عینیہ وجودیہ وشہدیہ وسابقہ ولاحقہ وغیر ذلک تمام جہانوں کے لیے عالم ارواح ہوں یا عالم اجسام ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول اور جو تمام عالموں کے لیے رحمت ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام جہان سے افضل ہو۔

۲۔ترجمہ: اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔ (آیت ۱۳۲، سورۃ آل عمران)

2۔الحدیث: ا۔آپ ﷺ نے فرمایا۔ ”میں لعنت کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہوں بلکہ میں حق کی دعوت اور جہان کے لیے صرف رحمت بن کر مبعوث ہوا ہوں۔ (مسلم)

۲۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کا رحمت ہونا عام ہے، ایمان والے کے لیے بھی اور اس کے لیے بھی جو ایمان نہ لایا ہو۔ مومن کے لیے تو آپ ﷺ دنیا اور آخرت دونوں میں رحمت ہیں اور جو ایمان نہ لایا ہو اس کے لیے آپ ﷺ دنیا میں رحمت ہیں کہ آپ ﷺ کی بدولت تاخیر عذاب ہوئی اور خسف مسخ اور استیصال کے عذاب اٹھا دیے گئے۔

3۔الوائے۔ محمد ﷺ اپنی ذات اور قوم کے لیے نہیں بلکہ دنیائے ارضی کے لیے ابر رحمت تھے۔ تاریخ میں کسی ایسے شخص کی مثال موجود نہیں جس نے احکام خداوندی کو اس عمدہ طریقہ سے انجام دیا ہو۔ (ڈاکٹر ڈی رائٹ)

4۔الفضائل: ا۔جو کوئی مصیبت میں مبتلا ہو اور کسی طرح بھی نکلنے کی صورت دکھائی نہ دیتی ہو تو وہ روزانہ ۹۷۵ مرتبہ اس اسم مبارک سیدنا رسول الرحمۃ کا ورد کر کے بارگار الٰہی میں دعا مانگے ان شاء اللہ مصیبت رفع ہو جائے گی۔

۲۔جو کوئی اپنے رزق حلال میں فراخی کا خواہاں ہو۔ تنگدستی اور غربت وافلاس دور کرنا چاہتا ہو تو وہ خلوص نیت کے ساتھ ہر نماز کے بعد ۱۰۰ مرتبہ اس اسم پاک کو پڑھ کر بارگاہ الٰہی میں دعا کرے۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس)

سلسلے وار ناول

صراطِ عشق

دلشاد نسیم

موجِ صبا، اے جانِ سحر میں یہاں پہ ہوں
تُو آ کے میرے دل میں اتر میں یہاں پہ ہوں
کیوں بے کلی سے پھر رہا ہے تُو گلی گلی
اے آسماں کے چاند اتر میں یہاں پہ ہوں

انسان کی خود مختاری... اس کے عقلِ کُل ہونے کا غرور بسا اوقات فریب کے تانے بانے بُننے لگتا ہے... اور یہ تانے بانے ریشم کے نہیں، مکڑی کا جال ہوتے ہیں... مگر اس بات کو سمجھنے تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہو...

"صراطِ عشق" ایسے ہی خود ساختہ، فریبی تانوں بانوں سے بندھی ایک کہانی ہے... جو کہیں کہیں سے سچ بھی ہے اور کہیں پر زیبِ داستاں کے لئے کورے کاغذ پر رنگین لفظوں سے کشیدہ کاری کرنے کی جسارت بھی کی ہے...

یہ ارادوں اور خوابوں کے ٹوٹنے کی کہانی ہے...

محبت میں جینے اور محبت میں مر مٹنے کی کہانی...

محبت کی اگلی حد... جب محبوب پاس نہیں مگر آنکھ اس کے خواب دیکھنے لگتی ہو... وہ کہاں ہے کس حال میں ہے، جاننے لگتی ہو...

ممتا کی آفاقی محبت... دنیاوی محبوب کی فرقت کی کسک... کچھ ملنے اور بہت کچھ کھونے کا المناک قصہ ہے... یہ داستانِ عشق...

اس پل صراطِ عشق پہ لایا ہے مجھ کو دل
اب پھونک پھونک کر مجھے رکھنا ہے ہر قدم





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ارزش احمد مقابلے کا امتحان پاس کر کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوا تو باؤ جی (صلاح الدین) کی دلی مراد پوری ہوئی تھی۔ بے جی (حمیدہ بیگم) ارزش کے لیے بہت حساس تھیں۔ وہ بہت سی باتیں اس کے بارے میں بغیر کہے ہی جان جاتی تھیں۔ ارزش ٹریننگ کے لیے اکیڈمی چلا جاتا ہے۔ اکیڈمی میں ارزش کی عبداللہ سے دوستی ہوتی ہے اور وہ اسے اپنی محبت زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارزش حویلی آتا ہے تو اس کے استقبال کے لیے ولایت ماموں اپنی فیملی کے ساتھ آتے ہیں اور اگلے دن اسے اپنے گھر بلاتے ہیں۔ رات کو عبداللہ کا فون آتا ہے کہ زینب کا انتقال ہوگیا ہے ارزش وہاں چلا جاتا ہے۔ باؤ جی کہتے ہیں کہ اکیڈمی کے بعد ارزش اور نین تارہ کی رخصتی کر دیں گے۔ ارزش باہر جانا چاہتا ہے اور اس بارے میں نین تارہ سے بات کرتا ہے تو وہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتی۔ ارزش اور نین تارہ کی شادی ہو جاتی ہے۔ ارزش اپنا پاسپورٹ تلاش کرتا ہے تو اسے نین تارہ کے بنائے ہوئے اسکیچ نظر آتے ہیں۔ ارزش، نین تارہ سے کہتا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو تو وہ کہتی ہے میں بے جی اور باؤ جی کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتی۔ ارزش کا یونیورسٹی آف لندن میں ایڈمیشن ہو جاتا ہے اور وہ آگے پڑھنے کے لیے لندن چلا جاتا ہے۔ صبح ارزش یونیورسٹی کے لیے نکلتا ہے تو اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور ایک فرشتہ صفت شخص اسماعیل ظفر اسے اسپتال اور وہاں سے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ وہاں اسماعیل ظفر کی منگیتر آمنہ رشید آتی ہے جس کو ارزش کا وہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔ ارزش ان کی باتیں سن کر وہاں سے چلا جاتا ہے اسماعیل، ارزش کو ڈھونڈتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ تمہیں یوں بغیر بتائے نہیں آنا چاہیے تھا۔ آمنہ، ارزش کو لفٹ دیتی ہے اور اسے اپنی باتیں بھولنے کا کہتی ہے۔ تین دن سے ارزش بے چین تھا۔ لیکن پاکستان میں کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ ارزش، اسماعیل کو بتاتا ہے کہ اسے آمنہ نے لفٹ دی تھی۔ آمنہ، ارزش کے گھر آتی ہے اس ملاقات کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ آمنہ، ارزش کے گھر آتی ہے اور کہتی ہے کہ مالک مکان نے مجھے نکال دیا ہے اور جب تک کوئی اور انتظام نہیں ہوتا وہ اسے اپنے گھر میں رکھ لے۔ ارزش، اسماعیل سے ملتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ آمنہ جس گھر میں رہتی ہے اس کا مالک تو اسماعیل ہے۔ تو کیا اس نے جھوٹ بولا تھا۔ نین تارہ، ارزش کے چھوٹے ماموں وقار احمد کی بیٹی تھی وہ پانچ سال کی تھی جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے ماں، باپ کا انتقال ہوگیا اور پھر بڑے ماموں ولایت احمد اور رضوانہ نے اس کی پرورش کی۔ نین تارہ اور ارزش کا رشتہ طے تھا۔ نین تارہ، ارزش سے محبت کرتی ہے اور اس کے پینسل اسکیچ بناتی ہے۔ صدف کہتی ہے کہ جب سے ارزش اکیڈمی گیا ہے تم پاگل ہوگئی ہو۔ نین تارہ، ارزش کے لندن جانے کے بعد اداس ہوتی ہے تو صدف اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے ارزش فون کر کے بتاتا ہے کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے۔ بے جی بے چین ہوتی ہیں اور نین تارہ ان کی ارزش سے بات کرواتی ہے لیکن وہ اپنے ایکسیڈنٹ کا نہیں بتاتا۔ بے جی نین تارہ کو بتاتی ہیں کہ ارزش کا فون آیا تھا کہ اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور اس کے پاؤں میں فریکچر ہوگیا ہے۔ بے جی، نین تارہ کو اپنا خواب بتاتی ہیں تو وہ انہیں بتاتی ہے کہ وہ پریگنینٹ ہے۔ بے جی باؤ جی، ولایت احمد اور رضوانہ شادی میں جاتے ہیں۔ نین تارہ اپنے پاس صدف کو بلا لیتی ہے۔ شادی سے واپسی پر سب ایک حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سفید حویلی کا ملازم جہانگیر، نین تارہ سے کہتا ہے وہ ارزش کو اس حادثے اور اپنی طبیعت کا بتائے تو نین تارہ بتاتی ہے کہ اس کے پاس ارزش کا نمبر نہیں ہے اور جو نمبر ہے وہ مل نہیں رہا۔ نین تارہ کے بیٹا ہوتا ہے اور وہ اس کا نام خضر احمد رکھتی ہے۔ نین تارہ، صدف سے کہتی ہے کہ وہ اپنا گھر بیچنے کے لیے ایک وکیل کرنا چاہتی ہے تو صدف اسے اپنے کلاس فیلو دانیال قیصر کا بتاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے..........

قسط نمبر: 6

”کیا آپ اکیلی سب ڈیل کریں گی؟“ دانیال قیصر نے سنبھل کر دوبارہ اسے دیکھا۔

اس نے دانیال کو عجیب نظر سے دیکھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

”میرا مطلب ہے یہ کافی مشکل کام ہے آپ اپنے ہسبینڈ کو بلا کیوں نہیں لیتیں؟“

”جب انہیں بلانے کی ضرورت ہوگی تو بلا لوں گی فی الحال میں یہ ضروری نہیں سمجھتی، یہ گھر میرے نام ہے۔“

دانیال نے سفید چادر میں لپٹی بظاہر معصوم چہرے والی مگر درحقیقت مضبوط نین تارہ کو بغور دیکھا۔

"میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ عدالت کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ وہ آپ کے لیے مشکل نہ ہو جائے۔"
وہ سخت نظروں سے دانیال کو دیکھنے لگی۔
"اوکے چلتا ہوں۔" دانیال نے جانے میں ہی عافیت جانی مگر کچھ دور جا کے وہ پلٹا۔
"میرا فون نمبر تو آپ کے پاس ہوگا؟"
نین نے اقرار میں محض سر ہلا کر جواب دیا، دانیال ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ کہتا ہوا سبحان بابا کے ساتھ ہال کمرے سے باہر چلا گیا۔
اس نے ایک لمبی سانس لی ابھی وہ کمرے میں واپس آئی ہی تھی کہ فون کی بیل نے متوجہ کیا، وہ جانتی تھی صدف کا فون ہوگا ورنہ اسے کون یاد کر سکتا ہے۔
اور وہ ہی ہوا صدف حسبِ عادت کھلکھلاتی آواز میں پوچھ رہی تھی
"کیسی رہی بات چیت؟"
"محترمہ بات چیت کے لیے دانیال کو میں نے نہیں بلایا تھا، کام تھا۔"
"ہاں، ہاں وہی کام کی بات چیت۔"
"حویلی دیکھنے کے لیے بابا کے ساتھ گیا ہوا ہے۔"
"تم بھی ساتھ چلی جاتیں۔"
"صدف تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ میں دانیال کو حویلی دکھانے اس کے ساتھ چلی جاتی، واہ کیا بات ہے تمہاری!"
"میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ......"
"تم کس لیے کہہ رہی تھیں مجھے نہیں سننا۔" نین نے بات کاٹی۔
"توبہ ہے بھئی، بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ خیر بات سنو میں شام کو آؤں گی، کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔ امی لوگ جا رہے ہیں کسی شادی پر اور میرا دل نہیں کر رہا بس تم میرے لیے زیادہ نہیں صرف چکن بریانی بنوا لینا کافی رہے گی۔"
"کوئی اور حکم؟"
"ہاں، ہمارا شہزادہ کیسا ہے؟"
"آ کے دیکھ لینا۔ خدا حافظ۔"
"خدا حافظ!"
"اگر آنا ہی تھا تو اتنا لمبا فون کرنے کی کیا ضرورت تھی، صدف نہیں سدھر سکتی۔" وہ سوچتی ہوئی خضر کے جھولے کے پاس آ گئی جہاں وہ دنیا جہان سے بے خبر سو رہا تھا اس کے چہرے پر فرشتوں کی سی معصوم مسکراہٹ تھی، یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کتنے قیمتی رشتوں سے محروم وہ اس دنیا میں آیا ہے، اس کی چاہ کرنے والی سوائے اس کی ماں کے کوئی اور نہیں اور اس کے والد نے تو اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھا، اس کے لمس کو محسوس بھی نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ باپ بن چکا ہے۔
ارزش احمد کی یاد پھانس کی طرح سینے میں چبھی ہوئی تھی نکلتی تھی نہ سکون ملتا تھا۔ نین نے اگر اسے فون نہیں کیا کوئی رابطہ نہیں رکھا تو اس نے بھی کب رکھا۔ وہ تو اپنی دنیا میں مگن تھا عجیب دنیا میں۔ کیا کوئی اتنا بے حس بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کسی کو بھی بتاتی کہ آج تک ان کی تفصیلی بات نہیں ہوئی نہ ہی وہ نو ماہ کے دوران اسے باپ بننے کی خوشخبری سنا پائی......تو کوئی بھی یقین نہ کرتا کہ ایسا کیسا ممکن ہے......مگر اب تو یہ سب ہو چکا تھا حتیٰ کہ وہ اپنے ماں، باپ کی ابدی جدائی سے بھی بے خبر ہے۔

☆☆☆

"ویسے میں بہت حیران ہوں۔" سیریل باؤل میں ڈالتے، ڈالتے آمنہ نے ارزش کو دیکھا اور کہا۔
"کیوں، کس بات پر حیران ہو؟"

''کہ تمہیں آج تک کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی۔''
ارزش نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔
''کیونکہ مجھے لگتا ہے محبت جیسی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔''
''تو کیا میں تمہاری محبت سے ہمیشہ محروم رہوں گی؟''
''ممکن ہے اور نہیں بھی۔'' ارزش نے کندھے اچکائے اور بے نیازی سے کہا۔
آمنہ دل ہی دل میں کافی مایوس ہوئی۔
''کسی نے تو تمہیں ضرور چاہا ہوگا، یہ کیسے ممکن ہے تم جیسا ہینڈسم، اسمارٹ، سول سروسز آفیسر، کروڑوں کی جائداد کا مالک اور اس کا کوئی اسکینڈل ہی نہیں...... بھئی میرا تو دل بالکل نہیں مانتا۔''
''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''
''کلاس فیلو، کزن، neighbor یا پھر فیملی فرینڈ......!''
''اچھا فرض کرو کوئی ہو بھی تو تم کیا کرو گی؟ مجھے چھوڑ دو گی؟''
''آمنہ اتنی پاگل نہیں ہے...... مجھے تو تم بہت اچھے لگے ہو۔ کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تمہیں کچھ کہنا باقی ہے۔ مطلب کچھ ہے جو تم نے چھپایا ہے؟'' آمنہ نے کچھ سوچ کر پوچھا۔
''ہاں ہے۔ میری کزن ہے لیکن یہاں پر بھی وہی معاملہ ہے میرے پیرنٹس اسے چاہتے ہیں لیکن میں نہیں، وہ میری ٹائپ نہیں۔'' ارزش نے شادی والی بات بالکل گول کر دی۔
''دیکھو ارزش، ہمیں یہ زندگی ایک بار ملی ہے ہمیں اسے اپنے طریقے سے جینا چاہیے، یہ کیا کہ زندگی ہماری ہو مگر اسے ہم کسی اور کے نقطۂ نظر سے گزاریں۔'' اس نے اک ادا سے کہا۔
''تھینکس گاڈ۔ کوئی تو میرا ہم خیال ہے۔'' ارزش نے چائے کا گھونٹ بھرا۔
''اچھا ہم اس پر شام کو بات کریں گے۔ بائے۔'' آمنہ نے شولڈر بیگ اٹھاتے ہوئے کہا اور ارزش کا جواب سنے بغیر مسکراتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔
ارزش خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ آمنہ سے براہِ راست نہ سہی پھر بھی...... اس نے نین کا ذکر کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا گویا آمنہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی اور بھی شامل تھا یا رہ چکا ہے یہاں کی لڑکیوں کی یہی تو اچھی بات ہے۔ پاکستان ہوتا تو لڑکی نے فریبی، بے وفا اور جانے کیسے، کیسے بیہودہ القابات سے نواز دینا تھا۔
ارزش ہنستے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے موبائل کو محض وقت دیکھنے کے لیے دیکھا۔ اسے میسجز اور کالز سے کوئی مطلب نہ تھا۔ ہر چیز اسی طرح چھوڑ کر وہ اٹھا، گھر کے بیرونی دروازے کو لاک کیا اور پیدل ہی چل پڑا۔ ساری عمر گاڑیوں میں سفر کرنے والے کو یہ سب ایڈونچر لگتا تھا۔
اور وہ یہی سب سوچتے، سوچتے بس اسٹاپ تک پہنچ گیا تھا۔
''میں نے آمنہ سے یہ کیوں چھپایا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ کیا اس لیے کہ میں نین کو اس قابل نہیں سمجھتا یا آمنہ کو کھودینے کا ڈر ہے؟''
اس نے خود کو ٹٹولا بات ریشمی دھاگے کی طرح الجھی ہوئی تھی۔ سلجھ نہیں رہی تھی۔ بس اسٹاپ آگیا تھا، ارزش نے الجھی ہوئی بات کو بنا سلجھائے چھوڑ دیا۔

☆☆☆

آج بہت دنوں بعد نین والدین کی حویلی میں آئی تھی۔ وہ حویلی جو اس کے نام تھی، اسی حویلی میں آتے، آتے کئی بار اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ حویلی کا وہ دروازہ جو کبھی بند نہ ہوا تھا، بند تھا اسے کھولا گیا۔ اسے کیا کھولا ماضی کا ہر ایک

لمحہ جیسے آنکھوں کے سامنے آگیا...... بابا، امی، بچپن اور بچپن کی بے فکری۔ یہیں کہیں وہ وقت بھی رکا ہوا ہوگا جب اس پر ارزش کی محبت آشکار ہوئی تھی۔ جہاں، جہاں اس نے ارزش سے باتیں کی تھیں۔ کبھی خیالوں میں کبھی آمنے سامنے سب کچھ تو تھا یہاں، نہیں تھے تو وہ چہرے نہیں تھے جن کے ہونے سے زندگی، زندگی لگتی تھی۔

گھر کے دو پرانے ملازم موجود تھے۔ دونوں نے بڑھ کر نین کو پہلے اپنے آنسوؤں کا نذرانہ دیا، مکینوں کو یاد کیا پھر بتایا۔

''کل کوئی صاحب آئے تھے حویلی دیکھنے کے لیے۔''

''میں نے ہی بھیجا تھا۔'' نین نے بابا کے وفادار و جاں نثار ملازم ایوب کو بتایا مگر ایسے کہ وہ نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔

''میں حویلی بیچنا چاہ رہی ہوں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں چھوٹی بی بی۔ بھلا پرکھوں کی نشانیاں بھی کوئی بیچتا ہے۔''

''پرکھوں کی نشانیاں اگر مٹی کھانے لگے تو انہیں نئی زندگی دینے کے لیے نئے اور محفوظ ہاتھوں میں دے دینا چاہیے۔''

وہ چلتے، چلتے برآمدے میں آ گئی جہاں اس کی کئی قیمتی یادیں اس سے لکا چھپی (آنکھ مچولی) کھیل رہی تھیں۔ وہ ایک سے دامن بچاتی، دوسری آ کر کھڑی ہو جاتی۔ کسی کی آنکھ میں آنسو تھے اور کسی کے چہرے پر خوشی، قہقہے...... وہیں کہیں بابا بھی بانہیں پھیلائے اسے اپنی جانب بلا رہے تھے۔ برآمدہ بہت اداس تھا یہاں ہر شام بابا اپنی چھوٹی سی پنچایت لگایا کرتے لوگوں کو حسنِ سلوک اور عفو و درگزر کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اسے یاد آ رہا تھا بارشوں میں یہیں پر بیٹھ کر اس نے ارزش کی محبت کو پروان چڑھایا تھا۔ نین بے قرار ہو کر شیشم کے بنے اونچے منقش داخلی دروازے سے اندر چلی گئی۔

ہر چیز یونہی رکھی ہوئی تھی۔ سلیقے، طریقے سے جیسے بابا اور امی کی زندگی میں ہوا کرتی تھی ملازمین نے اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دیا تھا۔ نین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ہم دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اپنا کردار نبھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' میرے اللہ یہ زندگی کتنی عجیب

ہے، سب اپنے ساتھ ہوں تو لگتا ہے ہر شے بے حد خوب صورت اور خوش رنگ ہے اور اگر یہی اپنے بہت پیارے بچھڑ جائیں تو زندگی بے حقیقت ہو جاتی ہے، سوچوں کے زاویے بدل جاتے ہیں ہم اتنے بے بس ہو جاتے ہیں کہ سوائے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے کچھ کر ہی نہیں پاتے۔ سسک، سسک کے، غمزدہ دل کو دلاسے دے کر جینے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ تسلیم بھی خوشی سے کہاں کرتے ہیں وہ تو مجبوری میں زندگی کی سانسیں پوری کرنا ہوتی ہیں اپنے بہت پیاروں کے بغیر۔'' وہ اندر ہی اندر جیسے سسک رہی تھی۔ ''مجھے یقین ہے بابا، آپ جہاں بھی ہوں گے اللہ کے پسندیدہ بندوں میں ہوں گے۔ آپ کی روح پُرسکون ہوگی جو محبت آپ نے ہم سب میں بانٹی اس سے کہیں زیادہ محبت اور عزت آپ کو اللہ تعالیٰ نے دی ہوگی۔ پھر بھی بابا میرے دل کو سکون نہیں آتا۔ میں آپ کی مخصوص خالی کرسی دیکھ تو رہی ہوں مگر اس سے نظریں نہیں ملا پا رہی۔ یونہی اِدھر اُدھر دیکھتے، گھر میں بے مقصد چلتے آپ کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ اسی لیے تو میں یہاں آتی نہیں، کتنا ہی دھیان بٹاؤں میں ناکام ہو جاتی ہوں۔ ڈائننگ ٹیبل کی اس کرسی پر ہمیشہ آپ بیٹھتے تھے، آپ کی سفید چادر جس میں ابھی تک آپ کی خوشبو آ رہی ہے اوڑھ کر آپ کی ابدی یادوں کو بہلا رہی ہوں، رات کے پہر جب چپکے سے تکیے میں آنسو جذب کرتی ہوں تو آپ مسکراتے ہوئے آ جاتے ہیں۔ آہ بابا آپ نے بہت جلدی کی...... خضر بڑا ہوگا تو کس کی انگلی تھام کر چلے گا۔ نانا بھی نہیں ہیں اور دادا بھی۔ اور اس کے بابا......؟'' نین نے سرد آہ بھری۔

''جانے آتے بھی ہیں یا نہیں؟'' وہ خود کلامی کی کیفیت میں تھی۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا کیوں ہر بات کے آخر میں اسے ارزش کا خیال آنے لگتا ہے۔

اسی وقت ایوب بابا نے دانیال کے آنے کا بتایا تو وہ سنبھل گئی۔

''جی بلالیں۔''

''جی بی بی جی۔'' ایوب اتنا کہہ کر غائب ہوگیا۔ واپسی پر دانیال ان کے ساتھ تھا۔

''آداب!''

''آداب!'' نین نے رسماً کہا۔

''ایک پارٹی آنا چاہ رہی ہے۔''

''تو بلالیں۔''

''آپ کا ہونا ضروری ہے۔''

''میں نہیں سمجھتی، میں نے یہ کام بہت اعتماد کے ساتھ آپ کو سونپا ہے، مجھے امید ہے آپ کے لیے یہ مشکل نہیں۔''

''شکریہ لیکن لین دین کا معاملہ ہے۔'' دانیال نے بے چینی ایک پیر کا وزن دوسرے پیر پر ڈالا۔

''جب وہ معاملہ ہوگا تب دیکھا جائے گا، فی الحال آپ پارٹی کو وزٹ کرادیں۔''

''بہتر......'' دانیال نے دل ہی دل میں تلملا کر بہت پروفیشنل انداز اختیار کیا۔

''بابا میں چلتی ہوں۔''

''چھوٹی بی بی جی کچھ دن یہاں آ کر بھی رک جائیں پھر تو حویلی بک ہی جائے گی۔ مالک اور مالکن کی روح کو سکون ملے گا۔''

نین دکھ سے مسکرائی اور بغیر کچھ کہے اسی اونچے منقش شیشم کے دروازے سے واپس چلی گئی۔

دانیال اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کو اپنے دل میں کسک سی محسوس ہوئی۔ کیسی عجیب کیفیت تھی۔

پھوٹ، پھوٹ کے رونے کو جی چاہتا تھا مگر آنکھیں خشک تھیں۔

بے بسی ایسی تھی کہ لگتا تھا جیسے بے آواز ہچکی سی بندھی ہے

سانسیں صدیوں کی آہیں بن کے آ جا رہی ہیں
وقت جیسے بین کر رہا ہو......
زمین دھکے دے رہی ہے ہو......
آسمان رو رہا ہو......
یہ کیا ہو رہا ہے......
ابھی تو میں زندہ ہوں......وہ بھی شاید
یہ فضائیں کفن پوش کیوں لگ رہی ہیں
نین نے تڑپ کے سوچا۔
کاش رونے کا کوئی بہانہ مل جائے
کوئی ہجر کا گیت چھیڑ دے
کوئی فراقِ یار کا قصہ سنا دے
بس رونا آ جائے
دل پر پڑا بوجھ اتر جائے
کوئی ایسی بات کر دے
کہ دل کا غبار آنکھوں کے رستے بہہ جائے
سماعت سُن ہو جانے سے پہلے
بصارت بے بصر ہونے سے پیشتر
گویائی گنگ ہونے سے پہلے
کوئی دلگداز کلمہ
کوئی دلفریب منظر
کوئی روح کا ترجمان......
کاش مرنے سے پہلے
زندگی ایک جھلک دکھا دے

تم آ جاؤ ارزش۔ شرارت سے آنکھوں پر ہاتھ رکھو اور کہو۔ ''بوجھو تو کون ہے؟''
اور میں کہوں۔ ''بھئی کوئی ہنٹ تو دو میں کیسے پہچانوں؟''
''ہم......م......م میں تمہارے خوابوں کا شہزادہ۔''
تم اترا کے کہو اور میں ہنسی میں اڑا دوں۔
''اوئے ہوئے بڑا آیا خوابوں کا شہزادہ۔ کبھی آئینہ دیکھا ہے۔''
اور تم سامنے آ جاؤ اور کہو ''میری آنکھوں میں دیکھ لو۔''
نین نے آہ بھری۔ آس پاس کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں، کچے پکے راستوں سے گاڑی گزر رہی تھی۔ ان کی حویلی سے سفید حویلی تک کا رستہ بہت زیادہ نہیں تھا لیکن جب ہر سانس پل صراط سے ہو کر آتی ہو تو راستے طویل نہ بھی ہوں کٹھن ضرور ہو جاتے ہیں۔
ابھی وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچی تھی کہ اسے دانیال کی کال آ گئی۔
''جی......!'' نین نے بٹن پریس کر کے اطمینان سے کہا۔

''پارٹی کو حویلی بہت پسند آئی ہے۔ مگر قیمت کم دے رہے ہیں۔''
''دانیال صاحب میں اپنا گھر کسی مجبوری میں نہیں بیچ رہی۔ اس لیے آپ انتظار کریں جب تک اس کی مناسب قیمت نہ ملے۔''
''ٹھیک ہے۔''
''شکریہ۔'' نین نے موبائل آف کر دیا۔
دانیال کا حالانکہ دل چاہ رہا تھا، بات طویل ہو اور یہ بات بھی اس نے محض بات کرنے کے لیے کہی تھی ورنہ پارٹی کو تو وہ پہلے ہی منع کر چکا تھا۔ مگر نین...... وہ تو ریشم کے الجھے دھاگے کی طرح تھی کوئی ایسا سرا مل ہی نہیں رہا تھا جس کی مدد سے دانیال یہ گتھی سلجھاتا۔
''وہ ایسی تو نہیں تھی؟'' اس نے الجھے، الجھے انداز میں صدف سے پوچھا۔
یہ محض اتفاق ہی تھا کہ دونوں کی دوستی اچھی ہو گئی تھی جب نین نے یونی چھوڑی، دانیال نے نین کی خبر گیری کے لیے صدف سے دوستی کر لی۔ دونوں جتنی بھی باتیں کرتے باتوں کا محور نین ہی ہوتی صدف کے لیے بھی نین اہم تھی اور دانیال کے لیے بھی اہم ترین۔ اسی لیے نین سے حویلی میں ملاقات کے بعد اسے چین نہیں آ رہا تھا اس نے اتنا نین کو سوچا کہ خود زچ ہو گیا۔
''واقعی وہ ایسی نہیں تھی خیر دل سے تو...... اب بھی بہت نرم مزاج اور معصوم ہے لیکن اس کے حالات بڑے عجیب ہو گئے ہیں۔'' صدف نے کہا۔
''ہاں مگر وہ اپنے خول سے نہیں نکلتی۔''
''وہ خول نہیں اس کا قلعہ...... اپنا تعمیر شدہ قلعہ ہے۔ جس میں وہ خود کو بہت پُرسکون اور محفوظ سمجھتی ہے۔''
''کسی طرح سے اس کے شوہر سے رابطہ ہو جائے تو۔'' دانیال نے بہت امید سے صدف کو دیکھا۔
''فائدہ؟''
''نین کو جینے کا کوئی حق نہیں؟''
''تم اس کے لیے اتنے حساس نہ بنو، وہ اپنے مسائل خود سلجھانا جانتی ہے۔''
''اچھی بات ہے۔'' دانیال نے کچھ تردد کے بعد صدف سے عجیب فرمائش کی کہ وہ حیران رہ گئی۔
''مجھے سفید حویلی میں جاب دلا دو۔'' وہ کہہ رہا تھا۔
''پاگل ہو گئے ہو۔''
''ایسا ہی سمجھ لو۔''
''خیر فی الحال تو یہ ممکن نہیں...... ہاں البتہ اگر وہ کہے گی تو میں تمہارا نام ضرور لے دوں گی۔''
''وہ کیا کہے گی؟''
''میرے کہنے کا مطلب ہے اگر اسے ضرورت ہوئی تو وہ ضرور کہہ دے گی۔''
''اکیلی ہے، ضرورت پڑ بھی سکتی ہے۔ چاہے منیجر کی حیثیت سے رکھ لے۔''
صدف سے فوری جواب نہیں دیا گیا۔ وہ جانتی تھی کہ نین کو کسی کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس کے حالات نے اسے بہت مضبوط کر دیا تھا۔

☆☆☆

بدلتا موسم اس وقت تک اداس رکھتا ہے۔ جب تک وہ پوری آب و تاب سے روح کے اندر رچ بس نہ جائے۔ پھر ہم اس سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ جدائیوں کے ساتھ رہنا آ جاتا ہے اور ہم اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ ایک کے بعد ایک موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اور پھر ہمیں اس سچ سے آگاہی ہو جاتی ہے کہ بدلنے والے بدلتے رہیں گے موسم آتے اور جاتے رہیں گے۔ ہمیں انہی موسموں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔

رب کریم آگاہ کرتے ہیں کہ مجھ سے جڑے رہو، اپنے اندر کی تار مجھ سے جوڑے رکھو۔ مجھ سے بہتر مستقل ساتھی کوئی نہیں۔ اور پھر اندر کا موسم مالک کی مہربانی سے خوشگوار ہو جائے گا خوب صورت، حسین کسی اور کے بچھڑنے کا غم تڑپائے گا نہ ہی اس کی جدائی سوہانِ روح بنے گی۔ ذکرِ رب کا خوشگوار خوشبودار موسم سدا پُر بہار رہتا ہے۔

نین نے حویلی کے حسین باغ میں پھیلی مروا کے پھولوں کی خوشبو کو بھرپور سانس کے ساتھ اپنے سینے میں کھینچا اور خود میں بسا لیا۔ شروع سردیوں کی شامیں بہت اداس ہوتی ہیں اور اب تو کچھ زیادہ ہی اداس لگ رہی تھیں، وہ گہما گہمی تھی اور نہ بی جی اور باؤ جی کے وجود کا حسین احساس۔ البتہ خضر نے آ کر زندگی کو رونق دے دی تھی۔

صدف کے ساتھ جا کے نین، خضر کو انجیکشن بھی لگوا لائی تھی۔ زندگی کے سارے کام ہی ہو رہے تھے۔ اور یہی یقین نین کو مضبوط سے مضبوط کیے دے رہا تھا کہ کسی کے نہ ہونے سے زندگی رکتی نہیں۔

☆☆☆

وہ شاید شام 7 بجے کا وقت ہوگا، سردیوں نے ہیٹنگ آن کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آمنہ ابھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ پاکستان میں اس وقت دن کے دو بجے کا وقت تھا جب ارزش کو کال آئی۔ ایک اجنبی مردانہ آواز......

"آپ ارزش احمد ہیں؟"

"جی اور آپ؟" ارزش نے موبائل کان سے ہٹا کے دیکھا۔ نمبر تو پاکستان کا ہے۔ مگر کون بات کر رہا تھا۔ اس نے سوچا۔

"جی...... میں پاکستان سے بات کر رہا ہوں۔" دانیال نے کہہ تو دیا تھا مگر اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بتائے کہ وہ کون ہے اور کیوں بات کرنا چاہ رہا ہے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا آپ کون ہیں اور مجھ سے کیوں بات کرنا چاہ رہے ہیں؟"

"سوری...... شاید مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔"

دانیال نے کہہ کر فون بند کرنا چاہا لیکن ارزش کی آواز نے اسے فون بند کرنے سے روک دیا۔

"جی...... اسے غلط فہمی نہیں کہتے، آپ نے میرا نام لیا ہے، میرے نمبر پر فون کیا ہے...... صاف، صاف بتائیں آپ کون ہیں اور کس مقصد کے تحت فون کیا ہے؟"

دانیال نے گلا صاف کیا۔

"میں دانیال قیصر ہوں آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو اور آپ کی فیملی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تو......؟" اس نے اکھڑے سے لہجے میں پوچھا۔ "اس جان پہچان کی وجہ بتا سکتے ہیں۔ آپ کے پاس میرا نمبر کہاں سے آیا اور آپ نے مجھے فون کیوں کیا...... یہ سب غلط فہمی ہے کیا؟"

دانیال نے لمبی سانس لی۔

"جی آپ درست فرما رہے ہیں، میں آپ ہی سے بات کرنا چاہتا تھا۔"

ارزش نے کوئی جواب نہیں دیا خاموشی سے دانیال کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگا۔

"اور اس بات کو تو رہنے ہی دیں کہ میں نے نمبر کہاں سے حاصل کیا غور طلب بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو فون کیوں کیا؟"

"میں بھی تو آپ سے یہی پوچھ رہا ہوں مسٹر کہ آپ نے مجھے فون کیوں کیا؟"

"کیا آپ جانتے ہیں ولایت احمد صاحب کی حویلی بک رہی ہے؟"

"آپ پاگل ہو گئے ہیں یا مجھے کر رہے ہیں؟"

''آپ سے اسی ری ایکشن کی توقع تھی۔ یہ حویلی آپ کی مسز...... میرا مطلب میڈم نین تارہ بیچ رہی ہیں جو اس حویلی کی اکلوتی وارث ہیں۔''

''ماموں اور مامی...... وہ کہاں ہے؟''

''کیا آپ واقعی نہیں جانتے...... وہ کہاں ہیں؟''

''جی، بالکل نہیں۔'' ارزش نے انتہائی پریشانی کے عالم میں فوری طور پر سرنفی میں ہلایا اور کہا۔

''پلیز پہلیاں نہ بجھوائیں۔ حویلی کیوں بک رہی ہے؟ اور آپ کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟''

دانیال نے گہری سانس لی اور ہمت جمع کی۔

''دراصل چند ماہ پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان سب کا انتقال ہو گیا۔''

''چند ماہ پہلے؟'' ارزش بے تحاشا حیران ہو رہا تھا۔

''جی...... چند ماہ پہلے۔ اب ظاہر ہے دو گھروں کو سنبھالنا آسان نہیں، دیکھا جائے تو نین تارہ صاحبہ نے بہترین فیصلہ کیا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور اس میں کتنی صداقت ہے۔''

''سچ پوچھیں تو میں بھی حیران ہوں، اتنی بڑی بات اور آپ لاعلم ہیں۔''

''مسٹر دانیال آپ کو ضرور کوئی غلط......''

''ارزش صاحب بات کو سمجھیں۔'' دانیال نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور فوراً اسے ٹوکا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' ارزش نے ڈرتے، ڈرتے کہا۔

''جی......'' دانیال نے نرمی سے ''جی'' کہا۔

''آپ نے ابھی کہا اُن سب کا انتقال ہو گیا۔ ان سب سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''آپ کو سن کر اچھا نہیں لگے گا۔'' دانیال نے کچھ جھجک کے کہا۔ ''اس حادثے میں آپ کے پیرنٹس بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

موبائل ارزش کے ہاتھ سے چھوٹتے، چھوٹتے بچا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے کسی نے کچھ بتایا نہیں، میں آپ کی بات کا کیسے یقین کرلوں؟''

''ہو سکتا ہے آپ کو اس لیے بھی اطلاع نہ دی ہو کہ آپ دیارِ غیر میں اکیلے اتنی بڑی خبر کو سننے کے بعد جانے کیا کرلیں...... مطلب کیساری ایکٹ کریں۔''

''آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے...... آپ کسی اجنبی کی نہیں میرے پیرنٹس کی بات کر رہے ہیں۔''

''سوری، میرا مقصد آپ کو مطلع کرنا تھا۔''

ارزش کو واقعی سمجھ نہیں آرہا تھا وہ کس طرح ری ایکٹ کرے دانیال فون بند کر چکا تھا۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ ارزش کا دم گھٹنے لگا۔

''باؤ جی، بے جی، ماموں، مامی اچانک سب ایک ساتھ چلے گئے اور میں ان کو کاندھا بھی نہیں دے سکا...... میں اس قدر بدنصیب ہوں اس قدر...... ان سب کے آخری دیدار سے بھی محروم کر دیا گیا۔ مگر یہ سب کیسے، کیسے ممکن ہے کیا یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے مگر کیوں......؟''

غصے کے مارے اس کی سانس پھولنے لگی۔ نتھنے پھڑ پھڑانے لگے۔

''سب داغِ جدائی دے گئے تم رہ گئیں، کیوں...... تم کیسے بچ گئیں۔ کیا تم اس حادثے کے وقت ان کے ساتھ نہیں تھیں؟'' وہ خیالوں میں نین تارہ سے مخاطب تھا۔

''اُف میرے خدایا کیا ہو گیا...... نین تم نے اچھا نہیں کیا مجھے اس حادثے سے لاعلم رکھا...... کیوں، آخر کیوں، مجھ سے تم نے یہ کیسا انتقام لیا ہے؟ اگر تم نے مجھے جان بوجھ کر انجان رکھا ہے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا...... ہرگز بھی نہیں......'' وہ بالکل الگ ٹریک پر سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ارزش کا دل چاہ رہا تھا چیخ، چیخ کر روئے اس کا سینہ شدتِ غم سے پھٹتا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا، یہ کہ نین کہاں ہے؟ نہ یہ کہ اس نے یہ اطلاع کیوں نہیں دی؟

اور یہ بھی نہیں کہ یہ دلدوز انکشاف کرنے والا...... یہ برچھی چلانے والا اجنبی کون تھا؟

سچ تو یہ ہے کہ اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ پلٹ کر اس اجنبی کو کال کرے اور مزید کوئی تفصیل پوچھے۔

کتنی ہی دیر تو وہ سکتے کے عالم میں رہا۔ اسے لگ رہا تھا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ ایک بے یقینی یا پھر بے بسی کی کیفیت میں...... خدا جانے وہ کتنی دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ موت کی خبر زندہ رہ جانے والوں کی بھی ایک بار تو ضرور سانس روک لیتی ہے اور جب خبر بھی کسی بہت اپنے کی ہو۔

تھوڑی ہمت ہوئی تو ارزش کو سب سے پہلے نین کا خیال آیا...... اس لیے نہیں کہ اس کو نین سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ اس لیے بھی نہیں کہ اس کے ساتھ ارزش کا نکاح کے دو بولوں کا بندھن تھا...... صرف اس لیے کہ اس نے یہ خبر کیوں چھپائی۔ وہ اسے کسی قسم کی بدنیتی، بے پروائی یا پھر بے حسی کس کا نام دیتا۔

انتہائی جلال میں اس نے نین کا نمبر ملایا دوسری طرف سے چند گھنٹیاں جانے پر فون ریسیو ہو گیا تھا۔

یہ اور بات کہ نین نے پہلے کئی بار سوچا کہ کال ریسیو کرے یا نہیں۔ اس کے اپنے اندر جھکڑ چلنے لگے تھے۔ دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو رہی تھی کہ سوائے اس آواز کے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

''ہیلو......!'' نین نے ان تین، چار حرفی لفظ کو بدقت کہا۔

''تم نے مجھ سے بدلہ لیا ہے؟'' ارزش نے تمہید باندھے بغیر کہا۔

نین مارے دکھ کے جم سی گئی۔

''تم نے جان بوجھ کے باؤ جی اور بے جی کی موت کی خبر مجھ سے چھپائی ہے......''

''مگر...... بتائی کس نے ہے؟'' نین نے بے ساختہ پوچھا وہ تو عرصہ ہوا رو دھو چکی تھی۔ بلکہ اسے تو اب اس غم کے ساتھ جینا بھی آ گیا تھا۔ اسے محرومی کی یہ کسک عجب مزہ دینے لگی تھی۔ اس سے کوئی رسماً بھی کہہ دیتا کہ اللہ تمہیں صبر دے تو وہ فوراً اللہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی کہتی مجھے صبر نہیں چاہیے میرا ہجر مجھے بہت پیارا ہے صبر آ گیا تو کسے یاد کر کے رووں گی، محبت کی کسک جب اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے تو تنہائی، تنہائی نہیں رہتی...... مجھے صبر نہیں چاہیے۔

''یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کس نے بتایا...... اہم یہ ہے کہ تم نے کیوں نہ بتایا، کیوں چھپایا مجھ سے میرے ماں باپ لاوارث نہیں تھے، میں تھا زندہ...... یہ تم نے مجھے کیسی سزا دی ہے نین تارہ......'' وہ جیسے غصے کی کیفیت میں بھی رو دینے کو تھا۔

ارزش نے نین تارہ کیا کہا۔ نین تارہ کا تو دل بیٹھ گیا۔ کتنے دن...... ہفتے...... صدیوں بعد اس کا نام یوں پکارا گیا تھا۔ کتنے زمانے بعد۔

''کیا میرا نقصان نہیں ہوا، میرے ماں باپ نہیں گئے۔'' نین صرف سوچ رہی تھی، وہ کہہ نہ پائی۔ صدیوں بعد تو محبوب نے نام سے پکارا تھا وہ تو یہ بھی بھول گئی کہ اسے بچے کا بتاتی۔

''حادثہ کب ہوا؟''

نین رو رہی تھی چپ چاپ بے آواز......

''چپ کیوں ہو...؟ میرے کسی سوال کا جواب تو دو۔''

''مم......میں نے کال کی تھی بتانے کے لیے مگر......''
''جھوٹ......بکواس۔'' اس نے ایسے کہا جیسے اسے تھپڑ مار رہا ہو۔
''ٹھیک ہے میں نے کال اٹینڈ نہیں کی...... تمہیں میسج تو کرنا چاہیے تھا۔ لگتا ہے یہ حادثہ تمہارے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔''
اب موبائل بند ہو گیا تھا......اور ارزش ہچکیوں سے رو رہا تھا۔
''بے جی...... باؤ جی...... تو کیا اب میں آپ دونوں کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔ کبھی نہیں......! میں اتنا... بدنصیب......اُف میرے خدا۔'' اس نے روتے، روتے اپنا سر تھام لیا تھا۔
''ایسا تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ دونوں مجھے اس وقت چھوڑ جائیں گے جب میں ان کے پاس نہیں ہوں گا۔ مجھے بلایا بھی نہیں جائے گا۔ بے جی...... آپ کو تو سب کچھ پتا چل جاتا تھا۔ پھر بتایا کیوں نہیں...... یہ کیوں نہ جانا کہ میں جب یہاں آیا تو وہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں رک جاتا، نہ آتا۔''
''کیا واقعی......؟'' وہ اپنے آپ سے محوِ کلام تھا مگر اندر ہی سے ایک اور صدا ابھری۔
''کیا واقعی تم یہاں نہ آتے۔ وہیں رک جاتے۔ تمہارے اس فریب میں کون آئے گا ارزش......تم نے تو ہر قیمت پر اپنے ملک، اپنے پیاروں کو چھوڑ کر آنے کا ارادہ باندھا ہوا تھا۔''
اپنے گم شدہ حواسوں کے ساتھ وہ کب اسماعیل کے پاس پہنچا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ اب اسماعیل کے گلے لگ کر رو رہا تھا۔

دوسری طرف تنہا نین تارہ، ارزش کے لفظوں کے زخم چن رہی تھی۔
''ارزش کو آخر کس نے بتایا ہوگا۔''
بار، بار اس کے دماغ میں یہی بات چل رہی تھی۔
''میرے علاوہ یہ نمبر اور کس کے پاس تھا؟'' اس نے سوچا۔
اسماعیل نے ارزش کو رونے دیا اس دوران آمنہ کی بہت کالز آئیں مگر ارزش میں ریسیو کرنے کی ہمت تھی اور نہ اسماعیل ریسیو کرنا چاہتا تھا کہ وہ آمنہ کی یا کسی کی بھی کال اس وقت ریسیو کرے۔
''ارزش اس میں کچھ غلطی تو تمہاری بھی ہے۔''
اسماعیل نے یہ بات اس وقت کی جب ارزش کی کچھ ڈھارس بندھ چکی تھی، آنسو اب تو اتر سے نہیں آ رہے تھے بلکہ ان کے برسنے کا دورانیہ بڑھ چکا تھا۔ گھٹی گھٹی سسکیاں بھی تھک چکی تھیں۔ یہی وقت تھا جب ارزش کو اس کی غلطی کا احساس دلایا جاتا کیونکہ اسماعیل جانتا تھا کہ اس نے پاکستان سے آ کر پلٹ کر دیکھا تک نہیں وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ کون، کون سے رشتے وہ چھوڑ کر آیا ہے لیکن باؤ جی اور بے جی کا ذکر تو وہ اکثر کرتا تھا...... یہ اور بات کہ فون کرتے اس نے یا وہاں کے لیے بے چین ہوتے ارزش کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔
''میری غلطی؟......'' ارزش بڑبڑایا۔
''تم نے یہاں آ کر باؤ جی اور بے جی کو کتنے فون کیے......؟ کتنی خبر رکھی۔''
ارزش سوچ میں پڑ گیا۔
''جس بات کا جواب سوچ کے دینا پڑے۔ اس میں غلطی کی گنجائش یقینی ہوتی ہے۔''
''اسماعیل میں مانتا ہوں میں بہت خبر گیر نہیں رہا لیکن...... تم خود سوچو ماں باپ کے مرنے کی خبر کیا اتنی غیر اہم ہے کہ اس کے لیے کوئی بھی ایکسکیوز چل سکتا ہے؟''
''کیا تم نے اس سے پوچھا...... کیا نام ہے تمہاری اس کزن کا...... ہاں نین تارہ......اس کے والدین بھی تو اس حادثے کا شکار ہوئے...تم نے اس سے پوچھا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ اس نے اپنے چار پیارے ایک ساتھ کھو

دیے۔ وہ کس قدر اکیلی رہ گئی۔ تم نے پوچھا اس سے کہ وہ کیسے رہ رہی ہے؟" ارزش نے ایک لمحے کو یہ سب کہنے کو سوچا اور پھر کہہ دیا۔

"اگر اس پر قیامت ٹوٹی ہوتی تو مجھے ضرور بتاتی۔ شریک کرتی مجھے۔" ارزش نے نہایت تلخی سے کہا۔

"اب تم خود کو دھوکا دے رہے ہو ارزش...... صرف دھوکا اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈال کر ساری برائیاں اس ایک لڑکی کے سر رکھ رہے ہو۔ تم صرف اپنا گلٹ چھپانا چاہ رہے ہو۔"

ارزش کو غصہ ہی آ گیا کہ کیسے اسماعیل نے سب سچ جان لیا۔ اس کے دل کا حال اسماعیل پر کیسے کھل گیا۔

اپنا گلٹ (شرمندگی) ہی تو چھپا رہا تھا وہ...... اس گلٹ کے پیچھے صرف ایک بات نہیں تھی کہ اس نے نین کے بارے میں سوچا نہیں کہ وہ کیسے رہ رہی ہوگی۔ اس گلٹ کے پیچھے ایک داستان تھی۔ جس سے وہ آنکھ چرا رہا تھا...... نین بری نہیں تھی، اس سے محبت بھی کرتی تھی پھر بھی اس کے نصیب میں جدائی تھی، ہجر کی سیاہ تاریکی تھی......

وہ بہت قیامت کی رات تھی۔ یہاں ارزش کے لیے بھی اور وہاں نین کے لیے بھی۔ نین کے تو ایک بار پھر سارے زخم اُدھڑ گئے۔ وہی منظر آنکھوں میں پھر گیا۔

پھر سے........... حویلی میں سسکیوں اور آہوں کا دبا، دبا شور دل کو ہولانے لگا۔

کوئی کہہ رہا تھا۔ "ارزش کو بلا لو میتیں ایدھی میں رکھ دیتے ہیں۔"

کوئی کہہ رہا تھا۔ "مُردے کو آزمائش میں نہ ڈالو۔ یہ مٹی کی امانت ہے جلدی سپردِ خاک کر دینا چاہیے۔"

کوئی کہہ رہا تھا کہ "وہی تو تنہا وارث ہے مرد ہے اسے یہاں ہونا چاہیے تھا۔"

کئی آوازیں اس کی ہمدردی میں بھی بولتی سنائی دے رہی تھیں۔

"ارے کوئی نین کو رُلا دے۔"

"غریب پر تو قیامت ٹوٹ گئی۔"

وہ باتیں بھی اسے یاد آنے لگیں جو اس وقت سنائی نہیں دے رہی تھیں......

صدف نے کس طرح اس کا پہرہ دیا۔

ڈاکٹر ماریہ نے کتنا اچھا سلوک کیا۔

اس کے پاس یاد کرنے کے لیے کتنا کچھ تھا۔

کتنی خوش قسمت تھی وہ۔

عین اس وقت جب نین یادوں کی گٹھڑی کھولے دکھ سکھ کی گھڑیاں الگ، الگ کر کے رکھ رہی تھی اس وقت رات کے اولین پہر میں ارزش دریائے ٹیمز...... کے کنارے اکیلے بیٹھا ہوا تھا اس کے پاس سوچنے کو کچھ نہیں تھا۔ سوائے اس بات کے کہ اس نے جو سوچا نہیں تھا، وہ ہو گیا۔ کیوں ہو گیا۔ اس نے لمبی آہ بھری۔

جانے کب تک بچپن اور جوانی کی باتیں یاد کرتا رہا۔ ہر منظر میں باؤ جی اور بے جی مسکراتے رہے۔ اور وہ دیارِ غیر میں روتا رہا۔

☆☆☆

وہ جب گھر پہنچا تو بہت رات ہو چکی تھی۔

آمنہ اس کو دیکھتے ہی بھڑکی لیکن ارزش کا مضمحل چہرہ۔ ڈگمگاتے قدم دیکھ کر چپ ہو گئی۔

ارزش آیا اور چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

آمنہ کی اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

☆☆☆

ہر انسان کی زندگی میں کچھ نہ کچھ نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور یہی اتار چڑھاؤ زندگی کا حصہ ہی نہیں زندہ رہنے کا احساس بھی دلاتے ہیں۔

کبھی تاریکی بڑھ جاتی ہے اور وہ بھی ایسی تاریکی کہ مایوسی کے سائے لمبے ہونے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے اس تاریک شب کی سحر کبھی نہیں ہوگی۔

اور کبھی روشنی کی ہلکی سی چھوٹی سی کرن مردہ امید میں زندگی بھر دیتی ہے۔ کبھی، کبھی ایسی راتیں زندگی میں آجاتی ہیں کہ لگتا ہے اس رات کی صبح نہیں ہوگی لیکن قدرت کی کرشمہ سازی کے قربان جایئے کہ ان کی صبح بھی ہو جاتی ہے......

اس رات کی صبح بھی ہو ہی گئی یہ اور بات کہ بہت مشکل سے ہوئی۔

صبح ہوتے ہی نین نے صدف کو کال کی اور صدف نے سر پکڑ لیا۔

''اب یہ کیا نیا ڈراما ہے؟''

''ڈراما نہیں ہے صدف، ارزش کو کسی نے بتا دیا ہے کہ اس کے والدین حادثے کا شکار ہو گئے۔''

''اچھا اور......؟'' صدف نے کہا۔

نین نے بہت سہولت سے سب کچھ بتا دیا۔

''اس نے تمہارے والدین کے لیے دکھ کا اظہار کیا؟''

صدف نے تیکھے انداز میں کہا۔

''تمہاری ساری باتوں میں ایک بار بھی اس نے تمہارے درد کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم پر کیا بیتی...... تم...... بیوی ہو اس کی۔ اس کے بچے کی ماں ہو۔'' نین تو بپھر گئی۔

''اس کو خضر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔''

''لعنت ہو تم پر...... بتایا کیوں نہیں؟''

''اس نے موقع ہی نہیں دیا۔''

''اور دیکھنا اس کو جب یہ خبر ملے گی تو کیسے بچے کا تیرے سر پر اور کوئی پتا نہیں ڈی این اے کرانے ہی بیٹھ جائے۔''

نین دکھ سے ہنسنے لگی۔

''بدنصیب ماں کا بیٹا ہے جانے کیا، کیا سہے گا۔'' نین نے سر کو جھٹکا۔

''ویسے مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ ارزش کو فون کس نے کیا ہوگا؟''

اس نے ذہن پر زور دیا اور اپنے اور ارزش کے درمیان ہونے والی گفتگو دُہرائی۔ اور یک دم جیسے اس نے سر پکڑ لیا۔

''صدف وہ کہہ رہا تھا کہ میں حویلی بیچنا چاہ رہی ہوں۔ تو کیا اس کا مطلب ہے یہ خبر دانیال قیصر نے ارزش کو دی ہوگی؟''

''دانیال نے......؟'' صدف نے دُہرایا۔ ''مگر کیوں اس کے پیٹ میں آپ کا خادم ٹائپ درد کیوں اٹھا بلکہ اس کی صحت تو کسی پنگے کی متحمل ہی نہیں؟'' صدف نے مسخرے پن سے کہا۔

''پوچھو اس سے...... اس کو کس نے اجازت دی اور سب سے بڑھ کر فون نمبر کس نے دیا۔''

''نمبر......؟'' نین نے کہا تو اب صدف بھی سوچ میں پڑ گئی۔

''واقعی نمبر اس کو کیسے ملا؟'' صدف نے دُہرایا۔ نین نے اسے گھور کے دیکھا۔

''کہیں تم مجھ پر شک تو نہیں کر رہی ہو؟''

''شک کی کھڑکی تو کھلی ہوئی ہے جناب۔ مجھے بہت غصہ آرہا ہے یعنی ہمارے اس قدر پرسنل میٹرز میں وہ ٹانگ اڑانے کی کوشش کر رہا ہے اور کوشش بھی کیا وہ تو اڑا چکا ہے۔''

''بے شک دانیال کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، دوسری طرف سچ یہ ہے کہ ارزش کو کسی نہ کسی دن خبر تو ہونی ہی تھی۔''

''ہاں تو خبر تو ہونی ہی تھی مگر یہاں بات کچھ اور ہے۔ اس طرح تو وہ صاف یہ سمجھے گا کہ میں نے، اس کے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ دھوکا دیا ہے اسے جان بوجھ کر بات کو چھپایا ہے۔ صدف، بات چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اگر اس کو بتانے کا طریقہ ٹھیک نہیں تو وہ اچھی بھی بری ہو جاتی ہے۔ اور اپنی اہمیت گنوا دیتی ہے۔ اور یہاں تو پھر زمین جائداد کا معاملہ ہے۔''

صدف سوچ میں پڑ گئی۔ کہیں جانے انجانے اس نے تو دانیال کو نمبر نہیں دے دیا۔ بہت سوچنے پر بھی اس کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ دانیال کے پاس ارزش کا نمبر کیسے پہنچا۔

☆☆☆

اس دن ارزش جاب پر گیا اور نہ ہی یونی۔ وہ دن اس کے لیے ایسا ہی دن تھا جیسے کل بے جی اور باؤ جی کی تدفین ہوئی ہو۔ بہت اداس، بے چین کئی قیمتی احساس گم ہو گئے تھے، ایک دکھ یہ بھی تھا اب اس کے لیے کون دعائیں کرے گا۔ وہ بات نہیں بھی کرتا تھا تو ایک نادیدہ احساس رہتا تھا کہ وہ چھاؤں میں ہے...... بالکل اچانک وہ جیسے تپتی دھوپ میں آ گیا تھا...... اسے یاد آ رہا تھا بچپن میں اسے بے جی نے بتایا تھا جب حضرت موسیٰ کی والدہ کا انتقال ہو گیا، غیب سے آواز آئی موسیٰ سنبھل کے اب تیری ماں نہیں رہی ......

آمنہ نے بھی اس کی دلجوئی کے لیے آف لے لیا تھا۔

''مجھے تو تمہاری کزن کا رویہ بہت عجیب لگا۔ تمہارے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو گئی اور اس نے بتایا بھی نہیں۔''

''کالز آئی تھیں اس کی، میں نے کال بیک بھی کی۔ مگر پتا نہیں کیوں...... کیا وجہ تھی۔ بات نہ ہو سکی پھر میں نے ہی اہمیت نہیں دی، میری ہی غلطی ہے۔''

''خود کو قصوروار کیوں سمجھ رہے ہو، تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے...... بس نین تارہ نے سوچا ہو گا کہ روپے پیسے پر قبضہ کر لے اور کیا؟'' آمنہ نے اپنے انداز سے سوچ کر کہا۔

''اسے روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے آمنہ۔ وہ خود اکلوتی ہے ساری حویلی اور جائداد کی مالک......'' ارزش کے دل میں ملامتی جھکڑ چل رہے تھے۔

''کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی ناں۔''

آمنہ کافی بحث کرتے، کرتے عام سے لہجے میں بولی۔ حالانکہ ارزش کو احتجاجاً آمنہ کی بات کو ان سنی کرنا چاہیے تھا اور شٹ اپ کال دینا چاہیے تھی لیکن وہ خاموش رہا۔

''ویسے کال کس نے کی۔ کسی سرونٹ نے؟'' آمنہ نے ارزش کی خاموشی کو توڑا۔

''معلوم نہیں کس نے کی۔'' ارزش کھویا، کھویا بولا۔

''کسی ملازم نے ہی کی ہو گی؟'' آمنہ نے پھر گرہ لگائی۔

کافی بن چکی تھی آمنہ نے کافی کا مگ ارزش کی طرف بڑھایا اور ایک مگ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''وہ کسی ملازم کی آواز نہیں تھی۔'' ارزش نے کچھ سوچا اور بے چینی سے بولا۔

''تو...... کال بیک کرنی چاہیے تھی ناں تمہیں فوری معلوم کرنا چاہیے تھا۔''

ارزش نے ایک لمحے کو حیران ہو کر آمنہ کو دیکھا۔ اسے یہ خیال کیوں نہ آیا۔

''یہ میں نے کیوں نہیں سوچا؟''

''تو اب کر لو کال......''

''ہاں......ابھی کر لیتا ہوں۔''
ارزش اور آمنہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ارزش نے کافی کا مگ وہیں صوفے کے سامنے رکھی میز پر رکھا اور فون کے کی پیڈ سے نمبر تلاش کرنے لگا۔ نمبر مل گیا۔
''پر میں اس سے کیا کہوں گا؟'' اس نے بے خیالی میں کہا۔
ارزش کی معصومیت پر آمنہ کو غصہ ہی آ گیا۔
''اس سے پوچھو تم کون ہوں؟ کیا تعلق ہے اس کا گھر والوں سے؟ تمہاری کزن نے تو بتایا نہیں حادثے کے بارے میں، تم نے کیوں بتایا اس کے پاس تمہارا نمبر کہاں سے آیا ویسے......''
آمنہ نے کافی کا سپ لیا بات کی اہمیت کو بڑھانے کے لیے ''ویسے......'' کے بعد بات ادھوری ہی رہنے دی۔
''کیا کہنا چاہتی ہو تم؟'' ارزش کے ہاتھ میں موبائل ضرور تھا لیکن وہ کال ملا نہیں رہا تھا۔
''تمہیں شاید برا لگ جائے تمہاری کزن ہے ناں وہ۔'' آمنہ نے پھر بات کو درمیان میں رہنے دیا۔
''آمنہ میں بہت ڈسٹرب ہوں، پلیز مجھے مزید پریشان مت کرو۔'' ارزش زچ ہو رہا تھا۔
''میں سوچ رہی تھی ممکن ہے اس لڑکے سے نین تارہ کا کوئی افیئر ہو۔''
''تم جانتی ہو تم نے کیا کہا ہے؟'' ارزش جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔
''ویسے ہی کہا ہے تم تو برا مان گئے۔'' وہ مسکرا دی۔ آمنہ کو حقیقتاً ارزش کا ری ایکٹ کرنا اچھا نہیں لگا۔
''مجھے جانا ہوگا۔'' ارزش بہت بے تابی سے بولا۔
''کہاں؟'' آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔
''پاکستان اور کہاں...... نین حویلی بیچ رہی ہے ممکن ہے وہ فون ڈیلر کا ہو اور نین چاہتی ہو کہ میں یہ سب کچھ جان لوں، وہ ایسی ہی ہے۔''
''تم اس کے بارے میں بہت جانتے ہو۔''
''ظاہر ہے وہ میری......'' ارزش نے گہری سانس لی۔ ''کزن ہے بچپن سے جانتا ہوں اسے۔''
آمنہ نے حیران ہو کر ارزش کو دیکھا جس کی آنکھیں کسی نادیدہ نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا ہے۔
''چلو مان لیتے ہیں تمہاری کزن نے نمبر دیا ہوگا۔ لیکن وہ تم سے پردہ تو نہیں کرتی۔ بات کر سکتی تھی۔'' ارزش نے سخت سی نظروں سے آمنہ کو دیکھا جسے آمنہ نے محسوس بھی کر لیا۔
''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھے میری کزن کے خلاف بھڑکا رہی ہو۔''
''میں......؟'' آمنہ نے ناگواری سے کہا۔ ''میں ایسا کیوں کروں گی؟''
''یہی تو...... تم ایسا کیوں کر رہی ہو، تمہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ اس حادثے میں اس کے بھی ماں باپ ختم ہو گئے۔ تم جانتی نہیں ہو اس کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہوا ہے...... اس کی تو نفسیات ہی بدل گئی۔ وہ بہت حساس ہے۔ وہ کیسے بھولے گی ان لمحوں کو جب اس نے سب کے آخری دیدار کیے ہوں گے۔ میرے دل و دماغ میں...... میری سوچ میں تو وہ سب... مسکراتے رہیں گے۔ مگر نین ...کیسے سہہ رہی ہوگی۔ بس یہی سب کچھ پوچھنے کے لیے مجھے پاکستان جانا ہے اس سے سب پوچھنا ہے۔''
''ایک بات پوچھوں؟'' آمنہ نے بہت سکون سے اس کی ساری باتیں سنیں اور پھر بولی۔
ارزش نے سوالیہ سے انداز میں آمنہ کو دیکھا۔
''تم اپنی کزن کو بہت چاہتے ہو؟''
''کیا......؟'' ارزش کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔

''تم واقعی بالکل پاگل ہوگئی ہو۔''

اس نے کافی کا مگ وہیں چھوڑا اور غصے سے باہر نکل گیا۔ آمنہ اس کے پیچھے لپکی۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا تم یہ کیسے ری ایکٹ کررہی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟''

ارزش کا دل چاہا کہ آمنہ کو صاف، صاف بتادے کہ وہ اس کی کون ہے۔ لیکن اتنا بڑا انکشاف کرنے سے پہلے اسے اپنا دل بھی بڑا کرنا تھا۔ جو ہو نہیں رہا تھا۔ ارزش نے اپنے دل میں جھانک کے دیکھا وہاں نین کی محبت نہیں تھی مگر خیال، احساس ضرور تھا...... ارزش اور نین کے درمیان قائم ہوا مقدس بندھن بھی ارزش کے دل میں محبت نہ جگا سکا لیکن یہ تو طے تھا دونوں کے درمیان...... نین نے بخوشی راستہ دیا تھا۔ اس کے لیے بے جی کو منایا تھا۔

آمنہ نے ارزش کا برہم موڈ محسوس کیا تو لہجہ بدل کر نرمی سے بولی۔

''تم شاید اپنی کزن کے لیے بہت زیادہ پریشان ہو، اچھا وہ بالکل تنہا بھی تو رہ گئی ہے۔ ایسا کرو واقعی چلے جاؤ، اس کا مسئلہ حل کرو بلکہ ہو سکے تو اس کی شادی بھی کرادو۔ اکیلی کیسے رہے گی وہ۔''

''جیسے اب رہ رہی ہوگی۔'' ارزش نے سوچا لیکن کہا نہیں۔ آمنہ کو دیکھا ایک گہری سانس لی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کافی؟'' وہ باہر پورٹیکو میں کھڑا تھا۔

''ابھی لے کے آتی ہوں۔'' آمنہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ ارزش تو چاہ رہا تھا وہ تنہا رہے...... اس وقت آمنہ کا وجود اسے اپنی سوچوں اور تنہائی کے درمیان کھٹک رہا تھا۔ وہ اکیلے میں کچھ وقت باؤ جی، بے جی اور ولایت ماموں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا، انہیں یاد کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

صدف یہ تو جان گئی کہ فون دانیال قیصر نے کیا ہے لیکن کیوں کیا، اس کا جواب ابھی ملنا باقی تھا اور اس جواب کے لیے صدف نے دانیال کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنے کو کہا۔ دانیال آ بھی گیا لیکن اس کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔

''وجہ جان سکتا ہوں۔ کیوں بلایا تم نے وہ بھی ریسٹورنٹ میں؟''

''ایمرجنسی تھی۔'' صدف نے مختصراً کہا۔

''ایمرجنسی تھی تو کال کرلیتیں بلایا کیوں؟'' دانیال نے آنکھیں چندھی کرکے اپنی حیرت کی گہرائی کا اظہار کیا۔

''تا کہ بوقت ضرورت تمہارا گلا بھی دبا سکوں اور ریسٹورنٹ میں اس لیے بلایا کہ کھانے میں زہر ملانا پڑا تو وہ بھی کرسکوں گی آسانی رہے گی۔''

''ہوا کیا ہے؟ خونی چڑیل کیوں بنی ہوئی ہو؟''

''تم نے ارزش کو کال کی تھی؟'' صدف نے گھورتے ہوئے جواب طلب کیا۔

''کی تھی۔'' دانیال نے بے پروائی سے کہا۔

''وجہ جان سکتی ہوں؟'' صدف نے کمال تحمل کا ثبوت دیا۔

''نین تارہ میری کلائنٹ ہیں۔ میں ان کے کیس کی بہتری کے لیے سب کچھ کروں گا۔'' دانیال نے اطمینان سے کہا۔

''تمہاری کلائنٹ ہونے سے پہلے وہ حویلی کی مالک اور ارزش کی بیوی ہے۔''

''میری کال کا ان باتوں سے کیا تعلق ہے؟''

''اچھا یہ بتاؤ کس کی اجازت سے کال کی؟'' صدف نے دانت کچکچائے۔

''اس کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ......''

دانیال بہت مدبرانہ انداز میں کہہ رہا تھا کہ صدف نے اس کی بات کاٹی۔

''دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ تمہیں اسی وقت شوٹ کردوں۔''

”تم ہر وقت مرنے مرانے کی بات کیوں کرتی رہتی ہو۔ احمق لڑکی، ایک بار ملنے والی اس زندگی کی قدر کیا کرو۔“
”اس ایک بار ملنے والی زندگی کا آخری دیدار کرلو۔ نین تمہاری اس حرکت پر بہت غصے میں ہے۔“
”کوئی نئی بات کرو۔“ دانیال بے ساختہ ہنسا۔
”بہت ڈھیٹ ہو۔“ صدف نے اسے گھورا۔
”اچھا کچھ کھلاؤ گی بھی یا گھورتی ہی رہو گی۔“ دانیال نے مینیو کارڈ سامنے کیا۔
”تم نین کو پسند کرتے ہو ناں؟“
”ہوں...... کرتا تھا، کرتا ہوں، کرتا رہوں گا۔ وہ ناقابلِ تسخیر خاتون ہے۔ میں نے ایسی لڑکی نہیں دیکھی آج تک۔ اسے پتا نہ چلے ورنہ کبھی دیکھنے کا چانس بھی ختم ہو جائے گا۔“ دانیال مسکرا دیا۔
”کیا کھاؤ گے؟“ صدف نے پوچھا لیکن اس کو کھانے سے زیادہ اس بات کی ٹینشن تھی کہ نین کا ری ایکشن کیا ہو گا...... دانیال کی یہ کوتاہی قابلِ معافی تو تھی نہیں۔

☆☆☆

خضر کو رات سے بخار تھا اور رات بھر جاگنے اور خضر کی پریشانی نے نین کی حالت عجیب کر رکھی تھی۔ صدف ریسٹورنٹ سے سیدھی نین کے پاس ہی آئی تھی لیکن نین کو فکر مند دیکھ کر اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔
”لگتا ہے خضر کو ٹھنڈ لگ گئی ہے۔“ نین تارہ پریشانی سے بولی۔
”ڈاکٹر کو دکھایا؟“
”ہاں......“ اس نے بے چینی سے کہا۔ ”ڈاکٹر کہہ رہا تھا نمونیہ ہو گیا ہے۔“ نین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ بچوں کے ساتھ اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے۔“
”میرے ہی ساتھ ہونی ہے یہ اونچ نیچ......“
”بی بریو میری جان تم تو بہت بہادر ہو ناں۔“
”اولاد کی محبت ساری محبتوں کی جان ہے۔ یہ مجھے خضر کے بعد معلوم ہوا...... یار بچے کبھی اس چاہت اور چاہت بھرے خوف کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو ماں باپ کو ہوتے ہیں جیسے اب مجھے ہو رہے ہیں۔“
”بس کر دو نین...... ابھی اس عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔“
وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ صدف کو دیکھنے لگی۔
”میں چلتی ہوں...... کوئی بھی پرابلم ہو تو مجھے فوراً کال کر دینا اکیلے مشکلیں اٹھانے سے یقین کرو کوئی ٹرافی نہیں ملتی۔“
صدف نے شولڈر بیگ کندھے پر ڈالا دوپٹا کندھے پر سیٹ کیا اور جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ نین نے اسے روک لیا۔
”ارزش کو دانیال نے کال کی تھی؟“
صدف کے پاس اقرار میں سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن صدف حیران رہ گئی۔ نین نے ری ایکٹ نہیں کیا خاموش ہو گئی۔ گہری سوچ میں ڈوبی نین کو صدف نے پریشانی سے دیکھا۔
”تم ٹھیک ہو تو ناں، تمہیں برا نہیں لگا؟“
”لگا تھا...... لیکن یہ بات کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی سے پتا تو چلنی تھی۔ چلو دانیال نے بتا دیا۔“
”ارزش نہیں سوچے گا کہ کسی غیر نے کیوں بتایا؟“
”کون غیر...... دانیال......؟ جو میرے لیے سوچتا ہے...... تم غیر جس کی میں ذمے داری بنی ہوئی ہوں...... یا یہ سبحان بابا، جہانگیر بابا...... کون غیر یہی تو میرے اپنے ہیں...... اللہ کے بعد انہی سب نے ہی تو سنبھالا ہے......“

صدف سمجھ گئی کہ اس وقت نین کو تنہا چھوڑ دینا ہی مناسب ہے سو اس نے وہاں سے چلے آنا ہی مناسب سمجھا......
اچھا ہوا صدف چلی گئی وہ واقعی تنہا رہنا چاہ رہی تھی۔ جب سے ارزش کو حادثے کی خبر ہوئی تھی اِدھر اس کی...... بے چینیاں بڑھتی جا رہی تھیں جن یادوں کو اس نے بمشکل تھپک، تھپک کر سلایا تھا سب کی سب جاگ گئی تھیں ایسا لگتا تھا سب اسی ایک کُن کے انتظار میں تھیں۔

''آج تو امی آپ بہت یاد آ رہی ہیں کتنے، کتنے لاڈ اٹھایا کرتی تھیں آپ اور میں ہمیشہ جا کے بابا کی گود میں چھپ جایا کرتی۔ لیکن آج دل کر رہا ہے کہ کوئی میرے لاڈ اٹھائے، آنسو پونچھے۔'' نین کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے۔

''امی......

یادوں کے جزیروں سے
تیری آہٹ جب آتی ہے
میرا دل ڈوب سا جاتا ہے
میں سوچوں کے سمندر میں غوطے لگانے لگتی ہوں
آپ کی باتیں سننے کو آپ کا ایک لمس پانے کو
تڑپ جاتی ہوں...... ترستی ہوں
آپ کے ہاتھوں کو چھو کر ماتھے سے لگانے کو
بچوں کی طرح آپ کے دامن سے لپٹ جانے کو جی بھر کے رونے کو
آپ کی گود میں سر رکھ کر سارے درد بھلانے کو میں کتنا تڑپتی ہوں

کاش آپ کو بتا سکتی۔ وہ سارا وقت جو ایسے ہی گزر گیا...... کاش میں اسے واپس لا سکتی...... کاش۔''

خضر کسمسایا۔ اس کی معصوم سی آواز نے اسے یادوں کی بھیڑ بھاڑ سے باہر نکالا...... ویسے بھی اس کی دوا کا وقت ہو چکا تھا جیسے ہی خضر نے ہلکی سی آواز نکالی دروازے پر مخصوص دستک ہوئی۔

''آ جائیں بابا۔''

سبحان بابا کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

''بابا کے رونے کی آواز آئی تو......''

''اچھا ہوا آپ آ گئے بابا، خضر کی دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ اسے پکڑیں میں دوا دیتی ہوں۔''

''آپ جاگ رہی تھیں؟'' سبحان بابا نے خضر کو گود میں لے لیا۔

''جی بابا، سوچا خضر کو دوا پلا کے ہی سوؤں گی۔'' نین نے اطمینان سے کہا۔

''بچہ بیمار ہو تو نیند نہیں آتی۔'' سبحان بابا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جب بھی ارزش بیٹا بیمار ہو جاتا تھا یا ہلکا ساز کام بھی ہو جاتا تو مالکن سوتی نہ تھیں۔ ارزش بیٹا تو بیمار ہوتے سو ہوتے معلوم ہوتا مالکن بھی بیمار ہیں۔''

''ایسے ہی تو ماں کا مقام بلند نہیں ہے ناں...... لیکن بابا ایک بات کہوں، مجھے باؤ جی بہت یاد آتے ہیں انہوں نے بہت محبت کی سب کے ساتھ بہت محبت......''

بابا دوا کھلا کے چلے گئے، جاتے، جاتے نین کو سونے کا بھی کہا۔ نین کو سبحان بابا بہت عزیز تھے۔ وہ واحد جو تھے گھر کے بڑے سے لے کر خضر تک سب کو جانتے تھے۔

☆☆☆

سچ تو یہ تھا کہ احساسِ جرم ارزش کو مارے دے رہا تھا...... اسے بے شک نین سے محبت نہیں تھی شادی اگر چہ ضرور کر لی تھی... لیکن کسی کو پریشان کرنا بھی اس کے مزاج کے خلاف تھا...... اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ وہ جائے

گا۔ نین کو طلاق دے دے گا بلکہ اس کے لیے کوئی بہت اچھا سا لڑکا دیکھ کے اس کی شادی کر دے گا...... وہ جیسی زندگی گزار رہی ہے وہ کوئی زندگی تو نہیں، اسے بھی جینے کا، خوشگوار زندگی گزارنے کا پورا حق ہے...... اس سوچ نے کسی حد تک اس کے درد کو کم کر دیا جرم کے احساس میں کمی ہونے لگی۔

وہ جب لندن آیا تھا تو اس کا پہلا تعارف اسماعیل تھا۔ وقت پڑنے پر ارزش نے اسی سے مدد لی تھی اب بھی وہ اسماعیل کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے...... تمہارا جانا ضروری ہے اپنی کزن کے لیے تم نے جو فیصلہ کیا وہ بھی بہت اچھا ہے۔'' اسماعیل اس کی شادی کی بات سے ہنوز ناواقف تھا۔

''میں وہ وقت تو واپس نہیں لا سکتا لیکن اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھ لوں گا شاید سکون آ جائے۔'' ارزش کی آنکھوں میں نمی آ گئی...... لہجہ کانپ گیا لفظ ادھورے رہ گئے۔

''میں جب آیا تھا تب میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اب ان پیاروں کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔''

''اپنی بے چینیاں کم کرنا چاہتے ہو تو والدین کو محبت سے یاد کرتے رہا کرو۔''

ارزش کا سر جھک گیا...... اس نے کبھی اس طرح سے یاد نہیں کیا تھا جیسا کہ یاد کرنے کا حق ہوتا ہے...... کسی کو بھی نہیں......

''کب جا رہے ہو؟'' اسماعیل نے پوچھا۔

''جتنی جلدی ممکن ہوا، میرا مطلب ہے ٹکٹ جتنی جلدی کی مل جائے گی۔''

''اس کے لیے فکر مت کرنا میں جلدی کی ارینج کرا دوں گا، تم بس گھر جاتے ہی مجھے اپنے پاسپورٹ کی تصویر کھینچ کے بھیج دینا۔'' اسماعیل نے کہا۔

ارزش کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ وہ چاہ رہا تھا اڑ کے پہنچ جائے دوسری طرف اس کا دل ایسا بوجھل ہو رہا تھا کہ اس کے لیے سوچنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ سب کا سامنا کیسے کرے گا......

اس نے اسماعیل کے گھر سے نکلتے ہوئے پاکستان فون کیا......

''ہیلو......'' نین نے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''میں آ رہا ہوں۔''

''کب؟''

''جیسے ہی ٹکٹ بک ہوتی ہے بتاتا ہوں۔''

اتنا ہی کہہ کر ارزش نے فون رکھ دیا۔

نین کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا، اس خوشی کو وہ کس کے ساتھ سیلیبریٹ کرے۔

''صدف......'' نین نے کانپتے ہاتھوں سے صدف کو کال ملائی۔

''سن ارزش آ رہا ہے......''

''کب؟''

''ٹکٹ لیتے ہی بتائے گا......''

''ٹکٹ لے کے بتاتا تو کم سے کم میں تیرے ہاتھوں پر مہندی لگانے والی بنتی ناں۔''

''بکواس کیے جا تو۔'' نین نے بے ساختہ ہنس کے کہا۔

نین نے فون رکھا اور ننھے خضر کو سینے کے ساتھ لگا لیا...... آخر اس کے بابا آنے والے تھے۔

(جاری ہے)

صبح، صبح ہی برابر والے گھر میں شور ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ عجیب قسم کے بچے تھے۔ ماں بیچاری بچوں کو بلا، بلا کر تھک جاتی، ہر بچے کو ناشتا خود کرواتی، لنچ باکسز پیک کر کے دیتی اور باہر نکلتے ہوئے بچوں سے پوچھا جاتا کہ واپسی پر کیا پکاؤں...... زارا ان بچوں پر رشک کرتی جن کی ماں اتنی بھرپور توجہ اور پیار الگ، الگ ہر بچے کے لیے لٹاتی۔ آوازوں سے زارا نے اندازہ لگایا کہ احمد اور عبداللہ تو بلا کے شریف بچے تھے غالباً وہ دونوں بڑے اور علی چھوٹا اور شفق سب سے چھوٹی...... علی اور شفق دونوں کافی شرارتی بچے تھے، لڑنے اور ہنسنے کی آوازیں ان کی ہی آتیں۔ ایک بیچارے شریف النفس سسر صاحب تھے۔ باقی سسرالی، رشتوں اور شوہر کا تعارف ابھی زارا حاصل نہیں کر پائی تھی۔ صحن کی دیوار دونوں گھروں کی مشترکہ تھی۔ کچن صحن کی طرف تھا سو سلیمان کا ناشتا تیار کرتے ہوئے زارا ساتھ والوں سے کافی متعارف ہو چکی تھی۔

"عبداللہ بیٹا تمہارا کل کا لنچ ویسے کا ویسا ہی آ گیا تھا۔ آج کیا دوں۔" جواب ندارد۔

"احمد تمہیں تو موقع ملنا چاہیے کینٹین سے الا بلا کھانے کا...... چلو آج تم دونوں ہی کینٹین سے کچھ لے لینا۔"

"خدا کے لیے طاہرہ اپنے اور میرے اوپر رحم کرو۔ علی

اک کسکِ جاں

خولہ سعید جاوید



اور شفق تمہاری ساری توجہ کے مستحق ہیں، ان میں دل لگاؤ......" سسر صاحب کی لجاجت بھری آواز آئی۔ "اوہ تو خاتون کا نام طاہرہ ہے"، بات اتنی بڑی نہیں تھی لیکن طاہرہ کے زور، زور سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اتنے میں وین کا ہارن ہوا اور صرف علی اور شفق کی اللہ حافظ کی آوازیں آئیں۔ زارا کو ان دیکھے احمد اور عبداللہ پر غصہ آنے لگا۔

"بھلا ایسا بھی کیا نخرہ، ماں منتیں کرتی رہ جاتی ہے اور بچوں کے مزاج دیکھو۔ حد یہ کہ مجال ہے جو کبھی ان کے منہ سے الوداعی کلمات بھی ادا ہوتے ہوں اور تو اور یہ بابا جی توبہ ہے بجائے اس کے کہ بچوں کو ٹوکیں الٹا بہو کو مزید تنگ کرنے لگ جاتے ہیں۔"

☆☆☆

سلیمان کا ہفتہ پہلے ہی پشاور ٹرانسفر ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ اس کو برانچ ہیڈ بنا دیا گیا تھا۔ تنخواہ اور مراعات اس کی توقع سے بھی زیادہ تھیں لیکن زارا جس کی شادی کو ابھی صرف چھ ماہ ہوئے تھے وہ یہاں آنا نہیں چاہ رہی تھی۔ بھرے پُرے گھر سے آئی تھی، سسرال میں بھی جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ پشاور آ کر اکیلے رہنا اس کے لیے مشکل تھا لیکن بہر حال آنا ہی پڑا اور یہ لوگ زارا کے ہمسائے تھے۔ سلیمان اپنی نئی ذمے داریوں میں بری طرح مصروف تھا۔ زارا کا ہمسائیہ نامہ کبھی بے دلی سے سن لیتا کبھی ہاتھ کھڑے کر دیتا۔

"ڈیئر مسز معذرت، سارا دن شدید ذہنی جسمانی تھکان کے بعد ہمسایوں کے قصے سننے کی مجھ میں ہمت نہیں۔" زارا کو ابھی یہاں آئے ہفتہ دس دن ہی ہوئے تھے، کچھ ہمسائیاں ملنے بھی آئی تھیں لیکن خود زارا ابھی تک ان کے گھر چکر نہیں لگا سکی تھی۔ ایک تو اس کے لیے یہاں کی سردی برداشت کرنا وہ بھی دسمبر کی خاصا مشکل تھا۔ دوسرے گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کے باعث نازک مزاج بھی بہت تھی۔ ابھی تک پورا سامان بھی کھول نہیں پائی تھی۔ روزانہ تھوڑا سا سامان کھولتی پھر کھانا پکانے اور صفائی میں دن گزر جاتا۔ دونوں میاں، بیوی تھے ماحول نیا تھا اس لیے ماسی کی علت پالنے سے زارا گھبرا رہی تھی، موبائل یاترا کے لیے بھی حسب تمنا ٹائم نہ مل پاتا۔ آج چھٹی کا دن تھا سو آغاز بھی دیر سے ہوا۔ کچن میں جاتے ہوئے زارا نے سوچا ہمسائے تو ناشتا کر چکے ہوں گے۔

"شفق اپنی پلیٹ سے کھاؤ بھائی اگر شریف ہیں اور کچھ نہیں کہتے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم بھائیوں کا حلوا اکیلی ہی کھا جاؤ......"

"احمد، عبداللہ آج تمہاری پسندیدہ حلوا پوری منگوائی ہے ڈٹ کر کھاؤ۔" جواباً شفق کی آواز آئی بڑے بچے یا تو بہت کم گو تھے یا اتنا آہستہ بولتے تھے کہ زارا پوری کوشش کے باوجود ان کی آواز نہ سن پاتی۔ کچھ دیر بعد علی کا کھنکھناتا قہقہہ ابلا......

"دادا ابو آج میں نے آپ کا سارا ناشتا خود کھا جانا ہے۔"

"چل شرارتی بلے اپنے ناشتے پر دھیان دے، میرا ناناشتا مجھے پکڑا۔"

"میں نہ پکڑاؤں دادا ابو......" مستی بھری آواز آئی دادا، پوتا چہلیں کر رہے تھے۔ زارا کو باقی دونوں بچوں کی خاموشی بہت کھلی ہمسائی نے دل کی بات سن لی۔

"احمد، عبداللہ تم بھی کچھ بولا کرو ناں، میں ہی پاگل ہوں جو مسلسل تم سے باتیں کرتی رہتی ہوں، آئیں تو ذرا اس سال تمہارے ابو تو واپس نہیں جانے دینا ذرا گھر رہیں اور تمہیں ٹھیک کریں۔" حیرت کی بات تھی طاہرہ، شفق، علی اور دادا مسلسل بول رہے تھے کم گو بچے بالکل ہی خاموش تھے۔

"بے حس اور بدتمیز نہ ہوں تو......" زارا نے دل کی بھڑاس نکالی۔ کمرے میں ناشتے کی ٹرے لائی تو سلیمان ہیٹر لگائے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں خوشگوار سی حدت پھیلی ہوئی تھی۔ سلیمان نے بیڈ پر لحاف ہٹا کر اس کے لیے جگہ بنائی آج بہت دنوں بعد اس کو فرصت تھی۔

"سلیمان پلیز ٹی وی بند کر دیں، آج میں نے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔" سلیمان بھی موڈ میں تھا فوراً ٹی وی آف کر دیا۔

"آج میں نے حلوا پوری کھانی تھی یاد ہی نہیں آیا۔" گرما گرم پراٹھوں کے ساتھ ڈھیر ساری پیاز، ہری مرچ، ٹماٹر، دھنیے والا آملیٹ کھاتے ہوئے زارا کو افسوس ہوا۔ سلیمان نے ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ سردی میں ٹھٹھرنے کے بجائے گرم کمرے میں گرما گرم ناشتا مل گیا۔

''پوچھ سکتا ہوں یاد کیسے آیا؟''

''ہمسائے آج حلوا پوری کھا رہے ہیں، سلیمان ایسا نہ کریں ہم دونوں جا کر اُن سے آج مل آئیں۔ انہیں تو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ مشترکہ دیوار ہے نئے، نئے ہمسائے آئے ہیں۔ آ کر مل ہی جاتیں، نہ جی بچوں کے لیے کھانے پکانے میں ہی ان کا سارا دن نکل جاتا ہے۔'' زارا تجسس کے ہاتھوں مجبور تھی۔

''آج نہیں، آج سارا دن گھر میں گزارنا ہے۔ ٹھنڈ بھی بہت ہے اور کچھ فرصت بھی، آج تو اپنی پرانی والی مسز سے ملاقات کا دن ہے۔ بہت دن گزر گئے جلوۂ جاناں کیے ہوئے۔'' سلیمان رومینٹک ہوا تو زارا نے بھی ہمسائیوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔

دوپہر کو کھانا پکانے کچن میں آئی تو صحن میں چکراتی بریانی کی خوشبو اس کی بھوک جگا گئی۔

''واہ بھئی، ماں ہو تو ایسی، صبح حلوا پوری، دوپہر کو بریانی۔'' اس وقت خلافِ معمول بچوں کی آوازوں سے صحن بھرا پڑا تھا۔ زارا رونق، ہنگامے کو ترسی ہوئی تھی لاشعوری طور پر بچوں کی آوازوں پر متوجہ ہوئی۔

''آج تو سلیمان نہیں مانے، میں خود ہی کل ان کے گھر چلی جاؤں گی۔'' بے دلی سے آلو، قیمہ پکاتے ہوئے دھیان بریانی اور بچوں میں ہی اٹکا رہا۔

''آج میکے سسرال دونوں گھروں میں ہی بچے گھر میں ہوں گے کسی رونق لگی ہوگی۔'' دل اداس ہو گیا۔ ''سلیمان کو بھی پشاور آنے کی ضد ہی ہو گئی تھی۔'' کھانا پکا کر زارا پہلی دفعہ چھت پر آئی اور ہمسائیوں کے گھر میں زندگی کو ہنستے مسکراتے دیکھا۔ شاید رشتے دار یا بچوں کے دوست آئے ہوئے تھے۔ صحن آوازوں اور خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ اباجی یا طاہرہ نظر نہیں آئے۔ شام تک بچوں کا شور وغل آتا رہا۔

''کل میرے بچوں کو مزہ آیا سب کے فرینڈز آئے تھے۔''

''جی اماں بہت زیادہ......'' شفق اور علی کل کے قصے دُہرانے لگے۔ زارا ناشتا آج قصداً آستی سے بنا رہی تھی۔

''میرے درویش بڑے بیٹوں، تم بھی کچھ بولو، میں نے کل کا سارا اہتمام تمہارے لیے ہی کیا تھا۔''

''اماں آپ میری بات سنیں ناں۔'' شفق کی باریک آواز قصے پر قصہ سنا رہی تھی۔ شاید بڑے بیٹے کچھ بولے تھے کیونکہ طاہرہ، شفق کو نظر انداز کر کے احمد اور عبداللہ سے مسلسل باتوں میں لگی ہوئی تھی۔

''آج جلدی، جلدی سب کام کرتے ہیں، تم لوگوں کے واپس آتے ہی بازار چلیں گے، تمہارے ابو کے آنے میں چند دن رہ گئے۔ ڈھیر ساری تیاری کرنی ہے۔'' زارا نے آج ان کے گھر جانے کا پروگرام بدل کر اگلے دن رکھ لیا، وہ چاہتی تو دن میں بھی جا سکتی تھی لیکن وہ ان چاروں بچوں سے ملنا اور انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

اگلے دن کام سمیٹ کر ایک کیک بیک کیا اور اسے لے کر ہمسائیوں کے گھر چلی گئی۔ اباجی نے دروازہ کھولا تعارف کروانے پر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر طاہرہ کو بھیج دیا۔ زارا کے ذہن میں ایک تیز، چیخ کر بولتی ہوئی رف سی عورت آئی لیکن طاہرہ کو دیکھ کر جھٹکا لگا۔ انتہائی خوش طبع، دھیما، دھیما بولتی ہوئی اداس آنکھوں اور گلابی رنگت والی طاہرہ دل کو بہت بھائی جس نے کیک کا بہت شکریہ ادا کیا۔

''چاکلیٹ کیک میرے چاروں بچوں کا پسندیدہ ہے۔''

''میں نے بھی آپ کو اور بچوں کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن آوازوں سے سب سے شناسائی ہے ماشاء اللہ بہت تمیزدار بچے ہیں ذرا جو آپس میں لڑتے ہوں۔'' طاہرہ نے بے چینی سے پہلو بدلا آنکھوں میں ہلکی سی آبی لہر چمکی۔

''پہلے بہت لڑتے تھے، بچے جو تھے۔'' طاہرہ اٹھ کر چائے بنانے چل دی اور چھوٹی بچی شفق آ گئی جو 6-7 سال کی تھی۔ زارا نے اس کی معصوم باتوں کے دوران کہا۔

''اپنے بھائیوں کو تو بلا کر لاؤ......''

''علی بھائی دادا ابو کے ساتھ باہر گئے ہیں۔''

''احمد بھائی اور عبداللہ بھائی نہیں ہیں تو کیا وہ بھی دادا کے ساتھ باہر گئے ہیں؟'' زارا نے پوچھا۔

''نہیں، وہ ہیں نہیں......'' ابھی بات شفق کے منہ ہی میں تھی کہ طاہرہ لوازمات کے ساتھ چائے لے کر آ گئی۔ زارا کے منع کرنے پر بولی۔

''بچوں کے لیے ہر وقت کچھ نہ کچھ بنتا ہی رہتا ہے،

مجھے باہر کے کھانے پسند نہیں، چھٹی کے دن فرصت ہوتی ہے سب اکٹھے ہوتے ہیں تو رونق لگتی ہے سب کھاتے پیتے ہیں ہلا گلا کرتے ہیں۔ ورنہ تو اسکول اور پڑھائی میں ہی سارا دن نکل جاتا ہے۔'' اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے ہوئے زارا خوش، خوش گھر آئی۔ طاہرہ اپنی صبح والی آوازوں کے برعکس انتہائی شائستہ لب و لہجے کی مالک سلجھی ہوئی خاتون تھی۔ زارا نے اپنے ذہن میں طاہرہ کے بچوں کا خاکہ پڑھاکو قسم کے آدم بیزار بچوں کا بنایا لیکن دیکھنے کا تجسس برقرار تھا۔ ''آئندہ چھٹی والے دن جا کر چاروں بچوں سے ملنا ہے۔'' دل میں پکا ارادہ کیا۔

☆☆☆

آج 16 دسمبر کی صبح تھی کچن میں ناشتا بناتے ہوئے زارا کے کان آوازوں کے منتظر تھے۔ لیکن ہمسائیوں کے کچن میں افراتفری اور جلدی، جلدی کی آوازیں مفقود تھیں۔ خلافِ معمول سناٹا چھایا ہوا تھا کچھ دیر بعد طاہرہ کی دکھی سی آواز آئی۔

''ابا جی آج کسی بچے نے ناشتا نہیں کرنا۔'' یعنی آج ابا جی بھی کچن میں تھے۔

''ابا جی آپ بھی کیسے ..... ہر وقت بچوں کی حمایت میں مجھے ٹوکتے رہتے تھے جاو بے جا ان کے لاڈ اٹھاتے ہیں لیکن مجھے آپ سے بہت شکوہ ہے...... جب احمد اور عبداللہ اسکول نہیں جانا چاہتے تھے تو آپ نے مجھے کیوں نہ روکا، کیوں نہ چھٹی کروائی دونوں کی۔ باپ کے سعودیہ جانے پر آپ نے ذمے داری اٹھائی تھی ناں میری اور بچوں کی اور آپ وہ بھی ذمے داری پوری نہ کر سکے۔'' اوہ تو آج بچے اسکول نہیں جانا چاہتے تھے شاید اسی لیے خاموشی سے نکل گئے ہیں بغیر ناشتا کیے اور لنچ باکس لیے۔

''دیکھیے ابا جی، وہ ایسے ناراض ہوئے کہ میں جیتے جی مر گئی۔ کئی سال ہو گئے ہیں مجھے راستہ دیکھتے ہوئے۔ کبھی کوئی بچہ یوں بھی ناراض ہوتا ہے ماں سے۔ سب ان کی مثالیں دیتے تھے تابعداری کی اور ماں سے پیار کی، کوئی مجھے پوچھے ایسے ناراض ہوئے کہ پھر کبھی شکل نہ دکھائی۔ ماں کہہ کر نہ پکارا کوئی فرمائش نہ کی کوئی آواز نہ دی کاش وقت پیچھے گھوم جائے تو میں انہیں گرم بستر سے کبھی نہ نکالوں، دونوں کیسے میرا ہاتھ پکڑ کر کہتے رہے۔''

''اماں آج بڑی سردی ہے، آج اسکول نہیں جانا۔'' میں نے زبردستی بھیج دیا تو وہ واپس ہی نہیں آئے۔ کوئی ماں کو یوں بھی سزا دیتا ہے۔'' طاہرہ بلک، بلک کر رو دی تھی۔ ساتھ ہی ابا جی بھی بلند آواز سے رونے لگے۔

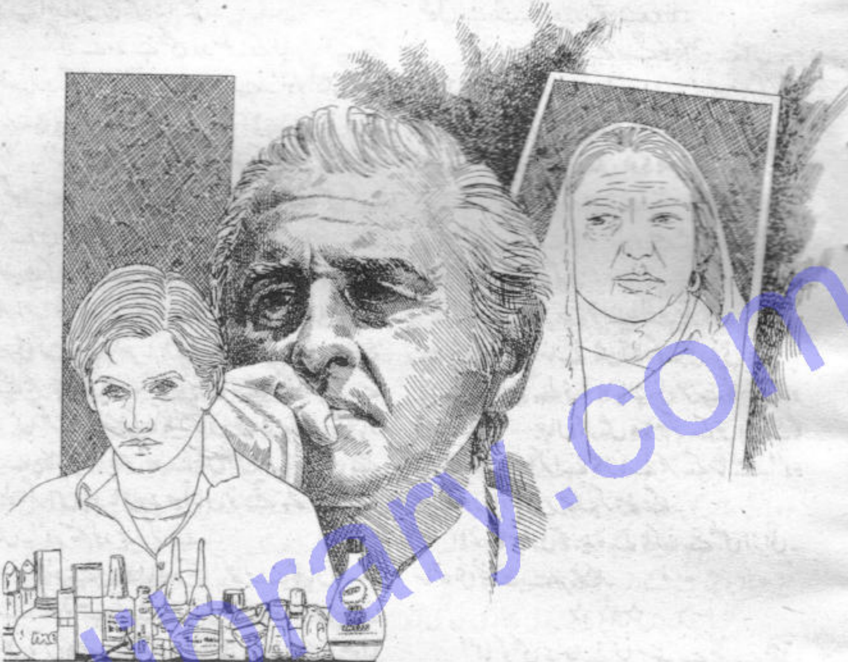
''بس کرو طاہرہ، ہم تم بچے سب کٹھ پتلیاں ہیں اللہ کی، ان کا وہی ٹائم اوپر جانے کا تھا۔ تم کیسے ان کو روک سکتی تھیں، ہم سب بے بس اور عاجز ہیں اسی کی مرضی اور حکم چلتا ہے۔''

''لیکن ابا جی اس دن دونوں نہیں جا رہے تھے۔ دونوں نے کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔ کاش میں اس دن ان کی مان لیتی، ہمیشہ ہی مانتی تھی پتا نہیں اس دن مجھے کیا ہوا۔''

زارا کے ہاتھ سے فرائنگ پین چھوٹ کر نیچے گرا کتنی ہی دیر وہ سکتے کی کیفیت میں کھڑی رہ گئی۔ جیسے تیسے سلیمان کا ناشتا بنایا، اپنے آپ کو سنبھالا اور طاہرہ کے گھر گئی۔ طاہرہ کے سب قریبی رشتے دار جمع تھے۔ ان کے گھر پر قیامت صغریٰ گزرے کئی سال گزر چکے تھے لیکن طاہرہ کے زخم ویسے ہی ہرے تھے۔ طاہرہ کا شوہر بچوں کو پُرتعیش زندگی دینے کے لیے کئی سالوں سے باہر تھا اور سانحہ APS کے بعد اپنی فیملی کو باہر لے جانا چاہتا تھا لیکن طاہرہ کا موقف تھا۔

''میرے بچے یہیں میرے ساتھ اس گھر میں ہر وقت موجود ہوتے ہیں، میرے دونوں شہید زندہ ہیں، میں ان سے باتیں کرتی ہوں، وہ یہیں میرے آس پاس ہر وقت ہوتے ہیں۔''

سب محلے والے بھی جمع تھے ان کے بقول طاہرہ ہر خوشی، غمی میں شریک ہوتی ہے۔ صرف دسمبر کے مہینے میں وہ ہوتی ہے اور اس کا غم۔ دسمبر کے بعد وہ پھر اپنے آپ کو سنبھال لیتی ہے۔ تقریباً ایسی ہی 132 شہیدوں کی مائیں ہیں جو مرتی ہیں پھر زندہ ہوتی ہیں پھر مرتی ہیں۔ پھر جیتی ہیں۔ موت کی منتظر رہتی ہیں کہ جب وہ اپنے بچوں سے ملاقات کریں۔



پارلر والا

حبیبہ عمیر

ابا کی ہوائی چپل لہراتی ہوئی آئی اور اس کی کمر کے بیچ و بیچ آ کر لگی۔ تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی اور وہ آگے کو لڑھک کر اوندھے منہ گرا۔

''منحوس، آوارہ انسان سارا دن بیٹھ کر زنانیوں والے شو دیکھتا ہے یہ لڑکا...... کوئی کام نہ دھندا بس بیٹھا ہار سنگار دیکھتا ہے زنانیوں کے اور یہ...... یہ ٹی وی والیاں۔'' ابا نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''ان کو بھی کوئی کام دھندا نہیں بس صبح سویرے اپنے رنگ برنگے منہ لے کر آجاتی ہیں، مارننگ شو کرنے۔'' وہ کمر کو ہلکا جھٹکا دے کر بولے جو دور سے ٹھمکا معلوم ہوا۔ اور چھوٹی کی تو ہنسی چھوٹ گئی۔ جس سے ابا کا پارہ مزید بڑھ گیا۔

''تو کیوں کھی، کھی کر رہی ہے...... ہیں؟'' انگارے برساتی نگاہوں سے گھورا۔ تو وہ بیچاری تپش نہ سہہ پائی ان انگاروں کی اور فوراً اندر کمرے میں گم ہوگئی۔

رخ ایک بار پھر سلیم کی طرف ہوا۔

''تو ابھی تک وہیں پڑا ہے کم بخت......'' وہ اس کی طرف بڑھے عین ممکن تھا کہ اسے ایک آدھ ہاتھ جڑ ہی دیتے اگر اماں بیچ میں نہ آتیں۔

''ارے، رہنے بھی دو سلو کے ابا...... اب کتنا غصہ کرو گے، ہاں چلو رہنے دو بچہ ہے۔'' وہ انہیں ٹھنڈا کر کے بولیں۔

''بچہ ہے، بچہ ہے، یہ کہہ، کہہ کر ہی تم نے اسے گھوڑے جتنا کر دیا ہے مگر کم بخت کو نہ جانے عقل کب آئے گی اور کب یہ کام دھندا کرے گا۔ جانتا ہے یہ خبیث کہ میرا واحد سہارا ہے مگر مجال ہے کہ اسے رتی بھر احساس ہو باپ کا کہ ہاتھ بٹاؤں۔ کتنی خواہش تھی میری کہ میرا بیٹا افسر بنے تو میرا سینہ بھی چوڑا ہو جائے محلے بھر میں مگر نہیں......'' انہوں نے سر کو دائیں سے بائیں گھمایا۔ ''میٹرک کا امتحان ہی نہ جانے کتنی بار دے چکا ہے مگر پاس ہونے میں نہیں آ رہا یہ۔ سن لے سلو اگر اس بار پاس نہ ہوا ناں تو تجھے کچھ کر دوں گا میں۔'' وہ سلیم کو دیکھ کر گرجے۔

''رہنے دے ابا اور کتنا کچھ کرے گا ہاں......! جب دیکھو تو تب ہی مجھے مارتا ہی ملتا ہے تو...... نہ جانے کس، کس کا غصہ تجھے مجھ پر ہی اتارنا ہوتا ہے۔ دیکھو ابا بار، بار کہہ چکا ہوں کہ پڑھائی پلے نہیں پڑتی میرے...... مجھے نہیں بننا افسر وفسر، میں تو بس میک اپ آرٹسٹ بننا چاہتا ہوں۔ مشہور ہونا چاہتا ہوں میں۔''

وہ جاگتی آنکھوں سے ایک بار پھر خواب سجا کر جذب کے عالم میں بولا۔ جہاں وہ ایک انوکھی دنیا میں تھا۔ جس میں وہ بڑی سی گاڑی سے نکل رہا تھا اور لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے، آٹو گراف لینے کے لیے۔ وہ اپنے نئے سیلون کا فیتا کاٹنے کو آیا تھا۔

''سلو سیلون......''

''ارے نکھٹو تو یہ زنانیوں والے کام کرنے کا بھوت کیوں نہیں اتارتا اپنے سر سے۔ ہاں بتا مجھے...... اب تو ن کیا ہیجڑا بنے گا...... ہار سنگار کرے گا۔'' ان کا

''بس کر دے ابا اب بس بھی کر دے۔'' ہیجڑے کا نام تو گویا سلو کو کرنٹ کے مانند لگا۔ وہ اچھل ہی پڑا۔

''میں خود کو تو لیپا پوتی نہیں کرتا، نہ ہار سنگار کا شوق ہے مجھے۔'' وہ ناراضی سے بولا۔

''تو دوسروں کو تو تجھے رنگنے کا شوق ہے ناں...... وہ بھی زنانیوں کو۔'' دیکھ سلو وہ اب کے لہجہ نرم کر کے بولے۔ ''دیکھ بیٹا اگر زیادہ ہی شوق ہے ناں تجھے تو نائی بن جا...... مجھے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا تجھے زنانیوں کی طرح کام کرتے دیکھ کر ہوتا ہے۔''

''بس کر دے ابا......'' وہ غصے میں پاؤں پٹختا ہوا صدر دروازہ عبور کر گیا۔

''دیکھ لے زبیدہ تو اپنے لختِ جگر کو......'' وہ صحن سے ہی باورچی خانے میں آٹا گوندھتی اپنی بیوی پر چلائے۔ ''دیکھ لے ذرا جو باپ کی عزت کا خیال ہو تیرے پتر کو...... جہاں بھر میں بدنام کر کے ہی دم لے گا یہ لونڈا مجھے، رسوا کرائے گا زمانے بھر کے سامنے۔'' وہ بولے اور چارپائی پر جھک کر بیٹھ گئے۔

اندر کام کرتی زبیدہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ساتھ ہی نخوت سے سر جھٹکا۔

☆☆☆

''ابا کو بھی نہ جانے کیا مسئلہ ہے میرے شوق سے۔ میں بس میک آرٹسٹ ہی تو بننا چاہتا ہوں۔'' وہ قریبی بستی کے پاس ریلوے لائن پر بیٹھا اپنے دل کی بھڑاس خود ہی پر نکالتے ہوئے بولا۔

''مجھے مشہور ہونا ہے، میں بھی چاہتا ہوں بڑے، بڑے لوگوں کی طرح میرے پاس بھی گاڑی ہو، پیسہ ہو۔'' وہ ریلوے ٹریک کے ساتھ چلتے ہوئے خود کلامی میں مصروف تھا۔

بال بکھرے ہوئے تھے، قمیص بھی سلوٹوں سے پُر تھی اور جینز کی پینٹ جو کہ کبھی نیلی تھی اب دھل، دھل کر اپنا اصل رنگ کہیں کھو بیٹھی تھی۔ دور سے ہی کوئی دیکھ کر اس کی بے بسی اور مفلسی کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ بھی یہاں کی عام عوام کی طرح مجبور و بے کس تھا۔ وہ بھی اپنے

جیسے عام نوجوانوں کی طرح بس خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ جن کا شرمندۂ تعبیر ہونا ناممکنات میں سے تھا۔

☆☆☆

''ارے بھابی گھر پر ہو کیا؟'' اندر آتی انیلا پھوپی گلا پھاڑے اندر آئی۔ ساتھ میں درجن بھر بچوں کا ٹولا بھی دوڑتا، بھاگتا پورے صحن میں پھیل گیا۔

''ارے پھپو آپ کب آئیں؟'' اندر سے چھوٹی نکلی۔

''چھوٹی اِدھر تو آ ذرا......'' وہ اسے اپنی طرف بلاتے ہوئے بولیں۔

''ہاں بولیں پھپو......'' چھوٹی نزدیک آئی۔

''ذرا اس لڈو کو سنبھال' میں رکشے کا کرایہ دے آؤں۔'' وہ لڈو کو چھوٹی کو دے کر پرس لے کر دوبارہ باہر نکل گئیں۔ اور وہ لڈو کو سنبھالنے لگی جو حلق کے بل چیخ، چیخ کر رو رہا تھا۔

''ننھی او ننھی خبردار جو پودے کو ہاتھ لگایا تو......'' وہ پانچ سالہ ننھی کو ڈانٹ کر بولی۔

''اور تم جنید نیچے آؤ چلو'' تین سالہ جنید سیڑھیاں چڑھنے کے درپے تھا وہ وہیں جم گیا۔

گڑیا جو کہ دس سال کی پھپو کی پہلوٹھی کی تھی وہ کچن سے نکلی۔

''اللہ باجی پتا نہیں کتنی گرمی ہے اور ٹھنڈا پانی نہیں پینے کو رکھا کچن میں۔''

''سلام نہ دعا، یہ کیا طریقہ ہے بات کا۔'' چھوٹی کو اس کا بے باک انداز ایک آنکھ نہ بھایا تھا تو فوراً ہی بول پڑی۔

''السلام علیکم کیا حال ہے تمہارا باجی......؟ اب بتاؤ کہ ٹھنڈا پانی ہے کہ نہیں۔'' وہ بھی گڑیا تھی اپنے نام کی ایک' وہ کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ ترکی بہ ترکی جواب آیا۔

''چل علی یہ بیگ پکڑ اور تو ننھی وہ لال بیگ پکڑ کر لا......'' ہانپتی کانپتی پھپو اپنے بچوں کو ہدایت دیتے آئیں تو دونوں متوجہ ہوئیں۔

''پھپو آپ اپنے لڈو کو سنبھالیں کان کھا گیا ہے چیخ، چیخ کر......'' وہ بیزاری سے لڈو کو پھپو...... کو تھماتے ہوئے بولی اور پھر کچن کی طرف بڑھ گئی پانی لانے کو۔ اتنے میں زبیدہ بھی ظہر پڑھ کر صحن میں آگئیں۔

''سلام بھابی......'' وہ برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھ گئیں۔

''وعلیکم السلام...... بڑی بات ہے کہ تم اس دفعہ پورے مہینے بعد آئی ہو۔ ورنہ تو ہر دوسرے ہفتے تم ہفتہ بھر کے لیے رہنے آجاتی ہو۔''

''بھابی طنز نہ کریں...... میں اپنے میکے نہیں آؤں گی تو کہاں جاؤں گی بھلا۔'' پھپو روہانسی ہوگئیں۔

''اچھا جانے دو، میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ بادل ناخواستہ یہاں آنسوؤں کی نہریں ہی نہ بہہ جائیں۔

''ارے بھابی گڑیا کے ابو کی دیہاڑی نہیں لگی تھی کئی دن بڑے ہی مشکل سے گزارا ہے یہ مہینہ پھر بچے بھی بیمار تھے۔ ایک کی بخار جان چھوڑتا ہے تو دوسرے کو آلیتا ہے۔'' پھپو وہیں قمیص اٹھا کر لڈو کا دسترخوان کھول کر بیٹھ گئیں۔ جواب ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

''اوہ...... چل اب سب ٹھیک ہے ناں......'' اماں دوپٹے کو کھولتے ہوئے بولیں۔

''بس اللہ کا شکر ہے، گزر رہی ہے جیسے تیسے......'' وہ رب کا شکر کر کے بولیں۔

''سلام پھپو......'' سلو بھی آوارہ گردی کر کے لوٹ آیا موڈ اس کا ابھی بحال نہیں ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام...... پھپو کی جان۔'' وہ جان لٹاتی نظروں سے اسے دیکھ کر بولیں۔ دنیا ایک طرف اور سلو کے لیے پھپو کا پیار ایک طرف تھا۔

''کیا ہوا میرے لال کو...... کسی نے کچھ کہہ دیا؟''

''ہونے کیا ہے پھپو...... وہی ابا کی ڈانٹ اور کیا......؟'' وہ بھی سڑ کر بولا۔

''لو ایک تو بھائی جان کو نہ جانے مسئلہ کیا ہے میرے بھتیجے سے...... چل تو موڈ اچھا کر پھر میرا اچھا سا میک اپ کر دینا مجھے رات کو شانی کی شادی میں جانا ہے۔''

''اللہ روبینہ تیری وہ سہیلی...... اس کی اب شادی ہو رہی ہے؟'' زبیدہ منہ کھولے پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں بھابی وہی میری بچپن کی سہیلی اب کہیں جا کر اس کے نصیب کھلے ہیں۔''

''اچھا، چلو اللہ نصیب اچھے کرے۔'' انہوں نے کہا۔

شام کو پھپھو کپڑے پہن کر اس کے کمرے میں آ گئیں اور بولیں۔

''چلو سلو ذرا میک اپ تو کر دو۔ دیکھو کپڑے پہن لیے ہیں جلدی کر دو ذرا لڈو اٹھ نہ جائے ورنہ وہ کرانے نہیں دے گا۔''

وہ جو میگزین میں بنے ہیئر اسٹائل کا جائزہ لے رہا تھا چونک گیا۔

''پھپھو کیوں مجھے ابا سے پٹوائیں گی......؟'' دل تو خوشی سے اچھل ہی پڑا تھا کہ کوئی تو ہے جو اس کے شوق کی پذیرائی کر رہا ہے۔

''دیکھ لوں گی ان کو بھی' مجال ہے کسی کی جو میرے لال کو ہاتھ لگائے۔'' وہ لگاوٹ سے بولیں۔

''چل آجا۔'' وہ ڈریسنگ کی میز کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی آ گیا اور کپڑوں کی مناسبت سے اس نے ایک ماہر کی طرح میک اپ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ اس کے پاس تھا کچھ پھپھو اپنا اٹھا لائی تھیں۔ ویسے بھی مارننگ شوز کی وجہ سے لوگوں کو میک اپ کا کافی پتا لگ گیا تھا۔ آئے روز وہ یہ ہی کام تو سکھاتے ہیں۔

اس نے بڑا زبردست میک اپ کیا ہلکی کوالٹی کی چیزوں سے بھی اور پھر بال بنائے اگرچہ وہ بہت نفاست سے نہیں بنے تھے مگر پھر بھی بہتر تھے۔

''اللہ سلو تیرے ہاتھوں میں تو جادو ہے بچی......'' وہ اپنا عکس دیکھ کر بولیں۔ ''نہ جانے کیوں بھائی کو نظر نہیں آتا۔'' وہ اس کی طرف پلٹیں۔

''میں آج خود بات کروں گی آ کر...... تو دل چھوٹا نہ کر۔''

''پھپھو آپ کا لڈو اٹھ بیٹھا ہے۔'' چھوٹی اسے سنبھالتی اندر آئی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ ''ارے واہ پھپھو آپ تو پہچانی نہیں جا رہیں۔ غضب ڈھا رہی ہیں۔''

''ہیں ناں...... میرے لال نے میک اپ ہی غضب کا کیا ہے کمال تو لگنا ہی ہے۔'' وہ اترائیں۔

''ہاں بھئی یہ تو ہے میرا بھائی کمال کرتا ہے یہ کام۔ پتا ہے پھپھو یہ ساتھ والی نہیں شبانہ اس کی شادی پر بھائی نے اتنا اچھا میک اپ کیا تھا کہ کچھ دنوں میں کئی محلے والیاں آ گئی تھیں میک کرانے مگر ابا نے منع کروا دیا۔''

''اچھا...... مجھے کیوں نہیں بتایا تو نے سلو...... میں بات کرتی بھائی سے۔'' انہوں نے شکایت کی۔

''رہنے دیں پھپھو کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ بجھے دل سے بولا۔

☆☆☆

رات کو پھپھو آئیں تو سیدھا بھائی کے کمرے میں چلی آئیں۔

''آ گئیں تم...... بتا دیتیں تو لینے آ جاتے۔'' وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے بولے۔

''بھائی اب میں پانچ بچوں کی ماں ہو گئی ہوں' اب خود آ جاؤں گی۔'' وہ ممنون ہوئیں۔

''کیسا رہا پھر روبینہ......؟'' روٹی والی چنگیر میں روٹی اور سالن کی کٹوری لیے بھابی بھی آ گئیں۔

''اچھا رہا بھابی، پتا ہے سب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کون سے پارلر سے تیار ہوئی ہو...... میں نے بھی تن کر کہا کہ اپنے بھتیجے کے پارلر سے۔ تو وہ سب بڑا حیران ہوئیں۔'' وہ جوش سے بولیں۔

''کیا کہا تم نے......؟'' بھائی کے منہ میں جاتا نوالہ ہوا میں ہی معلق ہو گیا اور بھویں تن گئیں۔

''کیا بھائی! جھوٹ کہاں ماشاء اللہ سے اس نے گھر میں ہی معمولی چیزوں سے اتنا کمال تیار کیا مجھے، وہ بھی صرف ٹی وی سے سیکھ، سیکھ کر۔ پتا ہے دو چار عورتوں نے تو پارلر کا پوچھا بھی تو میں نے کہا گھر پر ہی ہے۔ بولیں کل ولیمے کے لیے وہ یہیں سے تیار ہوں گی۔ میں نے کہا ہاں، ہاں کیوں نہیں۔''

''حد ہو گئی ہے اب یہ گھر پارلر والے کا کہلائے گا۔'' انہوں نے نوالہ چنگیر میں واپس تقریباً پٹخ ہی دیا۔

''بھائی دیکھیں، اللہ نے اسے ایک ہنر دیا ہے تو

میں اس کے شوق کا پورا ساتھ دوں گی۔'' روبینہ ان کا غصہ کسی خاطر میں نہ لائیں۔

''اور کہوں گی کہ آپ بھی ساتھ دیں۔ آگے آپ کی مرضی......'' وہ کہہ کر انہیں چھوڑ کر چل پڑیں۔ زبیدہ نے بھی کھسک جانے میں ہی بہتری جانی۔

اگلے دن واقعی تین عورتیں سرِ شام محلے والوں سے پوچھتے ہوئے پائی گئیں کہ پارلر والے لڑکے کا گھر کون سا ہے۔ شومئی قسمت کہ پوچھ بھی سلو کے ابا سے لیا وہ جو عصر پڑھنے جا رہے تھے محلے کے رشید اور صغیر کے ساتھ برے پھنسے۔ اگر بتاتے کہ میرا بیٹا ہی کرتا ہے تو جگ ہنسائی ہوتی نہ بتاتے تو الگ مسئلہ لہٰذا انہوں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

''ارے بھائی بتا بھی دیں کہ پارلر والا لڑکے کا گھر کون سا ہے؟'' ان میں سے ایک عورت رشید صاحب سے پوچھ رہی تھی۔

''بہن پارلر والا تو کوئی نہیں ہے یہاں۔'' وہ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''ارے باجی اس کی پھپھو کا نام یاد ہے تو پوچھ لو دیر ہو رہی ہے۔'' ساتھ والی سرگوشی کرتے ہوئے اکتائے لہجے میں بولی۔

''اچھا بھائی روبینہ سعید کا گھر ہی بتا دیں۔'' اس بار شانی کی بھابی بولیں۔

''اچھا روبینہ تو یوں کہیں ناں...... یہ ہیں اس کے بھائی نسیم سعید صاحب۔''

''تو بھائی آپ کیوں نہ بولے پہلے؟'' اس بار پہلی والی ناگواری سے بولی۔

''خیر آپ کا گھر کون سا ہے؟''

''وہ سبز دروازے والا۔'' وہ قدرے شرمندگی سے بولے۔ وہ تینوں بغل سے نکلتے ہوئے آگے بڑھیں۔

☆☆☆

'' چلو آ جاؤ سلو تمہارے پہلے گاہک لے آئی ہوں۔'' پھپھو اپنے قدرے بھاری وجود کو سنبھالتے ہوئے چھت پر چارپائی پر لیٹے سلو کو دیکھ کر بولیں۔

وہ تو اچھل ہی پڑا۔ جو نہ جانے آسمانوں کی

وسعتوں میں کیا تلاش کر رہا تھا۔

"کیا کہا پھپو......؟" وہ حیران تھا۔

"بھئی کہا تھا ناں میں تیرا ساتھ نہ چھوڑنے کی......تو نے ہی صبح سے شکل نہیں دکھائی تھی۔ صبح ہی بھائی کی ڈانٹ کے بعد ایسا غائب ہوا کہ شکل نہ دکھائی۔اب آجاؤ تم سے ... میک اپ کرانے کے لیے آئی ہیں۔شانی کی بھابی اور ان کی بہن۔ میں نے تمہاری تعریف ہی اتنی کی اور باقی کا کام تمہارے ہاتھوں نے کیا جو اتنا کمال تیار کیا تھا مجھے۔"

"سچ بول رہی ہیں پھپو......" وہ فرط مسرت سے انہیں کندھے سے تھامتے ہوئے بولا۔

"سو فیصد سچ میری جان' اب چلو نہ جانے میرے بچوں نے کیا حال بنایا ہوگا نیچے آجاؤ بس۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے نیچے بڑھیں۔

وہ دونوں نیچے صحن میں اترے تو خود کو ان کا منتظر پایا۔ چھوٹی بھی بڑی پُرجوش دکھائی دے رہی تھی جبکہ زبیدہ شش و پنج میں مبتلا تھیں کہ نہ جانے اس کے ابا کیا کریں مگر آنے والوں کے سامنے خاموش تھیں۔ سلو کے پاس جو اپنی ماں اور بہن کا سامان تھا اور جو پھپو کا لایا سامان تھا اس سے وہ شروع ہوگیا۔ سلو نے تینوں کا میک اپ کیا، تینوں تو بہت خوش تھیں۔انہوں نے اسے پندرہ سو روپے دیے تینوں کے۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے تھام لیے۔خوشی اور جذبات سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ابا بھی مغرب پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے تو قدرے ٹھٹک گئے وہ تینوں واپس لوٹ رہی تھیں۔ ہلکی سی نگاہ میں تو وہ پہچانے ہی نہیں کہ یہ وہی تینوں ہیں۔ میک اپ نے تو شکل ہی بدل دی تھی۔

زبیدہ اور چھوٹی تو انہیں کو دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ ماحول جو کہ سلو کی کامیابی سے کافی خوشگوار تھا وہ ان کی آمد سے کثیف ہونا شروع ہوا۔ جیسے، جیسے وہ ان کی طرف بڑھ رہے تھے ویسے، ویسے ہی سلو کو سانس لینی مشکل ہو رہی تھی۔

"ابا...... دیکھیں میری پہلی کمائی......" اس نے 500 کے تین نوٹ آگے بڑھائے۔

"زنانیوں کو لیپاپوتی کر کے تو نے کمائے۔" وہ گرجے۔

وہ بولے تو بولتے ہی چلے گئے۔خوب لعن طعن کی انہوں نے اور اس لپیٹے میں پھپو بھی آگئیں پھر غصے میں وہ اندر چلے گئے۔ سبھی اپنی، اپنی جگہ ساکت تھے۔سلو نے پیسے پھینک دیے اور غصے سے دروازہ عبور کر گیا۔

"حد کر دیتے ہیں بھائی......" روبینہ پھپو کو بھی غصہ چڑھ گیا۔سب سے زیادہ تو سلو کی طرف سے انہیں دکھ ہوا کیونکہ وہ بیچارہ تو پہلے ہی گھبرا رہا تھا مگر ہمت تو انہوں نے ہی دلائی تھی کہ کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا مگر ہو تو الٹ ہی گیا۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے لڈو کو تقریباً زبیدہ بھابی کی گود میں گرا کر بھائی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی بھائی......" وہ دروازہ دھاڑ سے کھول کر اندر آئیں۔نسیم صاحب بھی ایسی افتاد پر گھبرا گئے۔وہ جو لیٹنے کو تھے اٹھ بیٹھے۔

"کیا تھا جو بچے کا دل رکھ لیتے۔بسم اللہ کر کے اس کی کمائی پکڑ لیتے اور حوصلہ افزائی کرتے ہاں؟" آنسوؤں سے تر آنکھوں سے وہ بولیں۔" اس نے محنت کی تھی کہیں جوے سے جیت کر تو نہیں لایا تھا وہ۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ اللہ نے اسے ہنر دیا ہے اور وہ اس کا خوب استعمال جانتا ہے۔ مگر نہیں......" انہوں نے سر مارا...... "مجال ہے جو بچے کا دل ہی رکھ لیا ہو۔" وہ اپنا غصہ نکال کر ٹھنڈی ہوئیں۔

"ہاں تو جائز کام سے کمائے ناں...... نہ کے لیپا پوتی سے۔عورتوں کو کیوں چھوئے ہے وہ......" وہ بھی اکڑ کر بولے۔

"بس کریں بھائی بس کریں آپ...... جب ان عورتوں کے باپ' بھائیوں اور شوہروں کو فرق نہیں پڑتا تو آپ کے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ اور ویسے بھی ہمارا بچہ بس اپنا کام کرتا ہے اور اس کی نیت صرف کام کی ہے۔ نہ کہ چھیڑ خانی کی۔" وہ انہیں چپ کرا کر پلٹ گئیں۔ جبکہ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کیونکہ بات وہ ٹھیک ہی کہہ گئی تھیں۔ آج واقعی زیادتی کر دی تھی

انہوں نے سلو کے ساتھ۔ آج تو انہیں فخر ہونا چاہیے تھا کہ اپنے بیٹے کی کمائی پر جو اس نے محنت سے کمائی تھی۔ انہیں دکھ ہوا۔

☆☆☆

وہ بار، بار اپنے آنسو رگڑتا اور وہ کم بخت پھر سے نکل پڑے۔ وہ ریلوے لائنوں پر بیٹھا ارد گرد سے... بے نیاز بس روئے جا رہا تھا۔ وہ اپنا دل ہلکا کرنے یہیں آ جاتا تھا۔

''ابا نے اچھا نہیں کیا میرا مان ہی رکھ لیتے تو کیا بگڑ جاتا ان کا...... تیروں کے نشتر سے شاید اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اپنوں کے الفاظ کے خنجر جگر چیرتے ہیں۔ آج میرے لیے کتنا بڑا دن تھا کہ کوئی گھر چل کر میرے ہنر کی پزیرائی کے لیے آیا ہے مگر نہیں ابا کو تو بس مجھ میں دنیا جہان کے کیڑے ہی نکالنے آتے ہیں۔ میں ہی سب سے زیادہ نکھٹو ہوں...... میں ہی آوارہ گرد ہوں...... میں ہی خراب ہوں کیونکہ میں افسر نہیں بن سکتا۔'' ایک بار پھر اس نے آنسو پونچھے ''مگر میں کیا کروں میرے مالک، تو مجھے بتا...'' وہ آنسوؤں سے تر چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔

''میں کیا کروں؟'' آنکھوں میں انتہا کی بے بسی تھی۔ ''میں وہ نہیں بن سکتا جو ابا چاہتے ہیں کیونکہ میری عقل میرا ساتھ نہیں دیتی مگر میں وہ ہوں جو تو نے مجھے بنایا ہے۔ بس میرے مالک تو میرے باپ کا دل میرے لیے نرم کر دے۔ نرم کر دے، نرم کر دے۔'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دیا...... جبکہ دور کہیں گاڑی کی چھک، چھک کی آواز دھیرے، دھیرے بڑھتی جا رہی تھی۔

''اوہ......'' پاس سے گزرتے ایک لڑکے نے اسے دیکھا اور تیزی سے اس کی طرف دوڑا۔

''او لڑکے مرنا ہے کیا؟'' وہ تقریباً اسے گھسیٹتا ہوا لائنوں سے دور لایا اور کچھ سیکنڈز کے بعد گاڑی تیزی سے اس کے سامنے سے گزری۔

وہ تقریباً اس کا ہم عمر ہی تھا۔ سوکھا سا کانٹے جیسا بدن تھوڑی بڑھی ہوئی شیو...... اور الجھے بال......

''کیا گھور رہے ہو ہاں......'' اسے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ بولا۔

''شکریہ...... مجھے بچانے کا......'' سلو نے فقط یہ ہی کہا اور واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ جبکہ پیچھے کھڑا اجنبی لڑکا بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

ادھر نسیم صاحب کی ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ وہ بیڈ کے کنارے لیٹے صحن میں کھلنے والی کھڑکی سے مسلسل باہر کی طرف اندھیرے میں نہ جانے کیا کھوج رہے تھے۔ سوچیں بری طرح سے منتشر تھیں۔ رہ، رہ کر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کتنے ہی لمحے شرمندگی میں گزر گئے۔ ان کی سوچوں کا سلسلہ تب ٹوٹا جب سلو نے گھر میں قدم رکھا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی ساتھ ہی شکستہ قدموں سے وہ اندر آیا۔ پل بھر کے لیے اس نے ابا کے کمرے کی طرف دیکھا اور پھر زینے عبور کر گیا جو کھڑکی کے عین سامنے تھا۔ نسیم صاحب سلو کو دیکھ کر کچھ ہوا نہ جانے کب آنکھوں کی ندی کا بند توڑ کر ایک ننھا سا آنسو گال پر بہہ نکلا...... یہ آنسو نہ جانے سلو کے لیے تھا یا پھر اپنے ان خوابوں کے لیے جو سلو کی ذات سے وابستہ تھے اور بری طرح ٹوٹے تھے۔

☆☆☆

آج نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ابا باہر بیٹھک کو خالی کروا رہے تھے انہوں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ سب سامان نکال دو باہر۔ سلیم آج بھی چپ، چپ تھا۔ وہ اس دن سے خاموش تھا جب سے وہ حادثہ ہوا تھا۔ اگلے روز پھپھو بھی ناراض ہو کر واپس چلی گئی تھیں ورنہ وہ اس کا موڈ ضرور بحال کر دیتیں۔

''ارے سلو کے ابا کیا کر رہے ہیں یہ اور کیوں خالی کرا رہے ہیں؟''

اماں سے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھیں۔

''تم سے جو کہا ہے ناں وہ کرو بس زیادہ تفتیش مت کرو......'' وہ مصروف سے انداز میں بولے جبکہ اماں برا سا منہ بنا کر رہ گئیں۔

''اماں، ابا کر کیا رہے ہیں اور یہ سامان کہاں رکھنا ہے؟'' چھوٹی بھی چھوٹے صوفے کو گھسیٹتے ہوئے بولی۔

''تو خود پوچھ لے۔'' وہ جو پہلے ہی غصے سے بھری بیٹھی تھیں اسے جھاڑ پلا کر بولیں۔ گھنٹا بھر لگا کر سامان باہر نکال کر دوسرے کمروں میں منتقل کر دیا گیا۔ پھر ابا نے دروازہ اندر سے بند کر دیا ڈرائنگ روم کا اور اندر سے ٹھوکا ٹھاکی کی آوازیں آنے لگیں جو گھر بھر کے تجسس کو بڑھا رہی تھیں۔

سلو تو چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ جبکہ اماں اور چھوٹی بھی مصروف ہو گئیں۔

''کریں جو کرتے ہیں۔'' اماں نے ناک سے مکھی اڑائی اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

سلو کے ابا نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے میں ڈالی۔ ابھی انتظام کم تھا مگر بہت تھا۔ شروعات کے لیے۔ دو دن سے وہ لگے ہوئے تھے اپنے کام میں۔

''ارے زبیدہ بیگم اِدھر آؤ بھئی۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولے۔

''آتی ہوں۔'' زبیدہ بیگم نے کچن میں سے آواز دی۔

''ارے چھوڑو سارے کام بس اِدھر آؤ۔'' ان سے رہا نہیں جا رہا تھا۔

''کیا ہے سلو کے ابا......'' وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ ملتی آئی اور جیسے ہی نگاہ کمرے میں پڑی تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''یہ...... یہ کیا؟'' انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''بس ذرا سلو کو آنے دو تم......'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ شام ڈھلے وہ لوٹا، سارا دن سڑکیں ناپنے کے بعد اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔

''اماں کھانے کو کچھ دے دیں......'' وہ ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔

''کہاں تھے جناب؟'' ابا چہرے پر سنجیدگی سجا کر بولے جبکہ اندر سے ان سے رہا نہیں جا رہا تھا۔

''آپ کو کیا کہ میں کہاں تھا، کیا کر رہا تھا؟'' وہ نظر انداز کر کے اندر جانے لگا تو ابا نے اسے کندھے سے تھام لیا۔

''اِدھر آؤ کچھ دکھانا ہے تمہیں......'' وہ اسے لے کر اندر ڈرائنگ روم کی طرف چلے۔ پیچھے، پیچھے خوشی سے چھوٹی اور اماں بھی تھیں۔

''ارے چھوٹی لائٹ جلاؤ بھئی۔''

''جی ابا......'' وہ پُرجوش سی بٹنوں کی طرف بڑھی۔ جیسے ہی کمرا روشن ہوا تو سلو کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

''ابا یہ سب......؟'' وہ حیران سا پلٹا۔

کمرے میں ایک طرف دیوار پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ اس کے آگے کاؤنٹر بنا تھا۔ شیشوں کے گرد لائٹس تھیں اور آگے کرسیاں تھیں۔

''بس بیٹا میں اتنے کی ہی سکت رکھتا تھا۔'' وہ چیزوں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''ارے ابا یہ بہت ہے میرے لیے......'' وہ خوشی سے گلے لگ گیا۔

''میرے لیے یہی بہت ہے کہ آپ نے مجھے میرا شوق پورا کرنے کی اجازت دے دی۔ بس دیکھیے گا ابا میں کتنا بڑا میک اپ آرٹسٹ بنوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں یقین تھا، ابا بھی خوش تھے اپنے اکلوتے بیٹے کو خوش دیکھ کر۔ ضروری تو نہیں کہ ہر بچہ بڑا افسر بنے کچھ بچے خاص بھی ہوتے ہیں اور ان کا بچہ خاص تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کام میں ماہر تھا بغیر کسی سے سیکھے۔

''بھیا تم اپنے پارلر کا نام کیا رکھو گے۔'' چھوٹی تجسس سے بولی۔

''سلو بیوٹی پارلر......'' اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ابا بول پڑے۔

سب بے اختیار ہنس دیے۔

''اللہ تو میرے بچے کو بہت کامیاب انسان بنانا۔'' ابا نے سلو کے چہرے پر اطمینان اور خوشی دیکھی تو بے اختیار اس کی کامیابی کے لیے دعا کر ڈالی۔

انہوں نے سلو کا ہاتھ تھام کر...... کامیابی...کی منزل کی جانب پہلا قدم تو بڑھا دیا تھا جبکہ اسے اپنی محنت کے ذریعے اب آگے خود بڑھنا تھا۔

وین اس کے گھر کی طرف جانے والی گلی کا موڑ مڑ رہی تھی جب اس کے کالج بیگ میں رکھے موبائل فون نے وائبریٹ کرنا شروع کیا۔ ایک دم اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے اور اس کی نظر اپنی سامنے والی سیٹ پر بیٹھی زنیرا پر پڑی، جو اس سے فقط تین برس بڑی اور اس کی اکلوتی بہن ہونے کا شرف رکھتی تھی۔ اجالا کے دل نے کئی گنا رفتار کے ساتھ دھڑکنا شروع کر دیا جیسے موبائل فون کی مدھم سی لرزاہٹ زنیرا کے کانوں تک پہنچ ہی تو جائے گی۔ حالانکہ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ ایک تو گاڑیوں کا شور، اس پر وین میں بیٹھی سب لڑکیوں کی باتوں کا شور، اردگرد کے ماحول کا شور اس کے علاوہ تھا۔ بھلا زنیرا کو کیا پتا چلنا تھا کہ اس کے کالے رنگ کے کالج بیگ میں اس کے نرم ملائم ریشمی ہاتھ کے جتنا بالکل نیا ایک دم برانڈ نیو اسمارٹ موبائل فون ہے، جس کی

کچے رنگ

نبیلہ ابر راجا



تین دن پہلے ہی وہ مالک بنی ہے۔
موبائل کی وائبریشن ختم ہوئی تو اس کی جان میں جان آگئی اور اس نے مسکراتے ہوئے گاڑی میں اپنے ساتھ بیٹھی امامہ کو دیکھا جو زنیرا کی کسی بات پر سر ہلا رہی تھی۔ اجالا کے ہونٹوں پر اتنے عرصے میں پہلی بار مسکراہٹ آئی اور اپنے بے جا خوف پر تاؤ بھی، بھلا زنیرا کو اس کے فون کا کیسے پتا چلنا تھا۔ کیونکہ وہ تو اس کی حفاظت اپنی جان سے بھی بڑھ کر کرتی تھی۔ اور آج کل اسے اپنی جان سے بھی پیارا احسن تھا۔ اور جان سے پیارا بھی بھلا کچھ اور ہو سکتا ہے؟

☆☆☆

وین جیسے ہی گھر کے سامنے رکی، اجالا اپنا بیگ دونوں ہاتھوں سے تھامے باقی لڑکیوں کے پاؤں سے بچتی بچاتی سب سے پہلے نیچے اتری، زنیرا نے ناسمجھی سے اسے گھر کے گیٹ کو دھکیلتے اور پھر اندر جاتے دیکھا۔ گیٹ ان دونوں بہنوں کے آنے سے پہلے ہی کھلا ہوا تھا اور اس بات سے زنیرا کو سب سے زیادہ چڑ ہوتی تھی۔ وہ کالج سے آنے کے بعد سب سے پہلے گیٹ لاک کرتی تھی، گھر پر اس کی موجودگی کے وقت مجال ہے جو گیٹ کھلا مل جائے جو بھی آتا پہلے بیل بجاتا یا لوہے کا گیٹ ہاتھ سے دھڑ دھڑاتا تب کہیں جا کر اس کی مراد پوری ہوتی۔ اور عموماً دروازہ کھولنے کا فریضہ زنیرا ہی سر انجام دیتی کیونکہ باقی سب افرادِ خانہ الزام دیتی' جتاتی نگاہوں سے اسے دیکھتے جیسے بزبانِ خاموشی کہہ رہے ہوں جاؤ اب کھولو تم نے ہی تو بند کیا تھا۔ اور زنیرا یہ کام اکثر اوقات ماتھے پر بل ڈالے بغیر ہی کرتی تھی۔

اب بھی اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے گیٹ کو اندر سے بند کیا اور پھر بیگ کے ساتھ جرنل سنبھالتی آگے بڑھی۔ حسبِ معمول پورے گھر میں خاموشی طاری تھی، اس نے راحت بیگم کے کمرے میں جھانکا، وہ اے سی چلا کر بے خبر سو رہی تھیں، زنیرا دوسرے کمرے کی طرف بڑھی اور بیگ کے ساتھ دوپٹا اتار کر ایک طرف رکھا اور فوراً پنکھے کا بٹن آن کیا، گرمی بہت زیادہ تھی اس کے یونیفارم کی سفید شرٹ کمر سے مکمل طور پر پسینے میں بھیگ چلی تھی، پنکھے کی ہوا لگی تو تھوڑا سکون آیا اور اس نے پاؤں میں پہنے جوگرز وہیں بیٹھے، بیٹھے ایک ہاتھ سے اتارے۔ اور باہر نکل کر کچن میں پڑے واٹر کولر سے پانی کا گلاس بھرا، پانی حلق میں اترا تو فوراً احساس ہوا کہ اس میں جو اس نے صبح کالج جاتے وقت برف ڈالی تھی اس کا اثر مکمل طور پر زائل ہو چکا ہے۔ زنیرا نے پانی پی کر گلاس وہیں کولر کے اوپر رکھا اور یونیفارم بدلنے لگی کیونکہ اس کے بعد اسے اپنے لیے روٹی بھی پکانی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد اسے سب سے زیادہ مشکل مرحلہ یہی لگتا تھا۔ صبح کالج کے لیے تیار ہوتے وقت اسے یہ حسرت ہی رہی کہ کبھی اچھے طریقے سے بھرپور ناشتا کر سکے، جیسے اس کی باقی کلاس فیلوز آ، آ کر بتاتی تھیں کہ آج تو مما نے ناشتے میں آلو کا پراٹھا، دودھ پتی کے بھرے ہوئے کپ کے ساتھ کھلا کر بھیجا ہے، اس پر دوسری چہک کر کہتی میں نے آج ناشتے میں دیسی گھی کی چوری کھائی ہے، اس کی سب سے قریبی دوست سحر ناشتا رات کے بچے ہوئے سالن، اپنی ماں کے ہاتھ کی بنی تازہ چپاتی اور گرما گرم چائے کے ساتھ کرتی جبکہ خود زنیرا اور باقی بہن بھائی سوکھے پاپے، باسی ڈبل روٹی اور شیرے کی طرح میٹھی کالی چائے پی کر گھر سے نکلتے۔ وجہ راحت بیگم کی طبیعت کی خرابی تھی، جو برسا برس سے خراب چلی آ رہی تھی لیکن بیماری کیا تھی یہ آج تک کوئی نہیں جان پایا تھا، ان کا زیادہ وقت ٹی وی کے آگے لیٹے ہوئے اور ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کے چینل بدلتے ہوئے اور محلے میں اِدھر اُدھر آنے جانے میں صرف ہو جاتا، ان بہن بھائیوں کے حصے میں فقط ان کی ڈانٹ، پھٹکار، کوسنے، لعنت، ملامتیں اور بددعائیں ہی آتیں۔

ان کے ابو یونس احمد ٹریڈر تھے اپنا کام تھا اور اچھا خاصا چل رہا تھا۔ گھر میں ٹھیک ٹھاک خوشحالی تھی، انہیں اپنی بیمار بیوی سے بہت پیار تھا اور ہوتا بھی کیسے نہیں آخر کو محبت کی شادی تھی۔ انہوں نے اپنے پورے خاندان سے لڑ جھگڑ کر راحت کو اپنایا تھا، ان کے ماں باپ مان ہی نہیں رہے تھے، ان کا اعتراض معقول تھا۔ جب پہلی بار یونس احمد کی مرحومہ ماں ان کی ضد سے مجبور ہو کر راحت کے والدین کے پاس گئیں تو بیٹے کی پسند دیکھ کر انہیں کوئی

خاص خوشی نہیں ہوئی، راحت سمیت اس کی چار بہنیں اور بھی تھیں بھائی صرف دو تھے، ابھی تک صرف دو بڑی بہنوں کی شادیاں ہوئی تھیں اب راحت اور ندرت ہی باقی بچی تھیں، یونس کی ماں نے گھر کے مکینوں سمیت گھر کو بھی بغور دیکھا، تین عورتوں کے ہوتے ہوئے بھی گھر گندا..... بے ترتیب اور بدنظمی کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ اوپر سے جب راحت چائے کے نشانوں والی پلاسٹک کی ٹرے میں چائے سمیت بیکری کے بسکٹ لے کر شرمانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اندر آئی تو اس کے دو، دو انچ کے نیل پالش سے رنگے ناخن کندھوں تک کٹے گولڈن رنگ کے بال، مسکارے اور نقلی پلکوں سے مزین آنکھیں، ہونٹوں پر تیز لال رنگ کی لپ اسٹک دیکھ کر ان کا دل... بے حد خراب ہوا، اس کی ماں کا میک اپ بھی اس سے ملتا جلتا تھا، جس کا چہرہ خرانٹ اور آنکھوں سے تیزی عیاں تھی، دونوں لڑکیاں بھی انہی کا عکس تھی۔ راحت کی ماں کی دلچسپی یونس کی ماں میں کم اور ان کی جائداد کی تفصیلات میں زیادہ تھی کیونکہ راحت کی زبانی انہیں پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ یونس خاصے امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

یونس کے گھر والے بجھے دل سے گھر واپس آئے اور صاف، صاف کہہ دیا کہ وہ وہاں کسی صورت بھی اس کی شادی نہیں کر سکتے، پر یونس بھی اڑ گیا اور خودکشی کی دھمکی دے ڈالی ناچار بیٹے کی ضد سے مجبور ہو کر وہ راحت کو بیاہ لائے۔ بہت جلدی اس کے رنگ ڈھنگ کھل کر سامنے آ گئے وہ ایک نمبر کی نکمی، ست، کام چور تھی۔ ایک گھر کو گھر بنانے والی خوبیاں اس میں ندارد تھیں، شادی کے بعد اوپر تلے اللہ نے اسے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں بنایا پر اس کی فطرت وہی کی وہی رہی۔ اسے اپنے سونے، کھانے، پینے اور صرف آرام سے غرض تھی، بچے کیا کر رہے ہیں، کیا کھا رہے ہیں، کیا پی رہے ہیں، کیسے رہ رہے ہیں، اسے بالکل پروا نہیں تھی، جب تک یونس کی ماں زندہ رہیں، وہی پوتے پوتیوں کو سنبھالتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد حالات زیادہ بگڑے اور جبھی سے راحت کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی۔

تب سے لے کر اب تک زنیرا سمیت ان سب بہن بھائیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت زندگی گزاری تھی۔ گھر میں کام کے لیے دو عورتیں آتی تھیں ایک پورے گھر کی صفائی ستھرائی کرتی، برتن دھوتی اور دوسری ہفتے کے ہفتے آ کر کپڑے دھو جاتی۔ روٹی ہانڈی کسی نہ کسی طرح مارے بندھے راحت بیگم کر ہی لیتیں لیکن اس دوران بھی ان کی ہائے میں مرگئی، اُف میرے اللہ، مجھے اٹھا لے، اوہ اللہ جی کیا ساری تکلیفیں میرے لیے ہی رہ گئی ہیں، کی گردان جاری رہتی۔

زنیرا بہت حساس تھی، کالج سے آنے کے بعد بیگ رکھ کر کپڑے بدل کر وہ کچن کا رخ کرتی اور سب سے پہلے اپنے اور اجالا کے لیے روٹی پکاتی، یہ بھی شکر کا مقام تھا کہ سالن پہلے سے بنا ہوتا تھا ورنہ اس کی محنت دُگنی ہو جاتی۔ کھانا کھا کر وہ دس پندرہ منٹ جیسے ہی آرام کرنے کے لیے کمر ٹکاتی فوراً راحت بیگم چائے کے لیے آواز لگاتیں۔ ناچار اسے اٹھنا پڑتا اور سب کے لیے چائے بنا کر دے کر چائے کے برتن دھونا، کچن سمیٹنا بھی اس نے از خود اپنے فرائض میں شامل کر لیا تھا۔

رات کا کھانا اکثر وہی بناتی کیونکہ راحت بیگم کی طبیعت جو خراب رہتی تھی، ویسے سارا دن وہ اے سی چلا کر ٹی وی دیکھتیں اور جیسے ہی یونس احمد کے آنے کا وقت ہوتا ریموٹ کنٹرول ایک طرف رکھ کر وہ نقاہت زدہ انداز میں لیٹ جاتیں ان کا چہرہ اپنی نادیدہ پوشیدہ بیماریوں کی ان کہی کہانیاں سناتا لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ اپنے سرتاج کے لیے دروازہ وہ ہمیشہ خود ہی کھولتی تھیں۔ یونس احمد اپنی بیوی کی اس لازوال محبت پر برسوں سے فدا تھے۔

آفس سے واپسی پر ان کے ہاتھوں میں بہت سارے شاپرز ہوتے جو راحت بیگم اور اجالا کی فرمائشوں سے بھرے ہوتے۔ گھر واپس آنے سے پہلے وہ معمول کے مطابق راحت کو فون کر کے پوچھتے کچھ چاہیے تو نہیں جواب میں وہ ضرورتوں کی لمبی غزل سنا ڈالتیں۔ اجالا بھی اپنا حصہ لازمی ڈالتی، کھانے پینے کے معاملے میں وہ ویسے بھی چٹوری تھی۔ پر زنیرا نے پاپا سے شاذ و نادر ہی کبھی کسی چیز کی فرمائش کی تھی۔ یونس احمد جو بھی اسے لا کر دیتے وہ اسی میں خوش ہو جاتی۔

☆☆☆

زنیرا نے روٹی پکا کر چولہا بند کیا اور روٹیوں کو رومال میں لپیٹا۔ اتنی سی دیر میں وہ پسینہ، پسینہ ہو چکی تھی، قیامت خیز گرمی تھی۔ پتیلی سے اپنے اور اجالا کے لیے سالن نکال کر جب کھانا لے کر وہ کمرے میں آئی تو اجالا ابھی تک غائب تھی۔

''اجالا، اجالا آجاؤ کھانا کھا لو پہلے۔'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔

''آپی بس دو منٹ ابھی آئی، منہ ہاتھ دھولوں بس۔'' جواب میں باتھ روم کے اندر سے اس کی آواز سنائی تو زنیرا نے ٹھنڈی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد گیلے منہ اور بالوں سمیت اجالا باتھ روم سے برآمد ہوئی۔ تو زنیرا کو عجیب سا احساس ہوا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ دونوں بہنیں جیسے ہی کالج سے واپس لوٹتیں اجالا فوراً باتھ روم میں گھس جاتی اور کافی دیر بعد باہر نکلتی۔

''کھانا شروع کرو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' زنیرا نے آدھی روٹی توڑ کر اجالا کی طرف بڑھائی اور اسے غور سے دیکھا۔ اجالا کا منہ لال ہو رہا تھا اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

''ارے یہ تمہارے منہ کو کیا ہوا اتنا لال ہو رہا ہے۔'' زنیرا نے ہاتھ میں پکڑی روٹی کا نوالہ نیچے رکھ دیا۔

''ایں، ایں کچھ بھی تو نہیں آپی، گرمی دیکھی ہے کتنی زیادہ ہو رہی ہے، میری اسکن بہت سینسیٹو ہے، یہ موسم ویسے بھی میری اسکن کے لیے اچھا نہیں ہے۔'' اجالا نے فوراً گھبرا کر اپنے گال پر ہاتھ پھیرا۔

''تم روز واٹر اسپرے کیا کرو، میں تمہیں کھیرا کاٹ کر دوں گی منہ پر لگانا۔ پھر ایسا نہیں ہوگا۔'' زنیرا کے لہجے میں ماں والی فکر مندی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی، سب بہن بھائیوں کی فکر میں ہلکان۔

اس سے بڑے دو بھائی اور تھے، ابتسام اور عظام...... ابتسام سب سے بڑا تھا، وہ پاپا کے ساتھ ان کے آفس جاتا تھا اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتا تھا، اس سے چھوٹا عظام تھا اسے پڑھنے لکھنے سے خاص لگاؤ نہیں تھا جیسے تیسے بی کام کرنے کے بعد وہ فارغ تھا، اس کا زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ گھر سے باہر سیر سپاٹوں میں گزرتا تھا۔ یونس احمد کی مرضی تھی ابتسام کی طرح وہ بھی ان کے ساتھ آفس جائے اور کاروباری رموز سیکھے۔ پر کام کے نام سے ہی اس کی جان جاتی تھی، اس کی مرضی تھی وہ کسی طرح پاکستان سے امریکا چلا جائے اور وہاں جا کر راتوں رات کروڑ پتی بن جائے۔ راحت بیگم اس کی ہمنوا تھیں، وہ مسلسل یونس احمد کو اس سلسلے میں رام کرنے میں لگی ہوئی تھیں لیکن اس بار وہ بھی اڑ گئے تھے اور کسی طرح بھی مان کر نہیں دے رہے تھے۔

عظام سے تین سال چھوٹی زنیرا تھی، وہ ماس کمیونیکیشن میں گریجوشن کر رہی تھی، اس سے تین سال ہی چھوٹی اجالا تھی جو اسی سال کالج میں داخل ہوئی تھی۔ زنیرا کو ویسے تو اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے بھی بہت پیار تھا لیکن اجالا میں تو اس کی جان تھی، وہ اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ دونوں پہلے ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں تب اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ وین میں اسے اپنے ساتھ بٹھاتی تھی اور اسکول میں بھی جیسے ہی موقع ملتا اس کی کلاس میں چلی جاتی، اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ہر وقت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے۔

ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر کے جب وہ کالج میں گئی تو اجالا کے لیے کافی فکر مند رہتی۔ اس کا یونیفارم، لنچ، پڑھائی، ٹیسٹ وغیرہ کے بارے میں فکر مند رہتی یہ سب زنیرا نے اپنی ذمے داری بنالی تھی۔ خدا، خدا کر کے اسی سال اس نے اپنے ساتھ اپنے ہی کالج میں اجالا کا بھی ایڈمشن کروایا تھا۔ اب وہ کافی مطمئن تھی۔

اجالا آہستہ، آہستہ اب بڑی ہو رہی تھی۔ شروع سے ہی وہ خاندان بھر کی حسین بچی تھی، اب گداز جسم میں جوانی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور بچپنا دبے پاؤں رخصت ہو رہا تھا۔ دو سال پہلے زنیرا کا رشتہ اس کے چچازاد ... سدیس کے ساتھ دونوں خاندانوں کی مرضی ومنشا کے مطابق طے ہو چکا تھا۔ اپنے ننھیال کے مقابلے میں اسے اپنا ددھیال بہت اچھا لگتا تھا سب پڑھے لکھے اور تصنع سے کوسوں دور تھے اور رہا سدیس تو وہ تو بن مانگی دعا کی طرح اس کی قسمت کی لکیروں میں سج گیا تھا۔ اسے شروع سے ہی اپنا یہ کم گو اور سلجھا ہوا کزن پسند تھا۔ اس لیے جب سعدیہ چچی اس کے چچا کے ساتھ اس کا ہاتھ مانگنے آئیں تو

اسے ایک لمحے کے لیے اپنی قسمت پر رشک سا ہوا کیونکہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ ددھیال میں اس کی ماں راحت بیگم سمیت اس کے تمام ننھیال والوں کو بھی کوئی خاص پسند نہیں کیا جاتا، وجہ ان کی عورتوں کا پھوہڑ پن، بے ترتیبی بے ڈھنگا پن اور گھر کے مردوں کو انگلیوں پر نچانے کا فن تھا لیکن سعد یہ چچی کو زنیرا شروع سے ہی اچھی لگتی تھی، اس کی بول چال، ادب آداب، بے غرض فطرت اور حساس و ہمدرد دل رکھنے کی وجہ سے لگتا ہی نہیں تھا کہ اس کی پرورش راحت بیگم نے کی ہے۔

لیکن جو بھی ہو زنیرا کو اپنی ماں سے پیار تھا اور اسے ان کی ایک عادت بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ لڑکے لڑکیوں میں عاشقی معشوقی اور محبت بازی کے سخت خلاف تھیں۔ اسی لیے انہوں نے دونوں بیٹیوں کو ابھی تک الگ سے موبائل فون لے کر نہیں دیا تھا، اجالا یا زنیرا کو کسی سہیلی سے رشتے دار سے کزن سے یا کسی ٹیچر سے بات کرنی ہوتی تو وہ اپنے فون سے خود نمبر ملا کر دیتیں، اس معاملے میں ان کی نگاہ چیل کی سی تھی لیکن پتا نہیں پھر ان کی لاڈلی اجالا نہ جانے کیسے اپنے قدم موڑ کر ایک اور ہی راستے پر چل پڑی تھی۔

زیادہ پرانی بات نہیں تھی، تین چار ماہ پہلے ان کے پڑوس میں غفار احمد اپنے اہل وعیال سمیت آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان کی ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے، سب سے چھوٹا آبان تھا۔ غفار احمد کی بیوی نے نئے محلے میں گھر شفٹ کرنے کے بعد گھر میں میلاد کروایا جس میں راحت بیگم کو بھی دعوت دی، وہ اجالا اور زنیرا سمیت چلی گئیں، وہیں پہلی بار آبان اور اجالا کا آمنا سامنا ہوا اور کیوپڈ کا تیر دل کے آر پار ہو گیا۔ اب صرف دیکھنے سے کہاں کام بنتا تھا، شام کو اجالا اور آبان اپنی اپنی چھتوں پر چڑھ جاتے اور وہاں سے نگاہوں کی زبان میں باتیں کرتے لیکن کب تک، آبان کا دل چاہتا اجالا سے لمبی، لمبی راتوں میں لمبی باتیں کرے، اس کے لیے اس نے اجالا کو ایک فون لے کر دیا اور چوری چھپے کسی کی نظر میں آئے بغیر مع سم کارڈ کے اس تک پہنچا بھی دیا، باقی کے معاملات بہت سہل ثابت ہوئے اور دونوں بہت دور نکل گئے اتنی دور کہ روز رات کو اجالا سب گھر والوں کے سونے کے بعد اس کی مس کال پر چپکے سے پچھلی گلی کی طرف بنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیتی، اس کے بعد وحشت اور شیطانیت کا رقص شروع ہو جاتا جسے نئے زمانے میں محبت کا تقاضا کہا جاتا ہے۔

یہ سب مراحل تین، چار ماہ کے اندر طے ہوئے تھے۔

☆☆☆

آج بھی کالج سے آنے کے بعد اجالا فوراً ہی بستر پر لیٹ گئی تھی۔ اس کا چہرہ مضمحل اور زرد سا تھا۔ زنیرا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''کیا ہوا لگتا ہے طبیعت ٹھیک نہیں تمہاری۔'' زنیرا کے چہرے پر ماؤں والی فکرمندی تھی۔

''ہاں آپی، ہر وقت سستی سی چھائی رہتی ہے، دل خراب کمر اور پیٹ میں درد، پتا نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے، سمجھ سے باہر ہے۔'' اجالا نے لیٹتے ساتھ ہی اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

''رکو تم آرام کرو، میں تمہارے لیے ملک شیک بنا کر لاتی ہوں۔ ساری، ساری رات جاگ کر پڑھتی ہو، یہ سب تو ہوگا، حالانکہ تمہیں کہا بھی ہے ابھی ایگزام میں کچھ وقت ہے، پہلے سے اپنی جان مت کھپاؤ......'' زنیرا نے پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ پیچھے سے اجالا نے فوراً دروازہ بند کیا اور بڑی احتیاط سے اپنا موبائل نکال کر باتھ روم کا رخ کیا، حسب عادت وہاں آبان کی بیس مس کالز کا نوٹی فکیشن جگمگا رہا تھا، اور تقریباً اتنے ہی میسجز تھے، اس نے پہلے میسج کا آغاز ہی فحش کلامی سے کیا تھا اور اس کے بعد لکھا تھا کہاں ہو فوراً فون کرو۔ اجالا نے فوراً اس کا نمبر ملایا اور اپنی طبیعت کی خرابی کا بتایا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ چیک کیا تم نے؟'' آبان کے لہجے میں غصہ تھا۔

''نہیں چیک تو نہیں کیا۔'' اجالا نے مجرمانہ نفی میں جواب دیا تو وہ پھٹ پڑا، وہ ایسا ہی تھا غصے اور جذباتیت سے بھرا انتہا پسند۔ اجالا کو اس کے اسی انداز نے ہی تو اس کی طرف متوجہ کیا تھا، وہ اسے اپنی حقیقی زندگی کا اینگری ینگ مین ہیرو لگتا تھا کیونکہ آبان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ شادی تو مجھے تمہارے ساتھ ہی کرنی ہے چاہے اس

کے لیے مجھے تمہیں تمہارے گھر سے بھگانا ہی کیوں نہ پڑے، اجالا کے کچے ذہن پر فلموں کا اثر تھا اس کی یہ باتیں اسے آسمانوں پر لے جاتی تھیں۔

"جاؤ اسی وقت چیک کرو اور مجھے بتاؤ۔" آبان نے اسے حکم دیا۔ تو فون چھپا کر وہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔

"اجالا، اجالا جلدی آؤ گڑیا، میں ملک شیک بنا کر لے آئی ہوں، جلدی سے آ کر پی لو ورنہ بیکار ہو جائے گا۔" زنیرا باقاعدہ ہاتھ سے دروازہ بھی بجا رہی تھی، اِدھر اجالا کے ہاتھوں کے توتے اڑ چکے تھے۔

پریگننسی اسٹرپ پر دو لال لائنیں بڑی واضح تھیں، وہ جلدی سے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ایسے ہی نکل آئی۔ جہاں باہر اس کا اترا چہرہ دیکھ کر زنیرا اور بھی پریشان ہوگئی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں، امی، امی جلدی سے آئیں تو دیکھیں اجالا کو کیا ہوا...... زنیرا نے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی اجالا کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر بستر پر ڈالا اور ساتھ ہی راحت بیگم کو آواز دی۔ وہ اپنے آرام میں خلل ڈالے جانے پر بری طرح بھناتی ہوئی آئیں لیکن بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ مارے خفقان کے ان کا اپنا دل ڈوبنے لگا اور شوگر ہائی ہوگئی، اسی دوران باتھ روم میں گھسیں تو اجالا کی جلدی اور بے احتیاطی میں ٹھکانے لگائی گئی پریگننسی اسٹرپ پر ان کی نظر پڑی پھر تو جیسے ساتوں آسمان ان پر آ پڑے۔

☆☆☆

راحت بیگم اور زنیرا کو اپنے گھر کی عزت کے لیٹرے کا پتا چل چکا تھا۔ راحت بیگم نے خود اجالا کا فون اپنے ہاتھوں سے بھری دوپہر میں چھت پر لے جا کر توڑا تھا۔ اور اس میں موجود سم کارڈ کچل ڈالا تھا۔ وفورِ تاسف سے زار، زار ہاتھ ملتیں۔

"ہائے ہائے یہ مجھ سے کیسی بھول ہوگئی، اللہ نے پری جیسی بیٹی دی، اتنا انمول خزانہ میرے پاس تھا اور میں کیسی ماں تھی جو اپنے اس خزانے کی حفاظت ہی نہ کر سکی، اجالا جیسی بیٹی کی ماں کو تو رات میں بھی ایک آنکھ کھول کر سونا چاہیے اور میں کیسی ماں تھی جو دن کو بھی بے سدھ سوتی رہی۔"

راحت بیگم کی طبیعت اب سچ مچ خراب ہوگئی تھی، اتنے سالوں سے انہوں نے اپنی سستی، آرام طلبی کو خود ساختہ بیماریوں کے پردے میں چھپا رکھا تھا لیکن اب ساری پرتیں اتر چکی تھیں، اب وہ اس بات سے لرزہ براندام تھیں کہ یہ بات اگر یونس احمد اور ان کے بیٹوں کے علم میں آ گئی تو قیامت ہی آ جائے گی۔ یونس احمد کی محبت اپنی جگہ لیکن یہ کوتاہی جو ایک ماں ہونے کے ناتے انہوں نے برتی تھی وہ کسی صورت بھی نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں تھی۔

راحت بیگم کی ساری سستی اور بیماری ہوا ہو چکی تھی۔ انہیں اب اجالا کو آنے والی بدنامی سے بچانا تھا۔ اگر وہ اس بدنامی سے سترہ سالہ نادان بیٹی کو بچا لیتیں تو اسی صورت میں ان کا گھر اور بچی کھچی عزت بھی بچ سکتی تھی۔

☆☆☆

زنیرا نے سدیس کے ساتھ شادی سے منع کر دیا تھا جو اس کے فائنل ایگزام کے فوراً بعد طے تھی۔ خاندان بھر میں جس نے سنا ہکا بکا رہ گیا۔ تب راحت بیگم روتی ہوئی نادم و شرمندہ یونس احمد کے ساتھ سعدیہ بیگم کے پاس پہنچیں اور انہیں سدیس کی شادی اجالا کے ساتھ کرنے کے لیے راضی کر لیا۔

یہ شادی اپنے پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق ہی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا میری بیٹی۔" راحت بیگم روتی ہوئی زنیرا کے گلے لگ گئیں، انہوں نے روتے ہوئے اپنے ہاتھ زنیرا کے آگے جوڑے تو اس نے فوراً انہیں کھول کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"نہیں امی، مت کہیں ایسا... مجھے گناہ گار تو مت کریں، میں نے جو بھی کیا اپنی رضامندی سے با ہوش و حواس کیا......" اس نے روتی ہوئی راحت بیگم کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

راحت بیگم کی آنکھیں چھم، چھم برس رہی تھیں اور ایک برسات زنیرا کے دل میں بھی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا تو ایک بار پھر وہی منظر

آنکھوں کے دریچے میں ٹھہر گیا۔

وہ وقت بہت کڑا تھا جب ان دونوں ماں بیٹی پر اجالا کے گناہ اور نادانی کا راز کھلا۔ زنیرا نے ہی انہیں مشورہ دیا کہ یہ وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا ہے۔ ورنہ ان کے گھر کی تباہی یقینی ہے۔ راحت نے ایک دن جب گھر پر ان تینوں ماں بیٹیوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا آبان کو چپکے سے بلوایا اور اس کے سارے گناہ مع ثبوتوں کے اس کے سامنے رکھے، وہ باتوں کا شیر کاغذ کا بھی شیر ثابت ہوا اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگا صاف مکر گیا کہ آپ کی بیٹی مجھ پر الزام لگا رہی ہے۔ دوسرے کمرے میں بیٹھی اجالا سب کچھ سن رہی تھی، اس پر گالیوں اور بے ہودہ زبان کے ذریعے اپنا اینگری ینگ مین کا تاثر جمانے والا جھوٹا بھی تھا۔ وہ تو کسی طرح بھی ماں کے دے ہی نہیں رہا تھا کہ ان کی عزت پر ڈاکا مارنے والا وہ ہی ہے۔ کیونکہ وہ ان عورتوں کی کمزوری اچھی طرح بھانپ چکا تھا۔ کہ وہ اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ تب ہی تو چوروں کی طرح چپکے سے اسے یہاں بلایا گیا تھا۔

اس نے اگلے دن ہی اسلام آباد کا رخت سفر باندھا اور اپنی نانی کے پاس آ گیا اب اس نے یہیں رہ کر ان کی خدمت کے ساتھ ان کے بڑھاپے کا بھی سہارا بننا تھا اور ساتھ اجالا کی طرح کا عقل سے پیدل شعور سے دور اور کوئی نادان شکار ڈھونڈنا تھا۔

اسے پورا یقین تھا دنیا میں جب تک راحت بیگم جیسی..... بے پروا مائیں اجالا جیسی تربیت سے عاری بچیاں پیدا کرتی رہیں گی تب تک اسے محبت کے کھیل میں کوئی ہرا نہیں پائے گا۔

☆☆☆

زنیرا کے اندر جنگ چھڑی ہوئی تھی، ایک طرف لاڈلی بہن تھی ایک طرف گھر کی عزت تھی اور مدِ مقابل اس کا دل تھا۔

اور اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ سدیس کے ساتھ شادی سے انکار کر دے گی اور اپنی جگہ اجالا کا نام تجویز کرے گی۔ زنیرا بیوقوف تھی، معاملے کے دوسرے پہلو پر اس نے غور ہی نہیں کیا، یہ ضروری تو نہیں تھا کہ اس کی تجویز کو من و عن سدیس اور اس کے گھر والے بھی مان لیتے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے راحت بیگم کو ہاتھ پاؤں جوڑ کر راضی کر لیا۔

''امی خدا کے لیے مان لیں میری بات، مجھے تو کوئی نہ کوئی جو بھی میری قسمت میں ہوا مل جائے گا لیکن اجالا کا پردہ اگر فاش ہو گیا تو کیا ہوگا سوچیں پلیز......'' راحت بیگم خود بھی اندر سے ڈری ہوئی تھیں اس کے بعد انہوں نے یونس احمد کو بھی رام کر لیا۔

☆☆☆

''مبارک ہو، مبارک ہو'' کے شور میں دلہن بنی اجالا کو جب سدیس کے پہلو میں لا کر بٹھایا گیا تو اس کی آنکھوں کو خیرہ کرتے نوخیز حسن کو اس نے من چاہی خواہش کی طرف دل میں قید کر لیا۔ آج قدرت نے اس کی خواہش بن مانگے ہی اس کی جھولی میں ڈال دی تھی، اسے تو اول روز سے پریوں جیسے حسن کی مالک اجالا پسند تھی پر سعدیہ بیگم کے دل پر زنیرا کا قبضہ تھا سو ان کے کہنے پر مارے بندھے اس نے اس رشتے کو قبول کر لیا لیکن اس وقت اسے اپنی خوش قسمتی پر رشک آیا جب ان ہونی کو ہونی میں بدلتے دیکھا، زنیرا نے خود ہی اس کے ساتھ شادی کے لیے منع کر دیا تھا۔

پورے خاندان میں دبی، دبی زبانوں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ زنیرا کا کسی اور کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔ لیکن اصل حقیقت کسی کے بھی علم میں نہیں تھی۔

دولہا بنا سدیس اور دلہن بنی اجالا ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے تھے، ہنستا مسکراتا سدیس کزنز کے شرارتی جملوں کو بھرپور انجوائے کر رہا تھا۔ دور کھڑی زنیرا نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے سارا منظر دیکھا۔

اس نے اپنے گھر کی طرف آنے والی بدنامی کا رخ موڑ دیا تھا۔ باقی دل کا کیا ہے اس نے کسی نہ کسی طور بہل ہی جانا تھا۔ ویسے بھی اس نے سدیس کی نگاہوں میں اجالا کی محبت کے دیے جلتے دیکھ لیے تھے، اسے امید تھی، اس نے اپنی ماں جائی کو محبت کرنے والے ہاتھوں میں سونپ دیا ہے۔

اس نے مسکراتے ہوئے آسودہ مسکراہٹ سے اکلوتی سالی ہونے کے ناتے دودھ پلائی کی رسم کے لیے گلاس کو دودھ سے بھرا اور شادی کے اسٹیج کی طرف قدم بڑھا دیے۔



ناولٹ

میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں

سعدیہ ہما شیخ

پانچواں حصہ

آج صبح بھی فرحت کے میسجز آرہے تھے کہ کسی بھی وقت اس سے ملے۔ جبکہ ثنا عجیب کشمکش و پیچ کا شکار تھی۔ اس وقت بھی چائے بناتے ہوئے اس نے فرحت کے بارے میں بہت سوچا۔ اس کا دل فرحت کے لیے موم بن کر پگھل رہا تھا۔

جیسے ہی وہ کچن سے باہر نکلی فرش پر ایک اور کاغذ مڑا تڑا سا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جھک کر وہ کاغذ اٹھالیا تھا۔

تحریر محبتوں کی کسی شہزادی کی لگتی تھی۔ جانے یہ کون تھی درد کی ماری۔

''ہائے یارم!

یہ عشق بڑا انوکھا ہے...... کام بھی انوکھے کرتا ہے...... یہ لاڈلے بچے جیسا ہے...... موڈ میں ہو تو ہنستا رہے...... بدل جائے تو چیخیں نکلوا دے۔ مجھے تو عرش سے فرش تک کا سفر کروایا ہے اس نے پھر مجھے فرش سے اٹھا کے خاک کے بھی اندر ملا دیا...... ہائے یارم! میں اپنے گھر کی منتوں، مرادوں سے پیدا ہونے والی لاڈلی تھی...... پر اس انوکھے لاڈلے عشق نے رول دیا، خاک

نشیں کر دیا، مجھے مٹی کر دیا، دل صحرا بنا دیا، مجھے تو گلستان بننا تھا، میرا سبزہ سوکھ گیا، میرے پھول مرجھا گئے، میں بیاباں میں رُل گئی، میں اجڑ گئی، میں زرد رُتوں کے مرجھائے پھول کی طرح پتی، پتی بکھر گئی۔“

ثنا کا دل مٹھی میں آ گیا۔

”ہائے...... یہ عشق میں ہاری لڑکی! نہ جانے کون ہے؟ اور کہاں سے لفظ لاتی ہے درد میں تربتر کر کے۔“ ثنا کا دل بے حد برا ہو گیا۔

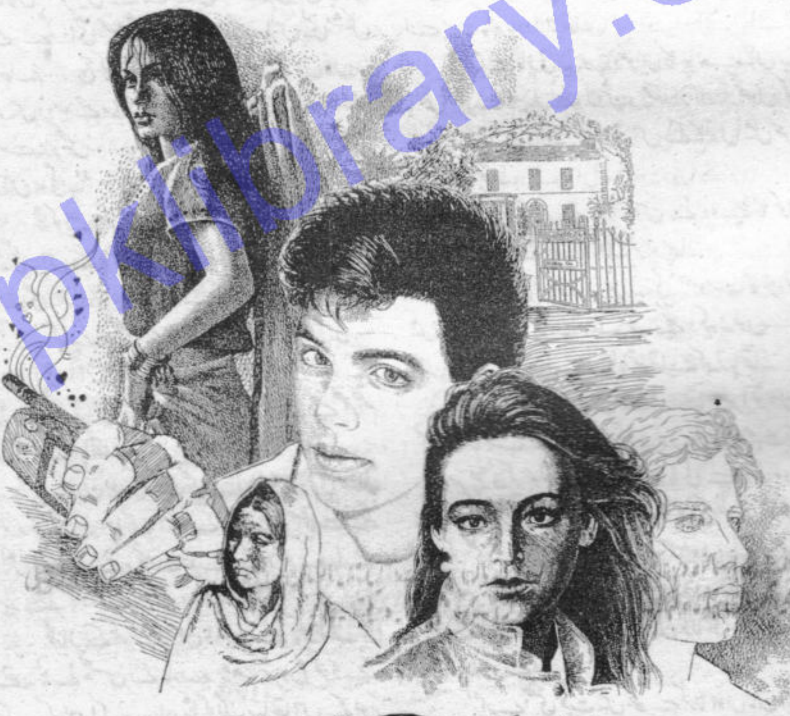
”محبت کرنے والے محبت کے سارے غموں سے آشنا ہوتے ہیں۔“ ثنا نے گہری سانس بھری۔

کاغذ پر کچھ اور بھی لکھا تھا۔

”میری یہ آوارگی کسی کی محبت کا کرشمہ ہے...... میں جو کبھی گھر سے نہ نکلی تھی...... اب پورے زمانے میں بھٹکتی پھرتی ہوں...... ان قدموں کے نشانات پر پاؤں رکھ کے چلتی ہوں جو کسی لمبی مسافت کی نشان دہی کرتے ہیں...... اس آوارہ گردی میں اتنی حال سے بے حال ہوئی ہوں میں کہ جہاں سے گزروں...... درویشوں کی نظر پڑ جائے مجھ پر...... تو وہ بے ساختہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں......“

ثنا کو پتا ہی نہیں چلا اس کے آنسو قطرہ، قطرہ پگھلنے لگے۔ اس کا دل تھم گیا اور ہاتھ میں پکڑی چائے ٹھنڈے سیال کی ہیئت میں ڈھل گئی۔

”ہائے میرے ہرجائی محبوب...... میں بڑی دلکش ہوا کرتی تھی...... میں چلتی تھی...... ہوا تھم، تھم جاتی تھی...... فضائیں گنگنا کے مجھے دیکھتی تھیں پھر یہ اداسی پتا نہیں کہاں سے آئی اور میری ہنسی میری دلکشی کو نوچ، نوچ کھا گئی...... وے سائیاں میرے شباب پر غزلیں لکھی جاتیں...... مجھے چاند سے، پھول سے، بہار سے تشبیہ دی جاتی...... پر ہائے یہ اداسی...... میری روح کو دیمک کی طرح لگی اور میرا اندر باہر سب چاٹ گئی۔“



ثنا پر جیسے کھڑے، کھڑے وقت زوال آ گیا۔
''میں نفسیات جانتی ہوں...... ہو سکے تو مجھ سے دور رہنا...... کیونکہ میں ماہر ہوں سوچ پڑھنے میں...... یہ نہ ہو کہ میں جیت جاؤں تم سے کسی بات میں...... پھر میں بے رحم ہو جاؤں اور تمہیں مائل کروں مرنے کی طرف...... اے جاناں بچ مجھ سے...... کیونکہ میں نفسیات کی عالم ہوں......''

جیسے ایک دھمکی اور جیسے ایک تنبیہہ...... اور جیسے ایک سرگوشی...... ثنا کے دل کو کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔

''ہائے ربا! میں اکیلی ہوئی ہوں صرف اپنی وجہ سے...... اپنے بولے لفظوں کی وجہ سے...... اپنے تیکھے لہجے کی وجہ سے...... اپنی زبان کی کڑواہٹ کی وجہ سے...... کیونکہ میرے لفظ سچ ہیں تو سچ بہت کڑوا ہوتا ہے...... ابھی میں دل میں زہر رکھ کے شہد لہجہ... اپنالوں، تعریفیں لکھنے لگ جاؤں...... منافق بن جاؤں تو میرے گرد اتنی بھیڑ لگ جائے کہ مجھے سانس لینی مشکل ہو جائے...... سچ کہوں، یہ جو میٹھے لہجے ہوتے ہیں ناں یہ بعد میں دو مونہے سانپ کی طرح ڈس لیتے ہیں...... میٹھا دوست نہ رکھیں...... چاہے غصے کا تیز دوست ہو...... کہیں ہار نہیں ہوگی۔''

ثنا کو جیسے چکر آنے لگے تھے۔ وہ وہیں فرش پر دوزانو بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہو رہے تھے اور جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اسے شاید ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

''کیا یہ کرن لکھتی ہے؟'' اس کے دل نے سرگوشی کی۔

اپنی ڈائری میں حالِ دل اتار کر پھر پُرزے، پُرزے کرنے والی کیا یہ کرن ہی تھی؟ ثنا کا دل جیسے تھم تھم کے دھڑک رہا تھا۔

یہ کچھ دن بعد کی بات تھی۔ ثنا اسٹڈی روم کی صفائی کر رہی تھی کہ اچانک اس کے ہاتھ چند صفحات لگے بالکل ویسے ہی تھے، نچڑے ہوئے اُلجھے، بکھرے، الٹے، سیدھے۔

گلناز کے گھر ملنے والی ڈائری سے کچھ مختلف ہی تھے۔ ثنا نے تجسس کے مارے پڑھنا شروع کر دیے۔ ایک کے بعد ایک...... اور ثنا کو لگ رہا تھا اس کے اوپر ساتوں آسمان آن گرے تھے۔ جو اس نے پہلے پڑھا، جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا کیا وہ سچ تھا یا پھر یہ صفحات؟

اس کا پورا وجود زلزلے کی زد میں تھا۔

☆☆☆

چودھویں کا چاند پورے جوبن پر تھا، اس کے اردگرد ستاروں کی روشنی آج چاند کے عروج پر ہونے کی وجہ سے ماند پڑ چکی تھی، صحن میں لگے گھنے شہتوت سے چاند کی بٹ کر آتی روشنی صحن کو کہیں سے روشن کر رہی تھی اور کہیں پر اندھیرا تھا، ہر طرف ''ہو'' کا سا عالم تھا۔ کبھی، کبھی ہلکی سی ہوا چلتی تو اس پُرسکون ماحول میں عجیب سا شور پیدا کرتی۔ اس گھر میں موجود سبھی نفوس ہر شے سے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے سوائے گلناز کے۔ وہ یک ٹک چاند کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خود تاریک حصے میں بیٹھی تھی، آنکھوں کے گوشے گیلے ہوتے تو وہ غیر محسوس انداز میں انہیں صاف کر کے چاند کو دیکھنے لگتی۔ چودھویں کا چاند اسے بہت کچھ یاد دلاتا تھا۔

''پتا ہے نازی یہ جو چودھویں کا چاند ہے ناں یہ بالکل تیرے جیسا ہے، روشن، چمکدار اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا۔'' فرحت اس کے کانوں میں سحر پھونک رہا تھا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو؟'' اس نے دوپٹے کا کونا دانتوں تلے دباتے ہوئے جھجک کر پوچھا۔

''ہاں ناں تمہارے چہرے کی معصومیت کا ہی تو میں دیوانہ ہوں، پتا ہے جب تک تجھے دیکھ نہ لوں...... چین نہیں پڑتا۔'' وہ اب اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔

''میرا بھی یہی حال ہے فرحت، میرا تو دن نہیں کٹتا جب تک تمہیں دیکھ نہ لوں، تمہاری محبت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔'' وہ بے باکی سے بولی، وہ ایسی تو کبھی نہ تھی۔ وہ تو معصوم اور کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنے والی تھی۔ وہ سہیلیوں کے ساتھ اکثر باہر چلی جاتی۔ وہاں سے ہی واپسی پر ایک دن فرحت نے اسے اپنی محبت کا یقین دلا ہی دیا اور وہ بھی ایمان لے آئی۔

''ارے جتنی محبت میں تجھ سے کرتا ہوں ناں اس

کا تو، تو اندازہ ہی نہیں لگا سکی، ارے یاد آیا دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں میلے سے؟" وہ اسے محبت کا یقین دلاتے، دلاتے چونکا اور جیب ٹٹولنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" گلناز نے حیرانی سے اس کے ہاتھ پر رکھے چھوٹے سے شاپر کو دیکھا اور ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کرتے ہوئے دیکھ کر بولی۔

"اس میں پائل ہے، دیکھ ناں کتنی پیاری ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں ناں، بہت پیاری ہے، یہ میں سنبھال کر رکھوں گی، شادی کے بعد پہنوں گی۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔

"ارے پاگل شادی کے بعد اور لے دوں گا۔ شہزادیوں کی طرح رکھوں گا تجھے۔" وہ دانت دکھاتے ہوئے بولا۔

"فرحت آخر کب تک ہم یونہی ملیں گے، کسی نے دیکھ لیا تو فضول میں ہنگامہ ہو جائے گا، اپنے ماں باپ کو بھیج دے ناں اب۔" گلناز کے چہرے پر تفکرات کے سائے لہرائے اور اسے احساس دلایا۔

"ارے میری جان بھیج دوں گا بس ابھی ابا سے لڑائی چل رہی ہے تھوڑی۔" اس نے ٹال مٹول سے کام لیا۔

"فرحت لیکن......"

وہ بولنے لگی تو اس نے انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھی۔

"یار چپ کر کے دیکھ ناں وہ چاند کتنا حسین لگ رہا ہے۔" وہ اسے پھر سے باتوں میں لگا کر اس کا دھیان اس بات سے ہٹا گیا۔

وہ بری طرح ماضی میں غرق تھی جب کسی چیز کے گرنے کی آواز پر وہ حال میں لوٹی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا، وہ غائب دماغی سے آگے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھ کر چہرہ گھٹنوں پر رکھ لیا۔ یہ ملاقاتوں کا سلسلہ رکا نہیں بلکہ بڑھتا گیا، وہ اس کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی پھر وہ دن بھی آن پہنچا جب سب ختم ہو گیا۔

"تو بہت بدل گیا ہے، اب پہلے کی طرح مجھے ملنے کو بلاتا تو در کنار میری لاکھ منتیں کرنے پر آتا ہے وہ بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔" گلناز شکوہ کناں تھی۔

"تجھے پتا ہے ملنا آسان نہیں ہے، میں مصروف ہوتا ہوں۔"

اس نے بیزاری سے کہا۔

"کہاں مصروف ہوتا ہے؟ تو کوئی کام بھی نہیں کرتا نکھے۔" اس نے اسی مان کے تحت شرارت سے کہا جو اس کی محبت نے بخشا تھا۔

"تو اب تو مجھے نکما ہونے کا طعنہ دے گی؟" وہ بپھرا۔

"نہیں، نہیں میں تو مذاق کر رہی تھی۔" اس نے فوراً بھیگے لہجے میں کہا، یہ وہ فرحت نہیں تھا جو اس کے نکما کہنے پر ہنس کر کہتا کہ تیری محبت نے نکما بنا دیا ورنہ میں بڑے کام کا آدمی تھا۔

"مذاق نہیں، طعنہ تھا، بچہ نہیں ہوں میں۔" وہ دہاڑا تھا، جب دل بھر جایا کرتے ہیں تو پھر سیدھی بات بھی غلط ہی لگتی ہے۔

"اچھا معاف کر دے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

"چل مجھے کام ہے۔"

وہ چلا گیا، وہ آوازیں دیتی رہ گئی مگر جانے والے نہیں سنتے۔

اسی طرح کئی دن بیت گئے تھے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی، وہ ملنے نہ آتا اور اگر کہیں نظر آ بھی جاتا تو نظر انداز کر دیتا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے، اس کی سرخ و سپید رنگت اب زرد ہو رہی تھی، محبت تو ایک سلو پوائزن کے جیسی ہوتی ہے جو اندر ہی اندر کھائے جاتی ہے، وہ خود کو ہزار دلاسے دیتی کہ نہیں وہ مصروف رہتا ہے۔ دل تو مان جایا کرتا ہے مگر دماغ دلائل سامنے لے آتا تو وہ بے بس ہی ہو جاتی۔ آنکھیں بات، بات پر بھیگنے لگتیں۔ ان دونوں کو ملے تقریباً ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا۔ وہ جھاڑو پونچھا لگا کر فارغ ہوئی تھی اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی کہ اچانک اسے یاد آیا کہ پیاز نہیں ہے، گھر پر کوئی موجود نہیں تھا تو اس نے کرسی دیوار کے پاس رکھ کر اس پر چڑھ کر پڑوسن کے گھر جھانکا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے، وہ گھر فرحت کی خالہ کا تھا۔ وہاں فرحت بیٹھا

خوش گپیاں لگا رہا تھا، وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی، دل تھا کہ خوشی سے ناچ رہا تھا، سچی محبت تو دیدارِ یار مانگتی ہے، اسے اپنی آنکھیں بھیگتی محسوس ہوئیں، اسے اپنی کیفیت سمجھ نہیں آرہی تھی، دل سب بھلائے بیٹھا تھا اور دماغ کی دل نے پہلے کب سنی ہے جواب سنتا۔ اس نے کرسی سے چھلانگ لگائی اور پڑوسن کے گھر جانے لگی کہ کچھ سوچ کر رکی اور کمرے کی طرف گئی، اپنے ایک چھوٹے سے بیگ سے اس نے پائل نکالی، دل جھوم رہا تھا، اس نے پائل پہنی، لپ اسٹک لگائی، کاجل لگایا آج کتنے ہفتوں بعد اس نے یہ سب چیزیں استعمال کی تھیں۔ خود پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ پڑوس میں چلی گئی تھی، فرحت جو اپنی خالہ اور کزن کے ساتھ خوش گپیاں لگا رہا تھا، اسے دیکھ کر چونکا۔ لبوں پر جو مسکراہٹ تھی وہ ایک دم غائب ہوئی، یہ بات گلناز نے واضح محسوس کی تھی لیکن اس کو اپنا وہم سمجھا۔

تمہارا نام سنتے ہی یہ چہرہ کھل سا جاتا ہے
محبت کتنی کرتی ہوں اندازہ خود لگا لینا

”ارے گلناز آؤ ناں۔“ راشدہ خالہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”جی خالہ، کیسی ہو افشاں؟“ اس نے خالہ کو سلام کرنے کے بعد خالہ کی بیٹی کو مخاطب کیا۔ افشاں اور فرحت ساتھ، ساتھ بیٹھے تھے۔

”میں ٹھیک، تم سناؤ؟ خیریت سے آئی ہو؟“ اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

”ہاں۔“

اس نے سر ہلایا، وہ حقیقتاً بھول چکی تھی کہ وہ کیوں آئی تھی۔ محبوب سامنے ہو تو بھلا کچھ یاد رہتا ہے، فرحت کے چہرے پر تناؤ وہ محسوس کر چکی تھی، اس کی بے رخی پر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

”ارے افشاں بیٹھی ہوئی کیوں ہو، جاؤ مٹھائی کھلاؤ ناں گلناز کو۔“ راشدہ خالہ نے افشاں کو ڈانٹا تو وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ اس نے پاؤں سامنے کیا گویا پائل دکھانا چاہ رہی ہو۔

”خالہ میں چلتا ہوں۔“ وہ فوری اٹھا تھا، گلناز کا دل پل بھر کو رکا۔

”ارے رے بیٹا بیٹھو دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔“ خالہ نے فرطِ محبت سے کہا۔

”ہاں بالکل فرحت بھائی، اس خوشی کے موقع پر آج میں آپ کے لیے بریانی بناؤں گی اور گلناز یہ منہ میٹھا کرو تم، پتا ہے فرحت بھائی اس گلناز کو گلاب جامن اتنے پسند ہیں کہ محلے میں کسی کی شادی ہوتی تو یہ گلاب جامن کھا، کھا کر ہی بیمار ہو جاتی۔“

افشاں نے اسے رکنے کا کہا اور ساتھ ہی ایک گلاب جامن گلناز کے منہ میں ٹھونس کر فرحت کو دیکھنے لگی۔

”ہاں تو اسے ہی دے دو یہ ڈبا مٹھائی کا آخر کو میری منگنی کی مٹھائی ہے، تمہیں میں اور بھجوا دوں گا، بچپن کی محبت پائی ہے میں نے تو پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹنا بنتا ہے ناں......“ وہ کاٹ دار لہجے میں بولا۔ گلناز کو لگا آسمان اس پر آن گرا ہو، گلاب جامن کا ذائقہ اسے کڑوا سا محسوس ہوا اور وہ اسے گلے میں پھنستا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگی۔

”اوہو، کیا ضرورت تھی اسے منہ میں ڈالنے کی۔“ راشدہ خالہ نے بیٹی کو گھورا۔

”خالہ افشاں کا کیا قصور ہے؟“ فرحت نے انہیں کہا اور اسے طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

”خالہ میں چلتی ہوں۔“

گلناز بھاگتی ہوئی جانے لگی۔ خالہ نے خشمگیں نظروں سے افشاں کو گھورا، وہ بہانے سے وہاں سے کھسکی۔ گلناز بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ کس سے کچھ کہتی، اس کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

”ہاں تو اسے ہی دے دو یہ ڈبا مٹھائی کا، آخر کو میری منگنی کی مٹھائی ہے، تمہیں میں اور بھجوا دوں گا، بچپن کی محبت پائی ہے میں نے تو پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹنا بنتا ہے......“ اس کے کانوں میں گویا کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تھا، وہ کانوں پر ہاتھ رکھے سر نفی میں ہلانے لگی۔

”یہ نہیں ہو سکتا، یہ میرا وہم ہے۔“ اس نے خود کو تسلی دی لیکن کب تک؟ وہ رو نہیں پا رہی تھی، کہتے ہیں

کوئی دکھ پہنچے تو بندہ بری طرح روتا ہے اور اگر زیادہ درد ملے تو آنسو آنکھوں سے نکلنے سے انکاری ہو جاتے ہیں، وہ سر گھٹنوں پر گرائے رونا چاہ رہی تھی مگر آنسو گلے میں اٹک گئے تھے، اس کا دل دھاڑیں مار کر رونے کو چاہا مگر بے بس تھی۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی تو وہ اسے جاتا ہوا دکھائی دیا۔

''رک جاؤ۔''

وہ بھاگی، فرحت چونک کر رکا تھا، اس وقت گیارہ بجے کا وقت تھا، مرد حضرات کام پر گئے ہوئے تھے، بچے اسکول اس لیے گلی مکمل خالی تھی۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟'' وہ پاس گئی اور بھیگے لہجے میں پوچھا۔

''کیسا؟'' وہ اسے اپنے لہجے سے چونکا گیا۔

''فر...... فرحت ہم...... ہم نے محبت کی تھی، جینے مرنے کے وعدے کیے تھے، تم مذاق کر رہے تھے ناں ابھی افشاں کے گھر۔'' وہ آس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ بالکل سچ تھا، میں اپنے ماموں کی بیٹی سے بچپن سے پیار کرتا تھا اور اب خوش ہوں بہت زیادہ کیونکہ ہماری جلد ہی شادی ہونے والی ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہہ کر اس کا سکون برباد۔

''تم، تم کیوں کر رہے ہو ایسا، ہم محبت......'' وہ بول رہی تھی جب اس نے ٹوکا۔

''کیا محبت، محبت؟ میں صرف اسی سے محبت کرتا تھا۔ تم سے دل لگی ہوئی تھی، اب سچ پوچھو تم سے دل بھر گیا ہے، میں تمہارے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتا ہوں جبکہ میرا تمہیں دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا، جاؤ معاف کرو اور آئندہ میرے رستے میں نہ آنا۔ میں اسی سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ چاہے جانے کے لائق ہے، وہ مجھ سے محبت کرتی تھی مگر کبھی کہا نہیں، وہ شرم و حیا کا پیکر ہے، اس کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ وہ محبت کرتی ہے۔ وہ ایک کال پر کبھی مجھے چاندنی رات میں ملنے نہیں چلی آئی، وہ باکردار لڑکی ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے درشتی سے بولا اور اسے بہت کچھ جتا گیا۔

''تم مجھے نہیں چھوڑ سکتے، دیکھو تم جو چاہو گے، جیسا چاہو گے میں بالکل ویسی بنوں گی لیکن مجھے چھوڑ کر مت جاؤ، میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔'' وہ سب بھول کر اس کے پاؤں پکڑنے لگی۔ محبت کو بچانا چاہتی تھی کچھ بھی کر کے، محبت مل جاتی تو سب مل جاتا۔

''مجھے تم چاہیے ہی نہیں ہو کیونکہ تم سے دل تو بہلایا جا سکتا ہے مگر تمہیں عزت نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ یہ نسلوں کا معاملہ ہے۔''

وہ کمان سمیت تیر اس کے دل میں اتار کر چلا گیا تھا اور وہ بنا کچھ کہے اسے جاتا دیکھ رہی تھی، وہ اسے کہہ نہ سکی کہ اس نے یہ سب اسی کے لیے تو کیا کہ وہ اس سے ناراض نہ ہو جائے۔ اس کی خوشی کے لیے وہ سب بھول گئی، وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے بمشکل گھر پہنچی اور چارپائی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی۔ اس کے الفاظ ہتھوڑے کے مانند اعصاب پر برس رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، وہ چلّانا چاہتی تھی مگر چلّا نہ سکی۔ اس نے ہاتھ منہ پر رکھ کر چیخ روکی، دل کرچی، کرچی ہو چکا تھا، سارے خواب ٹوٹ کر بکھر چکے تھے، ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اسے دل اور روح پر لگ رہی تھی۔

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کر جانے والا

''مجھے چھوڑ جاتے بنا کچھ کہے مگر میرے کردار پر تو انگلی نہ اٹھاتے فرحت۔'' رو، رو کر اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ گیٹ کھلا تو اسے احساس ہوا وہ دو گھنٹے سے یہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ اماں کے ہاتھ سے اس نے سبزی والا شاپر لیا.... زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے پیاز سے رونا نہیں آیا تھا مگر پھر بھی وہ رو رہی تھی۔

اب راتوں کو اکثر رونا اس کی عادت بن چکی تھی، وہ زرد پڑ چکی تھی، اماں کو لگتا اس پر سایہ ہو گیا ہے کیونکہ شوخ و شرارتی سی گلناز تو گویا کہیں کھو گئی تھی۔ گلناز اسے بھولنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی مگر بھولنا کہاں ممکن تھا، وہ اس کی پہلی محبت تھی، پہلی محبت اور شاید یکطرفہ محبت بھولنا ناممکن ہے، بظاہر تو وہ نارمل تھی مگر دل میں ہر وقت توڑ پھوڑ ہوتی رہتی۔ اسے اکثر گمان ہوتا کہ وہ آئے گا

کی ناول کے ہیرو کی طرح اور آ کر کہے گا میں تمہیں بھلا کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ میں صرف تمہارا ہوں۔ وہ اس سفر پر اتنے آگے نکل چکی تھی کہ واپس پلٹنا ناممکن تھا، اس کی زندگی گویا رک چکی تھی کیونکہ آگے خاردار جھاڑیاں تھیں جو اسے لہولہان کرتی تھیں اور اگر واپس پلٹنا چاہتی تو اتنا اندھیرا تھا کہ اسے خوف محسوس ہوتا۔

وہ اسے کبھی بھول ہی نہ پائی تھی۔ اس کی محبت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی، وہ اسے اکثر افشاں کے گھر دیکھا کرتی، وہ بہت خوش تھا اپنی بیوی کے ساتھ، اس کی شادی والے دن سارا گاؤں گیا تھا سوائے گلناز کے، وہ کیسے جاتی جس کی دلہن بننے کا سوچا تھا، جس کے ساتھ سہانے سپنے دیکھے تھے، اسے کسی اور کا ہوتا دیکھنے کی اس میں قطعی ہمت نہ تھی۔ اسے افشاں نے ہی بتایا تھا کہ وہ بہت خوش ہے، اسے یہی خوش فہمی تھی کہ اسے کبھی تو یاد کرتا ہوگا مگر وہ اسے یوں بھولا تھا گویا کبھی دیکھا بھی نہ ہو۔ وہ پل، پل تڑپتی رہتی، اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ چیزیں جو پہلے اسے سب سے پیاری تھیں اب وہ اس کی نظر میں اپنی قدر و قیمت کھو چکی تھیں بالکل ایسے جیسے وہ فرحت کی نظروں میں اپنی قدر کھو چکی تھی، اچھے کپڑے پہننا، ہنسنا مسکرانا وہ سب چھوڑ چکی تھی، اسے کوئی چیز خوشی نہیں دیتی تھی سوائے اس کے دیدار کی ایک جھلک کے۔ وہ بے وفا تھا اس نے راستہ بدل لیا تھا بلکہ وہ تو اپنی منزل تک پہنچ چکا تھا مگر وہ وہاں ہی کھڑی تھی۔ وہ اس کے لیے دعائیں مانگتی تھی۔ دعاؤں میں کیا مانگتی تھی وہ خود بھی نہیں جانتی تھی، وہ پانچ وقت کی نمازوں کی پابند اب مہینوں بعد نماز پڑھتی اور دعا بھی ٹھیک سے نہ مانگ پاتی۔ اب وہ بھٹک چکی تھی اس نے کتنے لڑکوں سے دوستی کر لی تھی فقط اس لیے کہ شاید کسی میں اسے فرحت مل جائے مگر نہیں، وہ کسی سے مخلص نہ رہ سکی، وہ ہر ایک سے چند دن بات کرتی مگر دل کہاں مانتا تھا اس کو تو بس وہی چاہیے تھا۔ وہ ہر ایک سے چند دن یا ہفتے بات کرتی اور پھر بس دل بھر جاتا۔ دل ایک ضدی بچے کی طرح تھا جو چاند کی تمنا کر رہا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ چاند اس کی پہنچ سے بہت دور ہے۔ اکثر وہ اسے دیکھتی تو وہ نظروں کا زاویہ بدل لیتا اور گلناز کی روح تک جھلس جاتی، وہ لبوں پر مسکان سجا لیتی کہ کوئی جان نہ سکے اس کے اندر کون سا لاوا پک رہا ہے۔ اس کا کبھی، کبھی دل چاہتا کہ محبت کی بھیک مانگ لے جا کر...... وہ بھیک مانگ بھی لیتی اگر اسے یقین یا کوئی امید ہی ہوتی کہ مقابل ترس کھا لے گا۔

''اب میں اسے کبھی یاد نہیں کروں گی۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے تہیہ کیا تھا۔ یہ بات وہ جانتی تھی کہ ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی روح میں سما چکا تھا، جب انا انگڑائی لیتی تو وہ خود کو ملامت کرتی کہ کیوں کیا وہ سب مگر یہ ملال فقط چند لمحوں کے لیے ہوتا پھر فرحت کا خیال ہر سوچ پر حاوی آ جاتا۔ وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ سر ہاتھوں پر گرائے اب سسکیاں لے رہی تھی، یہ تو روز کا معمول بن چکا تھا، خود کو اذیت دینا اس کا گویا پسندیدہ کام تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ فرحت نہ ملا تو مر جائے گی مگر یہ کیا وہ تو اس کے جانے، رخ موڑنے کے بعد بھی سانس لے رہی تھی لیکن سانس لینے اور زندگی جینے میں فرق ہوتا ہے وہ جینا چھوڑ چکی تھی۔ وہ زندہ لاش بن چکی تھی، سانسیں اب بوجھ بن چکی تھیں، دل خون کے آنسو روتا تھا مگر اس ہرجائی کو فرق نہیں پڑا تھا کہ کوئی اسے اس حد تک بھی چاہتا تھا کہ اپنی ہر خوشی اس سے وابستہ کر لی تھی۔

ادھیڑ ڈالے ہیں بخیے میرے جدائی نے
کہ کھا گیا ہے تیرا غم کتر، کتر کے مجھے

''شاید جب میں مر جاؤں تو اسے قدر محسوس ہو کہ مجھ سے زیادہ اسے کوئی چاہ ہی نہیں سکتا۔'' اس کو موہوم سی امید نظر آئی۔

''جسے میرے ہونے سے فرق نہیں پڑتا اسے میرے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔ بلکہ وہ تو میری موت کی خبر سن کر کہے گا کہ اللہ اس کے گھر والوں کو صبر دے۔'' وہ خود اذیتی کی انتہا پر تھی۔

''میں دعوے دار تھا چاہت میں جان دینے کا
میں تیرے بعد بھی زندہ رہا، منافق ٹھہرا''

ثنا کے ہاتھ سے ڈائری گر گئی تھی اور وہ شاید خود

بھی چکرا کر گر جاتی اگر دیوار کا سہارا نہ لیتی۔
یہ سب کیا تھا؟ ماضی میں کیا ہوا تھا؟ اب کوئی پردہ نہیں رہا تھا۔ اب کسی صفائی، کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ ثنا کے اندر جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ اس کے دل اور نئے نویلے گدگداتے جذبات کا خون ہوا تھا۔ وہ کیوں نہ ماتم کناں ہوتی!
اس کا دل چاہا کہ وہ دھاڑیں مار، مار کر روئے مگر اس کی آنکھیں سیم زدہ زمین کی طرح بنجر ہو گئی تھیں۔ شاید ان میں ایک قطرہ بھی آنسو کا نہیں بچا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ شاید وہ کرن تھی جو اسے آوازیں دے رہی تھی۔
''ثنا! تمہیں کیا ہوا ہے؟ ہوش کرو۔ پتھر کا مجسمہ بنی ہوئی ہو۔'' کرن گھبرا کر اونچا، اونچا بول رہی تھی۔
''ثنا! گھر سے فون آیا ہے کوئی؟ سب خیریت ہے ناں؟'' کرن نے اسے جھنجوڑ دیا تھا۔
''بولتی کیوں نہیں ہو؟'' کرن رو دینے کو ہوئی۔
''حوصلہ کرو، اگر کوئی بری خبر ہے تو بتا دو اتنی خاموش کیوں ہو؟'' کرن نے جیسے زچ ہو کر کہا تھا۔
''ثنا! میری دوست بتاؤ تو...... کیا پتا میں کچھ مداوا کر سکوں۔''
''کوئی مداوا نہیں کر سکے گا ایسے غم سے گزر رہی ہوں۔'' ثنا کے لبوں سے جیسے سسکاری نکلی تھی۔
''کوئی میرے درد کو سمجھ نہیں سکے گا۔'' وہ بالکل بے حواسوں کی طرح بول رہی تھی۔ کرن متوحش سی ہوئی۔
''ہوا کیا ہے؟''
''اعتبار ٹوٹا ہے۔'' ثنا کے لبوں سے نوحہ برآمد ہوا۔
کرن کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔
''آہ! ہمارے نصیب، اعتبار کس کا قائم رہتا ہے؟ جب اپنی ذات کو ناقدروں کے ہاتھوں رول دیں تو اعتبار کہاں بچتا ہے۔'' کرن کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔
''تم تو مجھے سمجھاتی تھیں پھر کیسے بھٹک گئیں؟ تم تو مجھے رستہ دکھاتی تھیں۔''
''میں بھول میں پڑ گئی تھی، میں جسے روشنی سمجھی تھی، وہ انگارہ تھا، جسے چشمہ سمجھا وہ سراب نکلا۔'' ثنا کا چہرہ سفید پڑنے لگا جیسے سفید لٹھا ہو جیسے اس پر موت کی زردی چھا رہی ہو۔
''میں نے بھی دھوکا کھایا جیسے ساری لڑکیاں محبت کے نام پر دھوکا کھاتی ہیں۔'' ثنا جیسے مرجھا رہی تھی۔ جیسے ڈال سے ٹوٹے پھول مرجھاتے ہیں۔
''ہم نادان ہیں ناں محبت کے نام پر لٹ جاتے ہیں۔ لوٹنے والے پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔'' کرن جیسے کرلا اٹھی تھی۔
''مگر تم تو سمجھدار تھیں پھر تم اس آگ میں کیوں کود پڑیں۔''
''محبت اندھا کر دیتی ہے کچھ دکھائی نہیں دیتا، بینائی چھین لیتی ہے، عقل مفلوج کر دیتی ہے، یہ محبت بڑی بد بخت ہے۔'' ثنا جیسے دھیرے، دھیرے کھلتی جا رہی تھی۔
کرن اسے سوز بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جیسے ان آنکھوں میں دکھ اور کرب کے سوا کچھ نہ ہو۔ وہ دونوں ڈار سے بچھڑی کونجوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ، لپٹ کر اپنے، اپنے غم کو کم کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ ان دونوں کے دکھ ایسے ہی سانجھے تھے جیسے منہ کے نکلے لفظ ایک دوسرے سے جڑے ہوں۔
دکھ ہمیشہ سانجھے ہی لگتے ہیں، خوشیوں کے محل الگ، الگ کھڑے کر لیے جاتے ہیں۔ دکھوں کی درگاہیں تو سانجھی ہی ہوتی ہیں جن پر اپنی، اپنی محرومیوں کے دیے جلا کر ایک ساتھ ماتم کیا جاتا ہے۔ جیسے اس وقت یہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی، اپنی اجڑی محبت کی پھوہڑی ڈال کر بیٹھی تھیں۔ جیسے ابھی کے ابھی ان کی محبت کے جنازے اٹھنے والے تھے۔

''من میں ایک دوجے کے لیے
چاہے کوئی اچھا جذبہ نہیں
باتوں میں چاہے لاکھ اختلاف ہے
دونوں کی شخصیت بالکل متضاد ہے
ہاں! مگر اِک چیز ہے جو میرے ساتھ
اسے بھی لگتا ہے ایک جیسی ہے
میں چاند ہوں وہ سورج ہے

بس قسمت ہماری ایک سی ہے
مقدر میں جتنی آزمائشوں پر گلہ اسے ہے
سہنا وہی سب مجھے بھی پڑتا ہے
جتنے امتحان اس کے لیے وبالِ جان بنتے ہیں
اتنے ہی دکھوں کے تازیانے کھا کر
میری روح بھی گھائل ہے
اس کی آنکھوں کے گرد پڑتے
گہرے سیاہ حلقے اگر شکست کی نشانی ہیں تو
منزل پر پہنچ کر رستہ بھٹکی
میری مسکان بھی سونی پڑ چکی ہے
اگر اسے لگتا ہے کہ اس کے لیے
معجزے کا کوئی در نہیں کھل رہا
تو میری دعائیں میرے حق میں ناکامی پا کر
آسمان سے خالی پلٹ آتی ہیں
پھر بھی کچھ تو ایسا ہے جس پر دل
اِک عجب سی لے پر دھڑکتا ہے
اور ذہن یہی کہتا ہے
اس کی خوشی کے لیے میں ہر شب
تہجد میں بِتا سکتی ہوں
ذہن میں سوچے اس کے لیے میرے
تصوراتی معجزے سچ ہو سکتے ہیں
اگر میری اس کے حق میں دعا
افق کے اس پار سن لی جائے
اس کی زندگی بدلنے کی مجھے روشن دیے کی طرح
پیہم اِک امید تو ہے
مگر باوجود سب کے اِک دکھ عظیم ہے کہ
اسے اب میرا نام بھی شاید یاد نہیں!''

دو چھوٹی عمر کی نادان لڑکیاں اپنی، اپنی کچی محبت کی موت پر کسی نوعمر بیوہ کا سا غم لیے ہجر کی دہلیز پر بیٹھی تھیں۔ دونوں کا غم اس وقت مشترکہ تھا۔ یہ دونوں اپنے، اپنے اعتبار کے قتل پر غمزدہ تھیں۔

ثنا نے خود کو آئینے میں دیکھا اور ششدر رہ گئی اس کے سامنے کوئی اور لڑکی کھڑی تھی۔ وہ اس کا عکس تھی یا بس ایک شبیہ؟

وہ جو راتوں کو ڈر جانے والی ایک لڑکی تھی۔ وہ کون تھی؟ جو ماں کے پہلو سے چپک کر ننھی سی آنکھیں موندے سونے کی کوشش کرتی، وہ ڈرپوک سے لڑکی کون تھی؟ وہ کون تھی جو بہت سندر لڑکی تھی؟ کیا وہ اچھی لڑکی نہیں تھی؟ ایسا نہیں تھا کہ وہ اچھی نہیں تھی......!

اچھی تھی، بہت اچھی...... اتنی کہ جتنا ایک انسان کو ہونا چاہیے...... نرم دل...... جذباتی سی لڑکی...... مگر وہ عجیب تھی بہت عجیب جو اپنی دعاؤں اور عبادتوں میں کبھی تو بہت شدت دکھایا کرتی اور کبھی اتنی غافل، اتنی گریزاں ہو جاتی...... اسے دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا یہ کبھی اللہ کے سامنے ہاتھ بھی پھیلاتی ہوگی۔

جب اسے ذرا سی خوشی ملتی تو وہ مصلیٰ بچھائے شکرانے کے نفل ادا کرنا شروع ہو جایا کرتی تو کبھی دل ہی دل میں اپنے اللہ سے شکوہ کناں بھی ہوتی پر اپنے آنسو اندر ہی اندر پیتی رہتی...... ایسے میں ہر وقت اس کا اداس رہنا اور رونا دھونا جاتا رہتا۔

''میں اتنی بری ہوں تو مر ہی جاؤں۔''

اللہ پر خود سے بڑھ کر یقین رکھنے کے باوجود وہ ذرا، ذرا سی بات، ذرا، ذرا سے لہجے سے اتنی ٹوٹ جاتی کہ اسے اپنی ہی مانگی دعائیں بوجھ لگنے لگتیں اور وہ اللہ کے سامنے بجائے رونے دھونے کے بس خود کو لے کر سب سے غافل سی ہو جاتی۔ خود سے بے انتہا نفرت کرنے لگتی...... خود کو اذیت پہنچانا اس کا معمول بنتا چلا گیا...... اسے لگتا اب اس کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں، کوئی معجزہ نہیں تو جیسے زندگی چل رہی ہے، چلنے دو! ویسے بھی اس کے ہونے نہ ہونے سے کون سا کسی کو فرق پڑتا ہے۔

اب وہ ہر الٹے سیدھے کاموں میں خود کو الجھائے رکھتی۔ وہ جیسے خوشی و غم سے عاری ہو چکی تھی۔ اس چکر میں اس نے اپنی ذات کے اردگرد بے حسی کی دیوار کھڑی کر دی...... اسے لگتا تھا اس کا دل مر چکا ہے اور جب دل مر جائے تو انسان جشن منائے یا سوگ میں رہے کیا فرق پڑتا ہے۔

عادتاً پنجگانہ نماز ادا کرتے جب دعا مانگنے کی باری آتی تو وہ اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بس یہ سوچا کرتی۔

''اب خدا سے کیا مانگوں؟'' اور جب ذہن و دل سے جواب نہ آتا تو کہہ دیتی۔
''یا اللہ مجھے شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔'' اور پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر دم توڑ دیتی۔
''مجھ جیسی عام سی لڑکی کی دعا سن کر اللہ پاک کیا کریں گے...... میں تو ویسے ہی اتنی بری ہوں......''
مایوس انسان حسنِ ظن سے عاری ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے خالق و مالک سے بھی دور ہو جاتا ہے تبھی تو مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔
پھر ایک وقت آیا جب اس کی زندگی کی کٹھن ترین آزمائش شروع ہوئی...... اس کی معصومیت اور کردار پر لگے بے بنیاد الزامات اور تہمتوں کی آزمائش کا وقت...... جس نے اس کی ذات کو اندر سے اس قدر چکنا چور کر دیا کہ وہ ہمت ہار بیٹھی اسے لگا اب سنگساری ہی اس کا مقدر ہے کیونکہ وہ ایک طرف تھی اور اس کے خلاف ہوتی ہوئی پوری دنیا ایک طرف......
وہ سچی ہوتی بھی تو اس پر یقین نہ کیا جاتا اور یہاں تو اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھے...... نہ ہی کوئی دعا......
وہ اب دعا مانگتی بھی تو کس منہ سے...... اس کی نظر میں اس نے اللہ کی رحمت کے دروازے خود پر خود ہی بند کیے ہوئے تھے۔
اب وہ شکستہ تھی اپنے ہر عمل، اپنے ہر رویّے پر...... مگر پھر بھی دل اپنی شدت سے یہ کہہ کر دھڑک رہا تھا۔
''اللہ! سب چھوڑ چکے آپ تو ساتھ مت چھوڑنا! آپ مت چھوڑنا میرے اللہ...... چاہے میں اوپر سے خفا تھی مگر دل کے راز تو آپ سے بہتر کون جانتا ہے...... یہ لوگ جو کر رہے ان کی نادانی ہے، آپ تو سب سمجھتے ہیں...... ان کے سامنے چپ ہوں جانتی ہوں میرا سچ ان کے لیے معنی نہیں رکھتا یہ لوگ مجھے گرانے کے درپے ہیں...... مگر آپ تو سچ جانتے ہیں۔ میرا ساتھ دینا میرے اللہ! میرا ساتھ دینا میرے اللہ!'' اس کی زبان خاموش تھی مگر دل لپک، لپک کر اپنے اللہ سے اس کے ساتھ کی التجا کر رہا تھا۔ وجود کو لگ رہا تھا بس یہ سانسیں آخری ہیں۔ ابھی کچھ کر کے خود کو اس اذیت سے نجات دلانی ہے اور وہ طریقہ ہے بس موت......
زمین و آسمان پر موجود ذات الٰہی اس دل کی شدت اور یقین کو بکھیر کر کیسے اسے جہنم میں دھکیل سکتی تھی۔
پھر وہ ہوا جو سب نے دیکھا! معجزاتی طور سے ثبوت کی صورت اس کے لیے پروانۂ رحمت بھیجا گیا اور وہ دنیا کے سامنے عزت سے سرخرو ہوگئی۔ جیسے ہی علم ہوا ساتھ تو صرف رب کی ذات نے دیا ہے تو وہ وہیں سجدۂ تشکر میں گر گئی۔
اس کی یہ ادا رب کو اتنی پسند آئی کہ اللہ نے اس کے دل سے سبھی خوف نکال دیے اور اسے اپنی رحمت میں لے لیا۔
اور بے شک اللہ کی ذات پر یقین رکھنے والے تو دنیا میں ہی جنت پا لیتے ہیں...... بشرطیکہ یہ یقین کبھی ٹوٹنے والا نہ ہو۔
ایسی الجھی سلجھی دھوپ چھاؤں جیسی وہ لڑکی آخر کون تھی؟ جو کبھی روٹھتی کبھی خود ہی مان جاتی، کبھی رب سے شکوے کرتی، اور کبھی شکر کے طویل سجدے۔ اس آئینے میں بنتے بگڑتے عکس لیے کھڑی وہ لڑکی آخر کون تھی؟ کیا وہ کرن تھی؟ یا وہ گلناز تھی؟ یا پھر ثنا تھی؟ یا ثنا جیسی ہی کوئی ملتی جلتی لڑکی؟ آج آئینے نے ہر لڑکی کے روپ میں ثنا کو سامنے لا کھڑا کیا تھا آج ہر عکس میں ثنا کا عکس تھا۔
آج ثنا خود کو گلناز اور کرن کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔
آج ثنا کو خود سے کراہیت بھی آرہی تھی۔
محبت کے نام پر بکنے کی سمجھ آئی تھی۔ انسان ہمیشہ گھاٹے کے سودے کرتا ہے۔ حقیقی محبت کی تلاش اسے بھٹکائے رکھتی ہے۔ ہر چہرے میں وہ خلوص کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔
دو انسانوں کی محبت یکساں نہیں ہو سکتی، اس لیے محبت کو بیان کرنا مشکل ہے۔ دراصل محبت ہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنی ظاہری شکل، باطنی شکل اور حقیقی شکل دیکھتا ہے۔
ثنا کو اپنی شکل کریہہ نظر آرہی تھی قریب تھا کہ وہ اس صدمے سے ہی ماری جاتی۔ اچانک اس کی ماں گاؤں سے

اسے ملنے چلی آئی تھی۔ امی کی آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ ثنا کی حالت ایسی نہیں تھی جو وہ اپنی ماں کا سامنا کر پاتی مگر اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے میری دھی!"
امی اسے دیکھ کر بھونچکی رہ گئیں۔

امی کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میرے دل کو بے سبب وہم نہیں لاحق تھے۔ ہائے میرے خدا! میری بچی کیسے پیلی پھٹک پڑی ہے۔" امی کا کلیجا منہ کو آ رہا تھا۔

"کیا روٹی نہیں کھاتی؟ دودھ نہیں پیتی؟ میں تیرے لیے دودھ کی بوتلیں، دیسی گھی اور چار مغز ڈال کے پنجیری لائی ہوں۔ مجھے پتا تھا پڑھ، پڑھ کے تم نے اپنی شکل بگاڑ رکھی ہو گی۔ اوپر سے تمہاری پھوپی......" امی جیسے لمحہ بھر سانس لینے کے لیے رکی تھیں۔

"کیا ہوا پھوپی کو؟" ثنا کی آواز میں سراسیمگی بھری تھی۔

"اس کو تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے۔ پڑھ، پڑھ کے شکل خراب ہو جائے گی۔ اس کی نوں وو ہٹی بن کے اچھی نہ لگی تو برادری میں خوب باتیں ہوں گی۔ ثنا تجھے تو پڑھائی کھا گئی ہے۔" امی کے دل کو کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں امی! اب تو مجھے بھی لگتا ہے کہ پڑھائی مجھے کھا گئی۔" اس کی آواز انتہائی شکستہ تھی۔ امی اس کا بڑی باریکی سے جائزہ لیتی رہیں، کھوجتی نظریں اور ٹٹولتی فکریں آس جمائے بیٹھ رہی تھیں۔

"سب خیر ہے میری بچی! پڑھائی کے علاوہ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟" امی نے گھبرا کر جیسے خود سے پوچھا۔

"مسئلہ بھلا کیا ہو گا میری دھی کو، بہن بھائیوں سے اداس تھی ناں؟ چل میں تجھے گھر لے چلتی ہوں۔" امی نے جیسے آناً فاناً فیصلہ سنایا۔

"نہیں امی! میرے پیپرز ہیں، میں ابھی تو نہیں جا سکتی۔" ثنا بدک سی گئی۔

"میرا دل ہول رہا ہے ثنا! چل میری بچی میرے ساتھ گھر چل پیپر کے دنوں میں آ جانا۔" امی ہول رہی تھیں۔ "میرے دل کو چین نہیں پڑے گا بیٹی۔ جب تک تو میرے ساتھ نہ چلی۔" امی کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

"کہا تو ہے جلدی آ جاؤں گی، آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے بوجھل دل سے کہا۔

"یہ تم نے کیسی شکل بنا رکھی ہے؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟" امی کے وہم بے بنیاد نہیں تھے۔ ثنا کو انہیں تسلی دینی مشکل ہو رہی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے امی! امتحان سر پر ہیں تو اس کی فکر رہتی ہے۔"

"جھلی نہ ہو تو...... شروع سے ہی پڑھائی کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔" امی کو شاید ڈھارس ملنی شروع ہوئی تھی مگر وہ مطمئن نہیں ہو پا رہی تھیں۔ وہ بڑی بے قرار تھیں۔ جاتے سے بار، بار اسے دیکھتیں۔ مڑ، مڑ کے جیسے دل نہ بھر رہا ہو جیسے دل اڑا اڑا جا رہا ہو۔ امی نے رکشا پکڑنے سے پہلے سو دفعہ کہا۔

"ثنا! اپنا خیال رکھنا۔" اس خیال رکھنے میں ڈھیر ساری تنبیہ تھی۔ ایک سرزنش تھی۔ ایک ٹوک تھی۔ جوان بیٹی کی ماں والے سارے دھڑکے ثنا کی ماں کو لگے ہوئے تھے۔ وہ انگلیوں پر دن گن، گن کے گزارتی تھی۔ کب دو سال پورے ہوں گے اور اس کی بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس گاؤں آئے گی۔

"ثنا! میں نے بڑی مخالفتیں مول لے کر تجھے شہر بھیجا ہے، اس جگہ جہاں لڑکے بھی پڑھتے ہیں۔ میرا دل بڑا پریشان رہتا ہے۔ دیکھ تیرا مستقبل عادل کے سوا اور کوئی نہیں۔ یہ بات کبھی مت بھولیو۔" ثنا اس سرزنش پر بھونچکی رہ گئی تھی آج امی کو کیا ہوا؟ جس رشتے کی مخالفت وہ خود کرتی تھیں، آج اسی رشتے کے لیے ثنا کو حدود یاد دلا رہی تھیں، اسے بتا رہی تھیں کہ تمہاری منزل پھوپی کا گھر اور عادل کی سلطنت کے سوا کچھ اور نہیں۔ اگر کوئی رو پہلا خواب بے خیالی میں بنا بھی لیا ہے تو اسے نوچ ڈالو خوابوں کی بیلوں کو بڑھنے نہیں دیتے۔ ان کی شاخیں کاٹ کے ٹنڈ منڈ کر دیتے ہیں ورنہ یہی خواب اکثر اوقات رسوائی کا سبب بن جاتے ہیں۔

"مگر کیوں امی؟" ثنا احتجاجاً چیخی۔ "ایسا کیوں؟ آپ نے تو کہا تھا میرا ساتھ دیں گی۔ مجھے پھوپی کے

بے رحم چنگل سے محفوظ رکھیں گی۔ پھر ایسا کیوں امی؟ اپنے وعدے سے کیوں مکرتی ہو۔'' ثنا تڑپ اٹھی۔

''وہ پرانی باتیں ہیں بھلا خاندانی لوگ زبان دے کے مکرتے ہیں؟ کیا تیرے باپ کی جگ ہنسائی نہیں ہوگی؟''

''اس ڈر سے آپ میری زندگی برباد کریں گی؟'' ثنا تلخ سے تلخ ترین ہوئی۔

''بربادی کیسی؟'' ماں کو سخت ناگوار گزرا۔ ''عادل میں کوئی کمی نہیں، ساری عمر راج کرو گی۔ کھلا پیسہ، کھلا رزق۔''

''بس کرو امی! نہ لالچ کے سبق پڑھاؤ۔ یہ نہیں سکھایا آپ نے... میں دنیاوی لذتوں کے پیچھے اپنے دل کی حقیقی خوشی سے کیسے منہ موڑ سکتی ہوں؟'' ثنا کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔ اُدھر اس کی ماں بھونچکی رہ گئی تھی۔

''کون سی دل کی خوشی؟'' ماں کے دل کو پتنگے لگ گئے۔ ثنا کو اچانک ہی غلطی کا احساس ہوا تھا۔

''امی! اتنا پڑھنے لکھنے کی خوشی۔'' وہ جیسے عاجزی سے بولی تھی۔

''اتنا پڑھا لکھا کر مجھے ڈھور ڈنگروں میں بیاہ دو گی۔'' اس کی آنکھوں میں یاسیت تھی۔ اتنی یاسیت کہ ماں کی آنکھوں میں کرچیاں بھرنے لگی تھیں۔ انہوں نے نگاہ چرالی اور دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں پڑھ کر اس پر پھونک ماردی۔

''گھر آؤ گی تو بات کریں گے پر تم اپنا خیال رکھو، دھیان سے کھانا کھایا کرو، اپنی حالت دیکھو آپا کی اکلوتی نوں......''

''امی! رکشا آگیا۔'' ثنا نے ان کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔ وہ دل مسوس کر رکشے میں بیٹھ گئیں مگر جاتے، جاتے ایسی نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

''ثنا! تم پابند ہو اپنی روایات کی، اپنی خاندانی اقدار کی، اپنے باپ کی دستار کی۔''

اور ثنا جیسے ان نظروں کا مفہوم پڑھ کر ڈھے گئی تھی۔

اس نے محبت کی سوندھی خوشبو کو طاق میں سجا دیا
ہاں محبت دور سے ہی اونچائی پہ بھلی لگتی ہے

مناجات

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
وہ جس منزل کے راہی ہیں ہم اس رہ گزر کو دیکھتے ہیں
ابھی گزریں گے اِدھر سے میرے حضورؐ لوگو!
تم بھی دیکھ لو اُدھر ہی ہم جدھر کو دیکھتے ہیں
جو ٹوٹ پڑیں تم پر دکھوں کے پہاڑ آکر
یوں سمجھ لینا پھر آقاؐ اِدھر کو دیکھتے ہیں
جب ان کو بلانا ہوگا بلالیں گے مدینے ہم کو
ہم تو خیالوں میں بس انہیؐ کے گھر کو دیکھتے ہیں
اے کوثرؔ امیدوں کو تو منقطع نہ کرلینا
ساقی نے جو ہے پلانی اس مئے اطہر کو دیکھتے ہیں

کاوش: کوثر خالد سودا، جڑانوالہ

پیاری نواسی کی سالگرہ پر نذرانۂ محبت

میری خوشبو میری بلبل
میرے دل کا قرار
''میرم'' میری جان
میری بیٹی کے گھر کی بہار
سلامت رہے تو
سدا مسکرائے
غم کا کوئی جھونکا نہ
تیرے پاس آئے
ہر موسم بنے تیرے لیے
موسمِ بہار......

آمین یارب العالمین

دعا گو: ثمینہ کوکب، جہلم

سسکیاں

آنسو آنکھ میں رہ گئے، درد، درد ہی رہ گیا
زخموں پہ نہ میرے کسی نے مرہم لگائی
مجھے لے چلو اس جہان سے، کسی اور اِک جہان میں
کہ سسکیاں میرے دل کی اب دے رہی ہیں دہائی

اریبہ، واہ کینٹ

محبت اپنی مسند سے نیچے اتر آئے تو بے مول ہو جاتی ہے
میں اس قبیلے سے ہوں
جسے رسموں سے سروکار نہیں
گو کہ یوں لگتا ہے
جیسے قرنوں پہلے میرے اور محبت کے بیچ
عدواتوں بھرا برتاؤ تھا
اب کوشش یہی ہے کہ گہرے سکوت تلے
اس آفاقی جذبے کا نام بہت خاموشی سے لیا جائے
تب خسوف دل کے دیمک زدہ کواڑوں سے
سسکتی آواز نکلتی ہے
محبت نام ہے رسوائی کا
محبت نام ہے نارسائی کا
محبت کا گوشت بھوکے بدن بھنبوڑتے ہیں
کئی گدھ محبت کے نام پر عزتوں کو روندتے ہیں
وہ جو اپنے باپ کی دستار کا بھرم لے کر
گھر سے پڑھنے کے لیے نکلتی ہیں
پھر وہ ساری عمر محبت نام کے
صحراؤں میں ماری ماری بھٹکتی ہیں
میں اپنے جذبوں کی زبان سننے کے بعد
ہر ساز پہ اپنی پوریں فگار کرنے کے بعد
ہجر کی موسیقی کو اپنی سماعتوں کی نذر کر کے
محبت نام سے علی الاعلان مکرتی ہوں
اے محبت میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں"

اس نے سوچا تھا اب وہ نہیں روئے گی مگر گلناز کے سامنے وہ اتنا روئی کہ سارے آنسو آنکھوں کے سوتوں سے سکھا ڈالے۔ اب تو نمکین پانی کی رمق تک نہیں بچی تھی۔ گلناز نے ایک بھر بھری سی آہ بھری۔

"نادان لڑکی! یہ رونا تمہارے کیا کام آئے گا؟"

"تو میں اپنے لٹنے کا ماتم بھی نہ کروں؟"

"اس سے کسی کو کیا فرق پڑے گا؟ بس اتنا ہی کہ تم خود کو جلا جلا کر اپنا رنگ روپ کھو دو گی۔" گلناز نے افسردگی سے کہا۔

"تو یہ رنگ روپ کس کے لیے ہے؟ مجھے خود سے وحشت ہوتی ہے بتاؤ تو کدھر جاؤں...... کیا جنگلوں میں نکل جاؤں؟" وہ سراسیمہ سی ہوئی بولتی جا رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا اس شہر کے جنگل میں ہر جانور اپنی بساط کے مطابق شکار کی گھات میں ہے۔ یہ بات اتنی جلدی سمجھ نہیں آتی ٹھوکر لگتی ہے۔ ایک دفعہ کیچڑ میں لت پت ہونا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ گندگی میں لتھڑے بغیر عقل کی کھڑکیاں نہیں کھلتیں۔" اس کا انداز جیسے مذاق اڑاتا تھا۔

"تم میری دوست تھی ناں؟ تم نے مجھے نہیں روکا؟" اس کی آنکھیں جیسے شکوہ کناں تھیں۔

"میرے روکنے سے تم نے کیا رک جانا تھا؟ ایسے بھلا ممکن ہے؟" اس نے ٹھنڈی نظروں سے اسے لاجواب کیا تھا۔

"اب میں کہاں جاؤں؟ میرا دل اس محبت کے بوجھ تلے دب گیا ہے۔ مجھے روگ لگ گیا ہے۔" ثنا بری طرح سے کرلائی تھی۔

"یہ روگ سب کو لگتا ہے، کچھ دن لگیں گے تم سوگ سے نکل کر روگ بھول جاؤ گی۔" گلناز نے.... بے حسی کی انتہا کر دی تھی۔

"یہ تمہارے لیے ممکن ہو سکتا ہے، میرے لیے ممکن نہیں۔"

"شروعات میں پہلی ٹھوکر تکلیف دیتی ہے اور پھر سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔" گلناز نے کندھے اچکائے۔

"تمہارا شکوہ بجا ہے مگر جب تک تم خود کو آزمانہ لیتیں تمہیں سمجھ نہیں آنی تھی۔ اب اگر سمجھ گئی ہو تو آگے تمہارے لیے آسانی ہوگی۔ ٹھوکر تو ہر ایک کو لگتی ہے۔ ثمرہ کو بھی لگی تھی، نائلہ کو بھی لگی تھی اور کرن ابھی تک چوٹیں سہلا رہی ہے۔ کچھ وقت گزرے گا پھر تم دونوں بھی چوٹیں سہلانے کی پوزیشن سے نکل کر چوٹ مارنے کے دور میں آ جاؤ گی۔" وہ ان کے فیوچر کا بڑا بھیانک نقشہ کھینچ رہی تھی۔ ثنا نے خوف زدگی کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔

"میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"کرو گی، ضرور کرو گی، انتقام تمہیں بہت کچھ کرنے پر مجبور کرے گا۔ تم اپنے زخموں کو مرہم دینے

کے لیے بہت کچھ کروگی۔'' گلناز کے لہجے میں تجربوں کی پھنکار تھی جبکہ ثنا بہت خوف زدہ ہو کر گلناز کو دیکھ رہی تھی۔ جواب بےفکری سے گنگنا رہی تھی۔

''اس نے مجھے بھی چھوڑا تھا۔ جھوٹ بول کر، جان چھڑوانے کے لیے منگنی کے ڈھکوسلے کیے۔ جھوٹی شادی بھی رچالی۔ یہی گیمیں کھیلی تھیں میرے ساتھ بھی سارے داؤ آزمائے اس نے۔ جھوٹا کہیں کا دغاباز،الو۔'' گلناز کے دماغ پر غصے کی چربی چڑھ گئی تھی۔ شاید ہی اب پگھلتی۔

''کہتا تھا منگنی کرلی پھر شادی۔ سالا جھوٹ بولتا رہا۔ ڈرامے باز...... میں نے بھی تھوک دیا اس پر اور پھر اس کے دوست سے ریلیشن بنالیا، اچھا تھا ٹائم پاس کے لیے۔'' اس نے گہری مسکراہٹ کے جلوے بکھیرے اور اٹھ کر چلی گئی۔ جاتے، جاتے اس کی آواز کسی بازگشت کی طرح سماعتوں میں زہر گھول رہی تھی۔

''بھول جاؤ اسے کسی بھیانک خواب کی طرح جیسے میں بھول گئی ہوں۔ کہو تو ان سے اچھی آسامی کا نمبر دے دیتی ہوں۔ دل بہلالو، ذہن کا بوجھ ہلکا ہوگا۔''

اور ثنا بے سانس سی سُن ہوتی سماعتوں کے ساتھ اسے سن رہی تھی۔

اس کی محبت کا پہلا ہی ستارہ بہت بری طرح سے ڈوب گیا تھا۔ نیلے جھاگ اڑاتے افق کی گہرائی میں کبھی نہ نکلنے کے لیے۔

☆☆☆

گدلے پانیوں کے قیدی

یونیورسٹی کی love road ویران تھی۔ امتحانات کے دن قریب تھے۔ سارا سال کھیل تماشے کرنے والے طالب علم بھی شاذ ہی دکھائی دیتے تھے۔

ثنا بہت دن بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ اس دن سنسان پیار کی سڑک پر اسے بہت دنوں بعد سر عارف دکھائی دیے تھے۔ وہ پیار کی اس ویران سڑک پر بہت سست قدموں سے چل رہے تھے۔ یہ وہ سڑک تھی جو پورا سال پیار کرنے والوں کی آہٹوں سے گونجتی رہتی تھی۔ آج بہت اداس اور اکیلی لگ رہی تھی۔

سر عارف نے بینچ پر بیٹھی ایک خاموش لڑکی کو دیکھا جس کا سر جھکا ہوا تھا اتنا کہ شاید اس کے گھٹنوں سے جا لگتا۔ وہ کسی جوان بیوہ کے اجڑے سہاگ کا سارا روپ لیے بیٹھی تھی۔ سر عارف کے آگے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

''چکھ لیا سواد؟'' ان کی آواز اسے سوچوں کے سمندر سے کھینچ لائی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر حواسوں میں لوٹی۔ سر عارف کو اتنا قریب دیکھ کر اس کی سانس سینے میں ہی تھم گئی تھی۔

''کرن کی طرح؟ اب کیا سارے زمانے کو تماشا دکھاؤ گی؟ جو بچی کھچی عزت ہے، اس کے اشتہار لگاؤ گی؟'' گہرا کاٹ دار طنزیہ لہجہ...... ثنا کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی تھی۔

''سس سر! آپ غلط سمجھے ہیں۔'' وہ ہکلا کر بولی۔

''چپ کر جاؤ!'' وہ غصے سے بھنچی آواز میں بولے تھے۔

''ہم سارے زمانوں کی خاک چھاننے والے بڈھے غلط سمجھتے ہیں، تم ناتجربہ کار جوان بچے ٹھیک سمجھتے ہو اور پھر اسی زعم میں مارے جاتے ہو۔'' انہوں نے اپنے کھچڑی زدہ بالوں والے سر کو جھٹکا دیا تھا۔

''منع کرتا تھا ایسے نہ لپکو انگارے کی طرف۔ جل جاؤ گی، فنا ہوجاؤ گی۔ مگر نہیں سمجھیں' خوشبو میں لپٹے پوزیشن ہولڈر...... لٹوں اور شکل پر پیسہ لگانے والے نئے، نئے پروفیسرز تم لڑکیوں کو آئیڈیل نظر آتے ہیں اور پھر اسی تصوراتی خاکوں کے پیچھے تم بیوقوف لڑکیاں اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہو۔ اپنے ماں باپ کی عزتوں سے کھلواڑ کرتی ہو، اپنے بھائیوں کی جوانیوں پر تم کو ترس نہیں آتا، ماؤں کے سفید بالوں کا خیال نہیں آتا۔ دو دن کی جھوٹی محبت تم کو سالوں پرانی محبتیں بھلا دیتی ہے۔ میں تم سب پر افسوس کرتا ہوں۔ میں تم سب پر فاتحہ پڑھتا ہوں۔'' سر عارف کی آواز بھیگ گئی تھی پھر وہ الٹے قدموں مڑے اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

ثنا ان کو آواز دیتی رہ گئی۔

وہ ان کے پیچھے پچھتاوؤں کے دہکتے الاؤ میں بھڑ بھڑ

☆☆☆

فروری کا اواخر چل رہا تھا اسی لیے سردی بھی کافی زیادہ تھی، سستی بھی اسی باعث جسم میں سرایت کر رہی تھی، ثنا نے نماز فجر پڑھی اور کپڑے پریس کر کے اس نے بیڈ پر ہی رکھے تھے طبیعت بوجھل سی تھی۔ بال ویسے ہی لپیٹ کر جوڑا بنالیا اس نے دوبار کرن کو جگانے کی کوشش کی تھی مگر وہ تو گویا گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔

''اٹھ بھی جاؤ یار اب تو، پوائنٹ آنے والا ہے۔'' اس نے اس پر سے کمبل کھینچا۔

''نہیں جانا۔'' وہ ہنوز اسی طرح لیٹے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں معمول کی طرح سوجی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً اس وقت کسی شدید کرب سے گزر رہی تھی۔ ثنا کے دل کو کچھ ہوا۔

''کیا ہوا کرن! اب تم یونی بھی نہیں جا رہیں؟'' ثنا نے اسے یوں ہی لیٹا دیکھ کر پوچھا۔ ''ایسے تو یہ کبھی اس فیز سے نہیں نکل سکے گی۔'' ثنا نے سوچا۔

''نہیں، میری طبیعت نہیں ٹھیک اسی لیے۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''کیا ہوا ایک دم سے، بخار تو نہیں ہے؟'' وہ فکرمندی سے اس کی جانب آئی۔ کلائی چیک کی۔

''کچھ نہیں ہوا، شاید کل رات بارش میں بھیگی ہوں اسی لیے۔'' اس نے فوراً بہانہ بنایا۔ وہ بہت ست اور بیزار تھی۔

''اوہو، اچھا تم یہ میڈیسن لے لو، ٹھیک ہو جاؤ گی مجھے یونی ضرور جانا ہے، کچھ نوٹس لینے ہیں اور اگر فرحت مل گیا تو اس سے بھی دو، دو ہاتھ کروں گی نہ ملا تو اس کے فلیٹ جاؤں گی۔ میں اسے سستے میں نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے مجھ سے گلناز کے ریلیشن کو کیسے چھپایا؟ وہ اسے بہت پہلے سے جانتا ہے۔ گاؤں سے اور مجھے صرف یہی بتایا کہ وہ یونی فرینڈز ہیں۔ گلناز اور فرحت دونوں نے مجھے دھوکا دیا مگر مجھے گلناز سے کوئی شکوہ نہیں ہے، اوکے اب میں جا رہی ہوں بس پوائنٹ آنے والا ہوگا، اپنا خیال رکھنا اور دعا کرنا کہ میں فرحت

چادر لپیٹ کر چلی گئی۔ وہ شاید کسی فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ کرن نے تھک کر سوچا۔

''کاش میں تمہیں سمجھا سکتی، میں خود تو برباد ہو رہی ہوں پر تمہیں برباد ہونے سے روک بھی نہیں سکتی۔ یہ محبت صرف دھوکا ہے اور فرحت، گلناز کی کہانی تو یونیورسٹی سے بھی بہت پہلے سے چلی اور ختم ہو گئی۔ یہ تو گلناز ہی ..... نہ جانے کس نیت اور کس انتقامی جذبے کے تحت اس نے دوبارہ سے فرحت کے ساتھ اچھے مراسم بنا لیے۔ یہ بات تو اب تک معما ہی رہی کہ گلناز کے ذہن میں فرحت کے حوالے سے کیا منصوبے ہیں؟ اور فرحت کے ساتھ تجدید تعلق کے پیچھے کون سی انتقامی کارروائی ہے۔ بظاہر تو لگتا ہے گلناز نے کچی عمر میں گاؤں کی پگڈنڈیوں پر اٹھلاتی اس البیلی محبت کے مجرم کو معاف کر دیا ہے مگر شاید حقیقت مختلف ہو۔'' کرن کی ذہنی رو بہک گئی اور اس کی سوچوں کا دھارا بھٹکنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ سسکنے لگی تھی۔ اسے اپنی حالت گلناز سے بدتر لگتی تھی۔ کم از کم گلناز اس جیسی اذیت سے تو نہیں گزری تھی۔ فرحت نے جتنا بھی برا کیا کم سے کم اس موڑ پر لا کر اسے دھتکارا نہیں تھا۔

کرن نے اٹھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے آنسو گلے میں اتارے۔ اسے اپنا ماضی بری طرح تکلیف دے رہا تھا۔ سر عامر کے ساتھ گزارہ اِک، اِک پل کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈس رہا تھا۔

☆☆☆

''کہاں رہ گئی تھیں تم؟'' جیسے ہی وہ یونیورسٹی پہنچی ثمرہ نے اسے بری طرح سے لتاڑا تھا۔

''پوائنٹ نکل گیا تھا تو رکشے پر آئی ہوں۔'' وہ سرعت سے بولی۔

''اچھا آؤ ناشتا کر لیں۔''

وہ کینٹین کی طرف آنے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر ثنا کو اچانک بہت سارے منظر یاد آنے لگے تھے۔ کینٹین وہ جب بھی آئی فرحت کے ساتھ ہی آئی تھی۔ ایک دو دفعہ ہی سہی۔ اسے یاد ہے وہ کارنر والی ٹیبل پر بیٹھتے تھے۔

فرحت اس کے روبرو ہوتا تو اس کی بھوک تک مٹ جاتی۔ پتا نہیں کیوں ثنا کو فرحت کی بازگشت مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اسے یاد تھا وہ کرن سے بہت چڑتا تھا اور کرن کے لیے اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔

"تمہاری چچی نہیں آئی آج؟" اس نے کرن کا پوچھا تھا۔ کچھ دن پہلے ہی کی تو بات تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زمانے گزر گئے۔

"وہ چچی نہیں دوست ہے میری، اس کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔" ثنا نے ہمیشہ کی طرح برا مان کے کہا تھا۔ وہ کرن کے لیے یوں ہی الجھ پڑتی تھی۔ اسے یاد تھا فرحت کا انداز خاصا تمسخر اڑاتا تھا۔

"اوہ، افسوس ہوا سن کر۔" اس نے کہا تو ثنا تب ویٹر کو آتا دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ مگر اسے فرحت کی بات بہت ہی چبھی تھی۔

"ویسے ایک بات کہنا تھی تم سے۔" فرحت آرڈر کر کے اس کی جانب متوجہ ہوا تھا اور اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات سے حظ اٹھاتا رہا تھا۔

"ہوں؟" ثنا نے صاف ناراضی دکھانے والے انداز میں کہا تھا۔ اسے یاد تھا وہ دو دن منہ پھُلائے ہی رہی تھی۔ فرحت نے ہنکارا ابھرا تھا۔ اس کے ہنکارے کی آواز اب بھی ثنا کے کانوں میں گونجتی تھی۔

"یہ کرن کیسی لڑکی ہے؟" فرحت کا انداز طنزیہ تھا۔ ثنا چونکی تھی۔

"میں سمجھی نہیں؟ کرن کو آپ ایک سال سے جانتے ہیں، وہ ایک اچھی اور شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔" اسے کرن کی صفائی میں بولنا تب بھی مشکل لگا تھا۔ وہ ناسمجھی سے اسے بتانے لگی تھی۔ اس وقت فرحت کے الفاظ بڑے کاٹ دار تھے۔

"ضروری نہیں شریف گھرانے کی لڑکیاں ہمیشہ ہی اچھی رہیں یا بے عیب ہوں۔ کبھی، کبھی شریف گھرانے کی لڑکیاں وہ کر جاتی ہیں جو اُن کو ساری زندگی پچھتانے پر مجبور کر دیتا ہے۔" اس نے اپنے چہرے کی ہلکی بڑھی شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ ثنا تب بھی سن ہو گئی تھی جیسے اس وقت بھی ٹکر، ٹکر اس لکڑی کی میز کو دیکھتی سن کھڑی تھی۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" اس نے ابرو اچکائی تھی۔ تیکھے چتونوں کے ساتھ وہ برہم نظر آتی تھی۔

"تم یقین نہیں کرو گی میری بات کا۔" اس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا تھا۔

"میں یقین کروں گی آپ بتائیں؟" وہ فوراً بولی۔ اسے لگا کرن کے معاملے میں اس کی ہٹ دھرمی فرحت کو بری نہ لگے۔

"یہ مجھے سر عامر کے ساتھ کچھ زیادہ ہی فرینک دکھائی دیتی ہے اور......"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا ثنا نے ٹوک دیا تھا کیونکہ اس سے تب کرن کی برائی سنی نہیں جا رہی تھی، ہاں کرن کے لیے وہ پکی تھی اور جانتی بھی تھی کہ کرن اور سر عامر کا تعلق ہے مگر پھر بھی اس نے فرحت کے سامنے کرن کا ہمیشہ دفاع کیا تھا۔

"اُف پلیز، وہ ایسی نہیں ہے۔" اس نے بمشکل لہجہ نارمل رکھا تھا۔

"تمہیں کیا پتا؟ تم دونوں ایک یونی میں ضرور پڑھتی ہو مگر ڈیپارٹمنٹ الگ ہیں سو تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا کرتی ہے، کدھر جاتی ہے؟" اس نے ابرو اچکا کر کہا تھا۔

"پلیز...... فرحت، میری دوست ہے وہ...... اب مزید برداشت نہیں کروں گی میں۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی تھی۔ اس سے زیادہ سچائی سننے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

"اوکے ایز یو وش۔" فرحت نے کندھے اچکائے تھے۔ تبھی ویٹر ناشتا لے آیا تو اس نے بہت بے دلی سے ایک سلائس لیا تھا فرحت کی باتوں پر اسے شدید غصہ تھا مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ جیسے اب خاموش تھی شدید خاموش۔ بالآخر ثمرہ کو اسے جھنجوڑنا پڑا تھا۔ پھر ناشتا کرتے بھی وہ غائب دماغ ہی رہی تھی۔ سارا دن غائب دماغی سے یونیورسٹی میں گزار کر وہ فلیٹ پہنچی تو کرن موجود نہیں تھی۔

"اب یہ کہاں گئی؟" ثنا کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ اس نے بیگ بیڈ پر پھینکتے ہوئے سوچا اور اس کا نمبر ڈائل کیا۔

نہ جانے کرن کہاں تھی؟ خراب طبیعت کے ساتھ کہاں نکل گئی؟ ثنا کا سر درد شدید تر ہو گیا تھا۔ اور پھر فرحت کی باتیں سوچتی نہ جانے کب وہ نیند کی وادی میں ڈوب گئی تھی۔

☆☆☆

''تم؟'' سر عامر اسے دیکھ کر چونکے۔ صرف چونکے ہی نہیں بھڑک بھی اٹھے۔ یہ کرن بے جا سر درد بنتی جا رہی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا اسے ہینڈل کیسے کرتے؟ اس سے پیچھا کیسے چھڑواتے؟

''ہاں میں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ آج وہ بڑی بہادر اور بڑی بے خوف نظر آ رہی تھی۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' وہ اسے دیکھ کر بوکھلاہٹ کا شکار ہوئے تھے۔ بوکھلاہٹ، غصہ اور عجیب سی چڑ ہوتی جا رہی تھی۔

''آپ کو مجھ سے نکاح کرنا ہوگا۔'' اس نے گویا حتمی فیصلہ کیا تھا جو انہیں سنا رہی تھی، ان کا دماغ ہی اڑ گیا تھا۔

''نکاح اور تم سے؟'' وہ استہزائیہ ہنسے اور پھر ہنستے ہی چلے گئے۔

''ہاں مجھ سے آپ نے مجھے یوز کیا ہے۔'' وہ چلائی۔ جیسا کہ چلا، چلا کے رونا اس کا مقدر بن گیا تھا۔

''آواز نیچی رکھو، اس کے بدلے میں تمہارے نمبر بھی تو لگے تھے ناں۔'' سر عامر نے اسے آئینہ دکھایا تھا یہ آئینہ انہوں نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا جب دل کرتا اس کے منہ کے سامنے کر دیتے تھے۔ انہوں نے گویا اس کا تمسخر اڑایا تھا۔

''آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔'' وہ روہانسی ہوئی۔ وہ رونے لگی وہ کمزور پڑ گئی تھی۔

''جاؤ بی بی معاف کرو، نہیں کر سکتا میں نکاح تم سے، جسٹ گو......'' وہ دہاڑے تھے انہیں دہاڑنا ہی تھا۔

''میں پریگننٹ ہوں۔'' اس نے گویا دھماکا کیا تھا جیسے اس دھماکے سے مقابل کے پرخچے اڑنے لگیں گے مگر سامنے موجود انسان بہت گھاگ تھا۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہے۔ انہیں ارد گرد دھماکے ہوتے محسوس بالکل نہیں ہوئے تھے۔

''تو جاؤ جا کر اس سے پیچھا چھڑا لو۔'' وہ نظریں چرا کر بولے تھے بہت سکون اور آرام سے جیسے یہ سب معمول کی کوئی بات ہو۔

''پلیز مجھ سے نکاح کر لیں۔'' وہ گڑگڑائی تھی۔ وہ روئی تھی چلائی تھی۔ حتیٰ کہ منت بھی کی۔

''میں تم سے نکاح نہیں کر سکتا، میں آل ریڈی میرڈ ہوں۔'' یقینی طور پہ یہ سوچا ہوا جھوٹ تھا۔

ان کی بات پر وہ چند ثانیے چپ رہی۔ اتنی چپ جیسے کبھی بول ہی نہ سکے گی اتنی خاموش جیسے موت اس پر سایہ کر رہی ہو۔

''اگر آپ نے مجھ سے نکاح نہ کیا تو میں بدنام ہو جاؤں گی، مجھے اگر آپ نے نہ اپنایا تو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی، سب کو بتاؤں گی کہ آپ نے میرے ساتھ کیا، کیا ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی تھی پاگلوں کی طرح۔ مجنونوں کی طرح، دیوانوں کی طرح......

''تو جاؤ جا کر بتاؤ سب کو، اس سے کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، سب الٹا تم پر انگلیاں اٹھائیں گے، بدنام میں نہیں بلکہ بدنام تم ہو گی، اب مرضی ہے تمہاری اور ہاں آئندہ میرے راستے میں مت آنا ورنہ میں ہی بتاؤں گا سب کو کہ تم مجھے ہراس کر رہی ہو۔'' انہوں نے اسے دھمکایا اور بہت سکون کے ساتھ چلے گئے، دروازہ بند ہو چکا تھا جیسے کرن کی زندگی کا دروازہ اس پر بند ہو چکا تھا۔ وہ سر ہاتھوں پر گرا کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔

''اے اللہ میں کیا کروں؟'' اس نے آہ و بکا کی تھی جتنی کر سکتی تھی، اس نے گریہ کیا تھا جتنا وہ کر سکتی تھی، یہ جانے بنا کہ وہ خدا کو کتنا ناراض کر چکی تھی۔ تبھی اس کا موبائل بجا تو وہ ہوش کی دنیا میں آئی۔ ثنا کالنگ دیکھ کر اس نے آنسو پونچھے اور کال پک کی۔ خود کو سنبھال کر دوستوں کو تسلی دینا بھی بڑا امتحان ہے۔ وہ اس امتحان سے گزر رہی تھی۔

''کہاں ہو تم یار؟'' ثنا فکرمندی سے بولی۔

''میں ڈاکٹر کے پاس آئی تھی، آ رہی ہوں واپس۔'' اس نے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

"او کے جلدی آؤ۔" اس نے اتنا کہہ کر کال کاٹ دی تو وہ گھومتے سر کے ساتھ اٹھی۔ اپنے وجود کی کرچیاں سمیٹ کر واپسی کے رستوں پر چلنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ کاش کوئی کرن سے پوچھتا۔ کاش کوئی اس لمحے کرن کو دیکھتا۔ آبلہ پائی اور نارسائی کے زخموں سے چکنا چور ہو کر واپسی کی راہوں پر چلنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔

کاش کوئی اس لمحے جان لیتا اور کاش کرن جیسی کوئی ایک نادان لڑکی سمجھ جاتی اور خود کو اندھی کھائی میں گرنے سے بچا لیتی۔

☆☆☆

"کرن کیا ہوا ہے تمہیں؟" اسے لٹے پٹے کسی ہارے مسافر کی طرح دیکھ کر ثنا کو دھچکا لگا تھا۔ کرن جس طرح فلیٹ میں داخل ہوئی تھی اور جس طرح وہ ٹوٹی بکھری تھی۔ ثنا کو سمجھنے دیر کیا لگنی تھی۔ اسے یوں روتا بلکتا بکھرتا دیکھ کر ثنا تڑپ اٹھی تھی۔

"ک...... کچھ نہیں۔" کرن نے لرزتی آواز میں کہا تھا۔ وہ ہکلا رہی تھی۔ گھبرا رہی تھی۔ خوف زدہ تھی۔ ثنا بھی ڈر گئی۔

"مجھے بتاؤ پلیز۔" وہ فوراً اس کے پاس آن بیٹھی۔ اس کے ہاتھ مسلنے لگی۔ اسے حوصلہ دیتی رہی۔

"کہا ناں کچھ نہیں۔" اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"تمہیں میری قسم ہے بتاؤ، میں کافی دن سے دیکھ رہی ہوں، تم بہت ڈسٹرب ہو، میرا یقین کرو، میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔ کوئی بات ہے تمہارے اندر جو تم بتا نہیں رہیں۔ کیا مسئلہ ہے؟ کیا الجھن ہے؟ کس مصیبت میں ہو؟" اس نے ہاتھ تھام کر اسے تسلی دی تھی۔ پیار سے اس کے بال سہلائے۔ آنسو پونچھے تو وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

"پلیز کرن بتاؤ ناں مجھے۔" اس کے رونے پر خود ثنا بھی غمزدہ ہو گئی۔

"ثنا میں برباد ہو گئی ہوں۔" اس نے تڑپ کر کہا تھا۔

ثنا کی سانس تھم گئی تھی، کرن اسے خوفزدہ سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کے رونے لگی۔ ثنا کو کسی انہونی نے متوحش کر دیا تھا۔

"میں بھائی کی شادی کی وجہ سے پیپر کی تیاری نہیں کر سکی تھی تو میں سر عامر کے آفس میں نمبر لگوانے گئی اور اسی طرح مجھے کئی بار کام پڑا، میں ان کے قریب تر ہوتی گئی' انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں مگر وہ ایک فراڈ تھا، انہوں نے مجھے یوز کیا اور اب میں......" وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ ثنا کو اپنے اوپر آسمان گرتا محسوس ہوا۔ وہ اس کی ادھوری بات کا مطلب اس کی حالت سے ہی سمجھ گئی تھی۔

"کرن کیوں کیا تم نے یہ سب؟ تم اتنا گر کیسے گئیں، فرحت مجھے کہتا رہا مگر میں نہیں مانی اس کی بات اور تم نے مجھے میری ہی نظروں میں......" وہ شاکڈ سی بولتی رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو۔" کرن نے کمزور آواز میں کہا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے منتیں کر رہی تھی۔

"میرے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوگا؟ تم کیسے بھول گئیں کہ تم کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو؟ کیا گزرے گی تمہارے ماں باپ پر جب ان کو پتا چلے گا کہ ان کے یقین کا یہ صلہ دیا ہے تم نے۔" اس نے حد درجہ افسردگی سے بھیگی آواز میں کہا۔

"پلیز بس کر دو...... میں پہلے ہی بہت پچھتا رہی ہوں۔" اس نے روتے ہوئے سر جھکا لیا تھا یہ سر کبھی نہ اٹھنے کے لیے جھک گیا تھا۔

"او میرے اللہ، میں کیا کروں! میں پھر سر عامر سے بات کروں گی اس کا یہی حل ہے۔" ثنا کا دل خوف سے سکڑنے لگا۔

اس نے کمرے کے باہر آ کر گہری، گہری سانس لی، اس خنکی میں بھی اسے اندر گھٹن محسوس ہو رہی تھی، آنکھوں سے پتا نہیں کیوں آنسو بہنے لگے تھے۔ کرن اسے کفن میں لپٹی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سفید جالے بن رہے تھے۔

☆☆☆

یونہی کئی دن گزر گئے تھے، کرن کی طبیعت روز بروز بگڑ رہی تھی، ثنا اس کی طبیعت کی وجہ سے کافی

پریشان تھی۔ اس نے خود کتنی بار سر عامر سے بات کی، انہیں معاملے کی نزاکت بتا کر منتیں بھی کیں مگر وہ کسی صورت نہ مانے، اب وہ اسے کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا سوچ رہی تھی، اس معاملے میں فرحت نے بہت ساتھ دیا تھا۔ ثنا کے دل میں گو کہ رنجش اور غصہ تو تھا مگر وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا۔ کرن کی مدد کے دوران ثنا، فرحت کے زیادہ قریب آ گئی تھی۔ فرحت کی ایک کزن ڈاکٹر تھی۔ فرحت کے فلیٹ پر ہی اس نے کرن کو چیک کر کے میڈیسن تجویز کر دی تھیں یہ پہلا موقع تھا جب ثنا، فرحت کے فلیٹ پر آئی تھی۔ دوسری مرتبہ کرن کی دوائی لینے بھی آنا پڑا تھا۔ فرحت کا فلیٹ ان کے فلیٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ وہ کرن کا مسئلہ اس سے ڈسکس کرنا چاہتی تھی کیونکہ کرن سوائے مرنے کے کسی اور طرف آ نہیں رہی تھی، اس کے پاس ہر مسئلے کا حل خودکشی ہی تھا۔ وہ کرن کی دوا لینے فلیٹ پر آئی تو فرحت شاید فریش ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ کچھ نروس تھی۔ فرحت جلدی ہی آ گیا۔ ثنا کو دیکھ کر وہ کھل اٹھا تھا۔

"زہے نصیب۔" وہ چہکا۔ فرحت اسے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

"میڈیسن کہاں ہیں جلدی دو۔" وہ چونک کر اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"اوہو جلدی کیا ہے۔ مجھے خوش تو ہو لینے دو، ویلکم مائی فیوچر وائف۔" وہ اس کے نزدیک آتے ہوئے شرارت سے بولا۔

"نہیں، مجھے جلدی ہے۔" وہ نروس سی ہو کر بولی تھی۔ فرحت کی بے تابیاں اسے گھبرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

"مجھے فوراً جانا ہے اور ویسے بھی میں ناراض ہوں۔"

"ارے کیسی ناراضی؟" فرحت چونکا تھا۔

"اچھا تو جناب میری دوست گلناز کے ساتھ فلرٹ کرتے رہے اتنا عرصہ اور مجھے کبھی پتا بھی نہیں چلنے دیا، واہ بہت اعلیٰ، اس پر تو تالیاں بجانی چاہئیں۔ اور مجھے خوش ہونا چاہیے۔" وہ اچانک ہی پھٹ پڑی تھی۔ گو کہ یہ موقع نہیں تھا مگر اسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا کرے۔

"جب اس سے فلرٹ کیا تھا تب وہ تمہاری دوست نہیں تھی۔" فرحت نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اور ویسے بھی تب بچپنا تھا، اتنی سمجھ نہیں تھی پھر گلناز بھی سب بھول چکی ہے اور میں بھی۔" فرحت نے بہت سلیقے اور سبھاؤ سے بات سنبھال لی تھی۔ یہاں تک کہ ثنا کے دل سے سارا میل صاف ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اس موقع پر اس نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ فرحت کی احسان مند تھی۔ اس نے جذباتی انداز میں اسے کہانی سنائی تھی۔ ساری بات بتا دی تھی۔ ثنا کو پشیمانی نے گھیر لیا تھا۔

"میں شرمسار ہوں۔ تم پر شک کیا..... مجھے معاف کر دینا۔" اس نے پشیمانی سے کہا وہ اس پر اندھا اعتماد کرتی تھی محبت کرتی تھی۔ سو اب شرمندہ تھی۔

"مجھے بتانا چاہیے تھا، وہ تمہاری دوست تھی، تم کبھی یقین نہ کرتیں بس یہی خوف رہا۔ جیسے ہر چیز کا وقت ہوتا ہے شاید یہ بات یونہی کھلنی تھی، مجھے معاف کر دو۔" اس نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے جوڑے تھے۔

"اُف...... پاگل نہیں بنو، آئی ٹرسٹ یو۔" اس نے فرحت کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھے۔ وہ سرتاپا پگھل گئی تھی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم مجھ پر یقین کرو گی، تھینک یو سو مچ۔" وہ محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا میں چلتی ہوں، کرن کی طبیعت کچھ ناساز ہے سو مجھے جانا ہے۔" وہ بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"کیا یار، میں نے سوچا تھا کہ ہم آج ڈنر باہر کریں گے۔" فرحت بد دل ہوا۔ اسے اتنی جلدی جاتا دیکھ کر وہ دل مسوس رہا تھا۔

"سوری پھر کسی دن۔" وہ چاہتے ہوئے بھی رک نہیں سکی تھی۔ افسردہ دل کے ساتھ نکل گئی تھی۔ پیچھے فرحت حسرت زدہ کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔

"واہ رے معصوم پلس بیوقوف لڑکی، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم اتنی جلدی مجھ پر یقین کر لو گی، ایسے ہی تو تم خوب صورت نہیں لگتی ناں۔" وہ اسے جاتا دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔

"وہ وقت دور نہیں جب تمام فاصلے سمٹ جائیں گے۔" وہ چالاکی سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆

گاؤں سے اچانک امی کا بلاوا آ گیا تھا اتنا اچانک کہ ثنا خود پریشان رہ گئی تھی۔ کرن کی ایسی حالت نہیں تھی کہ اسے چھوڑ کر جایا جاتا۔ گلناز غائب تھی اور باقی دونوں اپنے گھر گئی ہوئی تھیں۔ اب کرن کے پاس صرف ثنا ہی بچی تھی۔ ثنا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کرن کو کیسے بتائے؟

''میں گاؤں جا رہی ہوں، کچھ مجبوری ہے، تم اپنا خیال رکھنا، میں تمہیں بالکل چھوڑ کر نہ جاتی مگر میری امی نے مجھے ارجنٹ بلایا ہے، میرے ابا بڑے سخت ہیں۔ اگر نہ گئی تو مجھے پیپرز بھی دینے نہیں دیں گے۔'' اس نے کرن کو دیکھا۔ جو بہت متوحش اور خوف زدہ لگ رہی تھی اس کی آنکھوں میں عجیب سا ہراس اور سرد پن تھا۔

''واپس آ جاؤ گی؟ اگر تب تک میں نہ ہوئی تو؟'' کرن کے الفاظ نے ثنا کو منجمد کر دیا تھا۔ وہ سخت پریشان ہو گئی۔

''تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گی۔ مجھ سے وعدہ کرو۔ اپنا خیال رکھو گی۔'' ثنا نے پیار سے کہا تھا۔

''ایسے وعدے نہ لو جو پورے نہ کر سکوں۔'' اس نے سر ہلایا۔ اس کے لہجے میں صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔

''پلیز کرن! خود کو سنبھالو۔ سب بہتر ہوگا۔'' ثنا کو اپنی ہی تسلیاں کھوکھلی لگ رہی تھیں۔

''تم خیر سے جاؤ، میری فکر نہیں کرو، میرا تو اب کسی کا سامنا کرنے کو دل نہیں کرتا۔ اس دنیا کا نہ گھر والوں کا، نہ اپنی ماں کا۔'' اس نے بنجر آنکھوں کو مسلتے ہوئے کہا تھا۔ پورے کمرے میں اس کی نقاہت بھری آواز ابھر رہی تھی۔

''تم فکر مت کرنا، میں واپس آ کر تمہارے اس مسئلے کا حل نکالوں گی، سر عامر سے بات کروں گی۔ کچھ تو راہ نکلے گی۔'' وہ اسے بوگس تسلیاں دیتی خود بھی شرمسار تھی۔ جانتی تھی کہ اب کچھ ہونے والا نہیں ہے ... بیگ میں کپڑے ڈالتے ہوئے ثنا کے اپنے لفظ اسے خود ہی پرائے لگ رہے تھے اور کرن ناسمجھی سے سر ہلا رہی تھی جیسے سب سمجھ رہی ہو مگر درحقیقت کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا ہو۔

ثنا کے جاتے ہی کرن پر مُردنی چھا گئی تھی۔ اس نے موبائل پکڑا اور اپنی ماں کو کال کی مگر پھر ساری ہمت نچڑ گئی تھی۔ اس کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔

''مجھ سے وابستہ لوگو! مجھے معاف کر دینا مگر اب مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔ میری ماں! میں مجرم ہوں تمہاری! اپنے بہن بھائیوں کی آپ کی عزت خراب کرنے کی۔ مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ میں اس کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔'' اس نے تکیے کے نیچے سے سلیپنگ پلز نکال لی تھیں۔ بہت مشکل ہوتا ہے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں ختم کرنا...... ہاں بہت مشکل ہے۔ خود اپنی مرضی سے لحد میں اترنا بڑا کٹھن ہے۔ اپنے لیے گڑھا کھود کے اس میں آرام سے لیٹ جانا مگر یہ سب مشکل کام کرن کے لیے آسان ہو رہے تھے۔ اس نے ساری گولیاں نگل لیں۔

''مجھ جیسوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔'' اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ آئی۔ کرن نے موبائل اٹھایا پھر سے حوصلہ جوڑا اور ماں کو کال ملائی تھی۔

''اماں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لگ رہا ہے جان نکل رہی ہے، پلیز آپ آ جاؤ۔'' اس نے تڑپتے ہوئے ماں کو بے بسی سے بتایا تھا دوسری طرف ماں خوف اور غم سے نڈھال ہو گئی تھی۔

''لیکن بیٹا ہوا کیا ہے؟'' ماں کا دل کچلا جا رہا تھا۔ فکر، پریشانی اور کسی انہونی نے ماں کو بے قرار کر دیا۔

''مجھے نہیں پتا میرا دل بند ہو رہا......'' اس نے بھرائی آواز میں کہا تھا۔

''میری سانس بھی بند ہو رہی ہے ماں۔'' وہ بھیگتی آواز میں بول رہی تھی۔ اس کی زبان میں لکنت تھی اور اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔

''کرن...... کرن......''

دوسری طرف اس کی ماں چیخ و پکار کرنے لگی۔ وہ کرن کو پکارتی رہی مگر کرن نام کی روشنی ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔ گدلے پانیوں کے قیدی اپنے بنائے جوہڑ میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گئے تھے۔

☆☆☆

گہر ہونے تک

ثنا گاؤں سے واپس آ چکی تھی۔ کرن کی خودکشی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ یونیورسٹی کی فضا

سوگوار تھی۔ ہر آنکھ نم اور ہر دل غم زدہ تھا۔ کرن کی خودکشی کو صرف ایک خودکشی کیس سمجھ کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے گھر والوں نے کوئی تحقیق نہیں کی تھی اور نہ کیس کی پیروی کی۔ یوں چند دن بعد یہ کیس خود ہی دب گیا تھا۔ کرن نام کا صفحہ کتابِ ہستی سے پھٹ گیا اور ہمیشہ کے لیے تند ہواؤں میں اڑتا ہوا قصۂ پارینہ بن گیا۔

"کرن نے خودکشی کر لی مگر کیوں؟" ہر کوئی خوف زدہ انداز میں دوسرے سے پوچھتا۔ اس "کیوں" کا کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

"کرن مر گئی ہے۔"

"کرن نے خود کو مار ڈالا ہے۔"

"کرن زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔"

"ارے کرن تو بڑی پیاری اور لاڈلی تھی۔ وہ کیسے مر سکتی ہے؟"

"کرن، میری جان کیوں کیا تم نے ایسا؟ میں نے کہا تھا ناں کہ سب ٹھیک کر دوں گی، کاش میں نہ جاتی اس دن......" وہ اس کی کتابوں کو سینے سے لگا کر رونے لگتی۔ اس کے کپڑے، اس کا مگ، اس کے آنسو، اس کی ہنسی سب کچھ اس فلیٹ میں رہ گیا تھا مگر وہ خود نہیں تھی۔ جانے کس دیس کس نگر کس شہر چلی گئی تھی۔

"کرن......" وہ دھاڑیں مار، مار کر رونے لگتی۔ پورے فلیٹ میں بھاگتی، اسے آوازیں دیتی۔ اسے تلاش کرتی۔

کرن کی موت کے بعد فرحت نے جذباتی طور پر اسے بہت سہارا دیا تھا۔ ثنا اس کے بہت قریب ہو گئی تھی۔ اب وہ بہت زیادہ وقت ثنا سے رابطے میں رہتا تھا۔ اس کی فکر کرتا۔ اس کے لیے پریشان ہوتا۔

اس بات کو کافی دن گزر گئے تھے، ثنا کی فیملی بھی کرن کی پُراسرار موت کی وجہ سے خوفزدہ تھی۔ وہ خود بھی حد سے زیادہ ڈسٹرب تھی۔

"کتنا کہا تھا میں نے لیکن تم نے یقین نہیں کیا۔" فرحت نے اسے یاد دلایا۔

"پلیز فرحت، میں آگے ہی بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ دکھی انداز میں گویا ہوئی۔

"اچھا پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"اسے انصاف نہیں ملے گا۔ کوئی مجرم کو نہیں پکڑے گا۔" اس نے آنسو حلق میں اتارے تھے۔ وہ سخت آزردہ تھی۔

"اچھا فی الحال سب چھوڑو، میں تمہیں اس شاندار ہوٹل میں اس لیے لایا ہوں کہ تھوڑی دیر کو سب بھول جاؤ۔" بہت دن بعد وہ فرحت کے ساتھ باہر گھومنے کے لیے آئی تھی۔ اس نے حکمیہ انداز میں کہا تو اس نے سر ہلایا۔ ثنا ویسے بھی فرحت کے اثر میں تھی۔ اس کی قربت کے جادو کا حصار مضبوط تھا۔

"ثنا آئی لو یو سو مچ۔" فرحت آج اسے اپنی... بے پایاں محبتوں کا یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش میں تھا۔ وہ محبت سے کہتا رہا، ثنا بلش کرتی رہی۔

"کیا تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟" وہ آنکھوں میں چاہتیں سجا کے پوچھ رہا تھا۔ محبت کے نام پر ابن آدم، بنت حوا کو کیسے لوٹتا ہے؟ اس سے فرحت کی آنکھوں میں نظر آ رہا تھا۔

"ظاہر ہے فرحت تب ہی تو یہاں بیٹھی ہوں، میری دنیا میری کل کائنات تم ہو ہی، مجھے کبھی دھوکا مت دینا پلیز۔" اس نے جذبوں کی تمام تر شدتوں سے کہا تھا۔

"میری جان تم کیوں سوچتی ہو ایسا، تم بھی میری سانسوں میں بس چکی ہو، بس جلد ہی تمہیں اپنی دلہن بنا کر لے جاؤں گا، ایک ایسی دنیا میں جہاں صرف فرحت اور ثنا ہوں گے۔" وہ پلاننگ کرنے لگا تو ثنا بلش کر گئی۔ یہ پلاننگ سنہرے خوابوں کی کہکشاؤں جیسی تھی۔ جہاں رنگ، ہوا، خوشبو، بادل اور رونق تھی۔ محبت اور خوشی تھی۔ ثنا نہال ہو رہی تھی۔ ثنا قربان ہو رہی تھی... وہ ثنا اس وقت خود کو روئے زمین کی سب سے حسین لڑکی سمجھ رہی تھی۔

☆☆☆

امتحانات سولی کی طرح گزر رہے تھے۔ ثنا کی ماں گاؤں سے آ گئی۔ جب تک امتحان چلتے رہے سائے کی طرح ساتھ رہی۔ اِک لمحہ بھی ماں کے لیے بھاری رہتا جب تک ثنا کی صورت نہ نظر آتی۔

امتحان ختم ہوئے تو ثنا اور اس کی ماں کو اس کا بھائی لینے آیا اور وہ گاؤں چلی گئی۔ گاؤں میں اس دفعہ حالات اور تھے۔ ہر کوئی کرن کی موت کا واقعہ سننا چاہتا تھا۔ کچھ دکھ سے اور کچھ چسکوں کے خیال سے۔

ثنا کی پھوپی کیوں پیچھے رہتی؟ سو تازیانے مارنے میدان میں آگئی۔

''لڑکی کاہے کو مر گئی؟ سنا ہے اس وقت اس موئے ہاسٹل میں کوئی نہیں تھا؟ لڑکی کو مرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ مجھے تو قتل کی واردات لگتی ہے۔'' پھوپی رات تک قیافے لگاتی رہی۔ ثنا کے زخم بھنبوڑتی رہی۔

''یا کسی چکر میں پڑ گئی ہوگی۔ لڑکیوں سے آزادی ہضم نہیں ہوتی۔ اسی لیے تو میں نے اپنے بھرا سے کہا۔ بٹی کو بلا اور دو بول نکاح کے پڑھا۔ عزت اسی میں ہے۔'' پھوپی نے اپنے موٹے ہاتھ نچا کر کہا تھا۔

ثنا جیسے سہم گئی تھی۔

پھوپی اور آگے پیچھے والوں کی باتوں نے ثنا کو مزید افسردہ... کر دیا تھا، اپنے ہی تو ہوتے ہیں جو دل دکھاتے ہیں ورنہ غیروں کو کیا خبر دل کس بات پر دکھتا ہے، لوگ تو بس منہ سے لفظ نکالتے جاتے ہیں، یہ جانے بنا کہ کوئی کیسے سہے گا۔ جب اپنی باری پر کچھ سہنا پڑے تو درد سے بلبلا اٹھتے ہیں۔

''کاش کرن تم نے ہوش کے ناخن لیے ہوتے تو یہ سب نہ ہوتا، مجھ پر کچھ کم نہیں بیت رہی ہے تو تمہارے گھر والوں کا کیا حال ہوگا؟ کیسے، کیسے سوالات پوچھیں ہوں گے لوگوں نے ان سے، کیا کہا ہوگا انہوں نے، لوگ کہاں لحاظ کرتے ہیں کہ کسی کی جوان بٹی مر گئی ہے، ان کو تو بس مزے لینے کے لیے کوئی ٹاپک چاہیے ہوتا ہے۔ کبھی، کبھی سوچتی ہوں کہ لوگ دوسروں کو جلدی سے جہنم کا فارم پکڑا دیتے ہیں جیسے ان کے ہاتھ میں جنت میں جانے کا حتمی سرٹیفکیٹ ہو۔'' وہ آزردگی سے چھت کو گھورتے ہوئے سوچ رہی تھی، آنسو آنکھوں سے بہہ کر کانوں کی لو سے ہوتے ہوئے گردن کی طرف جا رہے تھے، آنکھیں جل رہی تھیں، حساس تو وہ پہلے سے ہی تھی مگر اب پھوپی کی باتوں نے اسے مزید سوچنے پر مجبور کر دیا تھا، چاہ کر بھی وہ

ان سوچوں کے بھنور سے خود کو نہیں نکال پا رہی تھی، دن سے رات اور رات سے صبح ہو جاتی تھی مگر وہ گم صم سی تھی، کرن اس کی بہت اچھی دوست تھی جو ایک زندہ دل لڑکی تھی شاید وقت سے پہلے مر جانا تھا تب ہی وہ ذرا، ذرا سی چیز کو بھی کھل کر انجوائے کیا کرتی تھی۔

"کیسے سکون میں رہو گے آپ سر عامر، آپ تو استاد کہلانے کے لائق بھی نہیں ہیں، کاش میں آپ کا گھناؤنا روپ سب کے سامنے لا سکتی، کاش سب کو بتا سکتی جس کو آپ آئیڈلائز کر رہے ہیں وہ انسانی روپ میں بھیڑیا ہے۔ جس نے ایک معصوم سی لڑکی کو پیار کا جھانسا دے کر اس کی دنیا ہی نہیں آخرت بھی تباہ کر دی ہے، آپ کی وجہ سے کتنی ہی کرنیں روشنی کی تابناک کرن بننے کے بجائے وقت سے پہلے بجھ جاتی ہوں گی، کب تک معاشرے میں آپ جیسے درندے آزاد گھومیں گے اور معصوم لڑکیاں آپ کے پیار کے جھانسے میں آ کر برباد ہوا کریں گی۔" اس کے لہجے میں صدیوں جیسی تھکن اتر آئی، چہرہ رو، رو کر اور سوچ، سوچ کر زرد ہو چکا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرن کو کھو چکی ہے۔

"ثنا بیٹا!" امی کمرے میں آئیں تو اسے ملگجے حلیے میں دیکھ کر گویا تڑپ گئیں یہ تو ہر وقت تک سک تیار رہنے والی ثنا تھی ہی نہیں۔

"جی۔" اس کی نقاہت بھری آواز کمرے میں ابھری۔

"بیٹا یوں غم منانے سے کچھ نہیں ہوگا، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے، مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جا سکتا اس لیے اٹھو اور جا کر نہاؤ، باہر نکلو سب میں اٹھو بیٹھو تب ہی اس کے غم سے نکلو گی۔" امی نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا، یہ جانے بنا کہ جانے والی سے ان کی بیٹی کتنی اٹیچڈ تھی، اس کو وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی، یہ غم اسے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا کہ کاش وہ نہ آتی اس دن اسے چھوڑ کر......نہ آئی ہوتی۔

"ثنا دیکھو لوگوں کو باتوں کا موقع نہ دو، جاؤ کپڑے بدلو، دو دن سے اسی حلیے میں ہو۔" امی نے پھر کہا تو اس نے خالی نظروں سے ان کو دیکھا، اس نے سر ہلایا اور کپڑے الماری سے نکال کر باتھ روم کی طرف چلی گئی کیونکہ وہ فی الحال کسی سے بھی بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ فریش ہو کر باہر نکلی تو گیلے بال تولیا سے خشک کر کے کمر پر کھلے ہی چھوڑ دیے اور صحن میں رکھے تخت پر آن بیٹھی، اسے بیٹھے چند ہی لمحے ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کسی کی بات مزید سننے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ اس لیے جلدی سے جوتا پاؤں میں پہن کر صحن میں لگی ہوئی سیڑھیوں سے ہی اوپر چھت پر چلی گئی۔ کبھی یہ گاؤں اس کی جان ہوا کرتا تھا مگر آج اسے یہ ایک عام سی جگہ لگی۔ بہار کا موسم آ رہا تھا، کوئل کی کوک ایک خواب ناک سا ماحول بناتی تھی، کبھی اسے یہ کوک بہت پسند تھی وہ سہیلیوں کے ساتھ جا کر پھول توڑا کرتی تھی... ہاسٹل جانے کے بعد سے وہ تو مکمل طور پر بدل گئی تھی، اسے اب یہ گاؤں قید خانہ لگتا تھا کیونکہ اسے شہر کی فضا بھا گئی تھی، اب چاند کی چاندنی کے بجائے شہر کی مصنوعی روشنیاں دل کو بھاتی تھیں، اب اسے گاؤں کی پُرسکون فضا میں وحشت ہوتی تھی جبکہ شہر کے شور کی اس کو عادت ہو گئی تھی، گاؤں کی ٹھنڈک اور تازہ ہوا کے بجائے شہر کی آلودہ ہوا گویا اس کو راس آ چکی تھی۔

"کاش مجھے گاؤں واپس نہ آنا پڑتا۔" اس نے زمینوں پر اگی چھوٹی، چھوٹی گھاس کو دیکھا جو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"کیا ہے یہاں؟ کچھ بھی تو نہیں وہی پرانی سوچ ہے لوگوں کی۔" اس نے نخوت سے سر کو جھٹکا اور صاف و شفاف آسمان کو دیکھا جہاں شام ہوتے ہی پرندے گھروں کو جا رہے تھے۔

"کب میری فرحت سے شادی ہو گی اور میری اس گھٹن زدہ ماحول سے جان چھوٹے گی۔" اس نے تازہ ہوا میں گہری سانس لیتے ہوئے سوچا ہلکی، ہلکی ہوا اس کے آدھ گیلے بالوں کو ہوا میں اڑنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"کیا ابا فرحت کے لیے مان جائیں گے؟ پھوپی بہت ہنگامہ کریں گی، مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ فضول رسمیں کیوں رکھی گئی، آج کل کے زمانے میں کون جاہل ہو گا جو بچوں کے رشتے بچپن میں ہی طے کر دے گا۔"

اس کو اب یہ سب رسمیں پیروں کی بیڑیاں لگنے لگی تھی، کافی دیر وہ اِدھر اُدھر ٹہل کر سوچ بچار کرتی رہی کہ اماں کو کیسے بتائے گی۔

''آپی آپ کا فون کب سے بج رہا ہے؟'' وہ سوچوں میں بری طرح غرق تھی جب اس کا بھائی فون لے کر آیا وہ بری طرح چونکی اور نا سمجھی سے موبائل پکڑا، وہاں فرحت کی کئی مسڈ کالز تھیں، اس نے فرحت کا نمبر ''کرن 2'' کے نام سے سیو کیا ہوا تھا۔ دل میں پھر سے ٹیس اٹھنے لگی۔

''کرن۔'' اس کی سسکی ابھری۔ موبائل کی چنگھاڑتی آواز نے اسے ہوش کی دنیا میں لا پٹخا، اس نے آنسو پونچھ کر کال پک کی، فرحت کے لیے اسے مسکرانا تھا کیونکہ وہ کرن کے ذکر پر چڑتا تھا۔

''کیسی ہو؟ کہاں تھیں؟ کب سے کال کر رہا تھا میں تمہیں، گاؤں گئی ہو یا پیرس جو جا کر بھول گئی ہو؟''

اس نے کال پک ہوتے ہی طنز کے تیر برسائے، اس کے ان رویّوں کی تو وہ عادی ہو چکی تھی، فرحت کے طنز سہنا تو گویا اس کی محبت تھی، انا اور عزتِ نفس کو کچل کر وہ محبت کو بچا رہی تھی، کاش کبھی ایک پل کو تو سوچتی کہ کیا محبت کرنے والے یوں طنز کرتے ہیں، یوں دل توڑتے ہیں مگر وہ محبت ہی کیا جو اندھی نہ ہو، آنکھیں کھلنے کے لیے کسی شدید ٹھوکر کی ضرورت ہوتی ہے، دنیا کی ہر چیز ٹھوکر پر گرتی ہے جبکہ انسان واحد چیز ہے جس کی آنکھیں ٹھوکر لگنے پر ہی کھلتی ہیں۔

''سوری، وہ فون نیچے تھا، میں چھت پر تھی، ابھی گڈو دے کر گیا ہے۔'' اس نے آنسو حلق میں اتارتے ہوئے بتایا۔

''تم چھت پر کیا کر رہی ہو؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا، ثنا کو شدید برا لگا مگر کر بھی کیا سکتی تھی۔

''ویسے ہی اندر طبیعت بوجھل ہو رہی تھی اسی لیے۔'' اس کی آنکھیں بھیگی۔

''اچھا، یہ بتاؤ کب واپس آ رہی ہو؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''فرحت میرے پیپرز ہو چکے ہیں، اب آنا اتنا آسان نہیں ہے بلکہ ناممکن سا ہے کیونکہ ابا بہت سخت ہیں اور اب تو اماں بھی کرن والے حادثے کی وجہ سے کبھی نہیں مانیں گی۔''

اس نے دبے لفظوں میں اسے کچھ پیغام دیا تھا کہ کوئی رشتہ بنا لو ورنہ ملنا آسان نہیں ہے۔ محبت کرنے والے تو نکاح کرتے ہیں یوں ڈیٹ پر نہیں جاتے مگر یہ بات ثنا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''ایک تو یہ کرن بھی ناں گلے کا طوق بلکہ جان کا عذاب بن گئی ہے، مر کر بھی جان نہیں چھوڑ رہی۔'' فرحت نے نخوت سے سر جھٹکا، ثنا کا دل مٹھی میں آ گیا، وہ چاہ کر بھی کرن کا دفاع نہ کر پائی، اسے یہ تک نہ کہہ سکی کہ مردہ لوگوں کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

''تم رشتہ بھیج دو۔'' اس نے ایک بار پھر انا کو مارا۔

''اچھا۔ کال آ رہی ہے جنید کی، رات کو کال کروں گا۔'' انداز صاف جان چھڑانے والا تھا، ثنا کو محسوس ہوا تھا مگر ہر بار کی طرح اپنا وہم ہی سمجھا تھا، یہ جو محبت کرنے والے ہوتے ہیں ناں یہ بڑے بھولے ہوتے ہیں، محبوب کی ہر بات کو خود سے ہی کوئی ادا سمجھ لیتے ہیں۔

''کیسے مناؤں گی اماں کو؟ یا اللہ کوئی راہ دکھا دے، میں فرحت کے بنا نہیں رہ سکتی۔'' اسے جب کوئی راہ سجھائی نہ دی تو چھت پر بنی چار دیواری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور رب سے مدد مانگنے لگی اور بے شک اللہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے، ہم بہتر کی تلاش میں ہوتے ہیں اور وہ ہمیں بہترین سے نواز دیتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم اس وقت اس کی مصلحت نہیں سمجھتے۔

☆☆☆

ثنا کی آنکھ کھلی تو کمرے میں کافی روشنی تھی، آنکھیں کھولیں تو کھڑکی سے چھن، چھن کرآتی روشنی اتنی تیز تھی کہ اس کی آنکھوں میں چبھی تھی۔ وہ فوراً آنکھیں بند کر گئی اور انگلیوں کو آنکھوں پر رکھ کر دھیرے، دھیرے آنکھیں مسلنے لگی... چند لمحے بعد اس نے آنکھیں مسل کر کھولیں تو آنکھیں روشنی سے مانوس ہوئیں، اس نے

سستی سے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر جمائی لیتے ہوئے ٹائم دیکھا تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اس نے بال سمیٹ کر کیچر میں مقید کیے۔

''او'' اتنا سوئی میں۔'' اسے حیرانی ہوئی تھی کیونکہ اسے تو صبح خیزی کی عادت تھی۔ کسلمندی سے اس نے پاؤں کو کمبل سے آزاد کر کے جوتوں میں مقید کیا۔ دوپٹا اٹھا کر گلے میں ڈالا اور واش روم میں گھس گئی۔ وہ فریش ہو کر باہر آئی، ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ اس پر بہت بھی بہت رہا تھا، وہ بالوں کو کھلا چھوڑ کر دوپٹا گلے میں ڈال کر باہر آئی تو سارا صحن دھوپ سے روشن تھا۔ چونکہ ابھی ٹھنڈک ہی تھی اسی لیے دھوپ بہت بھلی اور سکون آور تھی۔ سارا گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ امی اسے کسی کام کا نہیں کہتی تھیں کہ ان کاموں کو ساری عمر پڑی تھی، امی صحن میں ہی تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں، تازہ سبزی آگے ٹوکری میں پڑی ہوئی تھی گویا اب لنچ کی تیاری کی جارہی تھی۔

''اٹھ گئی میری بچی۔'' امی نے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ مسکراتی ہوئی، سر ہلاتی ان کے پاس آئی اور لاڈ سے بانہیں ان کے گلے میں ڈال کر ان کے چہرے پر بوسہ دیا۔

''چائے بناؤں تمہارے لیے اور دیسی گھی کے پراٹھے؟'' انہوں نے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں امی، میں بس کافی پیوں گی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھی۔

''کیا پیتی ہو تم یہ کڑوا قہوہ، گھر میں دودھ پڑا ہے کھلا وہ پیو، جب گئی تھیں کتنی صاف رنگت تھی اب دیکھو۔'' انہوں نے اسے گھورا۔

''ہا...... ہا امی اسی سے تو یہ آنکھیں کھلیں گی، فکر نہ کریں یہاں ہی ہوں خوب کھلا، پلا لیجیے گا۔'' وہ ہنستے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

''اللہ میری بچی کے نصیب اچھے کرے آمین۔'' انہوں نے دل سے دعا مانگی۔ وہ کافی بنا کر ان کے پاس آ کر بیٹھی اور باتیں کرنے لگی۔

''امی میں گھر بیٹھے، بیٹھے تنگ آ گئی ہوں، پڑھنے کو بھی کچھ نہیں ہے اس لیے آج میں باہر جاؤں گی، کھیتوں کی طرف۔'' اس نے کافی کا سپ لے کر ان کو دیکھا جو اب آلو کاٹ رہی تھیں۔

''نہیں ابھی نہ جاؤ بیٹا۔'' وہ انکاری ہوئیں، پھوپی کی سخت اور شکی فطرت سے اچھی طرح واقف تھیں، وہ ثنا کی حساس طبیعت سے بھی واقف تھیں۔

''پلیز امی، سچ میں گھر میں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی، پلیز مان جائیں ناں۔'' اس نے منہ بنا کر اجازت چاہی، آنکھیں بھی سوالی بنی ہوئی تھیں، امی نے اپنی خوب صورت بیٹی کو دیکھا اور تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ مان گئی تھیں اور ساتھ کافی نصیحتیں کرنے لگیں۔

''دھیان سے جانا بیٹا، پتا تو ہے لوگوں کا، ہر چیز میں ہی عیب نکالتے ہیں، کوئی ڈھنگ کے کپڑے پہن کر جانا اور ہاں چادر بھی لے جانا۔'' امی نے ساتھ ہی نصیحتیں بھی جاری رکھیں، ماں تھیں تو طرح طرح کے وہم بھی دل میں آ رہے تھے۔ کرن والے حادثے نے انہیں پہلے سے بھی زیادہ ڈرا دیا تھا۔ سب یہی کہتے کہ اس کی دوست تھی اور وہ اندر سے خوش بھی تھیں کہ وہ کرن والے ڈپریشن سے باہر نکلنا چاہ رہی تھی۔

''اسی لیے تو یہ گاؤں چھوڑ جانا چاہتی ہوں..... جلد از جلد، ایک ایسی جگہ چلی جاؤں گی جہاں مجھے کسی قسم کی کوئی فکر نہ ہو گی، فرحت تو بھی منع نہیں کرے گا۔''

ایک خوشگوار مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا، سہانے سپنے تپتی دھوپ میں بارش کی بوندوں جیسے ہوتے ہیں۔

''سن رہی ہو ناں؟''

امی نے اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ پوچھا۔

''جی، جی امی، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔'' اس نے چونک کر سر ہلایا اور کافی کا کپ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔

''واپس آئے گی تو ہی بتاؤں گی کہ ہم جلد ہی عادل اور اس کی شادی کرنے کا فیصلہ لے چکے ہیں۔'' امی نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے سوچا۔

اختتامی حصہ اگلے ماہ

وہ ایک خوشحال لوگوں کی بستی تھی۔ صاف ستھری دو رویہ درختوں کی قطاروں سے سجی سڑکیں اور ہر طرح کی ضروریاتِ زندگی اور آسائشوں سے مزین خوشنما بنگلے، مناسب فاصلے پر کوڑادان رکھے ہوئے تھے اور گھروں کے گیٹ پر رنگ برنگے خوب صورت پھولوں سے سجے گملے رکھے تھے لہٰذا کالونی دن بھر چمکتی اور مہکتی رہتی۔ تین چار سو بنگلوں پر مشتمل اس آبادی کی حفاظت کے لیے ایک طویل القامت چار دیواری تعمیر کی گئی تھی جس کے گیٹ پر ہمہ وقت دو چوکیدار متعین ہوتے جو مکمل جانچ پڑتال کے بعد ہی کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت دیتے۔ بستی میں زیادہ تر سناٹا چھایا رہتا۔ صرف گھریلو ملازمین، پلمبر اور الیکٹریشن وغیرہ ہی پھرتے نظر آتے کیونکہ مکین تو گھروں سے ہی اپنی بڑی، بڑی گاڑیوں میں سوار برآمد ہوتے اور تیزی سے اپنی منزل کی جناب روانہ ہوجاتے البتہ شام کو کچھ لوگ واک کرتے نظر آتے۔

کمرا رنگ برنگے غباروں، ڈھیروں آرائشی اشیا اور طرح، طرح کی لائٹوں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ سنہری شیروانی، اسی کی ہم رنگ ٹوپی اور خوب صورت کھسے میں ملبوس تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑی میز پر تین منزلہ کیک رکھا ہوا تھا جس کے اطراف میں گفٹ سجے ہوئے تھے۔ چاروں طرف کھڑے اس کے دوست اور رشتے دار تالیاں بجا، بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ وہ پھونک مار کر موم بتی بجھا چکا تھا۔ جیسے ہی

ماں سی

شاہدہ ذاکر



اس نے مسکراتے ہوئے کیک کاٹنے کے لیے چھری آگے بڑھائی تو تیز سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا نشہ کر کے سو رہے ہو جو آنکھ ہی نہیں کھل رہی؟ کب سے انتظار کر رہی ہوں مگر نواب صاحب کا آرام ہی ختم نہیں ہو رہا۔ فوراً کچن میں آؤ بچوں کو اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔'' کسی نے بے دردی سے ٹانگ کھینچ کر اسے خوابوں کے جزیرے سے حقیقت کی سنگلاخ وادی میں لا پٹخا۔ بے آواز دو آنسو اس کے نرم گرم رخساروں پر لڑھک آئے جنہیں اپنے ننھے منے ہاتھوں سے رگڑتے ہوئے وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ وہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا تھا تو بے جا نہ ہوگا...... اپنے والدین کا اکلوتا، لاڈلا، آنکھوں کا تارا، ان کے جینے کی وجہ...... صدف اس کی پیدائش پر کسی اندرونی پیچیدگی کا شکار ہو کر ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھیں۔ لہٰذا وہ والدین کی تمام تر محبت کا بلاشرکت غیرے حقدار ٹھہرا جو دن رات اس پر بن موسم برسات کے مانند برستی رہتی۔ اس کی ہر فرمائش ہونٹوں سے نکلتے ہی پوری ہو جاتی۔ چار سال کی عمر میں اس کا شہر کے بہترین اسکول میں داخلہ کرادیا گیا جہاں اپنی بھولی صورت اور خداداد ذہانت کی بدولت وہ اساتذہ کا بھی منظور نظر بن گیا۔

نامانوس سے شور سے اس کی آنکھ کھلی۔ اپنے بیڈ روم میں اسد انکل اور آنٹی کو دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ اس کے پاپا کے نہایت قریبی دوست تھے لیکن اتنی رات گئے تو وہ کبھی نہیں آتے تھے اور ویسے بھی وہ ہمیشہ ڈرائنگ روم سے ہی گپ شپ کے بعد رخصت ہو جاتے تھے اسے یاد آیا کہ ممی، پاپا رات کو کسی شادی میں شرکت کرنے گئے تھے اور چونکہ اسے صبح اسکول جانا تھا اس لیے اسے گھر میں بوا کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ ہاجرہ بوا ان کی پرانی ملازمہ تھیں جو گھر کے کام کاج اور عمر کی دیکھ بھال میں ممی کی مدد کرتی تھیں۔ وہ شروع سے ہی ان کے ساتھ تھیں لہٰذا گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر آنٹی نے لپک کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور زار و قطار رونے لگیں۔

''کیا کر رہی ہو؟'' انکل نے انہیں گھر کا۔ ''بچہ پریشان ہو جائے گا۔''

''یا اللہ یہ کیا ہو گیا......؟ اس ننھی سی جان کا کیا بنے گا۔ اسد ہم...... اتنی بڑی بات اس سے کیسے چھپا سکتے ہیں۔'' یہ سن کر انکل کے لیے بھی اپنے آنسوؤں پر بند باندھنا مشکل ہو گیا۔ کچی نیند سے بیدار ہو کر ناقابل فہم صورت حال نے اسے گنگ کر دیا اور وہ سکتے کی حالت میں ٹکر ٹکر ان کی صورت تکنے لگا۔

اور اس کا سکتہ تب ٹوٹا جب ایمبولینس تیزی سے ہارن بجاتے ہوئے گیٹ پر رکی اور اس کے ممی، پاپا کے خون آلود وجود اندر لائے گئے تو ننھی سی جان اس پہاڑ سے غم کا بوجھ نہ سہار سکی اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر وہ ہاجرہ بوا کے بازوؤں میں جھول گیا۔ پھر یہ بیہوشی کے وقفے طویل ہوتے گئے۔ جب بھی آنکھیں کھولتا ہاجرہ بوا کا متفکر چہرہ اپنے آس پاس دکھائی دیتا۔ کبھی ٹمپریچر چیک کرتے ہوئے، کبھی کوئی دوائی دیتے ہوئے اور کبھی کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کرتے ہوئے۔ دھیرے، دھیرے جب حواس نے کچھ کام کرنا شروع کیا تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

''بھائی جان میرے حالات تو آپ کے سامنے ہیں۔ آمدنی محدود ہے اور اخراجات لامحدود...... میں تو اپنا ہی کھینچ تان کر پورا کر رہا ہوں، معذرت خواہ ہوں مجھ سے تو آپ کوئی امید نہ ہی رکھیں۔'' اس کے چچا بولے۔ اس کے والد کے دو بھائی اور ایک ہی بہن تھیں جو قریبی شہروں میں رہائش پزیر تھے اور اب ایک جان لیوا ایکسیڈنٹ میں ان کی دائمی جدائی پر یہاں موجود تھے۔ پہلے بھی کبھی کبھار ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی جس کی خوشگوار یادیں اس کے ذہن میں تازہ تھیں لیکن اب والدین کی عدم موجودگی اپنوں کے رویوں میں زمین آسمان کا فرق لا چکی تھی۔ وہ جو سب کا لاڈلا چہیتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اب ایک ناگوار بوجھ بن چکا تھا۔ جس سے ہر کوئی پہلو تہی کر رہا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ پانچ، چھ سال کے بچے کو تنہا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس کے ننھیال میں تو صرف ایک خالہ تھیں جو

گزشتہ دو برس سے امریکا میں مقیم تھیں۔ نانا، نانی تو راہیِ ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ دسویں کے ختم کے بعد اس کی ذمے داری اٹھانے کا معاملہ زیرِ بحث تھا۔ وہ چپ چاپ ہاجرہ بوا کی گود میں دُبکا سب کو تک رہا تھا۔ پھپو کا دل اس کی حالت پر کٹ رہا تھا۔ صدف ان کے لیے صرف بھابی ہی نہیں بلکہ دوست اور بہن تھیں۔ اپنے بھائی کے چمن کے اس خوشنما پھول کو وہ اپنے کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہتی تھیں لیکن جوائنٹ فیملی اور پھوپا کے اکھڑ مزاج کے باعث خاموش تھیں۔ بالآخر قرعۂ فال تایا ابو کے نام نکلا جو انہیں طوعاً و کرہاً قبول کرنا پڑا۔

زندگی کا نیا دور زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں کھرچنے کا باعث بنا۔ گھر اور رزق میں جس قدر کشادگی تھی دلوں میں اتنی ہی تنگی تھی اور اس کی وجہ تھیں ثمینہ آنٹی...... (جنہیں اب وہ بڑی امی کہنے لگا تھا) کی چھوٹی بہن روبی جسے اپنی دیورانی بنانے کا خواب وہ مدت سے دل میں پالے بیٹھی تھیں۔ دراصل شادی ہوتے ہی وہ اپنے منجھلے دیور کو بے حد پسند کرنے لگی تھیں۔ اونچا، لمبا، گورا چٹا، مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ دانیال انہیں اپنی لاڈلی بہن روبی کے لیے بہترین انتخاب لگا۔ دھیرے، دھیرے انہوں نے اپنے شوہر کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ ابھی ساس، سسر سے بات کرنے کا مرحلہ باقی تھا کہ دانیال نے اپنی کلاس فیلو صدف سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ ان کی خوشی کی خاطر والدین اس کے گھر گئے اور وہ انہیں اس قدر بھائی کہ رشتہ دے کر ہی اٹھے۔ بڑی امی کے خواب چکنا چور ہو گئے اور یہ ان ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں تھیں جو عمر کو زخمی کر رہی تھیں۔

تایا ابو گھر میں اس کے واحد ہمدرد تھے لیکن وہ صبح کے گئے شام ڈھلے واپس آتے۔ رات کا کھانا وہ ان کی موجودگی میں سب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر کھاتا۔ دن بھر اس کے ساتھ گھر میں کیسا رویہ روا رکھا جاتا اس سے وہ بے خبر تھے۔ اس کی ضروریات پوری کر دینا، سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دینا یا دو چار پیار بھری باتیں کر لینا ان کے ضمیر کو مطمئن کر دیتا۔ اس سے زیادہ کی انہیں فرصت تھی اور نہ ہی وہ ضرورت محسوس کرتے۔ ان کے خیال میں تائی امی اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں۔

اور یہی ان کی غلط فہمی تھی۔ گھر میں اس کی حیثیت ایک معمولی ملازم کی سی تھی۔ بچا کھچا کھانا اور کزنز کے پرانے کپڑے اس کے حصے میں آتے۔ ویسے تو ذیشان اس سے تین سال بڑا اور کامران ہم عمر ہی تھا لیکن ماں کی ہدایت پر وہ اس سے دور۔۔ ہی رہتے۔ گڑیا ابھی صرف دو سال کی تھی۔

وہ گرمیوں کی ایک روشن صبح تھی۔ بچے تیزی سے اسکول کی تیاری کر رہے تھے۔

”ممی میں انڈا پراٹھا کھاؤں گا۔“ ذیشان نے فرمائش کی۔ کامران بریڈ، مکھن، جیم اور جوس پسند کرتا تھا۔ ان کا اسکول گھر سے کافی دور تھا اور وین پورے 7 بجے آ جاتی تھی۔ عمر اس وقت گڑیا کو بہلاتا جو رو، رو کر ماں کا کام کرنا مشکل کر دیتی یا اگر وہ سو رہی ہوتی تو کچن اور کمروں سے بھاگ، بھاگ کر انہیں چیزیں لا کر دیتا۔

”لو بھئی اب تم ہی ٹھونس لو میرے بچے تو بھوکے چلے گئے۔“ اس نے دیکھا پلیٹ میں ٹھنڈا انڈا پراٹھا رکھا تھا جو ذیشان جلدی کی وجہ سے چھوڑ گیا تھا۔ عمر پراٹھا کھانے کا بالکل عادی نہیں تھا لیکن اب تک وہ حالات سے سمجھوتا کر چکا تھا لہٰذا اسے ہی غنیمت جان کر چھوٹے، چھوٹے لقمے لینے لگا۔ تائی امی کا رویہ لوگوں اور تایا ابو کے سامنے اچھا ہوتا لیکن تنہائی میں وہ یکسر مختلف شخصیت میں تبدیل ہو جاتیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ اس کے منہ کا نوالا بھی چھین لیں۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں تھا۔ ان کا گھر اور پاپا کا بینک بیلنس اس کی کفالت کرنے کے باعث تایا ابو کے حصے میں آ گیا تھا لیکن وہ تو ابھی اتنا معصوم تھا کہ ان نزاکتوں کو جانتا ہی نہیں تھا۔ دنیا دکھاوے کو اسے ایک معمولی سے اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا جو گھر سے پانچ منٹ کی پیدل مسافت پر تھا پھر بھی ہر آئے گئے کے سامنے اس کی پرورش کرنے کا احسان جتایا جاتا۔

”بہن ہمارے آگے بھی اولاد ہے۔ خدا ایسا وقت کسی پر نہ لائے۔ دوسرے بہن بھائی تو ہاتھ جھاڑ کر

ایک طرف ہو گئے لیکن ہم سے اس کی بے بسی نہ دیکھی گئی۔ ہمارے دل میں تو خوفِ خدا ہے۔ یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنے کا بڑا اجر ہے۔'' دوسرے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے اور ان کے جذبے کو سراہتے لیکن تنہائی میں طعنے، تشنے اور جھڑکیاں اس کا مقدر ہوتیں اور کبھی کبھار وہ اسے ایک ہاتھ بھی جڑ دیتیں لیکن وہ ان کے ڈر سے کبھی تایا ابو کو بتانے کی جرأت نہ کر سکا۔ پھپو جب بھی آتیں تو اس کی حالت دیکھ کر دکھی ہوتیں۔ اور اسے پیار کر کے اور تحائف دے کر جاتیں۔ یونہی روتے، سسکتے دو برس کا عرصہ بیت گیا۔

کون کہتا ہے کہ دنیا میں معجزے نہیں ہوتے۔ عمر کی زندگی میں تو ایسا معجزہ ہوا جس نے اس کی کایا ہی پلٹ دی شاید یہ اس کی ماں کی دعاؤں کا اثر تھا یا اس کی معصومیت اور بے بسی کو دیکھ کر رحمتِ خداوندی جوش میں آ گئی تھی۔ دسمبر کی شدید سرد شام تھی۔ تایا ابو ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ تائی امی کچن میں مصروف تھیں۔ گڑیا سو رہی تھی۔ ذیشان اور کامران صوفے پر بیٹھ کر T.V گیم کھیل رہے تھے۔ ساتھ، ساتھ برگر اور فرائز سے بھی انصاف کر رہے تھے۔ عمر اسی کمرے میں ایک طرف فرش پر بیٹھا اپنے اور دونوں کزنز کے اسکول شوز پالش کر رہا تھا۔ یہ اس کی روزانہ کی ڈیوٹی تھی۔ اتنے میں ڈور بیل سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد تائی امی گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہمراہ ایک خوب صورت ماڈرن سی خاتون اور دو بچے تھے لڑکا تو عمر کے برابر ہی تھا جبکہ چھوٹی بچی کی عمر تقریباً چار سال تھی جو گرم پنک سوٹ، دو پونیوں اور پھولے، پھولے گالوں میں بے بی ڈول لگ رہی تھی۔

''بھابی عمر کہاں ہے؟'' خاتون کے بے تابی سے پوچھنے پر تائی امی نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھیں اور بے ساختہ اپنے ساتھ لپٹا کر اس کے رخساروں پر چٹاچٹ پیار کیا۔

''کیسا ہے میرا بیٹا؟'' عمر شرمندہ سا کھڑا رہ گیا۔ دراصل سردی کی وجہ سے تائی امی نے اسے ذیشان کا ایک چھوٹا گرم سوٹ پہننے کو دیا تھا جو اس کے سائز سے کافی بڑا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پر جا بجا پالش کے دھبے لگے ہوئے تھے لہٰذا اسے اپنا حلیہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس لیے وہ جھجک کر نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ لیکن وہ اس کی حالت کو نظر انداز کیے اس سے چھوٹی، چھوٹی باتیں کرتی رہیں اور پھر ڈھیروں تحائف دے کر رخصت ہوئیں۔

وہ جو بظاہر بہت ہمت اور بہادری سے اسے ملی تھیں گھر جا کر خود پر کنٹرول کھو چکی تھیں۔ اپنے پیارے بھانجے کو اس حالت میں دیکھ کر ان کا دل ٹکڑے، ٹکڑے ہو گیا۔ وہ تو اس گمان میں تھیں کہ عمر اپنے صاحبِ حیثیت تایا کے گھر میں خوشگوار اور پُرسکون زندگی گزار رہا ہوگا لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ چار سال بعد اپنی ساس کے انتقال پر شوہر اور بچوں کے ہمراہ وہ پاکستان آئیں تو اس سے ملنے دوڑی چلی آئیں اور اب ان کی ہچکیاں اور سسکیاں رکنے میں نہیں آ رہی تھیں۔

''حسن اسے دیکھ کر میرا تو کلیجا کٹ گیا۔ بھابی بھی مجھے اچانک دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ گندے پرانے کپڑوں میں فرش پر بیٹھ کر جوتے پالش کرتا دیکھ کر میں اسے کوئی ملازم ہی سمجھی۔'' وہ روتے ہوئے اپنے شوہر کو بتا رہی تھیں۔ ''میرے تو پاؤں تلے سے زمین ہی سرک گئی جب مجھے پتا چلا کہ وہ عمر ہے۔ ہائے میری پیاری آپا کا شہزادہ کس حال میں ہے اور مجھے خبر ہی نہیں۔ حسن ان کی روح اسے دیکھ کر کتنا تڑپتی ہوگی۔ ان کے بعد وہ میری ذمے داری تھا۔ میں ان کا کس منہ سے سامنا کروں گی۔'' حسن ان کے خالہ زاد تھے اور صدف سے ان کا بھی دوستی اور محبت کا رشتہ تھا۔ وہ انہیں بڑی بہن کا درجہ دیتے تھے۔

''فکر نہیں کرو، اب ہم آ گئے ہیں تو کچھ کرتے ہیں۔ شکر کرو کہ تم اس سے مل لیں اور حالات دیکھ لیے۔ ابھی ہم ایک مہینہ یہاں ہیں، دیکھتے ہیں کیا کر سکتے ہیں۔'' شوہر کے ساتھ دینے اور ہمت بندھانے پر انہیں کچھ سکون ہوا۔

وہ سرتاپا سفید لبادے میں ملبوس تھیں۔ گھنے سیاہ

بال ان کی کمر پر پھیلے ہوئے تھے۔ دھیرے، دھیرے وہ ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ قریب پہنچنے پر کشف حیرت زدہ رہ گئیں۔ وہ تو ان کی صدف آپی تھیں۔ خوشی ان کے انگ، انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ لبوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ تھی جس نے پورے چہرے کو جگمگا رکھا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کشف کو گلے لگایا اور بہت محبت سے پیشانی پر بوسہ دیا اور اسی خاموشی سے پلٹ گئیں۔ کشف آواز دے کر انہیں روکنا چاہ رہی تھیں کہ فجر کی اذان سے ان کی نیند ٹوٹ گئی۔ اٹھ کر چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ آنسوؤں سے تر تھا۔ شاید وہ خواب میں روتی رہی تھیں۔ اب بھی ان کی نگاہوں میں آپی کا چہرہ چمک رہا تھا۔

پچھلے ماہ ہی وہ عمر اور بچوں کے ساتھ امریکا واپس آئی تھیں۔ حسن تو چھٹی ختم ہوتے ہی لوٹ آئے تھے لیکن وہ بچوں کے ہمراہ رک گئیں اور تمام کاغذی کارروائی مکمل کی۔ پہلی ملاقات کے بعد وہ بار، بار عمر سے ملنے گئیں اور اس کے حالات دیکھ کر بالآخر حسن کی مشاورت سے سے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لانے کا فیصلہ کرلیا۔ تائی اماں نے دلی طور پر شکر ادا کیا کہ اس مصیبت سے ان کی جان چھوٹی لیکن بظاہر سب نے ان کی بہت مخالفت کی۔ لیکن جب کشف نے یقین دہانی کرائی کہ وہ اس کے تمام اخراجات خود برداشت کریں گی اور اس کے والد کی وارثت سے بھی انہیں کچھ سروکار نہیں تو اسے ساتھ لے جانے کی اجازت بخوشی مل گئی۔

''پاپا ہم آگئے......'' بچے ائر پورٹ پر حسن کو دیکھتے ہی دیوانہ وار اُن کی طرف بھاگے۔ انہوں نے بیٹھ کر دونوں کو لپٹا لیا اور پیار کرنے لگے۔ تبھی ان کی نظر عمر پر پڑی جو پیچھے کھڑا حسرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اسے بھی پیار کیا۔ بچے کافی دن بعد اپنے والد سے ملنے پر بہت خوش تھے اور گاڑی میں مسلسل بول رہے تھے۔ صبح کا سہانا منظر تھا۔ آفتاب نے ابھی تاریکی کو مکمل شکست نہیں دی تھی لہٰذا مدھم سا اجالا تھا اور بادِ صبا کے خوشگوار جھونکے...... گاڑی صاف ستھری چمکتی ہوئی سڑکوں پر پھسلتی جارہی تھی۔ عمر خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ دونوں طرف دور، دور تک ہریالی اور خوشنما رنگ برنگے پھول دکھائی دے رہے تھے۔ گاڑی ایک خوب صورت بنگلے میں داخل ہوئی۔ ایک طرف کار پورچ اور دوسری طرف سرسبز لان تھا۔ بچے خوشی سے شور مچاتے اندر بھاگے۔ انکل گاڑی سے سامان نکال کر رکھ رہے تھے۔ خالہ نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما اور اندر لے گئیں۔ لمبے سفر نے سب کو تھکاوٹ سے چور کردیا تھا۔ دن بھر سب نے خوب آرام کیا۔ رات کو ڈنر کے بعد کشف بچوں کے بیڈ روم میں آگئیں۔ وہ سونے کی تیاری کررہے تھے۔ وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گئیں۔

''دیکھو عمر آج سے تم میرے بیٹے ہو اور یہ گھر تمہارا بھی اتنا ہی ہے جتنا عمیر اور ہانیہ کا ہے۔'' انہوں نے عمر کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر کر پیار سے کہا۔

''تم میری بہت پیاری آپا کی نشانی ہو۔ وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن میں تو موجود ہوں ناں...... دیکھو بیٹا ماں کی بہن بھی ماں جیسی ہوتی ہے۔ ان کی غیر موجودگی میں تمہارا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ تم اپنا ہر دکھ، تکلیف اور پریشانی بلا جھجک مجھے بتاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی۔'' وہ خاموشی سے سر جھکائے سنتا رہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے والدین تم سے بے خبر ہیں۔ ہرگز نہیں...... وہ ہر پل اوپر سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ اگر تم خوش ہوگے تو انہیں خوشی ہوگی اور تمہارا غم انہیں بھی غمزدہ کردے گا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ ہم سب کو اپنا سمجھو گے اور ہمیشہ خوش رہوگے۔'' انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو عمر نے بھی نم آنکھوں سے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر وعدہ کرلیا۔

''ممی......! اس ہانیہ کی بچی کو دیکھیں تنگ کررہی ہے۔'' عمیر نے آواز لگائی۔ وہ اور عمر غبارے پُھلا، پُھلا کر کھیلنے کے لیے جمع کررہے تھے لیکن ہانیہ موقع ملتے ہی پھاڑ دیتی۔

''جی نہیں خالہ امی آپ اس کارٹون کو دیکھیں جو مجھے تنگ کررہا ہے۔'' عمر نے شرارت سے عمیر کو چڑایا تو وہ کشن لے کر اس پر حملہ آور ہوا اور یوں ایک نئی گیم

شروع ہوگئی۔ کشف نے اس پیار بھرے منظر کو چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ دراصل شروع میں وہ عمر کے سلسلے میں کافی پریشان رہی تھیں۔ وہ ایک ایسے خول میں بند تھا جس میں سے باہر نکالنے کے لیے ان کو بہت محنت کرنا پڑی۔ سارا سارا دن خاموش بیٹھا رہتا۔ اگر کوئی بات ... کرتا تو مختصر جواب دے دیتا۔ کشف کھانا دیتیں تو کھالیتا ورنہ نہ خود سے مانگتا نہ ہی کچھ لیتا۔ رات کو سوتے میں ڈر کر اٹھ جاتا۔ وہ متفکر ہو کر حسن سے بات کرتیں تو وہ سمجھاتے۔

''والدین کی اچانک جدائی اور دو سالہ تلخیوں بھرے دور نے معصوم ذہن کو بری طرح متاثر کردیا ہے، تم اپنی کوشش جاری رکھو ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔ اسے تھوڑا ٹائم دو رفتہ، رفتہ وہ ہم سے مانوس ہو کر نارمل ہوجائے گا۔'' تو وہ پُرامید ہوجاتیں۔ اس کا داخلہ بھی بچوں کے ساتھ ہوگیا۔ تینوں اکٹھے جاتے اور اکٹھے واپس آتے۔ بیڈروم بھی دونوں کا مشترکہ تھا۔ یوں... وقت کے ساتھ نے جلد ہی دونوں کو دوستی کے بندھن میں باندھ دیا۔ مل کر پڑھنے، کھانے اور کھیلنے لگے۔ ہانیہ تو دونوں کے لیے پیاری سی گڑیا تھی۔ یوں سب کی کوششوں سے دھیرے، دھیرے وہ نارمل زندگی کی طرف لوٹا تو کشف نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ سب چھ ماہ کے عرصے میں حسن اور عمیر کے تعاون سے ہی ممکن ہوسکا جس کے لیے وہ ان کی شکر گزار تھیں۔

کل عمر کی سالگرہ تھی۔ اس کے والدین اس کی ہر سالگرہ بہت دھوم دھام سے مناتے تھے۔ اس کے دوست اور رشتے دار مل کر ہلا گلا کرتے اور تحائف کے ڈھیر لگا دیتے لیکن اب تو یہ سب خواب وخیال ہوچکا تھا۔ وہ اپنے کزنز کی سالگراہوں میں دکھے دل سے شریک ہوتا۔

''کاش میرے والدین بھی زندہ ہوتے تو میرا بھی یہ دن خوشیوں بھرا اور یادگار ہوتا۔'' اس نے حسرت سے سوچا۔ رات کو سونے تک وہ انہی خیالوں میں کھویا رہا۔ صبح اٹھتے ہی کیلنڈر پر چمکتی تاریخ نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا لیکن وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے کچن میں چلا گیا جہاں سب نارمل انداز میں ناشتا کررہے تھے۔ جلدی، جلدی تیار ہو کر وہ اسکول روانہ ہوگیا۔ واپسی پر کھانا کھاتے ہی وہ بیڈ پر آ گیا۔ چونکہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اور رات کو بھی دیر سے سویا تھا لہٰذا لیٹتے ہی غافل ہوگیا۔

کمرے میں اچانک شور نے اسے خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ آنکھیں کھولنے پر عمیر اور گڑیا کو تالیاں بجا، بجا کر "Happy birth day to you" گاتے پایا۔ خالہ پاس کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ اسے اٹھتے دیکھ کر انہوں نے بے ساختہ اسے گلے سے لگالیا اور پیار کیا۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ لیکن اسے زیادہ جذباتی ہونے کا موقع نہ ملا کیونکہ اسے فوراً ہی تیار ہو کر باہر آنے کا آرڈر مل چکا تھا۔ سامنے سنہری شیروانی، اسی کی ہم رنگ ٹوپی اور سنہری کھسے دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

جب وہ نہا دھو کر تیار ہو کر باہر آیا تو گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم رنگ برنگے غباروں، آرائشی اشیا اور طرح، طرح کی لائٹوں سے سجا جگمگا رہا تھا۔ سامنے ٹیبل پر بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا جس پر خوب صورتی سے "happy birth day umer" لکھا دیکھ کر وہ حیرت سے گنگ رہ گیا۔ ایسی سرپرائز پارٹی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سب کے شور مچانے پر وہ حواسوں میں لوٹا اور پھونک مار کر موم بتی بجھادی۔ جب اس نے کیک کاٹ کر خالہ کی طرف دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے سامنے اس کی امی بانہیں وا کیے کھڑی ہوں۔ وہ بھاگ کر ان کے کھلے بازوؤں میں سما گیا اور بلک، بلک کر رونے لگا۔ خالہ نے اسے گلے سے لگا کر کان میں سرگوشی کی۔

''میرا بیٹا کیا سمجھا تھا، میں اس کی سالگرہ کا دن بھول گئی ہوں...... ایسا ہوسکتا ہے؟'' تب اسے یکا یک ادراک ہوا کہ ماں کی بہن کو ماسی کیوں کہتے ہیں یعنی بالکل ماں سی...... اسے ان کے لمس میں ماتا کی مہک محسوس ہوئی اور وہ مطمئن اور مسرور سا اس ہنگامے کا حصہ بن گیا۔



مجھے آواز نہ دو

شمیم فضل خالق

جانے میں کب سے کھڑی اس بوڑھے جوڑے کی چہلیں دیکھ رہی تھیں۔ گرمی کے دن تھے، وہ دونوں ایک دوسرے پر پانی پھینک رہے تھے اگرچہ اتنی دور سے میں ان کی آوازیں تو نہیں سن سکتی تھی لیکن ان کے چہروں سے پھوٹتی خوشی مجھے اتنی دور سے بھی نظر آ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح میں آج بھی یہ سوچ رہی تھی کہ کون کہتا ہے کہ محبت وقت کے ساتھ، ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تو لگتا ہے جیسے یہ جوڑا بوڑھا تو ہو گیا لیکن ان کے بیچ محبت جوان ہی رہی۔ مجھے اپنا جیون ساتھی افتخار یاد آ گیا...... خدا بخشے اسے خاصا غصیلا بندہ تھا لیکن جیسا بھی تھا ہم دونوں کے درمیان اچھا وقت گزر رہا تھا۔ وہ کافی محنتی اور ذہین بھی تھا۔ لیلیٰ، مجنوں والی محبت نہ سہی سمجھوتا تو تھا جس کے تحت ہم دونوں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے اور ہماری ڈولتی

ڈگمگاتی نیا کو اس وقت کنارہ مل گیا جب ہمارا بیٹا اسد پیدا ہوگیا...... میری تو گویا ساری دنیا سمٹ کر اسد میں ڈھل گئی۔ وہ ابھی سو رہا ہے۔ ابھی جاگ رہا ہے...... ابھی کھا رہا ہے...... میں سارا دن ساری رات اسی میں لگی رہتی۔ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ افتخار کچھ دن بیمار ہوئے اور پھر چل بسے...... مگر کیسے......؟ یہ تو ڈاکٹروں کو بھی پتا نہ چل سکا۔

اس کے بعد تو بس میں تھی اور میرا بیٹا تھا۔ دنیا جہان کے لوگوں نے کہا کہ ایک بیٹے کے سہارے ساری زندگی کیسے گزارو گی، دوسری شادی کرلو...... کچھ تو رشتے بھی لائے تھے لیکن میں اپنے بیٹے پر سوتیلے باپ کا سایہ کیسے پڑنے دیتی، میں نے ہر کسی کو انکار کیا اور اپنے بیٹے کو پالنے کے لیے کمر کس لی۔ اس دوران مجھے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا...... میرا کوئی میکا نہ تھا جو جذباتی طور پر میرا سہارا بنتا...... مجھے میرے...... ایک بے اولاد چچا نے پالا تھا جو میری شادی کے بعد چل بسے تھے۔ سسرال میں بھی میرا کوئی ایسا ہمدرد رشتہ نہ تھا، افتخار کی غصیلی طبیعت کی وجہ سے سارے رشتے دار ہم سے دور ہی ہوگئے تھے اور اب افتخار کی وفات کے بعد بس ہم دو ماں، بیٹا ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔

وقت بڑی جلدی، جلدی کروٹیں بدلتا ہے۔ وقت کے ساتھ، ساتھ میں بوڑھی اور اسد جوان ہوگیا۔ وہ اپنے باپ کی طرح ذہین اور محنتی تھا اور پھر کچھ میری تربیت کا بھی اثر تھا کہ پڑھائی میں اچھا تھا۔ وہ ڈاکٹر بن گیا تو ایک بڑے اسپتال میں اس کی جاب بھی لگ گئی۔ ان دنوں جب میں اس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھی تو ان ہی دنوں اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ساتھی ڈاکٹر کو پسند کرتا ہے۔ مجھے اچھا تو نہیں لگا کہ بالا ہی بالا اس نے لڑکی بھی پسند کرلی ہے لیکن میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ زمانہ بدل گیا ہے، اب لڑکے کہاں ماں، باپ کی پسند کو اہمیت دیتے ہیں اور پھر اس نے تو لڑکیوں کے ساتھ پڑھا ہے ظاہر ہے کسی کے لیے تو دل میں نرم گوشہ پیدا ہوا ہوگا۔ یہی سب سوچ کر میں نے اسد کی پسند پر کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی اور لڑکی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

اسد کو غالباً میرے اتنی جلدی مان جانے کا یقین نہ تھا سو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا اور اگلے دن وہ خود ہی ڈاکٹر حسنہ کو مجھ سے ملانے لے آیا۔ مجھے اس سے مل کر وہ خوشی نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔ وہ خوب صورت تھی، اسے بات چیت کرنے کا فن آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چالاکی نظر آئی جبکہ وہ مجھے بار، بار ''آنٹی جی، آنٹی جی'' کہہ کر اپنا اخلاق جتاتی رہی۔ چائے بھی اس نے مجھے نہیں بنانے دی...... خود ہی اٹھ کر چائے بنائی اور ہمیں پیش کردی...... بظاہر اس میں ناپسند کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے بھی خود کو دل ہی دل میں ٹوکا کہ چونکہ اسد کے معاملے میں، میں بہت حساس ہوں اس لیے چھوٹی سی چھوٹی بات میرے دل میں گرہ ڈال دیتی ہے۔ اس لیے ساری باتیں بھلا کر میں نے کھلے دل سے اسے قبول کیا اور وہ میرے بیٹے کی دلہن بن کر میرے آنگن میں آگئی۔ میرے لیے اس کا آنا اور نہ آنا برابر تھا۔ وہ اور اسد دونوں صبح اسپتال چلے جاتے اور شام گئے واپس آتے تو کہیں گھومنے پھرنے چلے جاتے۔ میں اپنے گھر اور محلے داری میں خوش تھی۔ میری وہی روٹین تھی جو اسد کی شادی سے پہلے تھی...... گھر کا کام کاج کرتی اور کام ختم کرنے کے بعد کبھی میں محلے داروں سے ملنے چلی جاتی۔ کبھی محلے والیاں میرے پاس آجاتیں...... ہماری خوب محفل جمتی اور وقت اچھا گزر جاتا...... ایک دن جب اسد نے بتایا کہ اس نے ایک پوش علاقے میں گھر لے لیا ہے تو میری تو سچ مچ سٹی گم ہوگئی۔

''لیکن بیٹا...... میں اس محلے میں خوش ہوں...... مجھے یہاں سے کہیں اور نہ لے کر جاؤ......''

''اماں!'' وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''وہ بڑی اچھی جگہ ہے...... وہاں بہت آرام ہے، سکون ہے، یہاں کی طرح گاڑیوں کا شور، ریڑھے والوں کی آوازیں آرام میں خلل نہیں ڈالیں گی۔''

''لیکن اسد...... تم دونوں تو سارا دن گھر سے

باہر رہتے ہو، میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں...... یہاں تو محلے داروں کے ساتھ وقت گزر جاتا ہے...... لیکن وہاں تو میں بالکل اکیلی پڑ جاؤں گی......'' میں بے بسی سے بولی تو وہ ہنس پڑا۔

''اماں، وہاں بھی آپ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ عادی ہو جائیں گی۔ بس...... اب اپنا سامان اکٹھا کیجیے، ہم ایک دو دن میں وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔''

اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اس دوران اس کی بیوی بالکل خاموش بیٹھی رہی جیسے اسے اس ساری گفتگو سے کوئی سروکار ہی نہ ہو...... یہی وہ چالاکی بلکہ مکاری تھی جو مجھے پہلے دن سے اس کی آنکھوں میں نظر آئی تھی اور یہ سارا کیا دھرا بھی اسی کا تھا۔ اسد نے تو ساری زندگی اس محلے میں گزاری تھی اور وہ یہاں ہی رہنا پسند کرتا تھا...... خیر...... میری تو ساری عمر سمجھوتے میں ہی گزری تھی تو اب میں ضد کرتی بھی تو کس بل بوتے پر کرتی...... دکھے دل اور نم آنکھوں سے راضی ہو گئی ہو۔

یوں اپنے محلے کو چھوڑا اور اس نئے مکان میں آ گئی۔ یہ چھوٹا سا مکان نہیں بڑا سا بنگلا تھا۔ میں ابھی اِدھر اُدھر مزدوروں کو سامان رکھتا دیکھ رہی تھی کہ اسد نے کہا۔

''اماں...... آپ کا کمرا اوپر ہے...... بلکہ کمرا کیا اوپر کا پورا پورشن ہی آپ کا ہے۔ اس گھر کی نسبت سو گنا کھلا اور کشادہ...... آئیں میرے ساتھ......''

''اوپر......؟'' میں نے حیرت سے اسد کو دیکھا۔ ''اور تم لوگ...... تم لوگ کہاں رہو گے......؟'' میری آواز میں خوف بھری تھرتھراہٹ تھی۔

''ہم نیچے رہیں گے......'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''دیکھیں اماں...... ہم ڈاکٹر لوگ ہیں...... ہمارے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں...... پھر ہمارے دوست احباب آتے ہیں، آپ ان کے آنے جانے سے ڈسٹرب ہوں گی...... اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ اوپر رہیں تو بہتر ہوگا۔ اس طرح آپ جب چاہیں آرام کریں...... جیسے چاہیں رہیں......''

''لیکن بیٹے...... میں ہر وقت سیڑھیاں اتر چڑھ نہیں سکتی...... ایک آدھ بار تو چڑھ لوں گی لیکن......''

میری بات کاٹ کر وہ حیرت سے بولا۔

''لیکن اماں...... آپ کو سیڑھیاں چڑھنے اور اترنے کی ہر وقت ضرورت ہی کیا ہے...... بلکہ بالکل بھی ضرورت نہیں۔ آپ کی ضرورت کی ساری چیزیں آپ کے پاس ہوں گی...... اوپر ایک چھوٹا سا کچن بھی ہے...... جس میں حسنہ آپ کی ضرورت کی ہر چیز رکھ دے گی...... بس مزے سے رہیں اور جو مرضی ہو اپنے لیے بنایا کریں...... اور کھایا کریں...... آپ کو نیچے اترنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔''

سارا پلان تیار تھا...... میرے بولنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی اس ساری گفتگو میں حسنہ بالکل خاموش تھی...... وہی مکاری جو ایسے وقت میں اس کے چہرے پر سجی رہتی تھی۔ اوپر کا پورشن بہت کشادہ تھا۔ میرا کمرا بھی بہت بڑا اور کھلا، کھلا تھا...... میری ہر چیز کمرے میں سیٹ کی رکھی تھی...... ٹی وی بھی تھا اور بیڈ روم فریج بھی رکھا تھا۔ کچن میں بھی ضرورت کی ہر چیز رکھی تھی۔ سب کچھ اچھا تھا لیکن مجھے ابھی سے آنے والی تنہائی سے خوف آرہا تھا۔ مجھے کمرے کی کشادگی متاثر کر سکی نہ عمارت کی خوب صورتی میرا دل موہ سکی۔ بلکہ مجھے تو یہ سوچ ہی دہلا دینے کا باعث بن رہی تھی کہ یہاں اس منزل میں مجھے اکیلے رہنا ہوگا اور مجھ سے بات چیت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ مجھے اپنا محلہ اور اپنا چھوٹا اور پرانا سا گھر جیسا بھی تھا بہت یاد آرہا تھا۔ اسد کے چلے جانے کے بعد میں جی بھر کر روئی۔ مجھے تو اپنی وہ محبتیں، وہ خدمتیں یاد آرہی تھیں جو میں نے اسد کے لیے کی تھیں۔ میں اسے خود اسکول چھوڑنے جایا کرتی اور خود ہی لے کر آیا کرتی تھی...... اس سلسلے میں، میں نے کبھی کسی پر بھروسا نہیں کیا تھا۔ ایک بار مجھے تیز بخار تھا میری پڑوسن کے بچے بھی اسد کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ پڑوسن نے کہا بھی کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اسد کو لے جائے گی لیکن میں نہ مانی اور بخار میں رُلتی، کانپتی، لڑکھڑاتی اسد کو خود لے کر اسکول گئی تھی اور واپسی پر بیچ سڑک پر بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے میری پڑوسن کا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے گھر لے آئی۔ ایسے بے شمار

واقعات تھے جو میرے ذہن میں کسی فلم کی سین کی طرح چل رہے تھے اور بے شک ہر ماں، باپ ہی بچوں کے لیے مشکلات لیتے ہیں۔ اب اسد نے عضو معطل کی طرح مجھے اوپر پھینک دیا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ تنہائی مجھے پاگل کرنے لگی...... کبھی، کبھی میرا دل چاہتا کہ میں خودکشی کرلوں اور اپنی اس بے رنگ اور بے مصرف زندگی کا خاتمہ کرلوں لیکن پھر سوچتی...... اب اس آخری وقت میں اپنا گناہ کیوں بڑھاؤں۔ بیٹا بہو مجھے اوپر پھینک کر بھول ہی گئے تھے۔ اس بار اسد پورے ہفتے بعد اوپر آیا...... میں نہا کر دھوپ میں بیٹھی تھی...... وہ سلام کر کے بولا۔

''واہ اماں...... آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں...... یہاں کی فضا نے آپ کی صحت پر بڑا اچھا اثر ڈالا ہے...... میں دراصل یہ دیکھنے آیا تھا کہ یہاں سب کچھ ہے ناں......'' وہ بولتا ہوا کچن میں گیا...... ڈبوں سے ڈھکنے اٹھا کر دیکھے...... دوائیوں کا لفافہ کھول کر دیکھا...... اور سب کچھ چیک کر کے جب عجلت میں جانے لگا تو میں منت آمیز لہجے میں بولی۔

''اسد...... مجھے نیچے اپنے ساتھ رکھو...... میں تم لوگوں کی آوازیں سن کر ہی خوش ہوجایا کروں گی۔ میں...... تم لوگوں کو بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گی......''

وہ جاتے، جاتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر آناً فاناً ناگواری چھا گئی اور وہ بولا۔

''کیا ہوا ہے اماں آپ کو...... آپ سمجھتی کیوں نہیں...... آپ کو یہاں تکلیف کیا ہے۔ کتنی اچھی طرح رہ رہی ہیں آپ یہاں...... آج کل وقت بہت بدل چکا ہے اماں...... اکثر ہمارے دوست آجاتے ہیں۔ ہم ساری رات ہلا گلا مچاتے ہیں...... بھلا آپ کہاں ہمارے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ آپ پلیز اپنی زندگی گزاریے اور ہمیں اپنی زندگی گزارنے دیجیے...... اور ہاں......'' وہ پیچھے مڑ کر بولا...... ''آپ کے کچن میں اور دوائیوں میں جو کمی بیشی ہے، وہ میں پورا کردوں گا۔'' وہ عجلت میں مزید میری کوئی بات سنے بغیر ایک ساتھ دو، دو سیڑھیاں پھلانگتا اتر گیا کیونکہ نیچے حسنہ اسے آوازوں پر آوازیں دے رہی تھی۔

اب یہ تنہائی میرا مقدر تھی۔ مجھے ہمیشہ کی طرح اس سے سمجھوتا کرنا تھا۔ اس لیے میں اکثر بالکونی میں کھڑے ہو کر نیچے کا نظارہ کرتی رہتی۔ اور تب مجھے وہ بوڑھا جوڑا نظر آگیا۔ اس عمر میں ان کی چہلیں مجھے بڑی اچھی لگیں۔ میں سوچتی شاید وہ ایک عرصے بعد تنہا ہوئے ہیں اور اپنی جوانی کو یاد کررہے ہیں لیکن ایسا نہیں تھا جب کئی دن تک مجھے ان کے گھر کوئی اور نظر نہ آیا تو مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ جوڑا تنہا رہتا ہے...... لیکن اس طرح کے بوڑھے جوڑوں کو تو میں نے اکثر لڑتے، جھگڑتے دیکھا تھا۔ اتنا زیادہ پیار و محبت میں نے آج تک اس طرح کے جوڑوں میں نہیں دیکھی تھی۔ دونوں اکثر میوزک لگا کر انگلش طرز پر ہاتھوں میں ہاتھ دیے ڈانس کرتے رہتے، میں ہنس، ہنس کر دُہری ہوجاتی۔ وہ دونوں خود بھی ہنستے اور اپنے ڈانس کو خود ہی انجوائے کرتے۔ کھانا کھاتے تو ایک دوسرے کے منہ میں نوالے بنا، بنا کر دیتے۔ باتوں کی آواز کم ہی کانوں میں آیا کرتی لیکن ان کے ایکشن سے میں خود ہی اندازہ لگاتی۔

اب تو جیسے میری تنہائی کا...... میری بوریت کا خاتمہ ہوگیا تھا...... اپنے کام سمیٹ کر، نماز پڑھتی، قرآن شریف کی تلاوت کرتی...... ذکر و اذکار کرتی...... تھوڑی بہت صفائی کرتی...... کچن میں جا کر اپنے لیے اپنی من چاہی ڈش بھی بناتی اور جب وہ لوگ کھانا کھاتے تو میں بھی اپنی ٹرے اٹھا کر بالکونی میں بیٹھ کر کھانا کھاتی۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں ان کی فیملی سے ہوں اور میں اپنا کھانا اس طرح انجوائے کرتی جیسے ان کے ساتھ تیسری چیئر پر میں بیٹھی ہوں اور ہم ساتھ ہی کھانا کھا رہے ہیں۔ میری خوراک میں اضافہ ہوگیا تھا حالانکہ جب سے میں اس گھر میں آئی تھی...... میری بھوک جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی میں زبردستی چند نوالے کھاتی اور بس...... لیکن اب تو میں اپنے کھانے کو انجوائے کرنے لگی تھی۔ پکاتی بھی شوق سے تھی اور کھاتی بھی شوق سے تھی۔ وقت کے ساتھ، ساتھ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ بوڑھا جوڑا دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ ان کی نہ کوئی اولاد تھی اور نہ عزیز رشتے دار تھے...... اس لیے تو نہ ان کے گھر کوئی

آتا جاتا تھا اور نہ یہ کسی کے گھر جاتے تھے۔
چند دن بعد وہ بوڑھا آدمی باہر چلا جاتا اور واپسی پر بہت سارے لفافے اٹھا کر لے آتا...... جن میں گھر کا سودا سلف ہوتا...... دونوں میاں، بیوی لفافے سنبھالتے، ہنس، ہنس کر لفافوں کی چیزیں اپنی جگہوں پر رکھتے...... ساتھ میں ہنسی مذاق بھی ہوتا رہتا...... کیا عجب بات تھی کہ اتنے غیر دلچسپ کام کو بھی انہوں نے دلچسپ بنا رکھا تھا...... کام ختم کر کے جب وہ دونوں باہر آکر اپنی مخصوص جگہوں پر بیٹھے تو میں نے ایک لمبی سانس لی جیسے میں نے اپنا سارا کام ختم کرلیا ہو۔
''واہ، کیا بات ہے۔'' مجھے خود پر ہنسی آگئی لیکن اس بوڑھے جوڑے نے جیسے میری بے رنگ زندگی میں رنگ بھرے تھے اور میں جیسے زندگی کو ایک بار پھر سے جینے لگی تھی۔
ایک دن ایک عجیب بات ہوئی، ان کے گھر ایک جوان لڑکی اور لڑکا آگئے۔ میں حیران رہ گئی...... میں نے دیکھا کہ دونوں بڑی گرمجوشی سے ان دونوں سے ملے۔ پھر لڑکا تو چائے پی کر چلا گیا لیکن لڑکی وہیں رہ گئی۔ اس کے ساتھ ایک اٹیچی اور کچھ اور سامان بھی تھا...... گویا وہ یہاں رہنے آئی تھی۔ جانے کیوں پر میں ڈسٹرب سی ہوگئی جیسے یہ لڑکی اچانک میری تنہائی میں مخل ہوئی ہو۔ تنہائی ایک تکلیف دہ چیز ہے لیکن اگر بندہ اس کا عادی ہوجائے تو پھر دوسروں کی موجودگی پر بندہ ڈسٹرب ہوجاتا ہے...... اور پھر یہ جوڑا...... یہ تو کسی کے عادی ہی نہیں ہیں۔ یہ تو ایک دوسرے میں گم رہتے ہیں...... یہ کیسے کسی تیسرے کو برداشت کریں گے۔
میں سچ مچ پریشان ہوگئی...... لیکن وہ بوڑھا جوڑا بالکل بھی پریشان نہیں تھا...... میں حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی، وہ اس لڑکی کی آؤ بھگت کر رہے تھے...... پھر وہ بوڑھی عورت اس لڑکی کے ساتھ اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔ غالباً اسے اس کا کمرا دکھانا مقصود تھا۔ پیچھے سے وہ بوڑھا کیاریوں اور گملوں کو پانی دینے لگا۔
اب تو میں اس جستجو میں پڑ گئی کہ آخر یہ لڑکی کون ہے اور یہ یہاں رہنے کیوں آئی ہے۔ وہ صبح، صبح ناشتا



غزل

کبھی دل کو اپنے لگا کر تو دیکھو
ہمیں اپنے دل میں بسا کر تو دیکھو

مرے پیار پہ ناز کرنے لگو گے
مری شاعری گنگنا کر تو دیکھو

تمہیں بھول جائے گی ساری خدائی
ذرا میری دنیا میں آکر تو دیکھو

تمہیں اپنے دل میں بسالیں گے جاناں
دل و جان ہم پر مٹا کر تو دیکھو

چراؤ نہ نظریں نہ دامن چھڑاؤ
ہمیں آج اپنا بنا کر تو دیکھو

کبھی تو ہمیں پیارا مکھڑا دکھاؤ
محبت کی محفل سجا کر تو دیکھو

میں مان جاؤں گی فوراً شگفتہ
مجھے پیار سے تم منا کر تو دیکھو

کلام: شگفتہ شفیق، کراچی

کر کے چلی جاتی اور شام گئے واپس آتی۔ بوڑھے جوڑے کی وہی روٹین تھی۔ وہی خوش فعلیاں تھیں، وہی ایک دوسرے سے محبتیں تھیں، وہی محبت بھری چھینا جھپٹیاں تھیں۔ بوڑھا آدمی اکثر پائپ سے گملوں کو پانی دیتا تو شرارت سے پانی کا رخ بوڑھی عورت کی طرف کردیتا۔ وہ چیخنا شروع کردیتی...... بوڑھا آدمی ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجاتا...... خود میں بھی ہنس، ہنس کر بے حال ہوجاتی...... بوڑھی عورت ذرا نہ چڑتی۔ وہ ہنسی میں اپنے خاوند کا ساتھ دیتی اور گیلے کپڑے بدلنے کے لیے چلی جاتی۔ سنڈے کو لڑکی گھر میں ہوتی...... وہ بھی ان کی شرارتوں میں شامل ہوتی۔ تینوں جی بھر کر موج مستی کرتے، میں حیران ہوتی رہتی...... یا اللہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں...... کیسے انہوں نے زندگی کو خوب صورت بنا رکھا ہے...... اور ایک میں ہوں...... بوڑھی اور لاچار...... میرے بچوں نے مجھے عضو معطل سمجھ رکھا تھا...... مجھے یاد آیا جب اسد اور حسنہ کسی بات پر ہنستے تو میں بھی ان کے پاس پہنچ جاتی اور محبت سے پوچھتی۔ "کس بات پر ہنسا جارہا ہے...... مجھے بھی بتاؤ کہ میں بھی تم لوگوں کی خوشی میں شریک ہوسکوں......" وہ دونوں ایسے خاموش ہوجاتے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی اماں...... آپ چھوڑیے...... یہ بتائیں، آپ نے اپنی دوائی لی ہے؟" اسد بات بدلتے ہوئے کہتا اسی طرح وہ ہر بار بات بدل دیتے...... پھر تو میں نے ایسے لمحوں میں ان کے پاس جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری کاش...... وہ مل جل کر میرے ساتھ رہتے، اپنی باتوں میں مجھے شریک کرتے، میرے ساتھ ہنستے، بولتے...تو مجھے کتنا اچھا لگتا۔ اب جیسے یہ لڑکی...... جو اپنی عمر بھلا کر اس بوڑھے جوڑے کو خوش رکھتی ہے...... ان کے ساتھ خود بھی مصروف رہتی ہے اور انہیں بھی مصروف رکھتی ہے۔ میں کافی دیر تک یہی سوچتی اور کڑھتی رہی۔

مجھے بینگن کی سبزی بہت پسند تھی یہ بات اسد کو معلوم تھی لیکن کافی وقت سے وہ سبزی میں بینگن نہیں لایا تھا...... اس دن میں نے سبزی والے کی آواز سنی...... اس پوش علاقے میں، میں نے کبھی اس طرح کسی ریڑھے وغیرہ کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ میں خوش ہوکر اندر گئی اور والٹ سے پیسے نکالے۔ اوپر کی اس منزل میں دو طرف سیڑھیاں تھیں، ایک تو نیچے کی منزل سے اوپر آتی تھیں جبکہ دوسری باہر کی طرف روڈ سے اوپر آتی تھیں۔ یعنی اگر اوپر کوئی کرایہ دار ہوتو وہ وہی راستہ استعمال کرے اور نیچے پورشن والے ڈسٹرب نہ ہوں۔ اسد نے روڈ والی سیڑھیاں اندر سے بند کردی تھیں صد شکر کہ اس نے تالا نہیں لگایا تھا بس کنڈی لگائی تھی۔ مجھے ایک آدھ بار سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ سو میں آرام سے اتر گئی...... قرب وجوار کی بہت ساری خواتین سبزی والے ریڑھے کو گھیرے کھڑی تھیں غالباً یہ ریڑھا یہاں پہلی بار آیا تھا۔ میں وہیں کھڑی اپنی باری کا انتظار کررہی تھی کہ میں نے دیکھا اس بوڑھے جوڑے والے گھر سے وہ مہمان لڑکی بھی ریڑھے کی طرف آگئی۔ میں نے اسے دیکھا تو مسکراہٹ خود بخود میرے ہونٹوں پر آگئی...... مجھے مسکراتے دیکھ کر وہ قریب آئی اور سلام کیا۔

"بیٹا...... یہ بوڑھا جوڑا تمہارا کیا لگتا ہے؟" سلام کا جواب خوشدلی سے دیتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"تایا، تائی ہیں میرے......" اس نے جواب دیا۔

"اچھا......" میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "خدا انہیں زندگی دے بڑا خوش باش جوڑا ہے۔"

"آپ کیسے جانتی ہیں انہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"میں سارا دن اوپر سے ان کو دیکھتی ہوں اور ان کی محبتوں کا نظارہ کرتی رہتی ہوں...... محظوظ ہوتی ہوں ان کی حرکتوں سے۔" میں نے اشارے سے اسے اپنی کوٹھی دکھائی۔

"جی آنٹی......" وہ نرم لہجے میں بولی۔ "میرے تایا اور تائی نے محبت کی شادی اور اس دن سے لے کر آج تک ان کی محبت قائم ودائم ہے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں...... لیکن انہوں نے یہ کمی محسوس نہیں کی۔ بس ایک دوسرے میں مگن رہتے ہیں۔"

"تم بیٹا...... ان سے ملنے آئی ہو......؟" میں نے اپنی معلومات کا دائرہ بڑھایا۔

"وہ دراصل میں اپنی جاب کے سلسلے میں آئی ہوں...... یہاں میری چند ہفتوں کی انٹرن شپ ہے......اسی سلسلے میں آئی ہوں......"

"بیٹا...... تمہارا نام کیا ہے؟" مجھے اس کا اخلاق بہت اچھا لگا...... تو میں نے پوچھا۔

"رومانہ نام ہے میرا...... سب رومی کہتے ہیں۔" اس نے ہنس کر جواب دیا...... سبزی والا فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے بینگن کے علاوہ بھی کچھ سبزی خریدی...... اس نے بھی اپنی مطلوبہ سبزی خریدی...... پھر مجھے آفر کی۔

"آنٹی...... میں آپ کی مدد کروں...... آپ کے یہ لفافے اوپر لے کر چلتی ہوں۔"

"نہیں بیٹا...... شکریہ۔" میں ہنس کر بولی۔ "یہ کوئی اتنا زیادہ بوجھ نہیں...... میں لے کر جا سکتی ہوں......"

گھر آ کر بھی مجھے اس لڑکی کا اخلاق، اس کا میٹھا لہجہ رہ، رہ کر یاد آ رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی...... کاش حسنہ کے بجائے یہ لڑکی رومی میری بہو ہوتی تو ہمارا وقت کتنا اچھا گزرتا...... یا پھر حسنہ میں رومی جیسی خصوصیات ہوتیں لیکن اب تو یہ دونوں باتیں ممکن نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے اپنی خریدی ہوئی سبزی کچن میں رکھی اور بستر پر گر گئی کمر سیدھی کرنے کے لیے...... اب بینگن کی سبزی بنانے کی ہمت نہ تھی۔ اب تو یہ حالت تھی کہ تھوڑی سی جدوجہد سے بھی تھک جاتی تھی۔ رات کا سالن پڑا تھا۔ میں نے سوچا آج وہی کھا لوں گی...... کل بینگن کی سبزی بنا کر انجوائے کروں گی۔

اگلے دن میں نے ناشتے کے بعد ہی بینگن کی سبزی بنالی۔ دو تین چپاتیوں کا آٹا گوندھ کر رکھا...... یہ تھوڑا سا آٹا میرے لیے دو تین دن چل جاتا تھا۔ دوپہر تک میں گھر کے چھوٹے موٹے کام نبٹاتی رہی۔ تھوڑی بہت صفائی کی، دوپہر کو اپنے لیے چپاتی بنا کر میں نے اپنے لیے ٹرے تیار کی اور جا کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔ جہاں سے مجھے اس بوڑھے جوڑے کا گھر صاف نظر آتا تھا اور میں جانتی تھی کہ وہ لوگ بھی اسی وقت لنچ کرتے ہیں۔ ان کے کمروں کے آگے کھلا برآمدہ تھا جہاں وہ سارا دن بیٹھے رہتے۔ وہاں ایک چھوٹی سی ٹیبل بھی رکھی تھی۔ وہ اپنا کھانا ناشتا وہیں کرتے تھے۔ آج تو سنڈے تھا۔ رومی بھی گھر پر ہوگی۔ جب وہ گھر پر ہوتی تو بھاگ، بھاگ کر کچن سے چیزیں لا، لا کر اس ٹیبل پر رکھتی جاتی...... جب تک وہ اپنا کھانا شروع نہ کرتے...... میں بھی نہ کرتی...... کیونکہ جب وہ کھانا اسٹارٹ کرتے تو میں بھی اپنا کھانا شروع کر دیتی اس تصور کے ساتھ کہ میز کے گرد پڑی ہوئی ایک کرسی پر میں بھی بیٹھی ہوں۔

چھوٹی سی تپائی پر اپنی ٹرے رکھ کر میں نے سامنے دیکھا تو آج برآمدہ خالی تھا...... پچھلے دنوں جب بھی میں نے دیکھا ان کی روٹین یہی تھی کہ وہ سارا وقت برآمدے میں ہوتے۔ دراصل ان کا مکان ذرا پرانی طرز پر بنا تھا اور پرانے گھروں میں ٹی وی لاؤنج کی جگہ برآمدے ہوتے تھے سو سارے کام وہیں ہوتے تھے۔

"کہاں گئے یہ لوگ؟" مجھے تشویش ہونے لگی آج سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا...... یہ لوگ اندر باہر ہوتے رہتے لیکن اس طرح غائب نہیں ہوتے تھے۔

"خیر...... اندر ہوں گے کمروں میں یا کچن میں...... ابھی باہر آ جائیں گے۔" میں نے خود کو تسلی دی...... ان کے بغیر میرا بھی کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کھانے کی میز پر بھی وہ اپنی چہلیں جاری رکھتے...... بوڑھی عورت پلیٹ میں کھانا ڈالتی تو بوڑھا آدمی ڈونگا اٹھا دیتا، اس کا ہاتھ ہوا میں معلق ہو کر رہ جاتا...... ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے...... یہاں میں ہنس، ہنس کر دُہری ہو جاتی لیکن آج تو ایسا سناٹا تھا لگتا تھا جیسے گھر میں کوئی نہ ہو۔

"کیا خبر کہیں باہر گئے ہوں......" اگرچہ وہ لوگ زیادہ تر گھر پر رہتے تھے لیکن باہر جانا ناممکنات میں سے نہیں تھا...... "ہوسکتا ہے رومی دونوں کو مجبور کر کے کہیں باہر لے گئی ہو......" مجھے اپنا یہی خیال صحیح لگنے لگا تو میں آخری نظر ان کے گھر پر ڈال کر اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہونے لگی لیکن اچانک میں بری طرح

چونک پڑی...... رومی موبائل فون کانوں سے لگائے کمرے سے باہر آ گئی لیکن وہ سخت گھبرائی ہوئی ... لگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے، پیچھے وہ بوڑھی عورت بری طرح روتے ہوئے باہر آئی۔ میرے ہاتھ پاؤں سے جیسے دم نکل گیا۔ جسم میں جان نہ رہی، میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چاہا کہ جلد سے جلد ان کے پاس جاؤں کہ اچانک ان کے دروازے پر ایمبولینس آن رکی۔ ایمبولینس سے دو مرد نکلے۔ رومی کی ہمراہی میں وہ دونوں مرد اندر کمرے میں گئے۔ اور اس بوڑھے، بے ہوش مرد کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس تک لے گئے۔ ان کے ساتھ ہی رومی اپنی تائی کو سہارا دے کر ایمبولینس تک لائی۔ اس کی تائی کا رونا کسی طرح بند نہیں ہو رہا تھا جبکہ رومی انہیں تسلیاں دے رہی تھی۔ وہ دونوں بھی ایمبولینس میں بیٹھ گئیں اور ایمبولینس فراٹے بھرتی وہاں سے چلی گئی۔

میں گم صم سی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی...... مجھے لگا جیسے مجھ میں سانس لینے کی بھی سکت نہ رہی ہو...... ہوش آیا تو میں بری طرح رونے لگی...... ''یااللہ...... اگر اس جوڑے میں سے کوئی ایک بھی نہ رہا تو دوسرا بھی نہیں رہے گا۔ کیونکہ ان دونوں کی دنیا ایک دوسرے کے دم سے تھی۔ ان دونوں کے لیے ایک دوسرے کے سوا کوئی نہ تھا دنیا میں...... یا اللہ وہ محبتوں کے پیغامبر ہیں...... ان کو زندہ رکھنا۔'' میں روتی رہی اور دعائیں مانگتی رہی لیکن بعض اوقات دعاؤں میں اثر نہیں ہوتا...... اس لیے تو... اسپتال سے بوڑھے آدمی کی ڈیڈ باڈی آ گئی۔ ساتھ میں پچھاڑیں کھاتی اس کی بیوی تھی اور اپنی تائی کو بمشکل سنبھالتی رومی تھی...... میری حالت بھی بری ہو گئی تھی کتنی دیر تک تو مجھے سمجھ ہی نہیں آئی کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ سامنے کا منظر دیکھ کر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں بری طرح رو رہی تھی۔ ''خدایا کیا محبت اس طرح بھی مر سکتی ہے...... کیا محبت مر گئی ہے...... اب یہ بوڑھی عورت کتنی دیر جی سکے گی؟ کیا سب کچھ ختم ہو جائے گا؟'' میں رو، رو کر خود سے ہی سوال جواب کر رہی تھی۔ جانے کیسے ہمت کی میں نے وہاں جانے کی...... ورنہ تو نہ میرے ہاتھ پیروں میں طاقت تھی نہ دل میں زور تھا۔

ان کے گھر میں ہماری اسٹریٹ کی ہی چند خواتین بیٹھی تھیں۔ چند مرد بھی تھے۔ مجھے دیکھ کر رومی میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ وہ بوڑھی عورت مسلسل رو رہی تھی، پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اپنے خاوند کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔ بار، بار کہہ رہی تھی۔

''رضی...... تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑو گے۔ پھر کیوں چلے گئے تم...... کیوں وعدہ خلافی کی تم نے......'' یہ کہہ کر وہ بری طرح چیخیں مارنے لگتی، ہاتھوں سے نکلنے لگتی۔ رومی اسے سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتی۔ اب میں بھی اس کے ساتھ اس کوشش میں شامل ہو گئی...... جنازہ اٹھنے لگا تو وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ ایک طرف لڑھک گئی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہوا۔ شاید وہ جنازہ اٹھنے نہ دیتی...... جب وہ ہوش میں آئی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ سارے لوگ اپنے، اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ مجھے رومی نے زبردستی روک لیا تھا۔ بوڑھی عورت نے آنکھیں کھول کر خالی، خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نظریں مجھ پر ٹک گئیں۔ رومی نے اسے کہا۔

''زلیخا تائی...... یہ اس سامنے والے گھر میں رہتی ہیں۔ یہ شبانہ آنٹی ہیں...... یہ اکیلی ہوتی ہیں اس لیے اوپر سے سارا دن ہمارے گھر کو دیکھتی تھیں......'' اس نے ہماری بلند و بالا عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے تفصیل بتائی۔

''اور ان کا کہنا ہے کہ یہ ہمیں اپنی فیملی کی طرح سمجھتی تھیں۔''

''ہاں......'' میں نے زلیخا کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا...... ہم چاہتے تھے کہ اس کا دھیان بٹ جائے لیکن وہ یہ سن کر رونے لگی اور بولی۔

''سب ختم ہو گیا...... فیملی ختم ہو گئی...... کچھ باقی نہیں رہا۔'' اب اس کا رونا پھر سے اسٹارٹ ہو گیا تھا۔ اب وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی......

شام کو میں نے رومی سے گھر جانے کی اجازت لی تو وہ رونے لگی۔

''شبانہ آنٹی...... میں اکیلی تائی کو کیسے سنبھالوں گی...... پلیز آپ آج رات میرے پاس رک جائیں...... پلیز آنٹی......'' میں اس کی ملتجی نظریں نظر انداز نہ کرسکی اور پھر میرا گھر میں کون انتظار کررہا تھا۔

''آپ، اپنے بیٹے سے اجازت لے لیں...... میرا سیل فون استعمال کرلیجیے......'' رومی نے اپنا فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میرا بیٹا ہفتوں اوپر نہیں آتا...... اور مجھے اس کی اجازت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں......'' میں نے تلخی سے جواب دیا اور قدرے ٹھہر کر بولی۔

''اچھا...... ٹھیک ہے...... میں رات تمہارے ساتھ رہ لوں گی...... بس مجھے گھر جا کر اپنی دوائیاں لانی ہوں گی اور وہاں سالن بھی تیار رکھا ہے، میں یہیں لے آتی ہوں......'' میں نے ایسا ہی کیا۔

رات زلیخا کو نیند کی گولی دے کر میں نے سلادیا...... میں اور رومی باتیں کرتے رہے...... پہلی بار ایک ہمدرد کو دیکھا تو میں نے اپنا دُکھادل اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ رومی ایک ہمدرد دل رکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ میری داستان کے دوران اپنی آنکھیں بار، بار صاف کرتی رہی۔ میرا ہاتھ تھپک، تھپک کر مجھے تسلی دیتی رہی جیسے وہ میری بڑی ہو۔ انسان کو ہر عمر میں خواہش ہوتی ہے کہ اس سے چھوٹوں جیسا برتاؤ کیا جائے میں نے بھی اس سے دل کی ساری باتیں شیئر کیں...... اور رات اسی طرح سوتے جاگتے اور باتیں کرتے گزر گئی۔

اگلے دن میں گھر آگئی...... لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میرا دل بالکل بھی گھر آنے کو نہیں چاہ رہا تھا...... میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں زلیخا کے آنسو پونچھتی رہوں۔ اس کے آس پاس رہوں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ بالکل غیر اور پرائے لوگ تھے میں بھلا ان کے گھر کیسے رہ سکتی تھی...... لیکن اگلے دن تو میں خود کو جانے سے نہ روک سکی۔ میں نے گوشت اور آلو کا سالن بنایا اور اپنے ساتھ لے کر وہاں چلی گئی۔ رومی تو مجھے دیکھ کر بے طرح خوش ہوگئی لیکن زلیخا نے جس طرح میری پزیرائی کی اس کی مجھے بالکل امید نہیں تھی، وہ آج بھی روزِ اول کی طرح رو رہی تھی۔ بار، بار اپنے شوہر کو پکار رہی تھی لیکن اس نے محبت سے میرے ہاتھ پکڑ کر سسکیوں کے بیچ رک، رک کر کہا۔

''شبانہ...... میں تم سے رضی کی باتیں کروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا؟''

''نہیں......'' میں نے اس کے ہاتھ محبت سے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ مجھے اچھا لگے گا کیونکہ میں تم لوگوں کی محبت کا عملی مظاہرہ تو دیکھ چکی ہوں لیکن داستانِ محبت سننی باقی ہے۔''

''لیکن تائی جان...... آپ رونا بند کریں گی تو شبانہ آنٹی کو کچھ بتانے کے قابل ہوں گی ناں......'' رومی جلدی سے بولی۔

''ہاں زلیخا...... پہلے تم رونا دھونا بند کرو...... رضی بھائی تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے تھے...... اب تمہیں روتا اور دکھی دیکھ کر ان کی روح کتنی افسردہ ہوگی...... کبھی یہ سوچا ہے تم نے۔''

''نہیں......'' وہ سر نفی میں ہلا کر معصومیت سے بولی۔ ''ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں...... مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ رضی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔''

میں نے اس کے آنسو پونچھے...... اور نرم انداز میں اسے سمجھانے لگی۔

''زلیخا...... رضی بھائی ایسا ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ تمہیں اکیلا چھوڑ دیں...... لیکن اپنی جان اپنے بس میں نہیں ہوتی۔ ہماری سانسیں تو اللہ کی امانت ہیں...... وہ جب چاہے ہماری سانسوں کی ڈور توڑ سکتا ہے...... لیکن رضی بھائی یہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ تم ہر وقت روتی رہو...... اگر تم یہاں خوش رہو گی تو وہ وہاں خوش رہیں گے۔'' میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا تو اس کی سسکیوں کو بریک لگ گیا...... وہ دھیمی آواز میں بولی۔

''میں نے رضی کو ہمیشہ خوش رکھا تھا...... اب بھی میں ان کی خوشی کے لیے خوش رہوں گی...... بس......

مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ افسردگی سے بولی...... میں اور رومی اسے سمجھاتے رہے...... اس کا دھیان بٹانے کو اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے...... پھر ہم نے ساتھ مل کر کھانا کھایا اسے بھی کسی نہ کسی طرح کھانے میں شریک کرلیا۔

شام گئے میں واپس گھر آگئی...... پھر تو جیسے یہ میری روٹین بن گئی' ناشتے کے بعد سالن بنا کر ان کے گھر چلی جاتی۔ سارا دن ان کے ساتھ گزر جاتا...... زلیخا مجھے دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو جاتی۔ وہ بہت حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ مجھے رضی کے قصے سناتی...... اس کی ہر بات رضی پر شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی...... میں دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی بیچ بیچ میں اس سے کچھ نہ کچھ پوچھتی رہتی۔ وہ خوش ہوتی جب میں گھر جانے کی بات کرتی تو اس کا چہرہ اتر جاتا، وہ اداس ہو جاتی...... رومی بھی اب میری وجہ سے آفس جانے لگی تھی۔ کیونکہ میں زلیخا کے پاس ہوتی۔ وہ میری بہت ممنون تھی لیکن مجھے روز، روز جانا اب اچھا نہیں لگ رہا تھا حالانکہ وہاں جا کر میرا وقت بہت اچھا گزر جاتا تھا۔ وہی وقت جو اس گھر میں ٹھہر جاتا...... رک جاتا...... گھڑی کی سوئیاں آگے نہ سرکتیں...... وہاں جا کر جیسے وقت کو پہیے لگ جاتے وہ دوڑنے لگتا...... لیکن میں تنہائی کے عفریت سے گھبرانے لگی تھی اس لیے خود کو وہاں جانے سے نہ روک سکی لیکن میں کبھی خالی ہاتھ نہ جاتی اپنے ساتھ ایک ہانڈی پکا کر ضرور لے جاتی۔ اس وقت جب میں نے وہاں جانے کا ارادہ کرلیا تو اٹھ کر سبزی کی ٹوکری نکالی۔ اس میں ایک پھول گوبھی تھی میں نے وہی نکالی۔ فریزر سے قیمے کا پیکٹ نکالا اور خود بیٹھ کر گوبھی کاٹنے لگی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''یہ کون آگیا؟'' میں نے حیرت سے سوچا......

یہ وہ گیٹ تھا جو باہر روڈ پر کھلتا تھا اور آج سے پہلے کبھی کسی نے اس پر دستک نہیں دی تھی۔ میں تھوڑی سی گھبرا گئی۔ گھر میں اکیلی تو تھی ہی لیکن...... نیچے بھی کوئی نہ تھا...... دروازے کے پاس جا کر میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''کون......؟ کون ہے؟''

''میں ہوں شبانہ آنٹی...... رومی۔'' رومی کی آواز پر میری جان میں جان آئی اور میں نے جھٹ سے کنڈی گرالی...... حالانکہ رومی بھی پہلی بار آئی تھی۔

''آؤ، اندر آجاؤ......'' سلام دعا کے بعد میں پیار سے بولی لیکن وہ گھر کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ سارے گھر کا جائزہ لیا تو اس کے ہونٹ ''واؤ'' کے انداز میں سکڑ گئے اور وہ حیرت سے بولی۔

''آنٹی...... آپ کا گھر کتنا خوب صورت ہے...... کھلا، کشادہ...... اور اس گھر پر صرف آپ کی حکمرانی ہے...... زبردست...... کوئی شیئر کرنے والا نہیں......''

''غم تو یہی ہے کہ کوئی شیئر کرنے والا نہیں......'' میں نے ٹھنڈی سانس لی اور اداسی سے بولی۔

''واہ...... اس میں غم کی کیا بات ہے...... آپ کی اپنی حکمرانی ہے، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں...... کوئی کہنے سننے والا نہیں۔''

''نہیں بچہ......'' میں نم لہجے میں بولی۔ ''اس عمر میں حکمرانی کی خواہش نہیں ہوتی...... دوسراہٹ کی تمنا ہوتی ہے...... کوئی بات چیت کرنے والا ہو، کوئی سننے سنانے والا ہو...... لیکن تم یہ سب باتیں چھوڑو...... اور یہ بتاؤ...... کیسے آنا ہوا...... زلیخا تو ٹھیک ہے ناں......'' میں نے خود کو سنبھالا اور بات بدل دی۔

''جی...... ٹھیک ہیں آنٹی...... بس میں یہ بتانے آئی تھی کہ میرے یہاں دو ہفتے رہ گئے ہیں...... پھر مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں گھبرا کر بولی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو رومی...... تمہارے جانے کے بعد تو زلیخا بالکل اکیلی رہ جائے گی...... کیا ہوگا اس کا؟''

''یہی تو میں آپ سے ڈسکس کرنے آئی تھی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''نہیں رومی...... کچھ بھی کرو لیکن یہاں سے مت جاؤ...... ورنہ تو زلیخا زندہ نہیں رہ سکے گی......'' میں تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

''مزید رکنا میرے اختیار میں نہیں آنٹی......'' وہ

بے بسی سے بولی۔ ''ورنہ تو میں خود بھی زلیخا تائی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی...... لیکن آنٹی...... اس کا ایک حل ہے......اگر آپ کو منظور ہو تو......''

''مجھے......؟'' مجھے اس کی بات پر بے انتہا حیرت ہوئی۔ ''میرا بھلا اس مسئلے سے کیا تعلق ہے رومی بیٹا!''

''آپ کا تعلق ہو یا نہ ہو لیکن اب یہ مسئلہ آپ کے بغیر کوئی حل نہیں کر سکتا۔'' اس کی بات پر میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے بولنے کے لیے الفاظ کا چناؤ کر رہی ہو...... پھر دھیمے لہجے میں بولی۔

''آنٹی...... آپ اور زلیخا تائی ایک دوسرے کی تنہائی دور کر سکتے ہیں......''

''وہ...... وہ کیسے......؟'' میری حیرت انتہا پر تھی۔

''وہ ایسے کہ آپ دونوں مل کر رہیں ایک ساتھ...... ایک گھر میں رہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو رومی...... ہم دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی رشتہ نہیں...... جمعہ، جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ابھی تو ہماری صحیح طرح سے جان پہچان بھی نہیں ہوئی۔ ہم بھلا اکٹھے کیسے رہ سکتے ہیں۔'' مجھے اس کی بات خاصی بیوقوفانہ لگی اس لیے میں نے تفصیل سے جواب دیا۔

''آنٹی...... !'' اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''آنٹی...... آپ دونوں کے بیچ محبت کا رشتہ ہے...... احساس کا رشتہ ہے، اپنائیت کا رشتہ ہے...... خون کا رشتہ تو آپ کا اپنے بیٹے سے ہے...... جو پلٹ کر پوچھتا بھی نہیں کہ ماں کا کیا حال ہے...... جبکہ اسی ماں نے اپنی ساری زندگی اسی کے لیے تیاگ دی ہے۔''

یہی تو میرا ویک پوائنٹ تھا۔ اسی بات پر تو میرے دل پر گھونسا لگتا تھا۔ اتنے دن ہو گئے تھے...... وہ اوپر نہیں آیا تھا۔ بس اس نے ایک فون کال کی تھی کہ وہ دونوں مصروف ہیں' اپنا کلینک دوسری جگہ شفٹ کر رہے ہیں۔ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں فون پر کہہ دوں...... وہ کسی کے ہاتھ بھیج دیں گے...... میں نے کہہ دیا کہ کسی چیز کی ضرورت نہیں...... رومی میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

''آنٹی...... آپ دونوں اکٹھا رہیں گی تو دونوں کو دوسراہٹ ملے گی۔ آپ دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنیں آنٹی...... اپنے بیٹے سے مشورہ کر لیں...... یقین کریں، وہ بالکل بھی منع نہیں کریں گے...... آپ کے اس فیصلے سے انہیں بھی فائدہ ہوگا......'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''فائدہ...... اسے بھلا کیا فائدہ ہوگا؟''

''جب آپ یہ اپر پورشن خالی کر دیں گی تو انہیں اس پورشن کا اچھا خاصا کرایہ ملے گا...... یہاں کے کرائے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں...... دوسرے وہ اس بات پر بھی خوش ہوں گے کہ آپ کو کوئی خیال رکھنے والا اور تنہائی بانٹنے والا مل گیا اور انہیں نجات مل گئی۔'' وہ اپنی آنکھیں گول، گول گھماتے ہوئے بولی۔

''تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں بیٹا...... لیکن اس کے باوجود میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکوں گی......'' میں معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ''اسے تم میری مجبوری سمجھ لو......''

''میں آپ کو فورس نہیں کروں گی آنٹی...... لیکن آپ اس پر سوچیں ضرور...... زلیخا تائی سے جب میں نے یہ بات میں ڈسکس کی تو وہ تو خوشی سے پھولی نہ سمائیں...... آنٹی......'' وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''اگر اس عمر میں آپ ہر کسی دوسرے کو خوشی دینے کا سبب بنتی ہیں...... کسی کا سہارا بنتی ہیں...... تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے...... ورنہ تو......'' وہ مایوسی سے بولی۔ ''میرے جانے کے بعد تو شاید وہ تنہا ایک ہفتہ بھی زندہ نہ رہ سکیں......'' اس کی بات پر میں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

''آنٹی...... آپ کے پاس پیسوں کی کمی ہے نہ ان کے پاس...... آپ دونوں ففٹی، ففٹی کی بنیاد پر خرچہ کریں گی۔ میں بھی ہر ویک اینڈ آپ کے ساتھ آ کر گزاروں گی...... بس...... آپ خود کو آمادہ کر لیں۔'' وہ

اٹھ کھڑی ہوئی اور سلام کر کے چلی گئی۔ میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ میرے دل اور دماغ میں عجیب سی تکرار جاری تھی۔ تنہائی کا عفریت مجھے مارے ڈال رہا تھا اور دل تھا کہ رومی کی بات کی تائید کررہا تھا۔ اگر اس آخری عمر میں، میں کسی کی زندگی کے چند دن بھی بڑھانے کا سبب بنتی ہوں تو یہ بہت بڑی بات ہے...... اور یہ احسان صرف زلیخا پر نہیں...... میرا اپنی ذات پر بھی ہوگا...... میں بھی تو کسی بیکار سامان کی طرح اس گھر میں پڑی تھی ...... آج کتنے دن ہوگئے تھے اسد نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی...... اس ایک فون کال کے سوا اس نے دوبارہ کال کی اور نہ پوچھا...... اگر اس طرح کوئی بوڑھی اور لاچار، تنہا پڑوسن بھی ہو تو انسان اس کا پوچھ لیتا ہے...... لیکن اسد کے دل میں تو یہ بات تک نہیں آتی کہ میں آگ سے جل سکتی ہوں یا باتھ روم میں پیر پھسل سکتا ہے یا مجھے ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے یا کسی وجہ سے میں چکرا کر گر سکتی ہوں۔ آخر وہ اپنی خوشیوں میں اتنا مگن ہے کہ بوڑھی ماں کی اسے رتی بھر پروا نہیں...... میرا دل خون کے آنسو رونے لگا...... کچھ دیر تو میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ پھر بے دلی سے اٹھ کر کھانا بنانے لگی۔

لیکن اسد کی بے حسی نے ایک مشکل فیصلے کو آسان بنادیا تھا۔ اسد ضد میں آکر مجھ پر خرچہ پانی بند کرسکتا ہے لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ افتخار نے بینک میں میرا اکاؤنٹ کھول دیا تھا جس میں میرے نام بہت رقم پڑی تھی اور اس سے میں ہر ماہ پرافٹ لے سکتی تھی۔ لیکن چونکہ مجھے ضرورت نہیں پڑتی اس لیے وہ پرافٹ بھی جمع ہوتا رہتا...... ”بس اب میں وہی استعمال کروں گی...... اور اگر میں ہر ماہ صرف پرافٹ ہی استعمال کروں تو میرا گزارہ ہو جائے گا...... اصل زر کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی......“ میں نے دل ہی دل میں عہد کرلیا کہ جس بیٹے کو میری پروا نہیں...... میں بھی اس کی قطعاً پروا نہیں کروں گی اور میں یہ فیصلہ خود لوں گی......

اگلے دن جب رومی میرا فیصلہ سننے آگئی اور میں نے اس فیصلے کے حق میں رضامندی دے دی تو وہ خوشی سے اچھل پڑی...... وہ ایک دردمند دل رکھنے والی عقلمند لڑکی تھی جو اپنی تائی کے لیے سوچتی تھی جبکہ میرا بیٹا اپنی سگی ماں کے لیے نہیں سوچتا تھا، وہ جب تک میرا سامان اکٹھا کرتی رہی...... میں یہی سب سوچتی رہی۔

”آنٹی...... آپ نے اپنے بیٹے اور بہو سے بات کی؟“ وہ میرے کپڑے بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔

”نہیں......“ میں نے رسان سے جواب دیا۔

”مجھے ان سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... اور ویسے بھی ان کے لیے میرا وجود ہونا یا نہ ہونا برابر ہے......“ وہ خاموش رہی یوں میں اس کے ساتھ اس کی تائی کے گھر چلی گئی۔

زلیخا نے جس طرح میرا گرمجوشی سے استقبال کیا...... جو خوشی اسے میرے آنے سے ہوئی...... اس نے میری ذات پر اپنا مان بڑھا دیا ورنہ تو میں سمجھتی تھی کہ نہ تو میری کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی حیثیت ہے لیکن زلیخا تو خوشی کے مارے اِدھر سے اُدھر پھدک رہی تھی اور بار، بار میرے ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”شبانہ...... تم اپنا اتنا خوب صورت گھر اور آسائشیں چھوڑ کر میرے پاس رہنے آگئی ہو...... میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی اور رضی تو وہاں تمہارا شکر گزار ہوگا۔“ وہ آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”اور نہیں تو کیا......“ رومی ہنس کر بولی۔ ”رضی انکل تو شبانہ آنٹی کے دل سے احسان مند ہوں گے جنہوں نے ان کی پیاری بیوی کے ساتھ رہنا قبول کیا اور ان کی دوسراہٹ کا سبب بنی ہیں۔“

رومانہ نے میرا سامان ایک کمرے میں رکھ دیا اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر کے وہ دو دن بعد چلی گئی لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ وہ فون کے ذریعے مسلسل رابطے میں رہے گی اور...... ہر ویک اینڈ پر باقاعدگی سے آیا کرے گی اور ہمارے سارے کام کر کے جایا کرے گی...... مجھے رومی پر رشک آتا تھا کیا لڑکی تھی وہ...... مخلص، رحمدل، ایماندار، خدمت اور محبت کے جذبات اس کے اندر کوٹ، کوٹ کر بھرے ہوئے

تھے۔کاش...... اس کے والدین زندہ ہوتے تو اس کی ذات سے کتنا فیض حاصل کرتے جو لڑکی اپنی تائی کو اپنی ذمے داری سمجھ کر اس کا ساتھ دے رہی تھی وہ اپنے والدین کی کتنی خدمت کرتی۔ میں نے اپنے دل میں عہد کیا کہ میں اور زلیخا اس کی شادی کے لیے تگ و دو کریں گے بلکہ اس کے لیے اچھا سا رشتہ ڈھونڈ کر اسے اپنی دعاؤں کی چھاؤں میں رخصت کریں گے۔

☆☆☆

میرا اور زلیخا کا وقت بہت اچھا گزر رہا تھا...... وہ اپنی اور رضی کی باتیں کرتی رہتی۔ میری پٹاری میں بھی جو باتیں جمع تھیں وہ بھی میں کھول دیتی...... ہم دونوں مل کر سارے کام کرتے...... وہی وقت جو ٹھہر جایا کرتا...... وہ اب ایسے گزر جاتا کہ اس کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وہ غیر دلچسپ کام جو میں بادلِ ناخواستہ کرتی اب دلچسپ لگنے لگے تھے۔ ہم دونوں خوش تھے...... ایک دوسرے میں مگن تھے۔ ہر روز رومی کا فون آتا تھا، وہ ہم دونوں سے باری، باری بات کرتی تھی، ہم سے ہمارا احوال پوچھتی۔ ہماری صحت کے بارے میں پوچھتی، مشورے دیتی...... تجاویز دیتی، کیا بہشتی لڑکی تھی وہ...... جو ہم سے جھولی بھر، بھر کر دعائیں لیتی تھیں۔ دعائیں بھی ہر بندہ نہیں سمیٹ سکتا...... یہ بھی کسی، کسی کی قسمت میں ہوتا ہے...... ہم اسے دعائیں دیتے نہ تھکتے۔

☆☆☆

صبح کا ٹائم تھا...... میں فجر پڑھ کر بستر میں گھس جایا کرتی...... آج بھی فجر پڑھ کر میں بستر میں گھس گئی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ زلیخا صبح فجر کے بعد ناشتا کرنے کی عادی تھی جبکہ میں ناشتا دیر سے کرتی تھی...... اس وقت بھی وہ مجھے کہہ رہی تھی۔

''شبانہ...... میں نے تمہارا ناشتا میز پر رکھ دیا ہے، میں نہانے جارہی ہوں، چائے دانی کو ٹی کوزی سے ڈھک دیا ہے لیکن اگر چائے ٹھنڈی ہوئی تو پلیز گرم کرلینا۔'' میں اسے ہوں، ہاں میں جواب دے کر اٹھنے لگی۔ زلیخا میرے لیے پراٹھا بنا کر رکھ دیتی ایک انڈا ابوائل اور دوسرا ہاف فرائی بنا دیتی...... میں روزانہ انڈا نہیں کھاتی تھی لیکن زلیخا روزانہ انڈے بنا کر رکھ دیتی تھی۔ آج وہ نہانے چلی گئی ورنہ چائے میں وہ میرا ساتھ دیتی اور ہم دونوں چائے کے ساتھ، ساتھ گپیں بھی لگاتے۔ میں جمائیاں لیتی ہوئی میز پر آگئی۔ چائے گرم تھی۔ میں پراٹھا اور فرائی انڈا کھانے لگی...... ساتھ میں چائے کا کپ بھی ہونٹوں سے لگا لیتی کہ اچانک دروازہ زور، زور سے بج اٹھا۔ میں چونک پڑی اس وقت کون ہوسکتا ہے؟ میں ناشتا چھوڑ کر گیٹ کھولنے چلی گئی کیونکہ گیٹ پر ایک بار پھر زور سے دستک ہوئی اور ساتھ ہی گھنٹی بھی زور سے بجنے لگی۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا وہ دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ ہاں...... وہ میرا بیٹا اسد اور بہو حسنہ تھے' اسد کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ یہاں چھپی بیٹھی ہیں اور ہم سارا، سارا دن آپ کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔''

''میں چھپی نہیں ہوں...... یہاں رہنے آئی ہوں......'' میں نے رسان سے جواب دیا۔

''کیوں......؟ اپنے گھر کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی غیر کے گھر رہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ بولیں ...... بتائیں؟'' وہ درشت اور تیز آواز میں بولا۔

''وہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا گھر ہے...... میرا نہیں۔'' میں اپنی دھیمی سی آواز میں بات کرنے لگی۔

''یہ بھی تو کسی اور کا گھر ہے......'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''وہ تو پھر بھی آپ کے بیٹے کا گھر تھا اور وہ گھر دیکھیے اور یہ دیکھ لیجیے...... زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں......''

''مجھے اونچی عمارتوں سے سر ٹکرانے کا شوق نہیں ہے۔'' میری آواز اب قدرے تیز ہوگئی تھی۔

''مجھے دو سراہٹ چاہیے تھی تم نے مجھے تنہائی کی عفریت کے حوالے کر دیا تھا۔ کہ وہ مجھے جھنجھوڑ ڈالے...... ختم کردے...... مار ڈالے...... لیکن میں جینا چاہتی تھی...... زندہ رہنا چاہتی تھی...... اس لیے میں یہاں آگئی۔''

''اماں...... آپ کو ہم نے ساری آسائشیں دی تھیں...... آپ کو کوئی تکلیف نہیں دیتے تھے پھر بھی آپ نے ہماری عزت کا جنازہ نکال دیا۔ ایک بار بھی نہ سوچا کہ آپ کی اس حرکت سے ہماری کتنی بے عزتی ہوگی۔ کیا جواب دیں گے ہم لوگوں کو...... سب لوگ تو ہمیں ہی برا کہیں گے ناں کہ بیٹے نے ماں کا خیال نہیں رکھا...... حالانکہ ہم نے تو ہر طرح سے آپ کا خیال رکھا تھا۔ آپ کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔'' اب اس کی تیز آواز قدرے ہلکی ہوگئی تھی جبکہ اس کی میسنی بیوی وہی مکاری بھری چپ چہرے پر سجائے کھڑی تھی۔

''بیٹا اس عمر میں بندے کو صرف آسائشوں کی ضرورت نہیں ہوتی......'' میں دھیمی آواز میں بولی۔ ''اچھے کھانے کی خواہش نہیں ہوتی...... اچھے کپڑوں کی ضرورت نہیں ہوتی، بس دل چاہتا ہے کہ کوئی بات کرنے والا ہو...... کسی سے کہہ سن کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا جائے۔ کہ قبر میں بھی تو انسان چپ ہی رہے گا تو زندگی میں وہ چپ کی اذیت کیوں سہے......''

''لیکن اماں......'' وہ احتجاج کے لہجے میں بولا۔ ''آپ جانتی کہ ہم مصروف لوگ ہیں...... ہم آپ کو آسائشیں تو دے سکتے ہیں لیکن چوبیس گھنٹے آپ کو وقت نہیں دے سکتے۔''

''میں نے چوبیس گھنٹے نہیں مانگے ہیں بیٹا جی...... چوبیس گھنٹوں میں سے صرف آدھا گھنٹا ہی مانگا ہے...... یا اس سے بھی کم...... لیکن تم اپنی کے لیے اتنا وقت بھی نہیں دے سکتے تھے...... اس لیے میں نے سوچا کہ اچھا ہے کہ میں تمہارا گھر خالی کردوں تاکہ تم اسے کرائے پر دے دو...... میں نے خوامخواہ تمہاری اتنی قیمتی پراپرٹی پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

''یہ سب باتیں چھوڑیں...... اور اپنا سامان اکٹھا کیجیے...... اور ہمارے ساتھ چلیں...... ہم آپ کو لینے آئے ہیں......'' وہ بات مختصر کرتے ہوئے بولا۔

''بیٹا...... اب بہت دیر ہو چکی ہے...... تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری ماں مر چکی ہے...... اب یہ میرا دوسرا جنم ہے...... مجھے ایسا لگتا ہے جیسے زندگی تو اب شروع ہوئی ہے...... پلیز بیٹا...... مجھے زندگی سے نکال کر دوبارہ موت کی طرف مت لے جاؤ......''

''اگر اماں نہیں جانا چاہتیں تو انہیں مجبور نہ کریں......'' پہلی بار حسنہ اپنے شوہر کی بات میں دخل اندازی کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ یہاں بھی ان کی خبر گیری کر سکتے ہیں...... ان کی دوا اور باقی سب چیزوں کا خیال رکھ سکتے ہیں۔''

''نن...... نہیں......'' میں اسد کے جواب دینے سے قبل بولی۔ ''مجھے تم لوگوں کی کسی قسم کی کسی خبر گیری کی ضرورت نہیں...... میرے پاس میرے شوہر کا پیسہ موجود ہے...... میں اپنا خرچہ خود اٹھانے کی طاقت رکھتی ہوں...... بلکہ میں تو یہ بھی پسند نہیں کروں گی کہ آپ لوگ بار، بار میرے پاس آئیں...... اور خود کو بھی تکلیف میں ڈالیں اور مجھے بھی ڈسٹرب کریں...... آخر آپ مصروف لوگ ہیں...... کہاں کسی کے لیے اپنے وقت کا زیاں کریں گے......''

''اماں...... یہی آپ کا آخری فیصلہ ہے؟'' اسد عاجز آکر بولا۔

''ہاں...... اب تم لوگ جا سکتے ہو......'' میں پیٹھ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی...... پھر قدموں کی دور ہوتی آوازیں آئیں...... میں نے گیٹ کو کنڈی لگائی اور دوبارہ سے میز پر آبیٹھی۔ اس دوران زلیخا باتھ روم سے باہر آگئی تھی اور آتے ہی بولی۔

''کیا گیٹ پر کوئی آیا تھا؟ میں نے گھنٹی کی آواز سنی تھی۔''

''ہاں......'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''بھکاری تھا......''

''تم نے اسے کچھ دیا......؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''نہیں، خالی ہاتھ لوٹا دیا...... کچھ لوگ بھیک دینے کے بھی قابل نہیں ہوتے......'' میں تلخ لہجے میں بولی...... وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرا کر میز سے برتن سمیٹنے لگی۔

انتظار

اپنوں کی سفاکی بیان کرتی خدیجہ شہوار کی ایک چشم کشا تحریر



گھر میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ عین جوانی میں کلیم اللہ کی طبعی موت پر پورا گاؤں دکھی تھا۔ سلیم اور شازیہ کی غم کے مارے حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ پورے گاؤں کے لوگ ان کے درد بھرے چہرے پڑھ سکتے تھے۔ مرد کی چالیس سال کی زندگی جوانی ہی ہوتی ہے۔

''ہائے بھابی..... میں نے کیا کچھ نہ کیا بھائی جان کے لیے..... سویاں پکائیں، دلیا بنایا..... یخنی بنا، بنا کر پلائی..... جو کھانے کی فرمائش کرتے فٹ سے پوری کر دیتی.....'' شازیہ متورم آنکھیں دوپٹے کے پلو سے بار، بار صاف کرتے ہوئے بول رہی تھی۔

"مجھے پتا ہے تم نے بہت خدمت کی ہے۔ بس مقدر میں یہی لکھا تھا شازیہ...... جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کے رہتا ہے......" کلیم اللہ کی بیوی نے خون کے آنسو روتے ہوئے پھر سے اسے سینے سے لگایا تھا۔

"ہائے، ہائے۔ یہ تکلیف بھائی جان کو لے ڈوبی...... یہ بیماری بھائی جان کو کھا گئی۔" شازیہ سینہ پیٹتے نوحہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مجھے آج ہی پتا چلا تھا کہ ان کی طبیعت خراب ہے...... میں صبح پانچ بجے ہی بس میں بیٹھ گئی۔ پتا ہوتا کہ دو دن سے ان کی طبیعت خراب ہے تو پہلے ہی بھاگی چلی آتی...... تین دن پہلے ہی تو گئی تھی جب تو یہ ٹھیک تھے۔" کلیم اللہ کی بیوی سوجی آنکھوں سے گھٹ، گھٹ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ دل خراش باتیں سن کر سبھی کا دل بھر آیا تھا۔

"میں آج صبح اٹھا تو بالکل ٹھیک تھے۔ حکیم صاحب کی دوا کا اثر تھا...... سوچا پھر بھی شہر لے جاؤں...... میں تو سواری کا انتظام کرنے گیا تھا...... پیچھے سے سب کچھ بدل گیا۔ ہائے، ہائے۔ انہیں دو گھونٹ، پانی بھی نہ پلا سکا میں۔ ہائے میری قسمت......" سلیم بھی زاروقطار روتے ہوئے بمشکل اپنی بات پوری کررہا تھا۔

کلیم اللہ کی میت سامنے صحن میں رکھی تھی۔ اسے پچھلے دو دن سے ڈائریا کی شکایت تھی۔ وہ دو بھائی تھے۔ اماں، ابا کی بہت پہلے وفات ہو چکی تھی۔ ان کے باپ کی دس مربعے زمین تھی جو دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہوئی تھی یعنی پانچ، پانچ مربعے۔ لیکن کلیم اللہ نے چند ماہ پہلے اپنی دن رات کی محنت کی کمائی سے پندرہ مربعے زمین اور خریدی تھی۔ سلیم کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ کلیم اللہ، سلیم سے بڑا تھا اور بے اولاد تھا۔ ان کی بیوی دوسرے گاؤں اپنے میکے کچھ دن رہنے گئی ہوئی تھی۔ اس لیے بیماری کی حالت میں کلیم اللہ کی خدمت کی ساری ذمے داری سلیم اور اس کی بیوی پر آگئی۔

☆☆☆

"بھائی! یہ نمکول پئیں۔ یہ اس حالت میں بہت اچھا ہوتا ہے۔" سلیم نے نمکول کا گلاس کلیم اللہ کی طرف بڑھایا جو پیٹ پر ہاتھ رکھے درد سے کراہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نمکول کا گلاس اپنے اندر انڈیلتے زبردست قے نے پھر سے انہیں پیٹ کے بل جھکنے پر مجبور کیا۔ پیٹ میں درد سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ بار، بار قے کرنے کی وجہ سے ایک ہی دن میں جسم لاغر ہو گیا تھا۔ طبیعت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔

"یہ نرم، نرم سویاں بنا کر لائی ہوں۔ انہیں کھلا دینا۔" شازیہ (سلیم کی بیوی) ہاتھ میں ڈش لیے ان کے پاس آئی تھی۔

"یہاں رکھ دو۔" سلیم نے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

"یار...... سلیم......!" درد سے کراہتے ہوئے کلیم اللہ کی آواز بلند ہوئی۔

"جی بھائی جان؟" سلیم نے فرطِ محبت سے پوچھا۔

"مجھے...... اسپتال لے چلو...... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" کلیم اللہ کی آواز میں نقاہت تھی۔ وہ اکھڑی سانسوں کے ساتھ بات کررہا تھا۔

"بھائی جان...... میرے ہوتے ہوئے آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ آپ حوصلہ رکھیں......" سلیم نے بڑے بھائی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے معنی خیز انداز میں دیکھا تھا۔

"نہیں...... یار...... کل سے یہی حال ہے...... طبیعت بگڑتی جارہی ہے۔ بس تو مجھے ڈاکٹر کے پاس شہر لے چل...... درد بہت شدید ہے...... لگتا ہے یہ درد میری جان لے کر چھوڑے گا......" اس نے بے بسی سے کہا۔ ان کے پورے گاؤں میں کہیں بھی اسپتال تو کیا کسی چھوٹے موٹے کلینک کی بھی سہولت موجود نہیں تھی۔ ہاں البتہ ان کے گاؤں میں ایک بہت سیانے حکیم صاحب رہتے تھے۔

"میں حکیم صاحب کو بلاتا ہوں۔ وہ کوئی نہ کوئی دوا ضرور دیں گے لیکن اس سے پہلے آپ یہ سویاں کھائیں...... ہمت کریں گے تو کچھ کھایا جائے گا۔ چلیں اٹھیں......" سلیم نے اسے بازو پکڑ کر اٹھایا تو وہ بمشکل اٹھ بیٹھا۔

"سا...... ساجدہ کو بتا دیا میرا؟" پانی والی سویّاں کھاتے ہوئے کلیم اللہ نے ایک دم سے رک کر پوچھا تھا۔

"جی...... جی بھائی جان۔ میری ان سے بات ہوئی تھی...... کہہ رہی تھیں اماں کی طبیعت شدید خراب ہے۔ آج تو نہیں لیکن کل واپس آنے کی کوشش کریں گی۔" سلیم نے حلق میں اٹکا تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ کلیم اللہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

"ان کی یہ حالت کب ہوئی؟" حکیم صاحب کے سوال پر وہ کچھ چونکا پھر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

"آج...... آج صبح تو ٹھیک تھے بس شام ہوتے طبیعت بگڑی ہے۔" سلیم نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"سلیم میاں۔ ان کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ میں یہ دوا تو دے رہا ہوں لیکن کلیم اللہ کو جلد از جلد اسپتال لے جاؤ......" حکیم صاحب نے سلیم کو دوا تھماتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی در آئی تھی۔

"دعا کریں حکیم صاحب۔ بھائی ٹھیک ہوجائیں۔" سلیم نے دوا کو گھورتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

"ارے...... دل چھوٹا نہ کر...... اللہ صحت دینے والا ہے......" حکیم صاحب اسے تھپکی دیتے ہوئے چل دیے۔ سلیم افسردہ چہرہ لیے اندر آیا۔

"بھائی جان...... حکیم صاحب نے بہت اچھی دوا دی ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ اس دوا سے آپ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔" سلیم نے ان کی ہمت بندھائی۔ کلیم اللہ اب بھی پیٹ پر ہاتھ رکھے سکڑا سمٹا درد سے کراہ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جو سویّاں کھائی تھیں وہ بھی قے کی نذر ہوگئی تھیں۔ معدے میں کوئی بھی چیز ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ صرف ایک دن میں اس کی آنکھیں تھکی ماندی اندر کو دھنسی محسوس ہونے لگی تھیں۔ رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ جسم میں کپکپاہٹ اور چال میں نقاہت آگئی تھی۔

"مجھے اسپتال...... لے جاؤ...... ڈاکٹر کوئی...... اچھی دوا دے۔ دے گا، بوتل لگا دے گا۔" کلیم اللہ نے درد سے لڑتے ہوئے بمشکل بات پوری کی۔ سلیم نے بھائی کی بگڑتی حالت دیکھ کر بے بسی سے گھڑی کو دیکھا۔

"رات کے نو بج رہے ہیں۔ شہر کو جانے والا راستہ بہت ویران اور سنسان ہوتا ہے...... اس وقت شہر جانا خطرناک ہوسکتا ہے...... ابھی کل ہی اس راستے پر دو ڈاکو پکڑے ہیں پولیس نے......" سلیم بے بس تھا۔ کلیم اللہ چپ چاپ چھت کو گھورتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔

"اور تو اور اس وقت کوئی سواری بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ بھائی...... آپ سمجھ رہے ہیں ناں؟" کلیم اللہ نے کچھ کہے بغیر بے رونق سی مدھم آنکھیں بھینچیں۔

"ہم صبح ہوتے ہی شہر جائیں گے...... آپ بس حوصلہ رکھیں...... یہ حکیم صاحب نے بہت اچھی دوا دی ہے۔ یہ دوا کھا کر تو دیکھیں...... حکیم صاحب کا بہت عرصے کا تجربہ ہے۔ ان کی دوا بہت اثر دکھاتی ہے......" سلیم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے بات سمجھائی تھی۔ اس نے مدھم سی ٹھہری آنکھوں سے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ سلیم کے چہرے پر فکرمندی کے آثار پڑھنا دشوار نہیں تھا۔ کلیم اللہ جانتا تھا کہ اس کا بھائی اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔ وہ صبح سے اس کی بے لوث خدمت کررہا تھا۔

اب کلیم اللہ کو صبح کا بے چینی سے انتظار تھا۔ رات کا ایک، ایک پل پیٹ کے بل لیٹتے تو کبھی درد سے لڑنے میں گزر رہا تھا۔ اس قدر تکلیف دہ رات اس کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ سلیم بھی رات بھر سو نہیں پایا تھا۔ وہ بار، بار اٹھ کر بھائی کا حال احوال دریافت کرتا رہا۔ شازیہ نے بھی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ سوپوں سے لے کر کھچڑی، دلیا تک سب بنا ڈالا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت اب بھی سنبھلی نہیں تھی۔

☆☆☆

"اوہو...... بھائی جان...... آپ کی قسمت۔" سلیم نے دروازے سے ٹیک لگائے کلیم اللہ بھائی کو درد سے کراہتا دیکھ کر دل میں سوچا تھا۔ رات پوری ہونے کو تھی لیکن اس کی تکلیف میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا

تھا۔ وہ اس کا درد محسوس کر سکتا تھا۔ درد اسے تھا لیکن سویا سلیم بھی نہیں تھا۔ وہ رات بھر بھائی کے سرہانے کھڑا رہا تھا البتہ شازیہ کب کی بچوں کے ساتھ جا کر سو چکی تھی۔ مرغ کی بانگ سنائی دی۔ یہ ایک اچھی خبر تھی کیونکہ مرغ کی بانگ امیدِ صبح لے کر آئی تھی۔ اس کی نظریں بے ساختہ صدر دروازے کی طرف اٹھیں۔ اسے بھی کلیم اللہ کی طرح صبح کا شدت سے انتظار تھا۔ وہ پھر سے بے تاثر چہرہ لیے دروازے میں کھڑا کلیم اللہ کو معنی خیز آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جو اس کی طرف پشت کیے پیٹ پر ہاتھ جمائے درد سے سکڑا، سمٹا لیٹا تھا۔

☆☆☆

صبح کے پونے چھے بجے تھے۔ ساری رات کا جاگا سلیم کچھ دیر پہلے ہی سویا تھا۔ کلیم اللہ پیٹ کے بل لیٹے اکھڑی، اکھڑی سی سانسیں بھر رہا تھا شاید کمزوری کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ رنگت کل رات سے بھی زیادہ زرد پڑ چکی تھی۔ اندر کو دھنسی آنکھیں مزید اندر کو ڈوبی محسوس ہونے لگی تھیں۔ جسم میں کپکپاہٹ پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کے لیے اٹھ کر خود باتھ روم تک جانا محال ہو گیا تھا۔

بیماری کی وجہ سے اسے اپنا وجود بوجھ لگ رہا تھا لیکن اس نے سلیم کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ خود کو دیوار کے سہارے بمشکل گھسیٹتے ہوئے وہ باتھ روم تک آیا تھا لیکن وہاں کھڑی بچوں کی سائیکل سے اٹک کر بری طرح لڑکھڑا گیا اور سنبھلنے سے پہلے ہی بری طرح زمین پر آن گرا۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اٹھنے میں ناکام ہوا تھا۔ اس کے گرنے کی زوردار آواز نے سلیم کو اٹھنے پر مجبور کیا۔ وہ صحن کی طرف بھاگا۔

''بھائی جان...... بھائی جان!'' اسے جوتا پہننے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ درد سے کراہتے اوندھے منہ زمین پر گرے ہوئے بھائی کو اٹھانے لپکا۔

بدتر حالت مزید بدتر ہوتی چلی گئی تھی۔ اس نے کلیم اللہ کو اس حالت میں دیکھ کر رنجیدگی سے آنکھیں بھینچی تھیں۔

☆☆☆

''مجھے...... ڈاکٹر کے پاس لے چل یار......''

کلیم اللہ نے پلنگ پر لیٹے ہوئے سلیم کو پُر امید نظروں سے دیکھا۔ اس نے رات کا ایک، ایک پل صدی کی طرح درد میں تڑپتے ہوئے گزارہ تھا صرف اس امید پر کہ صبح ہوتے ہی شہر اسپتال جانا ہے۔

''شازیہ......او......شازیہ......! بھائی کی تیاری کر دے...... میں انہیں شہر لے کے جا رہا ہوں۔'' سلیم نے گہری نظروں سے شازیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے منہ سے کچھ کہے بغیر صرف پلکیں جھپکا کر ہاں میں جواب دیا تھا۔

''میں سواری کا انتظام کر کے آتا ہوں...... اور بھائی جان...... زمینوں پر کچھ کام ہے۔ زمینوں کا دھیان بھی تو رکھنا ہے ناں...... شہر میں ہمیں ایک دو دن لگ سکتے ہیں...... میں سوچ رہا تھا کہ زمینوں کا کام ہدایت بابا کے ذمے لگا آؤں۔ وہ ثاقب کے ساتھ مل کر کام سنبھال لے گا......'' سلیم کی سمجھداری دیکھ کر کلیم اللہ کو خوشی ہوئی تھی۔ اس نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

''ٹھیک...... ہے۔ جلدی...... آنا......'' کلیم اللہ اپنا پیٹ پکڑے بستر پر لیٹا تھا۔ سوکھے ہونٹ، مرجھائی آنکھیں، زرد رنگت اس کی حالت چیخ، چیخ کر بتا رہی کہ وہ کچھ لمحوں کا ہی مہمان ہے۔ سلیم فرمندی سے اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

کلیم اللہ اس کا انتظار کرنے لگا اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا! درد کی وجہ سے دُہرے ہوتے ہوئے بھی دھیان صرف دروازے پر مرکوز تھا۔

وقت گزرتا گیا لیکن سلیم واپس نہ لوٹا۔ ساڑھے آٹھ ہونے کو تھے لیکن ابھی تک وہ واپس نہیں لوٹا نہیں تھا۔

''یہ سلیم کہاں رہ گیا۔ شا...... شازیہ......!'' اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ وہ مزید تکلیف برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ لیٹے ہوئے بھی جسم پر کپکپی طاری تھی۔ دو دنوں میں جسم چھوٹے بچے کی طرح دبلا پتلا سا ہو گیا تھا۔

''وہ بتا تو رہا تھا کہ زمین پر کچھ کام ہے وہی ہدایت بابا کے ذمے لگانے گیا ہو گا...... یا شاید

سواری ڈھونڈنے میں وقت لگ گیا ہو...... آ رہا ہو گا۔ بس شہر کی سواری بھی جلدی کہاں ملتی ہے؟ کافی دیر دھکے کھانے پڑتے ہیں۔'' شازیہ نے ان کے اردگرد بکھرے برتن سمیٹتے ہوئے کہا اور کچن میں برتن دھونے چلی گئی۔

انتظار کی گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی گئیں لیکن وہ گھر نہ لوٹا۔ کلیم اللہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ دماغ کسی گہری کھائی میں گرتا محسوس ہو رہا تھا۔ کمزوری نے چارپائی سے اٹھنا محال کر دیا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ سانس لینے میں بھی دقت ہونے لگی تھی۔

''سلیم......! سلیم......!'' کلیم اللہ اکھڑی، اکھڑی سانس لیتے ہوئے چلایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چھایا اندھیرا مزید تاریکی میں بدلنے لگا۔ ساڑھے دس بج چکے تھے لیکن سلیم ابھی سواری لے کر گھر نہیں لوٹا تھا۔

''شا...... شا...... شازیہ......! شا...... زیہ...... پا...... پانی۔'' وہ پوری اعصابی و جسمانی طاقت لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ لیکن کچن میں شاید برتنوں کی کھٹ، کھٹ میں شازیہ تک اس کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ اس کی سانس حلق میں اٹکنے لگی۔

وہ متواتر چلاتا رہا۔ اس کی آواز آہستہ، آہستہ مدھم ہونے لگی۔ لفظ اٹک، اٹک کر منہ سے ادا ہونے لگے۔

لیکن کوئی بھی اس کو جواب دینے کے لیے نہیں تھا۔ شازیہ اب بھی ان کی آوازوں سے بے خبر کچن میں پورے زور و شور سے برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اس سے پہلے برتن دھونے کی آواز ہمیشہ کچن تک محدود رہتی لیکن آج ایسا نہیں تھا۔ برتنوں کی آواز پورے گھر میں رقص کر رہی تھی۔ نہ جانے کس بات کی خوشی منا رہی تھی۔

اب وہاں نہ کوئی پکارنے والا تھا نہ سننے والا...... لیکن برتنوں کی گھر میں رقص کرتی آواز نہ جانے کیسے تھم گئی تھی؟

''گھر آجاؤ...... کام ہو گیا......'' شازیہ نے فون کان سے لگا کر دھیمے لہجے میں کہا۔

''کب......؟'' متجسس آواز ابھری۔

''بس تھوڑی دیر پہلے...... دم توڑ گئے بھائی۔'' شازیہ نے جیسے طمانیت سے کہا۔

''ابھی آیا...... ویسے بھائی جان نے بہت انتظار کروایا...... صبح سے فصلوں میں بیٹھا ذلیل ہو رہا ہوں......'' دوسری طرف سے سلیم کی آواز ابھری۔

شازیہ بے ساختہ ہنسی۔

''ارے...... بیس مربعے زمین تھی...... اتنا انتظار تو بنتا ہی تھا۔ ویسے یہ بیس مربعے میرے نام کب لگوائے گا؟'' شازیہ کی بات پر دوسری طرف سفاکانہ قہقہہ بلند ہوا۔

''ارے...... تیرے لیے ہی سب کچھ کیا ہے...... تھوڑا صبر تو کر...... کر دوں گا تیرے نام۔ اب یہ اپنی ہی زمین ہے......'' دونوں طرف قہقہے بلند ہوئے۔

کچھ ہی دیر میں گھر میں صفِ ماتم بچھی تو سلیم کا غم آسمان سے اور شازیہ کا غم ساتویں آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

''حوصلہ رکھ...... سلیم میاں...... صبر کر صبر۔'' لوگوں میں سے ایک نے لقمہ دیتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

''صبر...... صبر کیسے کروں؟ بھائی جان مر گئے...... میرے باپ جیسے تھے...... میرے باپ جیسے۔'' سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے اظہار غم کیا تھا۔ اس کی متورم سرخ آنکھیں غم جدائی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

''میں یتیم ہو گیا...... میں یتیم ہو گیا...... بھائی جان چلے گئے......'' سلیم خون کے (یا خوشی) آنسو بہاتا رہا۔ لوگ دلاسا دے سکتے تھے۔ سو دیتے رہے۔ سبھی کو لگا تھا بیماری نے ان کی جان لی ہے۔ اپنوں کی طرف کسی کا دھیان گیا ہی نہیں تھا۔

''کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پوشیدگی اور ظاہرداری سب کو جانتا ہے؟''

(سورہ نمبر دو، آیت نمبر ۷۷)

❀❀❀

سلسلے وار ناول | آخری قسط

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت . . . اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے . . . کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں . . . غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے . . . لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے . . . اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے
ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے
ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے
وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے





جامعہ کے اس ہال نما کمرے میں ابھی تک احتشام کی آواز گونج رہی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو...... دنیا میں صرف تم ہی ایک تکلیفوں کو جھیلتی رہیں۔ کچھ لوگ تو اتنے بدنصیب تھے کہ.... بے جرم ہی سزا پاتے رہے۔ ان کا گناہ صرف محبت تھی۔ وہ محبت جو کبھی بے لگام نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اُن کے نصیب انہیں بے مول کرتے رہے۔" وہ ذرا رکا۔

"اور تم کیا سمجھتی ہو عمائم! تمہاری ماں نے کوئی اذیت نہیں جھیلی؟ آخر کوئی تو مجبوری تھی جو وہ تمہیں اپنے سے جدا کر گئیں۔ ہم تب تک دوسرے کی تکلیف محسوس نہیں کر سکتے۔ جب تک خود کو اس کی جگہ نہ کھڑا کریں......"

جب وہ خاموش ہوا تو عمائم بے آواز رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو بے لگام تھے، باغی تھے اور رک نہیں رہے تھے۔ رک سکتے ہی نہیں تھے۔

وہ عمامہ کے غم پر روتی؟ وہ شاہ میر کے درد پر آنسو بہاتی؟ وہ اپنی ماں کی "مجبوریوں" پر تڑپتی یا اس عظیم "داستانِ محبت" پر دھاڑیں مارتی۔

وہ محبت جو بڑی عظیم، مقدس، پاکیزہ اور باوقار تھی۔ وہ ہمیشہ باوقار ہی رہی...... زمانے کی رسوائیوں نے اسے داغ دار نہیں کیا تھا، غلیظ نہیں کیا تھا۔ ناپاک نہیں کیا تھا۔

وہ محبت جو ہر بہتان، ہر الزام اور ہر رسوائی کو سہہ کر بھی بغاوت پر نہیں اتری۔ ہمیشہ ثابت قدم رہی، ہمیشہ مضبوط رہی...... ہمیشہ اٹل اور مستحکم رہی۔ ایک مرتبہ ڈگمگائی نہیں...... کپکپائی نہیں...... تھرتھرائی نہیں۔

"اگر یوں ہے تو یوں ہی سہی...... اب تو کر کے دکھائیں گے۔ ہر الزام کو "سچ" کر کے دکھائیں گے۔" کوئی ایسی محبت بھی کرتا ہے؟ کوئی اس طرح کی محبت بھی کرتا ہے؟

"اور عمائم! تم کیا جانو...... آدھی ادھوری کہانی نے مجھے کس کرب سے گزارہ تھا۔ میں بھی تمہاری طرح اذیتوں کا شکار رہا۔ لیکن اپنی کھوج کو روک نہیں پایا۔ یہ میرا جنون اور میرا تجسس تھا، یہ میرا اپنے باپ سے عشق تھا جو مجھے ایک دن وہاں لے گیا۔" احتشام کی پُرنم آواز نے ایک مرتبہ پھر عمائم کو چونکا دیا تھا۔ وہ گلابی، سوجی آنکھوں سے دیکھتی رہی، ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہی۔

"باپ سے محبت بھی عجیب ہوتی ہے، جیسی شاہ میر (شام) کو اپنے باپ سے محبت تھی۔ اس کی ہر برائی اور بدفطرت کو جان کر بھی انہوں نے اپنے باپ سے صلۂ رحمی کی، ان کا خیال رکھا۔ بدلے میں اس باپ نے کیا دیا؟ ذلت، رسوائی، نفرت اور حتیٰ کہ موت......" وہ رکا۔

"بابا اپنے باپ پر احسان کرنا نہیں چھوڑ سکے تھے تو پھر میں امی کی بابا کے لیے نفرت کو دیکھ کر اس کی کھوج کو کیسے چھوڑتا؟ میں امی کے نفسیاتی اثر کی کھوج کرتا، کرتا ایک دن ابرار منصور اور سونیا ابرار کے گھر جا پہنچا......"

احتشام کے اگلے الفاظ عمائم کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر گئے تھے۔ وہ جیسے رونا تک بھول گئی تھی۔ یہ احتشام اور کیا انکشاف کرنے والا تھا؟

"تم حیران ہوگی، آج یوم حساب ہے یا یوم انکشاف ہے۔ آج تم پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹیں گے اور تم اپنی "لاتعلقی" پر فخر محسوس کرو گی۔ کیا تم اسی زمانے میں رہتی ہو عمائم! اتنی لمبی عمامہ کی کہانی سنا کر مجھ میں عمائم تک آنے کا حوصلہ نہیں...... پھر بھی تمہاری "بدگمانی" کو دور تو کرنا ہے، تم کو "اپنوں" سے ملوانا ہے۔ اور تمہیں اپنا بھی بنانا ہے۔" احتشام کی سنجیدہ آنکھوں میں رنگ سے اتر آئے تھے۔ عمائم ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"اور میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں سونیا چاچی اور اپنے چچا ابرار تک کیسے پہنچ گیا۔ وہ دن بھی بڑا عجیب دن تھا، جب مجھے بابا کے کمرے سے اُن کی ذاتی ڈائری ملی۔ اس ڈائری میں ان کی "داستانِ حیات" تھی۔ ایک،

ایک محرومی، دکھ، نارسائی کی کہانی...... وہ ذلت جو بابا اپنے باپ کی وجہ سے محسوس کرتے تھے۔ وہ محبت جو انہیں عمامہ سے تھی...... اور وہ مجبوریاں جو عمامہ تک جانے نہیں دیتی تھیں۔'' وہ عمائم کو بتا رہا تھا۔

''بابا کی داستان حیات پڑھ کر مجھے خبر ہوئی کہ کچھ لوگ اتنے بدنصیب بھی ہوتے ہیں۔ اس ڈائری میں مجھے چند تصویریں بھی ملیں...... ابرار چچا اور سونیا چاچی کے نکاح کی تصویریں...... نکاح نامہ جس پر بابا کے دستخط تھے۔ پھر بابا جب تک زندہ رہے ابرار چچا سے رابطے میں رہے۔ ان کے فون نمبر، ایڈریس، خط کتابت کے پتے...... پھر چند سال بعد مجھے پتا چلا وہ لوگ پاکستان آچکے ہیں۔ قصہ مختصر میں اپنے باپ جیسے چچا سے ملا...... سونیا چاچی سے ملا، کرن سے ملا...... مجھ پر بہت سے انکشافات ہوئے۔ سونیا چاچی نے میرے پوچھنے پر کچھ بھی مجھ سے نہیں چھپایا۔ ایک، ایک بات بتادی۔ سارا قصہ سنادیا۔ کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھا۔'' عمائم چپ چاپ سن رہی تھی۔

''تب مجھے پتا چلا...... ہمارا گھرانا کتنے بڑے دکھوں کا شکار ہے، وہ کیسی، کیسی بدگمانیوں کا شکار ہے۔ کیسی، کیسی نفرتوں کا شکار ہے۔ مجھے ایک، ایک گرہ کو کھولنا تھا۔ ایک، ایک گانٹھ کو کھولنا تھا، یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ مجھے جان جوکھم میں ڈالنی پڑی تھی۔'' وہ ذرا رکا۔

''بہت پہلے حویلی والوں کے دل صاف کیے۔ بابا صاحب یعنی اپنے ماموں کو حقیقت بتائی۔ مامی اور اپنی امی کو بوسیدہ اوراق کھول کر دکھائے، یہ بہت آسان نہیں تھا۔ اس میں بہت وقت لگا...... لیکن سونیا چاچی انتظار نہیں کر پارہی تھیں...... وہ ہر صورت تم سے ملنا چاہتی تھیں، میرے روکنے کے باوجود......'' وہ دھیمی آواز میں بادبانوں کو کھول رہا تھا...... بہت آسان اور مختصر الفاظ میں عمائم کو دور تک جھنجوڑ رہا تھا۔

''میں بہت آسانی سے سب کچھ ہینڈل کرلیتا۔ اگر بیچ میں نورس کا قصہ نہ آجاتا۔'' احتشام لحہ بھر کے لیے رکا تو عمائم بے ساختہ چیخ اٹھی۔

''نورس کا قصہ......؟'' عمائم نے چلّا کر پوچھا۔ ''نورس کا یہاں کیا ذکر......؟''

''دیکھو...... مجھے ٹوکنا نہیں......'' احتشام نے تنبیہہ کی تھی۔ ''مجھے پوری بات بتانے دو...... ہاں تو یہاں نورس کا ذکر بھی ضرور ہوگا۔ کیونکہ تین سال پہلے نورس کی وجہ سے ایک جرنلسٹ عائلہ نے ہماری ایجنسی کو خفیہ رپورٹ دی تھی۔ وہ لڑکی بہت ذہین اور تیز دماغ رکھتی تھی۔ اس نے اپنی مصدقہ رپورٹ میں ہم پر بہت سے انکشافات کیے تھے۔ بعد میں عائلہ نے ہماری ایجنسی کو جوائن کرلیا...... اور اس کے بعد میں نے عائلہ سے کہا کہ وہ تم پر نظر رکھے اور مجھے پل، پل کی رپورٹ دے۔ کیونکہ نورس تمہارے بہت قریب تھی۔ اور تم میرے دل کے بہت قریب تھیں۔ نورس ایجنسی کو ''مطلوب'' تھی اور تم مجھے مطلوب تھیں۔ ایجنسی نورس کو سرچ کررہی تھی اور میں تمہیں سرچ کررہا تھا۔ نورس کا اگلا ٹارگٹ کون تھا؟ یعنی عمائم؟ بہت جلد ہم پر یہ انکشاف ہوگیا تھا۔'' وہ رکا۔

''اب تم پوچھوگی میں پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہوں...... صاف اور سیدھی بات کیوں نہیں کرتا۔ کہانی کو اتنا الجھا کر مشکل کیوں بنا رہا ہوں اور پھر بیچ میں کہانی کیوں شروع کردی؟ آغاز کہاں ہے اس کا وغیرہ وغیرہ...... تو چلو، پہلے آغاز کی طرف آتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''آغاز ہمیشہ محبت سے ہوتا ہے محبت جو اپنا آپ خود منواتی ہے، مجھے بھی ایسے خاموش کردار سے محبت ہوگئی تھی جس کی اپنی حیثیت اس گھر میں کچھ بھی نہیں تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری ماں اس خاموش کردار سے سخت بیزاری محسوس کرتی تھیں بلکہ کرتی ہیں۔'' وہ بولا۔

''یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ بہت طریقوں سے ڈھلنے والی یہ محبت بہت اولین دنوں میں محض خون کی

کشش تھی۔ ابرار چچا اور بابا کے درمیان رشتے، خون اور محبت کی مقناطیسی قوت تھی۔ میں نے ہمیشہ تمہیں خود سے قریب پایا۔ شاید اس لیے کہ ہم دونوں میں بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ تم بھی محرومیوں کا شکار تھیں، میں بھی رشتوں سے محروم تھا۔ امی نے کبھی اپنے ہوتے ہوئے محبت اور ممتا کا احساس نہیں دلایا تھا۔ اور بابا تو تھے ہی نہیں...... یہی صورتِ حال تمہاری تھی۔'' وہ ذرا رکا۔

''میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا سمجھا...... اپنے قریب سمجھا...... اسی محبت کی کشش میں، میں نے عائلہ کو تمہارے قریب کیا تھا۔ جب مجھے پتا چلا کہ جو نورس ہمیں مطلوب ہے۔ وہ عمائم کے جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر ہے۔ تو پھر تم یوں سمجھو، تب ہی نورس اور تم ہماری ایجنسی اور خاص طور پر میری ہارٹ لسٹ پر تھیں۔ عائلہ کو تمہارے قریب آنے کے لیے ''دوستی'' کا سہارا لینا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے مخلص ثابت رہی ہو، یہ اس لیے ضروری تھا تا کہ تم پر اور نورس پر نظر رکھی جائے۔ نورس جو ایک دینی مدرسہ چلا رہی تھی۔ کیا واقعی وہ دینی مدرسہ چلا رہی تھی؟ اگرچہ ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا مگر اچھے اور برے تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں ناں جو دوسروں کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ اس کھوج کے لیے ہمیں تین سال لگ گئے۔ سب سے لمبا ترین پروجیکٹ۔ کیونکہ ان کا نیٹ ورک بڑا وسیع تھا۔ اس پر اتنی آسانی سے قابو نہیں پایا جا سکتا تھا۔ بہت لمبی اور طویل حکمت عملی کی ضرورت تھی لیکن نورس بہت ہوشیاری سے اپنا کام چلا رہی تھی۔ بہت دور سوچوں کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں...... اور نہ ہی میں تمہارے ''صبر'' کو زیادہ آزماؤں گا...... بہت مختصر الفاظ میں نورس کے گینگ تک پہنچنے کے لیے بہت طریقوں سے تمہیں ''سرچ'' کیا گیا۔ تم پر نظر رکھی گئی اور تبھی تمہیں بہت دفعہ ذہنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ اس کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں...... تمہیں تکلیف دینے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی نورس تک پہنچنے کی...... میں نے بہت دفعہ تمہیں ''الرٹ'' کرنا چاہا...... پیشگی اطلاع دی۔ خطرے سے آگاہ کیا لیکن تم انتہائی معاملہ فہم ہونے کے باوجود بھی نہ سمجھیں۔ حالانکہ اتنی صاف سی بات تھی۔ ثریم کی بہن کے فنکشن میں ایک جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر کا جانا ضروری نہیں تھا۔ لیکن وہ گئی، تمہارے ساتھ گئی...... بھلا کیوں......؟ اس لیے ناں کہ اسے بڑا اہم ''پارسل'' وصول کرنا تھا۔ جگہ کا انتخاب نورس نے ثریم کا گھر کیا...... خود وہ اس کے گھر میں روپوش رہی...... تمہیں پارسل اور بوکے دے کر بھیج دیا۔ کیونکہ نورس کو اطلاع مل گئی تھی کہ آگے ناکہ لگا ہے۔ بعد میں اس کی خوش نصیبی کہ ناکے پر روشان تھا۔ تم نے اذان کے حوالے سے فیور لے لی...... بعد ازاں ''بچ بچا'' کر پارسل بھی نکل گیا...... نورس اس پارسل کے لیے پاگل ہو رہی تھی۔ پھر وہ پارسل کہاں گیا......؟ اتنا تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے ناں مجھے......؟ وہ پارسل میں نے چرایا تھا۔ اور جانتی ہو، اس کھلونے میں کیا تھا ٹائم بم۔ اور بوکے میں موجود پیکٹ میں ایسا نشہ تھا جو اسمگلنگ کے لیے سلیکٹ کی گئی لڑکیوں کو اس قابل بنا دیتا کہ ان کے اندر کوئی احساس کوئی صلاحیت کوئی سوچ باقی نہیں رہتی۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بتایا۔

''پھر نورس نے تمہیں پارسل کے لیے بڑا ستایا۔ میں جانتا ہوں تم ان دنوں بہت تکلیف میں رہی تھیں۔ مجھے پیکٹ واپس رکھوانا پڑا...... لیکن اس سے پہلے نورس نے اپنی اوقات دکھا دی۔ اس نے تمہیں جامعہ میں روک لیا۔ بعد میں مجھے پھر ہائی الرٹ ایکشن لے کر سلپس لکھ، لکھ کر ''عقل'' سے نوازنا پڑا کہ جامعہ سے کس طرح نکلو۔ تم مانو یا نہ مانو...... میں نے ہر موڑ پر تمہاری راہنمائی کی۔ کبھی فلسفوں سے، کبھی تاریخی واقعات سے، کبھی اچھے بھلے لطیفوں سے۔ کیا نہیں کی؟ اب آنکھیں کھول، کھول کر کیا دیکھ رہی ہو......؟ ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ جب تک قصہ تمام نہیں ہوتا۔ تمہیں کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔'' وہ اسے گویا

تنبیہا کہہ رہا تھا۔

''ہاں تو صرف اس پیکٹ کے مشکوک ہونے پر ہی نورس پر ہاتھ ڈال دیا جاسکتا تھا۔ لیکن کہاناں اس عورت کا نیٹ ورک بہت وسیع تھا۔ بہت ہوشیاری کے علاوہ آپریشن نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اوپر سے ہدایات بھی سخت تھیں۔ اُدھر تم بھی کچھ مشکوک ہو رہی تھیں...... ایمان نے الگ منگنی کا شور مچا رکھا تھا۔ پھر تمہاری توجہ ان معاملات سے ہٹانے کے لیے ایمان سے منگنی کروانا ہی پڑی تھی۔

لیکن اس سے پہلے کچھ بہت برا ہو گیا تھا۔ یعنی ثریم کے انکشافات...... جو اس نے بڑے غلط وقت پر تم تک پہنچا دیے تھے۔ اور اس سے بھی پہلے کرن کا معمولی سا جرم...... جب وہ پیکٹ تمہاری دسترس میں دے کر واپس گئی تو نورس کو ثریم کی بالکونی میں دیکھ کر شاکڈ رہ گئی تھی۔ کرن نے اپنی سادگی میں ثریم کو سب بتا دیا۔ جانتی ہو، نورس ٹائپ مافیا کے لوگ ایک ایک لمحے، ایک نکتے کی غلطی کو معاف نہیں کرتے۔ سو کرن کی اتنی معمولی غلطی پر نورس نے بڑے گہرے پلان کے بعد اس کا قتل کروایا۔'' عمائم حیرانی سے سن رہی تھی۔

''نورس یہ نہیں جانتی تھی کہ کرن پر ہاتھ ڈال کر اس نے اپنے لیے ''عذاب'' مول لے لیا ہے۔ کرن کا مرڈر کیس کسی عام شہری کا ہوتا تب بھی اتنا ہی اہمیت کا حامل ہوتا لیکن اب تو معاملہ ہی کچھ اور تھا...... وہ ابرار چچا کی بیٹی تھی اور وہ دونوں اس کے بہیمانہ قتل پر غم سے نڈھال ہو رہے تھے۔ میرے لیے کرن کے قاتلوں کو ڈھونڈنا ایک مشن بن چکا تھا۔'' احتشام لمحے بھر کو رکا۔

''اس کے بعد حالات ہاتھ سے جانے لگے۔ سونیا چاچی، کرن کے بعد تمہارے لیے زیادہ بے قرار ہو گئی تھیں۔ وہ ذرا بھی انتظار کرنے پر تیار نہیں تھیں۔ پھر سوئے اتفاق تم اظہارِ تعزیت کرنے ان کے گھر چل پڑیں۔ ان کو سنبھالنا ابرار چچا اور میرے لیے کتنا مشکل تھا۔ ان لمحات کا ذکر بھلا کیسے کروں......؟ میں بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہا تھا۔'' وہ بتا رہا تھا۔

''اِدھر جامعہ کی نگرانی پر چیف کوئی کمپرومائز نہیں کر رہا تھا۔ اُدھر نورس کی سرگرمیوں کو نوٹ کرنا ہوتا تھا۔ اِدھر تم پر کڑی نگاہ رکھنی ہوتی تھی۔ کیونکہ تم سے کسی بھی گڑبڑ کی امید رکھی جاسکتی تھی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''عائلہ نے ہمیشہ ہر کڑے وقت میں میرا ساتھ دیا۔ لمحہ، لمحہ مجھے باخبر رکھا۔ یہ اس کا پروفیشن بھی تھا۔ تمہارے لیے کچھ باتیں بڑی حیران کُن ہوں گی۔ پھر یوں ہوا کہ شہر کے حالات خراب ہو گئے۔ بم دھماکے کی وجہ سے وقتی طور پر کرن کا کیس دب گیا تھا۔ تمہارے اور نورس کے کچھ کلیش بھی ان دنوں ہوئے تھے۔ ہم لوگ برابر جامعہ کے سامنے والے فلیٹس سے نگرانی کر رہے تھے۔ بہت سے ثبوت اکٹھے ہو چکے تھے اور بہت سے ثبوت ابھی رہتے تھے۔ میں تمہیں برابر ''چوکنا'' رہنے پر اکساتا رہا تھا۔ اور شاید اسی لیے تم محفوظ ہاتھوں اور جگہ پر موجود ہو...... ورنہ تم نے خود کو ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' احتشام شاید بول، بول کر تھک چکا تھا۔ اس لیے لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔ لیکن یہ لمحاتی کیفیت تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر عمائم سے پہلے ہی بول پڑا کیونکہ وہ جانتا تھا اگر نہ بولا تو عمائم کے سوال ابل پڑیں گے۔ وہ بڑے ضبط سے بیٹھی تھی۔

''مجھے یہ تو بتانا نہیں پڑے گا ناں کہ تمہیں ''ٹیکسٹ'' کون کیا کرتا تھا؟ ہر گام پر، ہر موڑ پر تاریخی قصے کون سناتا تھا؟'' وہ آنکھوں میں ڈھیروں چمک لیے عمائم سے مخاطب تھا۔ اور عمائم کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا ہی سر پھوڑ دے۔ وہ اتنے قریب کی چیزیں نہیں سمجھ پائی تھی۔ کیا عمائم سے بڑھ کر کوئی کم عقل بھی ہوگا۔

''ویسے اتنی عام سی چیزیں تم سمجھ نہیں پاتیں...... یہ تو سامنے کی باتیں تھیں...... خیر اینی وے...... بات

کرن کے مرڈر سے شروع کرتے ہیں...... میں نے بتایا ناں کہ نورس کے گینگ میں پلک جھپکنے کی غلطی نہیں ہوتی، نہ کوئی گنجائش ہوتی ہے۔ کرن کو اتنے سے جرم کی سزا ملی کہ اس نے ثریم کو یہ کیوں بتا دیا تھا کہ نورس فنکشن سے گئی نہیں تھی بلکہ ثریم کی بالکونی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھتی رہی اور کرن پر نگاہ رکھتی رہی تا کہ پارسل عمائم تک پہنچ جائے۔ نورس کا سیکنڈ ٹاسک ثریم اور نور تھیں...... ہے ناں حیرانی کی بات کہ انہوں نے کون سا گناہ کیا تھا۔ محض اتنا کہ نور نے انسانی ہمدردی کے تحت تمہیں اپنا گاؤن اور کارڈ دے کر جامعہ سے باہر نکالنے میں مدد دی تھی۔ اور ثریم کی غلطی کیا تھی؟ صرف اسی قدر کہ اس نے کرن کو اپنی ہی کالونی میں نورس کو دیکھ کر جامعہ تک چھوڑتے ہوئے نورس کو اپنی کار میں لفٹ دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔'' احتشام ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

''یہ مین پوائنٹ'' جو کرن کے قاتلوں تک پہنچنے کا سبب بنا۔ صرف اتنے چھوٹے، بے ضرر اور معمولی پوائنٹ پر کرن کے قاتلوں تک ہی رسائی نہیں ہوئی تھی بلکہ نورس جیسی عظیم، باوقار، مقدس، دین دار، نیک، خدا ترس اور رحم دل خاتون کی اصلیت کھل کر بالآخر سامنے آ گئی......'' وہ لہراتے پردے کو کچھ دیر کے لیے دیکھتا رہا۔

یہ اسی کمرے میں لگا پردہ تھا۔ جو پارٹیشن کے لیے لگایا گیا تھا۔ یوں کہ ایک کمرے کے دو حصے ہو چکے تھے۔ یہ ویلویٹ نما پردہ تھا بہت موٹا اور بھاری، اس کے پیچھے کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی عمائم کو لگ رہا تھا کہ اس پردے کے پیچھے کوئی ہے؟ پردے کے پیچھے کون تھا؟ اور پردے کے پیچھے کیا، کیا تھا؟ ابھی جاننا باقی تھا۔ ابھی کچھ انکشافات باقی تھے۔ ابھی تھوڑا سا ''راز'' باقی تھا۔ لیکن جو کچھ عمائم ایک ہی دن میں جان چکی تھی۔ یہ اس کا کمال ''حوصلہ'' تھا جو ابھی تک برداشت کیے بیٹھی تھی۔ ورنہ عمامہ سے سونیا اور سونیا سے عمائم تک کی منزلوں کو سہنا اتنا آسان ہرگز نہیں تھا۔ بیچ میں کتنی ہی مرتبہ ضبط کے ٹانکے اُدھڑے تھے۔ بیچ میں کتنی ہی مرتبہ زخموں کے دھاگے کھلے تھے۔ کئی مرتبہ وہ اونچی آواز میں روئی تھی۔ کئی مرتبہ اسے احتشام نے ڈانٹ کر چپ کروایا تھا۔ کئی مرتبہ اس کے سوال لبوں پر دم توڑ گئے تھے۔ جیسے ابھی، ابھی وہ بے ساختہ چیخ پڑی تھی۔

''نورس ایسی نہیں، وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتی...... مجھے یقین نہیں آتا۔'' عمائم نفی میں سر ہلاتی بے یقین تھی۔ احتشام جیسے تاسف سے سر ہلاتا رہ گیا تھا۔

''یعنی میری اتنی لمبی تقریر کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں ایویں ہی حلق سکھا، سکھا کر تھک رہا ہوں......'' وہ جیسے عمائم پر برس پڑا تھا۔ پھر عمائم کو چپ ہونا ہی پڑا۔ احتشام کی سننا ہی پڑی۔ کیونکہ سب کچھ جاننے کی بے چینی تو اسے بھی تھی۔

''اب بیچ میں ٹوکا تو پھر دیکھنا۔ کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔ ابھی کہ ابھی اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ باقی کی کہانی دوسروں سے سن لینا۔ وہ بھی تمہیں بتانے کو بے چین ہوں گے۔'' اس کے دھمکانے پر عمائم کو اپنے لبوں پر بے ساختہ ہاتھ رکھنا پڑا...... اب وہ بالکل بھی بولنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

''ہاں تو میں تمہاری ہر دل عزیز ہستی نورس کی اعلیٰ صفات پر روشنی ڈال رہا تھا۔ یہ بہت ہی ''چونکنی'' بہت ''ہوشیار'' بہت ''مکار'' اور بہت ''کایاں'' عورت تھی۔ اس نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیل رکھی تھیں۔ اس کا نیٹ ورک بے حد وسیع تھا۔ اس کی سیکیورٹی بہت جدید اور اعلیٰ تھی۔ جامعہ کے کچھ بلاک حساس سسٹم اور برقی آلوں کی وجہ سے مکمل ''محفوظ'' تھے۔ وہاں کوئی آدمی اپنی عقل کی لگامیں دوڑا نہیں سکتا تھا۔ جا بجا کیمرے لگے تھے۔ ایک کنٹرول روم تھا۔ جس میں ہر طرح کے جدید حساس سسٹم، خطروں میں الرٹ کرنے والے ٹائم پیس، جدید کیمرے، کمپیوٹر اور باہر سے منگوائی جدید مشینیں تھیں۔ جو کسی بھی مشتبہ شخص کو

فوکس کرلیتیں۔ جامعہ میں ہونے والی ہر کارروائی کو فیڈ اپ کرتیں...... کوئی چڑیا بھی یہاں ''پر'' نہیں مار سکتی تھی۔ کوئی انجان بندہ ان بھول بھلیوں میں کسی کنٹرول روم کو تلاش نہیں کرسکتا تھا۔ پھر روشان کی کیا مجال...... مگر اس نے اپنی پاک دھرتی کے سپاہی ہونے کا حق ادا کر دکھایا۔ کسی عام آدمی کا ذہن وہاں تک نہیں رسائی حاصل نہیں کرسکتا تھا جس جگہ تک وہ ذہین و فطین جرنسلٹ پہنچ گئی تھی۔ کنٹرول رومز کے نیچے بہت نیچے تہ خانوں تک...... جہاں پر میرے ملک کے نہتے شہریوں کے لیے بھیانک ''موت'' رکھی تھی۔ ٹائم بم، ٹائم مشینیں، دستی بم، خودکش دھماکا خیز مواد، بارودی جیکٹس، نشے کے تھیلے، گنیں، پستول، گولیاں اور وہ سب جو میرے وطن کے معصوم بچوں کو ان کی ''درس گاہوں'' میں بیہمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ جو انہیں ہمیشہ کی نیند سلا دیتے، جو انہیں اسکول کے نام سے خوفزدہ کرتے، ڈراتے، کہا کرتے کہ وہاں موت چکراتی ہے۔ موت دندناتی ہے۔'' وہ بتا رہا تھا۔

''پھر عائلہ نے اس کنٹرول روم تک رسائی حاصل کرلی۔ وہاں کی وڈیوز اور ثبوت اکٹھے کیے اور یہ انکشاف بھی عائلہ نے کیا کہ عنقریب نورس، عمائم کو اپنے گینگ کے ایک گروپ کی لیڈر بنانے والی ہے کیونکہ نورس کو ہمیشہ لاوارث اور بے سہارا، جذباتی طور پر ٹوٹی ہوئی لڑکیوں کی تلاش رہتی تھی۔ اور عمائم تو نورس کا بہت اہم ٹاسک اور آسانی ترین ٹارگٹ تھی۔'' وہ لمحے بھر کو رکا۔

''دوسری طرف نورس اپنی ''اچھائیوں'' اور ''صلۂ رحمی'' کی دھاک بٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس نے بڑے گھاگ انداز میں اپنے ''دورخ'' بنا رکھے تھے۔ اور وہ پورے ملک میں ہر عظیم دہشت گردی کو ہینڈل کرنے میں عقلِ کل کی مالک سمجھی جاتی تھی۔'' وہ اسے نورس کے متعلق بتانے لگا۔ نورس، دراصل تھی کیا؟ اس کی حقیقت کیا تھی؟ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟

''اینجو ئیلی نورس بارڈر پار سے کسی بڑے اسمگلر کے عشق میں فرار ہوکر آئی تھی۔ بعد میں اس کے ساتھ فراڈ ہوگیا۔ اور اس بڑے اسمگلر نے نورس کو دہشت گرد گروپ کے ہاتھ بیچ دیا۔ نورس کا دھوکے باز عاشق نام نہاد مسلمان تھا۔ سو نورس کو مسلمانوں سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہوگئی۔ اس آدمی کی بے وفائی نے نورس کو انسان سے حیوان بنا دیا۔ وہ اس تحریک میں شامل ہوکر اپنے اُدھڑے زخموں کا بدلہ ہر مسلمان پاکستانی سے لیتی رہی۔'' عمائم بغور سن رہی تھی۔

''وہ ذہین عورت تھی۔ تعلیم یافتہ تھی، اسے کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ جلد ہی ''تحریک'' کی روحِ رواں بن گئی۔ اپنی پیشہ ورانہ تربیت میں طاق ہوکر علاقہ غیر سے پاکستان کے ہر بڑے اور اہم شہر تک رسائی حاصل کی۔ اپنا نیٹ ورک بچھایا اور بنیادوں کو مضبوط کر کے پورے ملک میں اپنی نفرت انگیز جڑیں پھیلا دیں۔'' وہ بتانے لگا۔

''اس ضمن میں نورس نے ایک دینی مدرسے کو ٹارگٹ بنایا۔ یہ مدرسہ ایک بیوہ عورت چلاتی تھی۔ وہ انتہائی نیک اور پاک باز عورت تھی۔ وہ بچیوں کو مفت تعلیمی سہولیات مہیا کرتی۔ اور دین و دنیا کے علم سے سرفراز کرتی...... نورس اس مدرسے میں بطور اسٹوڈنٹ داخل ہوئی بعد ازاں اس نے اپنی ہوشیاری اور چالاکی وعیاری سے تمام جامعہ کے ایڈمنز کو منظر سے ہٹا کر اصل مالکن کا پتا کاٹ دیا اور خود فرعون بن کر حکومت کرنے لگی۔ اسے ایک ایسے رجسٹرڈ ادارے کی ضرورت تھی جو کہیں سے بھی ''مشکوک'' نہ سمجھا جاتا۔ اس جگہ بیٹھ کر اس نے ملک کے شہر، شہر میں تباہیاں مچائیں۔ خون خرابے کیے۔ خوف وہراس پھیلایا۔ ناحق لہو بہایا۔ معصوم بچوں کو یتیم کیا۔ عورتوں کو بیوگی کی چادر اوڑھائی، ماؤں کی کوکھیں اجاڑ دیں۔ نفرتوں کے زہر پھیلائے اور انتقام کی گندی ترین داستانیں رقم کی۔'' وہ نورس کی حقیقت بیان کر رہا تھا۔

نورس کا ''اصل مقصد'' کیا تھا؟ مسلمانوں کو پوری دنیا میں بدنام کرنا...... ہمارے دینی اداروں کو مشکوک ثابت کرنا...... اسلام سے نفرت، دین سے بیزاری اور پورے عالم میں مسلمانوں کو ''دہشت گرد'' ثابت کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا...... اور اس نے اپنا کردار بڑی ''ہولناکی وسفاکی'' سے ادا کیا اور پھر ایک دن اسے اسی ذہانت، اعلیٰ ترین مکاری کی منصوبہ سازی اور ہوشیاری پر مات ہوئی بلکہ شہ مات ہوئی۔ اس کے جاسوسی سسٹم ہر بات سے اسے ''باخبر'' رکھتے تھے۔ روشان کا جامعہ آنا جانا مشکوک انداز میں جائزے لینا۔ جامعہ کی ہر لڑکی پر کڑی نگاہ رکھنا۔ تمہارا ''قید'' کرنا۔ پھر جامعہ کے کونوں سے میری ''تاریخی سلیپس'' اٹھا کر تمہارا پڑھنا، جامعہ سے تمہارا فرار...... روشان کے چکر...... وہ سب کچھ کیمرے کی آنکھ سے دیکھ کر محفوظ کر رہی تھی۔'' وہ بتا رہا تھا۔

''پھر اس نے ایک طویل پلاننگ کی...... جامعہ میں ہونے والی کسی ''نمائش'' کا شوشا چھوڑ کر غریب لڑکیوں کو ''لالچ'' دلائی۔ پھر نمائش کے دن اور تاریخ کا اعلان کیا...... اس سے پہلے نورس کے دوسرے گروپ نے اپنی اوقات دکھا کر دہشت گردی کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ نمائش ڈلے ہوگئی۔ نورس کو اس دوران حالات بگڑتے دکھائی دیے۔ اس نے فوری طور پر نمائش کا اعلان کیا...... جگہ اور دن مقرر ہوا۔ نورس نے از خود سکیورٹی طلب کی اور اس کے باوجود بھی عظیم ترین دہشت گردی کا شکار جامعہ کی سیکڑوں طالبات اور عام شہری ہوئے۔ کیوں؟ کیسے؟ کس طرح؟ اس دھماکے کی اصل وجہ کیا تھی؟ ساری خفیہ ایجنسیاں اور ادارے الرٹ ہوگئے تھے۔'' احتشام لمحے بھر کو رکا۔

''نورس کی پلاننگ کے مطابق نور، شریم، عالی اور عمائم نمائش میں شرکت کرتیں...... بعد ازاں ان کو ''اغوا'' کرلیا جاتا۔ پھر دھماکا ہوتا اور پورے جہان کو خبر ہوجاتی کہ جامعہ کی کئی طالبات کے ساتھ یہ سب بھی لقمۂ اجل بن گئیں۔ پلاننگ بڑے کمال کی تھی...... پھر بھی جھول پڑ گیا...... عمائم نمائش میں آئی نہیں...... اور جو آئی تھیں

انہیں پلاننگ کے مطابق اغوا کرلیا گیا تھا۔ نور کے گھر والے تھے نہیں...... ثریم اور عالی کے گھر والے انہیں مردہ تصور کر کے صبر و شکر کا جام پی چکے تھے۔'' عمائم دم بخود تھی۔

''قصہ ختم، خس کم جہاں پاک...... لیکن اصل عذاب تو تب اترا جب عالی اور ثریم کو اغوا کیا گیا۔ عالی، ثریم، نور...... انہیں اغوا کرنے کا مقصد قتل کرنا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ گروپ کی خواہش تھی نئی خودکش حملہ آور کو تربیت دے کر تیار کرنا...... اور اس سے پہلے انہیں نشے کا عادی بنانا...... لیکن پتا ہے کیا ہوا؟'' احتشام نے ایک ڈرامائی وقفہ دے کر عمائم کی سانس تک کھینچ لی تھی۔ وہ جیسے ساکت اور ہکا بکا سی بیٹھی اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پردے کے قریب پہنچ گیا۔ احتشام اب کیا کرنے والا تھا؟ عمائم میکانکی انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''اور تم یہ سن کر اس قدر حیران ہوگی کہ جس جگہ ثریم، عالی اور نور کو لے جایا گیا تھا وہاں پہلے سے انتہائی مدہوش حالت میں... کرن موجود تھی۔ وہی کرن...... جو ابرار چچا اور سونیا چاچی کی معصوم بیٹی تھی۔ تمہاری چھوٹی بہن کرن...... جسے قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کے ذہن کو شکستہ کر کے گینگ رپورٹر بنانے کی تربیت دی جا رہی تھی۔'' احتشام نے جیسے ایک لمحے کے لیے رک کر اپنی بات مکمل کی تھی اور پھر عمائم کی جیسے چیخ نکل گئی۔ تو گویا اس کی سہیلیاں عالی، ثریم، نور اور وہ معصوم کرن زندہ تھیں۔ جن کی اچانک موت نے عمائم کو کتنے ہی دن خود سے بیگانہ رکھا تھا۔

یہ انکشاف عمائم کے لیے ہر تکلیف دہ انکشاف پر بھاری تھا۔ وہ ہق دق رہ گئی تھی۔ بے قرار ہوگئی تھی۔ مضطرب ہوگئی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں سے ملنا چاہتی تھی۔ انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ محسوس کرنا چاہتی تھی۔ چھونا چاہتی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ احتشام کو جھنجوڑ کر پوچھے...... ''وہ سب کہاں ہیں؟'' اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ احتشام سے چیخ، چیخ کر کہے...... ''مجھے ان کے پاس لے چلو......'' اور احتشام پردے کے پاس کھڑا اس کے ہر تاثر کو سمجھتے ہوئے مزید بتا رہا تھا۔

''اور اس کے بعد قصہ انتہائی مختصر محبِ وطن اداروں کا کامیاب آپریشن، اعلیٰ ترین مخبری، لڑکیوں کی بازیابی، تمام خطرناک ترین دہشت گردوں اور ان کے سرغناؤں کے ساتھ پورے گروپ کو زندہ حالت میں گرفتار کرنا...... ان کو بہیمانہ انجام تک پہنچانا...... جامعہ کو ''کلیئر'' کرنا...... ہر بلاک، ہر بلڈنگ سے حساس سسٹم اور بارودی ہتھیاروں کا صفایا کرنا...... طالبات کو محفوظ ٹھکانوں تک پہنچانا...... اور سب سے بڑھ کر تمہاری نورس کو اذیتیں دے، دے کر اس کی کھال اُدھیڑ کر جہنم برد کرنا...... تاکہ مر کر بھی اسے یاد رہے کہ کس، کس باغ کے پھول اجاڑ کر آئی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکا۔

''اس وقت جامعہ ذمے داران کی زیرِ نگرانی ہے۔ کوئی نورس یہاں پر نہیں مار سکتی۔ علاقہ کلیئر ہو چکا ہے۔ اس لیے میں بھی اتنے ٹھاٹ سے یہاں موجود ہوں۔ اور اب تمہارے صبر اور ضبط کا زیادہ امتحان نہیں لیتا۔ اور پردہ اٹھا دیتا ہوں۔ تم اپنی سہیلیوں اور اکلوتی بہن سے مل سکتی ہو......'' احتشام نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پردہ کھسکاتے ہوئے ایک اور دھماکا کر دیا تھا۔ عمائم کے سر پر آسمان آ گرا تھا۔

ویلوٹ کے موٹے پردے کے پیچھے عالی، ثریم، نور اور کرن کھڑی تھیں...... انتہائی تکلیف دہ، پُراذیت، عذاب ناک ساعتوں سے گزرنے کے بعد، اپنے زندہ ہونے کا یقین کر کے روشن چمکتی مسکراہٹوں کے ساتھ عمائم سے بے ساختہ لپٹ رہی تھیں۔ بھینچ بھینچ کر مل رہی تھیں۔ ہنس بھی رہی تھیں۔ رو بھی رہی تھیں...... ملن کا یہ ''موسمِ برسات'' بھی دیر تک چلتا رہا...... احتشام مسکراتا رہا۔

☆☆☆

بعض انکشافات روح تک کو ''ہلا'' ڈالتے ہیں...... اور بعض دفعہ زندگی میں بڑے عجیب، عجیب موڑ آتے ہیں۔ عمائم کی زندگی میں بھی بڑے عجیب، عجیب موڑ آئے تھے۔ بڑے خوفناک موڑ آئے تھے۔ بڑے بھیانک موڑ آئے تھے۔ وہ آج بھی سوچتی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اس دن تائی امی کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود وہ نمائش میں چلی جاتی تو اس کا بھلا کیا حشر ہوتا۔

صد شکر کے اس نے تائی امی کی بات مان لی۔ کیونکہ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن جس دن سونیا نامی خاتون عمائم کی زندگی کے بھیانک انکشاف لے کر اونچے محرابوں والے گھر میں آئی تھیں۔ اس دن عمائم کسی کے روکنے پر بھی نہیں رکی تھی۔ کسی کی آواز پر بھی نہیں رکی تھی۔ حالانکہ بہت سی آوازیں عمائم کے پیچھے آئی تھیں...... لیکن وہ رکی نہیں...... اور اپنی محفوظ پناہ گاہ کو اپنے ہاتھ سے دھتکار کر ہمیشہ کے لیے جامعہ چلی آئی۔

اور اگر جامعہ اس دن پہلے کی طرح نورس کے تسلط میں ہوتا تو عمائم کی بھلا کیا حالت ہوتی؟ وہ عمائم کا بھلا کیا حشر کرتی؟ اسے کس حد تک تباہ کرتی......؟ اور عمائم کے ''لاپتا'' وجود کا کسی کو عمر بھر سراغ نہ ملتا۔

وہ بھی عالی، ثریم، نور اور کرن کی طرح ہمیشہ کے لیے ''روپوش'' کروادی جاتی۔

عالی جو عمائم کی بڑی پیاری دوست تھی۔ جو تین سال پہلے احتشام کے کہنے پر عمائم کی زندگی میں آئی تھی۔ اور جس نے ہمیشہ احتشام کو عمائم کے بارے میں ''باخبر'' رکھا۔ لحظہ لحظہ کی رپورٹ دی تھی۔ اور وہی جان سے پیاری عالی اسے بہت سارے ''عذابوں'' سے بچا گئی تھی۔ جس کے بارے میں عمائم بیچ میں کچھ عرصہ بدگمان بھی رہی۔ جب وہ احتشام سے بے تکلف ہوتی تھی تو پس پردہ عمائم کو برا لگتا تھا۔ لیکن وہ عالی کو روک نہیں سکتی تھی۔ وہی عالی اس دن جامعہ کے پردے سے نکل کر عمائم کو ہنس، ہنس کر بتا رہی تھی...... یہ ہنسنا اس اذیت کے بعد کا تھا جو اس نے اپنے وجود پر جھیلی تھی۔

''اور اب تم عالی کے اس ''ہیرو'' سے ملو...... جسے وہ ''شراب طہور'' اور شراب دوآتشہ کا نام دیتی تھی۔ جو میری گفتگو میں ''وہ'' بن کر شامل رہتا تھا۔ جس کی فرمائش پر میں ہر وقت اس کی تعریفیں تمہارے سامنے کرتی تھی۔ تاکہ تمہیں ''چونکا'' سکوں...... لیکن تم ایسی ڈھیٹ رہیں کہ تین سالوں میں ایک مرتبہ بھی اس ہیرو بیچارے کا پوچھ نہیں سکیں۔ حتیٰ کہ نام تک پوچھنا گوارا نہ کیا۔'' اور جب وہ لوگ پُراذیت لمحات سے گزر چکے تب ہنس، ہنس کر پرانی باتوں کو یاد کرتے رہے۔

''بھئی احتشام شاہ میر نامی...... ''وہ'' کے معروف لقب کے ساتھ تمہارا ''ہیرو'' تھا...... تم اپنا جتا، جتا کر اس کی تعریف کرتی تھیں۔ پھر میں کیوں دلچسپی لیتی۔ تم اول روز سے کہہ دیتیں۔ عمائم! تمہارا ہیرو احتشام شراب دوآتشہ ہے۔ یعنی دو دفعہ کشید کی ہوئی شراب جیسا...... میں آسانی سے سمجھ لیتی۔'' عمائم کے برجستہ جواب نے ثریم، نور اور کرن کو ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہی کرن جو ثریم کی دور پار سے کزن تھی۔ جس کے اچانک مرڈر نے عمائم کو بہت دکھ پہنچایا تھا۔ جس کے گھر وہ تعزیت کے لیے بھی گئی تھی۔ وہی کرن جو سونیا اور ابرار کی بیٹی تھی۔ عمائم کی چھوٹی اور اکلوتی بہن تھی...... جانے کن، کن کربناک حالات سے گزری تھی۔ نورس کے تسلط نے اسے کن، کن اذیتوں سے گزارا تھا۔

اور پھر عمائم اس معصوم کرن سے رکھائی نہیں برت سکی تھی۔ اس نے کرن کو سینے میں بھینچا تو محبتوں کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ اس دنیا میں عمائم کا پہلا خون کا رشتہ ایک محبت بھرا گرم احساس، اس کی اپنی ماں جائی، اس کی اپنی بہن، وہ کیسے بیگانگی برت سکتی تھی۔

احتشام سینے پر ہاتھ باندھ کر مسکراتا رہا۔ وہ اسی منظر کو دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔ کتنا مکمل اور جاندار منظر تھا۔ مگر ابھی کچھ رنگ ادھورے تھے۔ احتشام نے انہیں مکمل کرنا تھا اور پھر احتشام نے انہیں مکمل کر دیا تھا۔

☆☆☆

اسی ماربل کے عظیم الشان جامعہ میں سونیا اور ابرار، احتشام کے بلاوے پر آئے تھے۔ اپنی ایک نہیں، دو، دو بیٹیوں کو لینے...... اور جب انہیں کرن کے زندہ بچ جانے کے بعد عمائم سے ملنے کی خوشخبری ملی تو ان دونوں کو جیسے ہفت اقلیم کی دولت میسر آ گئی تھی۔

اسی باوقار، عظیم جامعہ میں بہت سے کھوئے ہوئے لوگوں کو اپنے بہت اپنے ہمیشہ کے لیے مل گئے تھے۔ اور عمائم جو احتشام کے اس قدر سمجھانے پر بھی سونیا اور ابرار کو اس جرم پر معاف کرنے کا کبھی ارادہ نہ کرتی کہ ان دونوں نے محض اپنی ذات کے لیے عمائم کو عمامہ کی گود میں پھینکا اور خود ملک سے فرار ہو گئے۔

لیکن جب سونیا اور ابرار، عمائم کے سامنے آئے تب نہ وہ بے اعتنائی برت سکی تھی اور نہ ہی رکھائی سے پیش آ سکی۔ نہ غصہ کر سکی نہ ناراضی دکھا سکی۔ بلکہ اپنے ماں، باپ اور کھوئے ہوئے مضبوط حوالوں کو پا کر دنیا بھلا چکی تھی۔

اپنے ماں، باپ کے سینوں سے لگ کر گزشتہ ہر غم، ہر دکھ، ہر محرومی ہر اذیت بھلا چکی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ عمائم ایک سنگلاخ زمین پر کھڑی تھی...... وہ عمامہ کے نام سے ہوتی یا سونیا کے نام سے...... عمائم کے دونوں حوالے بڑے مضبوط تھے۔ بڑے مستحکم تھے۔ بڑے اٹوٹ تھے۔

اور پھر جامعہ کی عظیم دیواروں نے سالوں بعد ملنے والوں کی ہر خوشی، ہر دکھ، ہر آنسو کا ایک، ایک رنگ دیکھا تھا...... جامعہ کا عظیم الشان مینار ملن کی ان ساعتوں پر مبارک بادی کا اعلان کر رہا تھا۔ جامعہ کی عظیم عمارت پر مبارک بادی کا فیضان ہو رہا تھا۔ دوسری طرف اونچے محرابوں والے گھر میں بھی خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔

ہر کوئی شاد اور مسرور تھا۔ بزرگوں سے لے کر بچوں تک...... اس گھر کی بہوئیں، پوتے، پوتیاں...... گویا ہر کوئی بے انتہا خوش دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا، برسوں کے زنگ اتر گئے ہیں، کثافتیں ڈھل گئی ہیں۔

تائی امی بے انتہا خوش تھیں...... اس لیے کہ ان کی عمائم کو اپنا اصل ''نام و نشان'' مل گیا تھا۔ وقتی طور پر دکھ ضرور ہوا تھا کہ عمائم چلی گئی ہے لیکن یہ دکھ لمحاتی تھا۔

وہ جانتی تھیں کہ عنقریب عمائم واپس آنے والی ہے اسی گھر میں...... احتشام کے نام سے منسوب ہو کر...... کیونکہ فقیہہ نے سارے پچھلے باب بھلا کر، کدورتوں کو دھو کر، کثافتوں کو مٹا کر سونیا اور ابرار سے عمائم کو ہمیشہ کے لیے مانگ لیا تھا...... اور سونیا نے شمسہ یعنی تائی امی کو اس معاملے کا اختیار دے دیا تھا۔ عمائم تائی امی کی بیٹی تھی...... وہ جو بھی عمائم کے بارے میں فیصلہ کرتیں...... تائی امی کے لیے سونیا کا دیا گیا ''مان'' ہی بہت تھا۔ سو...... سو انہوں نے احتشام کے حق میں فیصلہ سنا دیا تھا۔

تقی، طاہر، بسمہ، طابہ حتیٰ کہ ایمان، ماہم اور ماما بھی اس فیصلے پر بہت خوش تھیں اور حریم کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔

بابا صاحب اور طاہرہ (اماں) سجدۂ شکر بجا لاتے نہیں تھکتے تھے۔ آخر ان کا باغ مکمل ہو گیا تھا۔ آخر گلشن میں پھول مہک اٹھے تھے۔ آخر موسم بہار آ گیا تھا۔

مگر ایک کمی سی تو ضرور تھی...... اور وہ کمی آج بھی آنکھوں میں نمی سی بھر دیتی تھی۔ طاہرہ کو وہ رات کبھی نہ

بازاری کھانے اور فاسٹ فوڈ

بچوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں ایک مقولہ بڑا مشہور ہے کہ ''بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی آنکھ سے۔'' ماضی میں اس محاورے سے یہ مطلب مراد لیا جاتا تھا کہ بچوں کو ہمیشہ خالص اور معیاری غذائیں کھلائی جائیں تاکہ ان کی نشوونما میں کسی طرح کی کمی نہیں آسکے۔ لیکن دورِ جدید میں اس محاورے کا معنی یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور اب اس محاورے سے مراد زیادہ تر والدین کے نزدیک اپنے بچوں کو مہنگی سے مہنگی چیزیں فراہم کرنا ہی رہ گیا ہے۔ چاہے وہ مصنوعی غذائیں ہوں۔

خاص طور پر مہنگی بازاری غذائیں بچوں کو کھلا کر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی دانست میں بچوں کو سونے کا نوالہ کھلا کر اپنی ذمے داری کما حقہ پوری کر دی۔ حالانکہ وہ یہ نہیں جانتے کہ بازاری کھانے خاص طور پر فاسٹ فوڈز وغیرہ بچوں کی دماغی ذہانت کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ بچوں کی ابتدائی عمر میں ناقص غذا کا استعمال ان کی علمی کارکردگی پر انتہائی منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔

اس حوالے سے سائنسی محققین نے تقریباً 14000 کم عمر بچوں کی کھانے کی عادات اور ذہانت کی سطح وصلاحیت جانچنے کے لیے ایک تحقیقاتی مطالعہ کیا۔ اس سائنسی تحقیق کے اخذ کردہ نتائج انتہائی حیران کُن رہے اور معلوم ہوا کہ تین سال کی عمر کے جن بچوں کو بنیادی طور پر بازاری، پروسس شدہ کھانے یعنی فاسٹ فوڈز کھانے کو دیے گئے، ان بچوں میں

بھولتی ...... وہ غم میں بھیگی رات، وہ آنسوؤں سے بوجھل رات ...... وہ عمامہ سے عمر بھر کی جدائی والی رات ......

اور آخر وہ اپنی ماں کی محبت سے بے وفائی کر گئی ...... وہ اپنی جدائی انہیں عمر بھر کے لیے دان کر گئی ...... سارا زمانہ ان کی ''جانِ من'' پہ گرد اڑا رہا تھا۔ دھول پھینک رہا تھا۔ کیچڑ اچھال رہا تھا۔ اس کے اپنے بھائی اسے دھتکار رہے تھے۔ بھابیاں طرح، طرح کے قصے منسوب کر رہی تھیں۔ اور وہ ہر طنز، ہر طعنے، ہر بہتان، ہر الزام، ہر حقارت بھری نگاہ سے بے نیاز، لاتعلق ہو کر اپنی ماں سے اونچی آواز میں التجا کر رہی تھی۔ اصرار کر رہی تھی۔ آج بھی ضد کر رہی تھی۔ اس دن بھی ٹھنک رہی تھی۔

اپنی ماں سے بار، بار کہہ رہی تھی۔ کئی بار کہہ رہی تھی۔ کہہ، کہہ کر تھک رہی تھی۔

پیاری ماں!

اب مجھ کو رخصت ہونا ہے، کچھ میرا ہار سنگار کرو
کیوں دیر لگاتی ہو سکھیو، جلدی سے مجھے تیار کرو
یہ کیسا انوکھا جوڑا ہے، جو آج مجھے پہنایا ہے
میں حوروں جیسی دلہن بنی، اب اٹھو اور دیدار کرو
اِک ہار ہے سرخ گلابوں کا، اِک چادر سرخ گلابوں کی
اور کتنا روپ چڑھا مجھ پر، اس بات کا تم اقرار کرو
اِک بار یہاں سے جاؤں گی، میں لوٹ کے پھر کب آؤں گی
تم آہ و زاری لاکھ کرو، تم منت سو، سو بار کرو
رو، رو کر آنکھیں لال ہوئیں، تم کیوں سکھیو بے حال ہوئیں

پانچ سال بعد وٹامنز اور غذائی اجزا سے بھرپور گھر کی بنائی گئی غذا کھانے والے بچوں کے مقابلے میں اوسط عقل یعنی آئی کیو لیول انتہائی کم رہا۔
اس تحقیقاتی مطالعے کے بعد محققین بھی یہ بات ماننے پر مجبور ہو گئے کہ وٹامنز اور غذائی اجزا پر مشتمل گھر پر تیار کیے گئے کھانے انسانی دماغ کی نشوونما میں زبردست مدد فراہم کرتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں بازاری، پروسس شدہ کھانے یعنی فاسٹ فوڈز جیسی اشیا دماغ کو آہستہ، آہستہ گھن کی طرح کھا جاتی ہیں۔
چونکہ انسانی دماغ زندگی کے ابتدائی تین سالوں کے دوران اپنی بہترین شرح سے بڑھوتری دکھاتا ہے لہٰذا بچوں کو ابتدائی عمر میں غذائیت سے بھرپور کھانے کی اشد ضرورت ہوتی ہے تاکہ دماغ کی مجموعی صلاحیت اور کارکردگی بہتر ہو سکے۔
اس لیے اگر آپ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے مستقبل میں مختلف طرح کے دماغی عوارض سے محفوظ رہ کر اپنی نمایاں ذہانت سے ایک عالم کو متاثر کریں تو اپنے بچوں کو غذائیت سے بھرپور گھر میں پکائے گئے کھانے کھلانے کو ترجیح دیں۔ علاوہ ازیں آپ بھی اگر بازاری کھانوں یعنی فاسٹ فوڈز وغیرہ کھانے سے اجتناب برتیں گے تو یہ عادت آپ کی دماغی کارکردگی میں بھی زبردست اضافہ کا باعث ہوگی۔
از: قضہ بتول، بہارہ کہو

اب ڈولی اٹھنے والی ہے، لو آؤ مجھ کو پیار کرو
ہاں یاد آیا اس بستی میں، کچھ دیے جلانے تھے میں نے
تم ان کو بجھنے مت دینا، بس یہ وعدہ اک بار کرو

اور عمامہ کے نام کا دیا آج بھی جل رہا تھا...... عمامہ کی یاد کا دیا آج بھی جل رہا تھا۔ طاہرہ کے دل میں...... طاہرہ کی دھڑکنوں میں......
ان کی وہ پاکیزہ اور مقدس بیٹی جو شادی کے نام پر بھی کنواری رہی تھی اسے کیسے ''داغ دار'' کیا گیا تھا۔ اس کی عزت کو کیسے تار، تار کیا گیا تھا۔ ہر بہتان لگایا گیا، ہر الزام لگایا...... ایک محبت عمامہ کا جرم تھا جس کی اسے کڑی سے کڑی سزا ملی...... کوئی ''جرم محبت'' کی ایسی سزا کا بھی مستحق ہوتا ہے؟
اور طاہرہ کو آج بھی وہ رات کبھی نہیں بھولی تھی...... جب عقبی صحن میں اترنے والی گول ماربل کی سیڑھیوں کے آخری قدمچے پر بیٹھی نیم اندھیرے میں گم عمامہ کے قریب کھڑا وہ مضبوط سایہ بے آواز سسک رہا تھا۔ کرلا رہا تھا، رو رہا تھا۔
''دیکھو عمامہ! میں قرض اتار آیا ہوں...... میں عمریں گزار آیا ہوں...... میں خود کو ہار آیا ہوں......'' وہ آواز آج بھی طاہرہ کو بے قرار کر دیتی تھی، مضطرب کر دیتی تھی، بے چین کر دیتی تھی۔ تب طاہرہ کی بادامی آنکھوں میں ریت اڑنے لگتی۔ ایسی ہی دھول طاہرہ کو بے قرار دیکھ کر صوفی صالح صمدانی کی آنکھوں میں اترنے لگتی۔ وہ بھی اتنے ہی مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ کبھی دریچہ کھول لیتے، کبھی باہر نکل جاتے۔
عمامہ کے چلے جانے، دنیا سے پردہ کر جانے کے اتنے بے شمار سالوں بعد بھی صوفی صالح کو اس سوال کا

کبھی جواب نہیں ملا تھا کہ آخر ان کے اتنے تقویٰ، پرہیز گاری، پارسائی اور نیکیوں کے باوجود ایسی ہولناک ذلت ان کے حصے میں کیوں آئی تھی؟

وہ کئی سال تک اس سوال کا جواب تلاش کرتے رہے تھے پھر بالآخر انہیں ایک روز خود ہی سارے جواب مل گئے۔

یہ عظیم الشان ذلت ان کے مقدر میں اس لیے لکھی گئی تھی کیونکہ صوفی صالح کا ''تکبر'' سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ انہیں دولت اور جاہ وحشمت پر کوئی تکبر نہیں تھا۔ انہیں تکبر تھا تو صرف نیک اولاد پر...... اپنے نیک بیٹوں اور پارسا بیٹی پر اپنے حافظ قرآن بیٹوں اور قاریہ بیٹی پر...... کیا کوئی تقویٰ کی بنا پر بھی تکبر کر سکتا ہے؟ کیا کوئی کردار، پارسائی اور نیکیوں، اعمال اور دین دار ہونے پر بھی غرور کر سکتا ہے؟

ہرگز نہیں......

لیکن صوفی صالح کو غرور تھا۔ اپنی نیک، فرمانبردار، صوم وصلوٰۃ کی پابند اولاد پر...... وہ کالونی کے ہر بندے کو تربیت کے نام پر حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ فلاں نے اپنے بچے کی تربیت نہیں کی۔ فلاں کا بچہ گھٹیا، آوارہ، زانی، شرابی ہے۔ اور فلاں کی بیٹی نیچ، بے کردار، سطحی، آوارہ ہے۔

آخر انہیں کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اتنے بڑے تکبر کے بول بولتے۔ ان پر اکڑتے، ضد کرتے، سینہ تانتے۔ خود کو پاکیزہ اور اعلیٰ وارفع ترین انسان سمجھتے۔ باقی سب حقیر تھے۔ کیڑے مکوڑے تھے، کمتر تھے۔ ایک ان کا گھرانا نیک، پارسا، باکردار، باوقار اور بلند تھا۔

پھر اللہ نے انہیں اس تکبر کی کیسی سزا دی۔

ان کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دیا۔ ان کی گردن جھکا دی...... آنکھیں جھکا دیں۔ پھر صوفی صالح کو اللہ سے توبہ کا خیال آیا۔ پھر اگلے بے شمار سال انہوں نے ''توبہ'' میں رہ کر گزارے...... اللہ نے ان کی عاجزی کو قبولیت کا شرف بخشا تھا اور پھر ایک روز ان کی لاڈلی عمامہ اور سر پر رکھے سفید عمامہ شریف کے سارے داغ دھونے اور عمامہ کو اپنے بھائیوں کی نگاہ میں ''بری'' کرنے بیرسٹر ہمدانی کی بیٹی اور منصور جیسے ذلیل انسان کی بہو سونیا چلی آئی تھی۔ اور وہ عمر بھر کے لیے سرخرو ہو گئے تھے۔

☆☆☆

یادوں کا کارواں کبھی متا ہی نہیں تھا۔ رک، رک کر چلتا...... ٹھہر، ٹھہر کر رکتا...... چل، چل کر ٹھہرتا۔ یادوں کے اس میلے میں بھیڑ بھی بہت تھی۔ رش بھی بہت تھا۔ لوگ بھی بہت تھے اور فقیہہ تنہا تھی۔ وہ جب بھی ہوتی...... تنہا ہوتی، اکیلی ہوتی۔

یادوں کے کارواں میں اتنے بڑے ہجوم کے ساتھ ہمیشہ شام اور عمامہ اکٹھے نظر آتے تھے۔ ایک دوسرے کے برابر چلتے ہوئے، اگرچہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر چلتے ہوئے لیکن ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر مسکراتے ہوئے...... پُرسکون، مطمئن وسرشار......

اور فقیہہ انہیں حسرت سے دیکھتی رہتی...... کبھی انہیں روکتی، کبھی آواز دیتی...... کبھی پیچھے بھاگتی...... مگر وہ سنتے ہی نہیں تھے۔ اپنے دھیان میں گم، مگن، پُرسکون چمکتی مسکراہٹوں اور روشن چہروں کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔

فقیہہ ان کے پیچھے بھاگ، بھاگ کر تھکنے لگتی تھی۔ تھک کر ٹوٹ جاتی تھی، ٹوٹ کر گر پڑتی تھی۔ ہانپنے لگتی تھی، کانپنے لگتی تھی۔ پھر بھاگنے لگتی تھی مگر بے سود......

وہ چلتے، چلتے گم ہو جاتے...... اور فیقہ بے دم سی رونے لگتی...... وہ ان کو روک کر، ان کے پیچھے بھاگ کر کوئی طعنہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ تو محض ان دونوں سے معافی مانگنا چاہتی تھی...... لیکن وہ فیقہ کی بات سنتے ہی نہیں تھے۔ جیسے سننا چاہتے ہی نہیں تھے۔ جیسے انہیں فیقہ کی معافی سے کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں تھا۔

فیقہ کو بہت رونا آتا...... وہ خواب سے اٹھ کر رونے لگتی، نیند سے اٹھ کر رونے لگتی...... اور کئی سال تک روتی رہی تھی...... ہر نماز میں، ہر عبادت میں، ہر تہجد میں ایک ہی معافی مانگتی۔ لیکن اب یادوں کے کارواں میں شام اور عمامہ ایک ساتھ چلتے ہوئے پیچھے مڑ کر فیقہ کی طرف ضرور دیکھ لیتے تھے، مسکرا بھی دیتے تھے۔ تاہم خاموش ہی رہتے...... کوئی بات نہیں کرتے۔

اتنے بے شمار سال بعد فیقہ کو لگا تھا کہ شام اور عمامہ اب اس سے ناراض نہیں، خوش ہیں...... کیونکہ آج کی رات اس نے شام اور عمامہ کی یادوں کے کارواں کو دوبارہ دیکھا تھا۔

ایک ہجوم، ایک شور، ایک ہنگامہ تھا...... اور وہ دونوں فیقہ کو سرخ گلاب دے رہے تھے۔''

فیقہ نیند سے اٹھی اور سجدے میں گر گئی تھی۔ تو گویا اس کی گریہ وزاری قبول ہو چکی تھی۔ اس کی معافی قبول ہو چکی تھی۔ شام اور عمامہ نے اپنا ''حق'' جو وہ زبردستی ان سے چھین چکی تھی...... ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا تھا۔ وہ عمر بھر کے لیے سرخرو ہو چکی تھی۔ وہ یادوں کے کارواں میں شام اور عمامہ کے ہم قدم شامل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''اس آخری ٹیکسٹ میں جو مجھے تمہیں کرنا پڑا تھا...... اس میں اگر تم حامی نہ بھرتیں تو میں تمہیں اسی جامعہ میں ملنے کے لیے بلواتا اور تم حیران ہو جاتیں عمائم......!'' احتشام اتنے رش سے نکل کر لوگوں سے مبارک بادیں لیتا۔ اذان، ایمان، روشان اور لقمان وغیرہ کی ''بکواس'' کا برجستہ جواب دیتا اسٹیج پر آ کر دلہن بنی عمائم کے کان میں بولا تھا۔ اور وہ جو سمجھ رہی تھی احتشام نے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ ایک دم بھنا کر رہ گئی تھی۔ احتشام کو اسی طرح کوئی نہ کوئی گزشتہ بات یا واقعہ یاد آ جاتا۔ جسے سنانے کے لیے یا تو اسے فون کرنا پڑتا یا خود آنا پڑتا...... روز، روز کی اس مشقت سے بچنے کے لیے بالآخر اس نے شادی کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ سو اونچے محرابوں والے گھر میں خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔

سونیا، ابرار اور کرن بھی بہت خوش تھے۔ دونوں اطراف دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ اور آج ان تیاریوں کے نتیجے میں ان دونوں کا ولیمہ تھا۔

''مطلب......؟'' عمائم نے جان کر کہا مگر جیسے انجان بن کر......

''یاد کرو، جب میں نے تمہیں میسج کر کے ملنے پر اکسایا تھا۔ تب تم نے کہا تھا۔ میری پسند کی جگہ پر تمہیں آنا پڑے گا...... اگر یہ آپشن میرے پاس ہوتا تو میں تمہیں اسی دن جامعہ میں بلواتا...... لیکن افسوس وہ موقع نہیں مل سکا......'' احتشام کا قلق جاتا ہی نہیں تھا۔ غم دور ہی نہیں ہوتا تھا۔ عمائم کی ہنسی نکل گئی تھی۔

اسے ہنستا دیکھ کر عالی، نرمین، نور، کرن اور ماہم اس کے لتے لینے پہنچ گئی تھیں مگر حریم آج بھی احتشام اور عمائم کے ساتھ تھی۔ ان سب کے طعنوں پر حریم نے ایک ہی برجستہ جواب دیا تھا۔

''بیچاروں کو آج تو ہنسنے، بولنے دو...... باقی عمر تو رونا ہی ہے۔'' حریم کی اس بات پر بزرگوں نے اسے گھورا تھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں ''اللہ نہ کرے کیسی باتیں کر رہی ہو......'' جبکہ نوجوانوں نے خوب سراہا پھر ایک چھت پھاڑ قہقہہ لگا تھا اور محفل زعفران زار بن گئی تھی۔

عمائم نے ہنستے مسکراتے سب کے بے فکر چہروں کو دیکھا۔

اسے بابا صاحب اور نانی کے چہرے پر قرنوں کا سکون دکھائی دیا تھا۔ اسے فقیہہ کی آنکھوں میں خوشی اور کچھ پا لینے کے رنگ نظر آئے تھے۔ اسے سونیا اور ابرار کی آنکھوں میں ''انوکھا سکون'' دکھائی دیا تھا۔ اسے تقی اور طابہ کی آنکھوں میں محبت نظر آئی تھی۔ اسے طاہر اور بسمہ کے لبوں پر دعا اور مسکراہٹ دکھائی دی تھی۔ اسے تائی امی اور بڑی امی کی آنکھوں میں مسرت و اطمینان کی جھلک نظر آئی تھی۔ اسے ماما کی آنکھوں میں حسد کے بجائے خوشی نظر آئی۔

ایمان اور پاہم بھی مسکرا رہے تھے۔ محبتوں کی کونپلوں پر رنگ اتریں تو قوسِ قزح پھیلتی ہی ہے۔ قوسِ قزح اب بھی پھیل رہی تھی۔ بکھر رہی تھی، ستاروں کی طرح چمک رہی تھی۔

عمائم نے ایک گونا سکون کے ساتھ ستاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ آسمان جو بہت بلند تھا، بے کراں تھا، عظیم تھا، وسیع تھا، ستاروں کے جھرمٹ سے بھرا ہوا تھا۔ جگمگا رہا تھا۔ عمائم ستاروں بھرے آسمان کو ایک ٹک دیکھتی رہی۔ وہاں سب سے روشن جو ستارہ تھا۔ وہ عمامہ کے نام کا ستارہ تھا۔ اور وہ شام کے نام کا ستارہ تھا۔

وہ ستارہ اب بھی چمک رہا تھا۔ جگمگا رہا تھا۔ اور سب ستاروں میں زیادہ روشن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ستارہ ایک شیش محل بن گیا۔ آبگینے جیسا حسین محل، کانچ کا خوب صورت محل...... جس کے چکنے فرش، دودھ سے ستون اور موتی سے مینار تھے۔

وہاں سے محبتوں کا ایک ''کارواں'' اٹھتا ہوا نظر آیا...... ایک ہجوم تھا، لوگوں کا رش تھا۔ ایک میلا سا تھا...... پھر بھی انتہائی سکون، انتہائی سکوت اور خاموشی تھی۔ جیسے ایک نظم و ضبط ہو...... بڑے اصول پر کاربند ہونے والا...... قوانین کا پاسدار، قول کا پابند، محبتوں کا کارواں تھا...... عمائم ایک ٹک دیکھتی رہی۔

اس نے زندگی میں ''محبت'' اور ''عشق'' کے درمیان ایسے اصول ایسے قانون، ایسے قواعد اور ایسے نظم و ضبط نہیں دیکھے تھے۔

محبتوں کے کارواں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ شام اور عمامہ آگے چلتے جا رہے تھے۔ عمائم مبہوت سی دیکھتی رہی...... دم بخود سی دیکھتی رہی۔ سب سے روشن ستارے کے شیش محل میں شام اور عمامہ چل رہے تھے۔ آج بھی ہم قدم مگر فاصلے پر ساتھ، ساتھ لیکن آس پاس...... ضبطِ عشق کے مرحلوں سے سر اٹھا کر گزرتے ہوئے...... آج بھی مستحکم اور مضبوط......

کیونکہ ''ضبطِ عشق'' کے ہر مرحلے پر سر اٹھا کر چلنے والوں سے ''تاریخ'' بنتی ہے۔

اور شام، عمامہ کی محبت ''ضبطِ عشق'' کے ہر امتحان، ہر آزمائش اور ہر مرحلے سے گزر کر ''تاریخ'' کا حصہ بن چکی تھی۔

کیونکہ محبت جب نارسائی میں ڈھلتی ہے تو عشق اوڑھ لیتی ہے...... اور عشق جب ''ہجر'' میں ڈھلتا ہے تو ''ضبطِ عشق'' لاتا ہے۔

محبت جب ہر منزل سے سرخرو ہو کر گزر جائے تو ہر دل کے ہر شہر کی ہر گلی میں پکار، پکار کر اعلان کرتی ہے کہ ''میں عشق ہوں''...... ''میں عشق ہوں''...... ''ہاں میں عشق ہوں......''

اور عشق جب ضبط کی منزل پر آتا ہے تو ''تاریخ'' بن جاتا ہے......

عمامہ کی عمائم آج سر بلند تھی، سرخرو تھی۔ اس کا ہر حوالہ معتبر، محترم اور مضبوط تھا۔

(ختم شد)

توبہ ہے! کتنی گندگی ہے، کیسے اطمینان سے بیٹھ کر کھا رہے ہیں، ان کو بدبو تک نہیں آ رہی؟ مجھے یہاں چھٹی منزل تک آ رہی ہے، حد ہے بھئی۔" اماں اپنے گھر کی بالکنی سے نیچے بنی فوڈ اسٹریٹ کو دیکھ رہی تھیں جہاں سڑک پر جا بجا میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے سب ہی فل بھری ہوئی تھیں اور کتنے ہی لوگ انتظار میں کھڑے تھے اور کیوں نہ ہوتے یہاں کے کھانے کی تعریف ہر کسی سے سننے میں آ رہی تھی۔ اب یہاں کا رش اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ کھانا واقعی بہت مزے کا ہے اس لیے گھنٹا بھر انتظار میں کھڑے رہنا بھی لوگوں کو منظور تھا۔

جب سے ریسٹورنٹ میں اندر بیٹھ کر کھانے پر پابندی عائد ہوئی تھی تب سے جگہ، جگہ ہوٹلوں کے باہر کھلی جگہوں پر کرسیاں میزیں لگا کر ان کو فوڈ اسٹریٹ بنا دیا گیا تھا۔ ایسا ہی کچھ منجھلی بلڈنگ کے پیچھے بنی ہوا تھا اور اماں کو اپنا فارغ وقت بالکنی میں کھلی ہوا میں بیٹھ کر گزارنے کا شوق تھا، وہ کہتی تھیں جو مزہ اور ٹھنڈک کھلی فضا میں ہے، وہ اے سی والے بند کمروں میں کہاں۔

"ذرا موٹر سائیکل والوں کو تو دیکھو کیسے خطرناک طریقے سے اِدھر سے اُدھر نکال لیتے ہیں...... سانس ہی رک جاتی ہے میری تو۔" پہلے تو وہ اسی بات پر کڑھتی رہتی تھیں۔

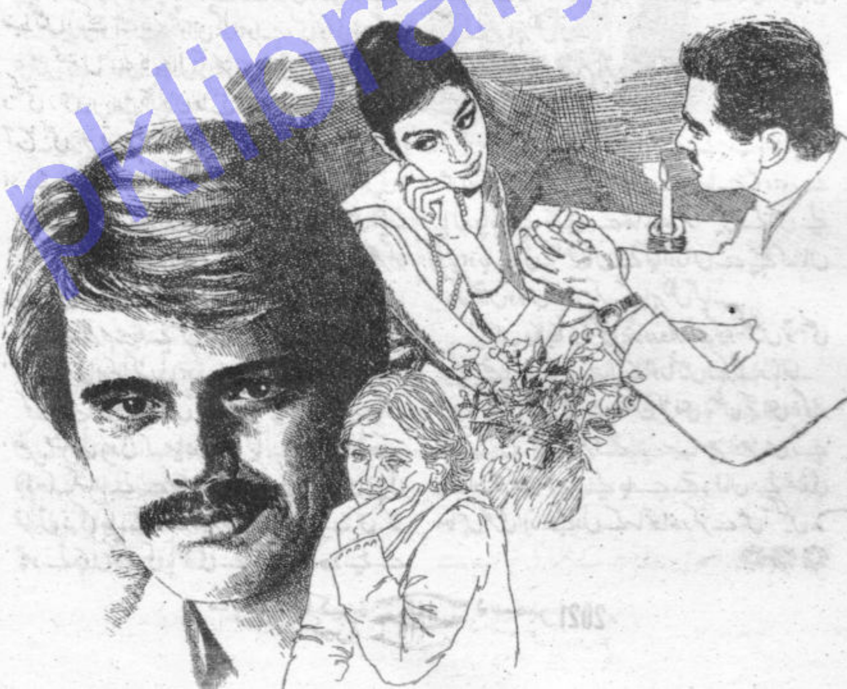
"توبہ، توبہ کیسے آرام سے سگنل توڑ کے نکل گیا گاڑی والا۔"

تو کبھی رکشوں اور بسوں کے ہارن سے نالاں۔

سب سے زیادہ تکلیف انہیں سڑکوں پر جمع پانی اور کچرے کو دیکھ کر ہوتی تھی جسے اب ان ریسٹورنٹ والوں نے ڈھک ڈھکا کر وہیں اب میز کرسیاں بچھا کر لوگوں کو کھانا کھلانا شروع کر دیا تھا اور اماں لوگوں کو اس

چراغ تلے

مریم شہزاد



گندگی میں بیٹھ کر مزے سے کھاتا دیکھتیں تو ان کا اپنا جی متلانے لگتا تھا، یوں تو ان کو ایک نیا شغل مل گیا تھا مگر ان کی نفیس طبیعت پر یہ ماحول بہت گراں گزرتا تھا۔

''ارے کیا ان کے گھروں میں کھانا نہیں پکتا؟ یا ان کی عورتوں کو پکانا نہیں آتا؟'' اماں ایک بار پھر غصے سے بڑبڑائیں۔

''کیا ہوا اماں؟ کس پر غصہ کر رہی ہیں؟'' ملیحہ بالکنی میں آئی تو اماں کو دیکھ کر پوچھا۔

''غضب خدا کا...... ان مردوں کے دیدوں کا پانی مر گیا ہے، اپنی بیوی، بیٹیوں کے ہمراہ کھلی سڑک پر بیٹھ کر کھانے آجاتے ہیں، کوئی شرم حیا ہی نہیں ہے اور پھر اُدھر شامیانہ لگا دیا تو کیا ہوا ذرا اس کے پیچھے بھی تو جھانک کر دیکھو...... کیسے کتے بلیاں لوٹ رہے ہوتے ہیں۔ کیسا زمانہ آگیا ہے اللہ معاف کرے......''

''اماں آپ کو آخر غصہ کس بات پر ہے؟ گندگی پر یا عورتوں کو سڑکوں پر کھانا کھلانے پر؟'' ملیحہ نے پوچھا۔

''اے دفع کرو، مجھے کیا پڑی ہے کسی پر غصہ کرنے کی...... ہمیں تو بچپن سے یہی سکھایا جاتا تھا کہ ڈھک کر کھاؤ، چھپا کر کھاؤ، کچرا تک چھپا کر پھینکتے تھے کہ کسی کا دل خراب نہ ہو۔ مگر یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، کسی کو کوئی ڈھنگ ہی نہیں ہے۔'' اماں نے دل کی بھڑاس نکالی۔

''اماں اب ٹرینڈ مطلب وتیرہ ہی یہ بن گیا ہے کہ ویک اینڈ پر باہر ہی کھانا کھایا جائے۔''

''لیکن بہو! ذرا کوئی سوچے تو چاروں طرف اونچی، اونچی بلڈنگیں ہیں اور اس میں یقیناً چلو دس بارہ نہ سہی ایک گھر تو ایسا ہو سکتا ہے ناں جس میں گھر والوں کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہ ہو رہا ہو یا ایسے سفید پوش بھی آباد ہوں گے جو اپنا بھرم نہ جانے کس طرح رکھے ہوئے ہوں گے۔ ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی یا چلو ایسا کوئی بھی نہیں ہو مگر کوئی تو ایسا ہوگا ناں جس نے اپنے بچوں کی تربیت اس طرح کرنی ہوگی کہ میانہ روی کیا ہے یا کھانا ڈھک (ڈھک کر کھانے سے مراد اماں کی یہ ہوتی تھی کہ کسی چیز کی نمائش نہ کی جائے اور نہ دوسروں کو چڑایا جائے حتیٰ کہ چھوٹے بچوں کو گھر کی پالتو بلی کے سامنے دودھ دینے سے بھی وہ بہت منع کرتی تھیں) کر کھاتے ہیں، وہ یہ سب دیکھ کر اپنے ماں باپ کی طرف سوالیہ نظروں سے نہ دیکھتے ہوں گے؟'' اماں دکھ سے بولتی چلی گئیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں! مگر اب تو لگتا ہے کہ کوئی سدھر ہی نہیں سکتا۔''

''اور یہ دیکھا ہے تم نے، یہ جو مسجد کے بیت الخلا کی دیوار ہے اس کے ساتھ ہی کھانا لگا ہے، استغفر اللہ! کسی بات کا کوئی احساس ہی نہیں۔''

''بس اماں کیا کہہ سکتے ہیں...... اچھا اماں وہ......''

''کیا ہوا کچھ کہہ رہی تھیں؟'' اماں نے پوچھا۔

''اماں وہ عرفان کہہ رہے ہیں کہ ہم کچھ دیر کے لیے بچوں کو لے کر باہر جا رہے ہیں۔''

''اچھا، اچھا ٹھیک ہے چلے جاؤ بس جلدی آجانا۔''

''اماں وہ......'' ملیحہ نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر اس کی زبان لڑکھڑا گئی وہ اندر آگئی اور عبایا پہن کر تیار ہوگئی

''اماں کو بتا دیا کہ ہم کھانا باہر کھا کر آئیں گے۔'' عرفان نے پوچھا۔

''نن...... نہیں...... میں بچوں کو لے کر نیچے اترتی ہوں، آپ بتا کر آجائیں۔'' وہ جلدی سے بولی اور بچوں کو لے کر باہر نکل گئی۔

''ٹھیک ہے، تم اترو میں آتا ہوں۔'' عرفان اماں کے پاس آیا۔

''اماں آپ کھانا کھا لیجیے گا ملیحہ نے سب ہاٹ پاٹ میں رکھ دیا ہے۔ اور پھر آرام سے سو جائیے گا، ہمارے پاس چابی ہے، ہم باہر سے کھانا کھا کر آئیں گے اس لیے دیر ہو جائے گی۔'' عرفان نے کہا اور اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہتیں وہ ان کو سلام کر کے باہر نکل گیا۔

اماں ہکا بکا سی کبھی بند دروازے کو دیکھتیں تو کبھی نیچے بیٹھے لوگوں کو...... جہاں کا شور انہیں زہر لگ رہا تھا۔

کٹا کٹ، کٹا کٹ، چکن کڑاہی، مٹن کڑاہی، گولہ کباب، سیخ کباب، پراٹھے...... سب دھڑا دھڑ بن رہے تھے اور گاہکوں کو سرو کیے جا رہے تھے۔ اماں نے ٹھنڈی سانس بھری اور بجھے دل کے ساتھ اندر کمرے میں آگئیں۔

❁❁❁

خواب کی تعبیر

ممتاز عمر



”کیپٹن صاحب! صبح کی کیا تیاری ہے؟“

”بابا جان! اسکول میں پارٹی ہے۔ نویں جماعت کے طلبا دسویں جماعت کے طلبا کو الوداعی پارٹی دے رہے ہیں۔ پہلے تمام طلبا ہال میں جمع ہوں گے جہاں ہماری جانب سے ہر طالب علم کے لیے اس کی شخصیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک، ایک شعر پڑھا جائے گا۔ پھر دسویں جماعت کے طلبا کی جانب سے محترم اساتذہ کرام کی خدمت میں اشعار کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا جس کے بعد کھانے پینے کا پروگرام ہے۔“

”بیٹا وہ دن کب آئے جب ہمارے خوابوں کی تعبیر تم ہمارے سامنے پاک فوج کی وردی پہنے کاندھوں پر فیتے سجائے کھڑے ہوں گے؟“ باپ، بیٹے کی اس گفتگو میں ماں بھی شامل ہوگئی تھیں۔

''ماما انٹر کے بعد کمیشن کے لیے سلیکشن ہوگا اور بس آپ یہ سمجھیں کہ آپ کا بیٹا بہت جلد اس منزل کو پانے والا ہے۔صرف دو، تین سال کی بات ہے۔ ہاں......! مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں فوج میں کب جاؤں گا؟ آپ اور بابا جان نے تو مجھے بچپن ہی سے کیپٹن صاحب کہہ کر میری رگوں میں موجود خون کو ولولے، حوصلے اور جوش سے ہم آہنگ کر دیا ہے کہ میرا مقصدِ حیات فوج میں شامل ہو کر ملک و قوم کی خدمت کرنے کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔'' عمر گل اپنی ماں کی یہ بات سن کر بڑی استقامت سے گویا ہوا۔

پشاور کے ایک گھر میں یہ گفتگو 15 دسمبر کی شب ہو رہی تھی جہاں اس گھر کے مکینوں کی کل تعداد تین نفوس پر مشتمل تھی۔ عمر گل کا باپ گل فراز ایک تاجر تھا۔ جس کی بڑے بازار میں الیکٹرانک کے سامان کی بڑی دکان تھی۔ عمر گل کی ماں عذرا خانم اپنے شوہر کی چچا زاد تھی۔ شادی کے کئی سال بعد تک اولاد کی خواہش پوری نہ ہوئی اور شادی کی کئی سالگرہیں سونی گود کے ساتھ گزریں تو عذرا کا سرخ و سفید چہرہ پیلا پڑنے لگا مگر پھر اس کے شوہر نے تسلی دی۔ پہلے دونوں نے اپنا طبی معائنہ کرایا جس کے مطابق وہ دونوں مکمل طور پر تندرست قرار پائے...... مگر قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ جس کے بعد دعاؤں اور منتوں کا سلسلہ شروع ہوا...... یوں شادی کے ساتویں سال ان کے گلشن میں عمر گل کی صورت میں پھول کھلا۔

منتوں اور مرادوں سے مانگے ہوئے اس بچے کی آمد نے گھر کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔ ہر طرف خوشیاں بکھری تھیں، دعوتیں ہوئیں...... مٹھائیاں بٹیں اور پھر عذرا اپنے بچے کی پرورش میں تندہی سے مصروف ہو گئیں۔ عمر گل کے متولد ہونے کے بعد ان کے یہاں مزید بچے کی ولادت نہ ہوئی جس پر کچھ زیادہ خیال بھی نہ کیا گیا کہ اللہ نے جو ایک بیٹا دیا ہے وہی اُن کے گھر کو جنت بنا رہا ہے۔

عمر گل کی اٹھان بہت اچھی تھی، وہ اپنے ہم عمروں میں صحت مند اور ڈیل ڈول کے حوالے سے نمایاں معلوم ہوتا تھا اور کیوں نہ ہوتا ماں، باپ کی تمام تر توجہ کا مرکز و محور وہی تھا۔ تین سال کی عمر میں اسے اسکول کی راہ دکھائی گئی۔ یوں وہ اسکول میں داخل ہوا۔ اسکول جانے آنے کے لیے وین لگی تھی۔ ہر صبح اس کی ماں اپنے لختِ جگر کو تیار کرتی اور وین میں بیٹھا کر اسکول کی طرف روانہ کر دیتی۔ اس دوران اس کا شوہر بھی اپنے کاروبار پر چلا جاتا۔ گھر میں ملازمہ موجود تھی مگر عذرا خانم بھی گھر کے کاموں میں جتی رہتی اور اپنے بیٹے اور شوہر کے لیے قسم، قسم کے پکوان تیار کرتی...... سردیوں کی آمد ہوتی تو عمر گل کے لیے سوئیٹر بُنتی جسے دیکھ کر گل فراز اکثر کہا کرتا۔ ''بلاوجہ اتنی محنت کرتی ہو بازار میں بڑے اچھے، اچھے ڈیزائن کے سوئیٹر زبہ آسانی دستیاب ہیں۔'' جس پر وہ کہتی ''میرے ہاتھ کے بنے سوئیٹروں میں ماں کی جذباتی محبت اور ممتا بھی موجود ہوتی۔''

عمر گل اپنے والدین کی امیدوں کے مطابق اپنی پڑھائی پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آٹھویں کلاس تک وہ اپنی کلاس میں اول آتا رہا۔ نویں جماعت میں بھی اس نے A+ سے کامیابی حاصل کی۔ وہ محض تعلیمی سرگرمیوں میں ہی مشغول نہ رہتا بلکہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی اپنے اسکول کے ممتاز ترین طلبا میں شمار کیا جاتا۔ 15 دسمبر کی شام وہ خوب صورت کارڈوں پر اپنی خوشخطی کے جوہر دکھاتے ہوئے کافی دیر سے اشعار لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے باپ کی آمد اور کیپٹن صاحب کہہ کر مخاطب کرنے کے دوران ماں اور باپ کی گفتگو کے بعد تینوں نے رات کا کھانا کھایا اور کھانے سے فارغ ہو کر ایک بار پھر وہ کارڈ لے کر اشعار لکھنے میں مصروف تھا۔

''بیٹا کیا سارے کارڈ تم نے ہی لکھنے ہیں؟'' اسے نہایت مصروف دیکھ کر باپ نے پوچھا۔ جس پر وہ بولا۔

''نہیں میرے حصے میں تو آدھے آئے ہیں کیونکہ میرے علاوہ حذیفہ کی لکھائی خوشخط ہے اسی لیے سر نے ہم دونوں کو برابر، برابر کارڈ بانٹ دیے تھے۔''

وہ رات دیر تک کارڈ لکھتا رہا اور ان کے دائیں بائیں

مختلف کلرز سے مزید خوب صورتی پیدا کرنے کی کوشش میں اس قدر محو رہا کہ وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہو
"بیٹا اب سو جاؤ......" رات گیارہ بجے کے بعد اس کی ماں نے وقت بتاتے ہوئے کہا۔

اگلی صبح نماز فجر سے فارغ ہو کر عذرا تو ناشتا بنانے کے لیے کچن کی طرف چل دیں جبکہ گل فراز ... قرآن کریم کی تلاوت اور پھر اخبار کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ عمر گل اٹھا اور اسکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ تمام کارڈ احتیاط سے ایک شاپر میں رکھے۔۔۔ یونیفارم، پہنا، جوں ہی نظر گھڑی کی طرف پڑی زور سے پکارا۔

"ماما......! میں اسکول جا رہا ہوں۔ وین آ گئی ہے۔"

"ناشتا بالکل تیار ہے بیٹا۔" ماں نے آواز دی۔

"نہیں ماما، دیر ہو رہی ہے۔ وین آ چکی ہے، اب ناشتے کا وقت نہیں اور آج تو اسکول میں پارٹی بھی ہے وہیں کھالوں گا۔" اسی دوران ماں اس کے قریب آ کر بولی۔

"بیٹا ناشتا بالکل تیار ہے۔" اتنے میں باہر سے وین کے ہارن کی آواز آئی۔ عمر گل نے اپنی ماں کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"ماما، آپ سمجھیں میں نے ناشتا کر لیا۔" اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ باہر کی طرف چل دیا۔ عذرا محویت کے عالم میں اپنے ہونہار بیٹے کو گھر سے نکلتے دیکھتی رہی۔

عمر گل کے اسکول چلے جانے کے بعد عذرا اور گل فراز نے بیٹھ کر ناشتا کیا۔

"تم عمر گل کے ساتھ ناشتا کرتیں۔" گل فراز نے بیوی سے کہا۔

"وہ رات دیر سے سویا تھا اس لیے صبح بیدار ہونے اور پھر تیاری میں تاخیر ہو گئی، ناشتا تیار تھا میں اصرار کر رہی تھی کہ اچانک وین کا ہارن بجا اور وہ ناشتا کیے بغیر چلا گیا۔" عذرا ...... نے بتایا۔

"دراصل وہ آج کی پارٹی کے لیے اس قدر فکرمند تھا کہ کھانے پینے تک کا خیال نہیں رہا۔ تم نے شاید غور نہیں کیا کہ رات کو بھی اس نے بڑے لاابالی انداز میں کھانا کھایا تھا۔" ناشتے سے فارغ ہو کر گل فراز گاڑی نکال کر اپنی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد عذرا گھر کے کاموں کی طرف متوجہ ہوئی اسی دوران ملازمہ بھی آ گئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ آج واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھو لیے جائیں۔" عذرا نے کہا۔

"ایسا کرو تم دونوں کمروں کی جھاڑو دے کر

مشین لگالو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ خود کچن کی طرف چل دی۔ کچن اور ٹی وی لاؤنج ساتھ ساتھ تھے۔ آج کوکنگ چینل سے مسالے والی تہ دار بریانی بنانے کی ترکیب بتائی جارہی تھی۔ عذرا کچن کی مصروفیات ترک کر کے بریانی بنانے کی اس ترکیب کو سمجھنے اور لکھنے کے لیے ٹی وی لاؤنج میں آبیٹھی۔ دن گیارہ بجے کا وقت تھا ایک طرف ترکیب بتائی جارہی تھی تو ساتھ ہی نیچے بریکنگ نیوز کی پٹی چلنی شروع ہوئی۔ تازہ ترین خبر یہ تھی کہ آرمی پبلک اسکول پر دہشتگردوں نے حملہ کردیا ہے۔ اسکول اور کالج کے بچے اور اساتذہ یرغمال بنالیے گئے ہیں۔ یہ خبر وقفے، وقفے سے آرہی تھی کہ اچانک نشریات روک کر آرمی پبلک اسکول کے بارے میں فوری معلومات پیش کی جانے لگیں۔ عذرا نے گھبرا کر کئی چینل بدل ڈالے۔ ہر چینل سے یہی خبر نشر ہورہی تھی۔ جس میں ابتدائی طور پر چند بچوں کے وحشیانہ قتل کی خبر آرہی تھیں۔

عذرا کی نظریں اور کان بظاہر ٹی وی اسکرین کی طرف تھے۔ مگر لاشعوری طور پر وہ اسکول میں موجود دہشتگردوں کی فائرنگ کا تصور کرتے ہوئے اضطراب و بے چینی کا شکار تھی۔ اس نے فوراً موبائل فون اٹھایا۔ گل فراز کا نمبر ڈائل کیا مگر ابتدائی کئی کوششوں میں رابطہ نہ ہوپایا۔ نیٹ ورک بزی معلوم ہوتا تھا۔ کافی دیر بعد رابطہ ہوا۔ دوسری طرف سے گل فراز کی کٹی، کٹی آواز سنائی دی جس میں وہ کہہ رہا تھا کہ ''میں گھر آرہا ہوں۔'' کچھ دیر میں وہ آپہنچا تھا۔ اس دوران ٹی وی چینلز آرمی پبلک اسکول میں ہونے والے دہشتگردی کے واقعے کو براہِ راست نشر کررہے تھے۔ دہشتگردی کا نشانہ بننے والے بچوں کی تعداد بڑھتے ہوئے پچاس سے زائد ہوچکی تھی اور یہ خبر ان کے اضطراب کو مزید بڑھانے کو کافی تھی کہ دہشتگردوں نے اسکول کے اس ہال کو بھی نشانہ بنایا جہاں نویں، دسویں کے طلبا کی پارٹی ہورہی تھی۔ گل فراز نے گھر پہنچتے ہی بتایا۔

''ہر طرف افراتفری کا عالم ہے، بازار بند ہوچکے ہیں، میں نے کئی بار اسکول سے رابطے کی کوشش کی مگر ایک تو نیٹ ورک بزی ہیں اور پھر شاید حالات کی سنگینی کی وجہ سے رابطہ ممکن نہیں ہو پارہا.... میں اسی وقت اسکول جارہا ہوں...... وہاں جاکر کچھ معلومات حاصل ہوئیں تو تمہیں بھی بتاتا ہوں۔'' ابھی اس کی بات بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ عذرا بڑی لجاجت سے بولی۔

'' مجھے بھی ساتھ لے چلیے'میرے لیے یہاں بیٹھنا اور انتظار کرنا ناقابلِ برداشت ہوگا۔ خدارا آپ مجھے ساتھ لے چلیں۔'' گل فراز نے منع کیا کہ اس موقع پر تمہارا جانا مناسب نہیں مگر عذرا کے مسلسل اصرار اور روتی صورت دیکھ کر گل فراز نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوگیا۔ ان کے گھر سے آرمی پبلک اسکول کی مسافت پندرہ، بیس منٹ کی تھی مگر ہر چوک پر ٹریفک جام تھا، ہر ایک جلدی جانے کی کوشش میں ٹریفک قوانین سے بالاتر راہوں کا متلاشی تھا۔ یوں گاڑیوں کی رفتار کم اور ہارنوں کی زیادہ تھی۔ قریباً پون گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ اسکول سے کچھ فاصلے پر روک لیے گئے۔ یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ اسکول کی طرف جانے والے وہ اکیلے نہیں سیکڑوں والدین اور بھی تھے۔ جو بہت جلد اسکول پہنچ جانا چاہتے تھے۔ مگر انتظامیہ نے تمام راہیں مسدود کر کے لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ ہر طرف سے ایمبولینس کا شور تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ گل فراز اور عذرا گاڑی سے اتر کر ایک جانب آکھڑے ہوئے جہاں ان جیسے بہت سے والدین آنکھوں میں خوف سجائے کھڑے تھے۔ سب کی زبانیں تقریباً گنگ تھیں۔ یہاں صرف جو آواز سب سے نمایاں تھی وہ ایمبولینس کے سائرن تھے جو شاید اپنی قوت سے نہیں تعداد کی وجہ سے چیختے چلّاتے محسوس ہورہے تھے۔ پھر کہیں سے صدا سنائی دی کہ فوجی آپریشن کا آغاز ہوچکا ہے۔ سیکڑوں بچے بحفاظت نکال لیے گئے۔ زخمی اور مرنے والوں کو لیڈی ریڈنگ اسپتال کی طرف روانہ کیا جارہا ہے۔

جن بچوں کو زندہ بحفاظت نکالا گیا تھا انہیں ٹولیوں کی شکل میں لایا جارہا تھا۔ خوف کی ان فضاؤں

میں جن والدین کو اپنے بچوں کے دمکتے چہرے نظر آئے وہ خوشی کے آنسو بہاتے اُن سے چمٹ کر ان کے بوسے لے رہے تھے۔

کچھ دیر تک بچوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور پھر مایوسی کے بادل چھانے لگے، لوگ اسپتال کی طرف دوڑنے لگے۔ گل فراز ... بھی اپنی گاڑی میں بیٹھا عذرا اس کے برابر والی نشست پر خاموش آنسوؤں کی لڑی بہاتی خوف اور حسرت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اسپتال سے کچھ فاصلے پر انہوں نے اپنی گاڑی کھڑی کی اور پیدل اسپتال کی طرف چل دیے۔

ابھی وہ چند قدم آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے آنے والی ایک خاتون عذرا سے چمٹ کر بلک، بلک کر رونے لگی۔ یہ حذیفہ کی ماں تھی جس کا غم دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ''بہن دعا کرو میرا بچہ بچ جائے وہ اسے آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں کہتے ہیں آپریشن ہوگا۔'' اس کے ہمراہ دوسری عورتیں اسے تسلی دے رہی تھیں۔

''عمر گل کا بھی کچھ پتا نہیں ہے۔'' عذرا نے کہا۔

''میں سارے زخمی بچے دیکھ کر آئی ہوں۔ ان میں تو وہ نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ اسے کسی قسم کا زخم نہیں آیا۔'' اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ عذرا بولی۔

''مگر جو بچے بحفاظت نکالے گئے ان سب میں تو میرا عمر گل نہیں تھا۔'' جس پر حذیفہ کی ماں نے بتایا۔

''کچھ زخمی بچے دوسرے اسپتالوں میں بھی لے جائے گئے ہیں وہاں دیکھ لو......'' گل فراز نے کہا کہ۔

''پہلے ہم یہاں دیکھیں گے پھر کسی دوسرے اسپتال کا رخ کریں گے۔'' گل فراز نے کہا۔

اسپتال کے داخلی دروازے پر بڑا رش تھا۔ وہ بڑی مشکل سے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچے وہاں موجود زخمی بچوں کو ایک، ایک کر کے دیکھتے رہے اچانک ان کی نظر نور العارفین پر پڑی۔

''بیٹا کیسے ہو؟'' عذرا نے کہا۔

''آنٹی ٹھیک ہوں میں'' وہ بڑی نحیف آواز میں بولا۔

''عمر گل وہ تو شاید......'' یہ کہتے، کہتے اس کے ہونٹ بھینچ گئے، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چہرے پر کرب و اذیت کے احساس کی شدت سے آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جسے دیکھتے ہی وہ دونوں بے قرار ہو کر تمام مریضوں کو دیکھنے کے بعد انتہائی ... بے چینی کے عالم میں مردہ خانے کی طرف گئے۔ کہرام مچ رہا تھا، ہر طرف آہوں اور چیخوں کی صدائیں تھیں ماں، باپ اپنے بچوں کی لاشوں کے گرد کھڑے زارو قطار رو رہے تھے۔ صبر، صبر کی آوازیں بلند ہوئیں مگر نالہ فریاد کی صدائیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ جن لاشوں کی شناخت نہ ہوئی تھی وہ دونوں ان کی طرف بڑھے۔ چند لاشوں کے بعد ہی ایک چہرے پر ان کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ یہ نوجوان جس کی آنکھیں اور ہونٹ کھلے تھے......کوئی اور نہیں ان کا لخت جگر عمر گل تھا۔ ان دونوں پر سکتہ طاری تھا۔ رونا چاہتے تھے مگر آواز نہ نکلتی تھی پھر قریب کھڑے ایک شخص نے جو غم سے بوجھل مگر تسلی پا چکا تھا ان تینوں کے چہروں کو پہچان کر گل فراز کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی اور صبر کی تلقین کرنے لگا۔ اس کی تسلی نے تمام بندھن توڑ ڈالے تھے۔

گل فراز بے اختیار اس شخص سے چمٹ کر زارو قطار رونے لگا اسے احساس بھی نہ ہوا کہ کب عذرا بے ہوش ہو کر عمر گل پر جا گری۔ لوگوں کی آوازوں نے اسے چونکا دیا، اس دوران اسپتال کا عملہ قریب آ چکا تھا۔ انہوں نے عذرا کو ہوش میں لانے کی کوشش کی، وہ ہوش میں آئی مگر چند ہی لمحے بعد دوبارہ بے ہوش ہوگئی۔ اسے اسٹریچر پر مردہ خانے سے باہر لے جایا گیا۔ کچھ دیر بعد گل فراز ایمبولینس کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ پیچھے اسٹریچر پر اس کا بیٹا جسے وہ کیپٹن عمر گل کہا کرتا تھا ابدی نیند سو رہا تھا۔ ''میرے بیٹے تم نے تو کہا تھا ماما آپ سمجھیں میں نے ناشتا کر لیا۔'' اس کی ماں بیٹھی ہوئی کہہ رہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آہیں سسکیوں میں بدل گئیں۔ ان کا بیٹا اب بھوکا نہیں تھا بلکہ وہ جامِ شہادت نوش فرما چکا تھا۔

ناولٹ

عہدِ ازل

فریدہ سیفی



وہ ازل سے میرے ساتھ تھا۔ میرے وجود کی تخلیق سے بھی پہلے جب میری ابتدا ہوئی۔ اس وقت سے جب میری روح حکمِ کُن سے آشنا ہو کر تعمیلِ فرمان کرتے ہوئے عدم سے وُجود میں آئی۔ یہ عالمِ ارواح تھا..... اور یہاں میرا رفیق وہ تھا..... وہ میری روح کے ہر رمز سے آشنا تھا، ہر اسرار سے واقف..... اور کیوں نہ ہوتا..... وہ میرا خالق تھا اور میں اس کی مخلوق..... میری روح نہ صرف اس کو خوب پہچانتی تھی بلکہ اس کی محبت کے احساس سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اس کی ربوبیت کی شان سے خوب واقف تھی۔ اس کی عظمت وجلال سے پوری طرح باخبر تھی۔ ہم ایک عرصہ ساتھ رہے۔

پھر زمانہ بدل گیا..... اب اس نے میرا وجود تخلیق کیا۔ ایک خاص حسن اور ترتیب کے ساتھ کہ وہ باکمال مصور تھا۔ میری روح کا ٹھکانا اب اس کا تخلیق کردہ جسم تھا اور یہ جسم ایک تنگ جگہ پر تھا۔ یہ تنگ جگہ میری ماں کا پیٹ تھی۔ ماں..... وہ پہلا لمس تھا جس سے میں روشناس ہوئی تھی۔ میرے احساس کی دہلیز پر نقش ہونے والی دوسری چھاپ کہ میرا پہلا رشتہ تو اسی کے ساتھ تھا جو آغاز سے میرے ساتھ تھا۔ اور جو انتہا تک میرے ساتھ رہنے والا تھا۔ میرا محرمِ راز..... میری پہلی محبت..... تو ماں مجھے ملنے والا دوسرا رشتہ تھی۔ میری دوسری محبت..... اور اس ماں کے دل میں اس نے میرے لیے محبت کسی الہام کی طرح... اتاری۔ وہ دنیا میں میری آمد سے قبل ہی دلوں کی زمین پر میرے لیے محبت کاشت کر رہا تھا۔ کیا اس سے زیادہ کوئی مہربان ہو سکتا ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی خیال رکھ سکتا ہے..... وہ ہر لمحے کے ہزارویں، کروڑویں حصے میں بھی مجھ پر نظر رکھتا ہے..... میری سانسوں کی آمد و رفت کا حساب رکھتا۔ میری ہر ضرورت کو پورا کرتا..... میں



کس قدر خوش قسمت تھی جو اس کی رحمت کے مستقل حصار میں تھی۔

ایک عرصہ اسی حالت میں گزرا۔ زمانہ ایک بار پھر بدلا۔ میرا تیسرا پڑاؤ دنیا تھی...... دنیا...... رنگوں، روشنیوں اور آوازوں سے بھرپور دنیا...... اب میں اکیلی نہیں تھی...... میرے آس پاس بہت سے لوگ تھے۔ میں ان سب کے ساتھ کسی نہ کسی رشتے میں بندھی ہوئی تھی۔ یہ رشتے خون کے رشتے تھے۔ وہ سب مجھ سے محبت کرتے...... میرا خیال رکھتے...... میرے لاڈ اٹھاتے...... میرے نازنخرے برداشت کرتے...... میری ایک پکار پر لپک کر میرے پاس چلے آتے۔ میرے ایک آنسو پر پریشان ہوجاتے۔ میری ایک مسکراہٹ پر نثار ہوجاتے۔ مجھ میں کیا بات تھی کہ مجھ سے محبت کی جاتی۔ میں جو ایک کمزور، لاچار چھوٹا سا وجود تھی لیکن میرے پیچھے سہارا بہت مضبوط تھا۔ میرے رب نے میرے ارد گرد موجود لوگوں کو میری نگہبانی پر مقرر کردیا تھا۔ کیسا احسان کرنے والا تھا وہ...... کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی محسن ہوسکتا ہے۔ آج اس کی بنائی ہوئی اس دنیا میں رہتے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہوگیا ہے اور میں نے ہر لمحہ اسے اپنے ساتھ محسوس کیا ہے۔ اپنے پاس، اپنے بے حد قریب...... اس نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا...... اور کبھی بے آسرا نہیں کیا...... دھوپ کی سختی میں اس نے ہمیشہ میرے لیے بادل مہیا کیے...... تاریکی کی وحشت میں میرے لیے روشنی کا بندوبست کرنے والا ہمیشہ وہی تھا...... اگر کبھی میرے ارد گرد دیواریں اٹھ گئیں، سارے دروازے بند ہوگئے تو اس نے میرے لیے وہاں سے راستہ نکالا جہاں سے کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

میں برملا اعلان کرتی ہوں کہ میرے رب سے زیادہ پیار کرنے والا کوئی نہیں...... میں اقرار کرتی ہوں کہ اس سے زیادہ احسان کرنے والا کوئی نہیں...... میں فخر کرتی ہوں اس محبت پر جو وہ مجھ سے کرتا ہے اور میں...... خود پر...... فخر کرتی ہوں اور اس محبت پر جو میں

اپنے رب سے کرتی ہوں۔

☆☆☆

روح نے وجود کو چھوا ہی تھا کہ لال بتی روشن ہوگئی۔ خطرے کی گھنٹی بج گئی اور یہ لال بتی پورے نو ماہ جلتی رہی اور خطرے کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی وہ اپنی ابتدا سے ہی ڈینجر زون میں تھی...... پورے دس سال بعد صابر حسین اور جنت بی بی کو اللہ نے خوشخبری دی تھی۔ پورے دس سال انہوں نے صبر کیا تھا اور صبر کے ساتھ انتظار...... یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی لمبا رستہ پنجوں کے بل چلے۔ اگر آپس میں محبت نہ ہوتی تو یہ دس سال کبھی نہ کٹتے اور اگر محبت نہ ہوتی تو صابر حسین نے کہاں اتنا انتظار کرنا تھا۔ گاؤں کے اس ماحول میں جہاں لڑکے، لڑکیوں کا آپس میں میل جول بے حد محدود تھا اس نے جنت بی بی سے محبت کی شادی کی تھی...... ہاں اپنی پسند سے۔ اماں کی کبھی اپنی نند سے نہیں بنی تھی لیکن صابر حسین اڑ گیا تھا کہ شادی کرے گا تو صرف جنت سے جو اس کی واحد پھوپی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ منت، ترلے، پیار، محبت، لاڈ، ناراضی، دھمکیاں۔ اماں نے ہر داؤ آزمایا تھا لیکن پھر ہار گئیں۔ بڑی پکی ضد لگائی تھی انہوں نے لیکن برا ہو اس ماں کے دل کا جو بیٹے کی آنکھوں کے نیچے پڑے حلقوں اور اس کے چہرے پر چھائی بے رونقی اور مُردنی کی تاب نہ لا سکا اور پگھل گیا۔

بڑی ہی عجیب چیز ہے یہ ماں بھی...... ساری عمر اولاد کے مدار میں ہی گھومتی رہتی ہے۔ کبھی اپنی خدمت کے جواب میں، اپنی ریاضت کے بدلے میں اپنی بات منوانے کا سوچے بھی تو، دل پکا کر بھی لے تو زیادہ عرصہ ٹھہر نہیں سکتی۔ اپنی ہی محبت کے بہاؤ میں بہہ جاتی ہے۔ یوں اماں صابر حسین کے لیے جنت بی بی کو بیاہ لائی تھیں۔ جنت بی بی نے خدمت اور محبت کے معاملے میں اماں اور صابر حسین کو مایوس نہیں کیا تھا لیکن اولاد کے معاملے میں وہ بے بس تھی۔ ایک سال گزرا، دو سال...... جوں، جوں وقت گزرتا گیا۔ زندگی اس کے لیے مشکل ہوتی گئی۔ اماں نے اسے گاؤں کی مستند دائی سے چیک کروایا...... پھر جدی پشتی حکیم سے...... پھر تحصیل کے سرکاری اسپتال کی بڑی ڈاکٹر سے اور آخر میں ضلع کے بڑے مہنگے پرائیویٹ اسپتال سے بھی اس کے سارے ٹیسٹ کروائے ہر رپورٹ ٹھیک تھی، ہر ٹیسٹ کلیئر تھا۔ سب کچھ نارمل تھا۔ بس اللہ کی طرف سے دیر تھی اور اس دیر کا کوئی علاج نہیں تھا۔ جب تک رب سوہنا خود کرم نہ کرتا۔ بات ڈاکٹروں کے ہاتھوں سے نکل کر پیروں اور تعویذ گنڈوں تک پہنچ گئی تھی۔ اماں یہ سب بھاگ دوڑ کبھی نہ کرتی اگر صابر حسین دوسری شادی کے لیے تیار ہو جاتا لیکن وہ بھی اپنے نام کی طرح صابر ہی تھا۔ آج بھی اس کے لیے سب کچھ اس کی محبت ہی تھی۔ اماں کے طعنوں سے مجبور ہو کر جنت بی بی خود اسے کئی بار شادی کا کہہ چکی تھی لیکن اس سادہ سے انسان کی محبت بڑی خالص اور سچی تھی۔

''اولاد اگر میرے نصیب وچ ہے تو جنت سے ہی ہو جائے گی ورنہ مجھے نہیں چاہیدی۔'' وہ صاف کہتا تھا۔

''ہونہہ......'' اماں منہ بنا کر سر جھٹکتیں...... ''تیرے پہ تو جادو کیا ہوا ہے اس بانجھ نے۔''

اور جنت بی بی کے دل پر جا کر لگتا ہے یہ لفظ ''بانجھ......'' وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی...... اپنی جہیز کی الماری کھولتی اور چہرہ اس میں گھسا لیتی۔

''رب سوہنے...... تیرے خزانوں میں تو کوئی کمی نئیں اے...... مجھ نمانی تے وی رحم کر...... میری جھولی وی بھر دے...... مجھے بھی ماں کا رتبہ دے، دے۔''

وہ الماری اس کے بے شمار آنسوؤں کی، لاتعداد شکوؤں کی اور پوشیدہ مناجاتوں کی واحد گواہ تھی اور پھر کوئی دعا ہی تھی جس نے قبولیت کا درجہ پایا تھا۔ کوئی آنسو ہی تھا جو منظوری کا شرف پا گیا تھا کہ پورے دس سال بعد جنت بی بی کو اولاد کی خوش خبری مل گئی اور یہ خوش خبری ایسے تھی جیسے آندھی طوفان میں کسی دیے کا جلنا جو ہمہ وقت بجھ جانے کے اندیشے میں مبتلا ہو...... اپنی ذات کے سروائیول کی جنگ میں مصروف......

تحصیل کے سرکاری اسپتال کے ہر چکر پر وہاں بیٹھی ڈاکٹر، جنت بی بی کو مشینیں لگا کر چیک کرتی۔

مختلف قسم کے ٹیسٹ کراتی اور پھر ان ٹیسٹوں کی رپورٹس کو چیک کرتے ہوئے انتہائی سنجیدہ شکل بنا کر نفی میں سر ہلاتی...... اس دوران جنت بی بی، صابر حسین اور اماں کے دل کسی انہونی کے ڈر سے لرزتے ہی رہتے۔

''بچے کی پوزیشن نارمل نہیں ہے۔''

''ہارٹ بیٹ بہت کم ہے......''

''گروتھ نہیں ہو رہی۔''

ہر دفعہ وہ ایک نیا انکشاف کرتی۔ آرام کا مشورہ دیتی اور کھانے پینے کا خیال رکھنے پر زور دیتی۔ ہر دفعہ واپسی پر صابر حسین زیادہ سختی سے جنت بی بی کو گھر کے کام کاج سے منع کرتا۔ اگرچہ اس سے چھوٹے ظفر حسین کی شادی ہو چکی تھی اور اس کی بیوی بھی گھر کے کام کرتی تھی لیکن پھر بھی جنت بی بی کو کسی بھی قسم کے مسئلے سے بچانے کے لیے اس نے مستقل حل نکالا۔ ان کے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر ماسی بختے کی ادھیڑ عمر بیٹی حنیفاں بیوہ ہو کر واپس میکے آ بیٹھی تھی۔ بال بچہ تھا نہیں...... اکیلی جان سارا دن کبھی اس گھر تو کبھی اس گھر گھومتی رہتی تھی۔ صابر حسین نے اسے گھر کے سارے کاموں کے لیے ملازمہ رکھ لیا۔ اب جنت بی بی مکمل طور پر بیڈ ریسٹ پر تھی۔ مسجد کے مولوی صاحب نے ذکر کے لیے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ جب تک بیٹھی رہتی کلام پاک پڑھتی رہتی۔ تھک جاتی تو لیٹ کر تسبیح ہاتھ میں لے لیتی۔ پاس پانی کا جگ رکھا ہوتا...... دم کرتی رہتی اور پیتی رہتی...... تو پورے نو مہینے...... نور الہدیٰ'' تک اللہ کا کلام بذریعہ خوراک پہنچتا رہا۔ اس کی سماعتیں قرآن پاک کی تلاوت سے خوب مانوس ہوتی رہیں۔ سارا وقت وہ آیاتِ کریمہ کے حفاظتی حصار میں رہی اور اسی حصار میں اس نے (صحت مند حالت میں) دنیا میں قدم رکھ دیا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ ایک کشش تھی جو اس کے اندر سے پھوٹتی تھی۔ ایک نور کا ہالہ تھا جو ہمہ وقت اس کے چہرے کے گرد رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں سنہری تھیں اور بڑی، بڑی۔ کوئی شاعر انہیں دیکھتا تو یقیناً جھیل سے تشبیہ دیتا۔ وہ چمکدار آنکھیں مسکرانے سے مزید جگمگا اٹھتی تھیں۔ سنہرے بال اور گلابی رنگت...... وہ خیالی شہزادیوں کے مانند حسین تھی۔

صابر حسین اور جنت بی بی کو صبر کا بہت شیریں پھل ملا تھا۔ وہ ناز نخروں میں پلتی رہی۔ اس کی فطرت کی اچھائی اور نیکی نے اس کے حسن کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ اسکول میں داخل ہوئی تو پہلے دن سے ساری ٹیچرز کی چہیتی بن گئی۔ اسکول سے گھر واپس آتے ہی اپنا بستہ کھولتی، کتابیں نکالتی اور سارا کام کر دیتی۔ جنت بی بی...... نے اسے گھر میں ہی سپارہ پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ گاؤں کے اور بچوں کو بھی قرآن پاک پڑھاتی تھی۔ باقی بچے تو سبق یاد کر کے اٹھ جاتے، نور الہدیٰ اپنا سبق سنا کر اگلا سبق بھی لے لیتی اور پھر اسے یاد کرنے بیٹھ جاتی۔ جنت بی بی گھر کے کام کرتی رہتی اور...... نور الہدیٰ اس کے پیچھے، پیچھے پھر کر اسے سبق سناتی رہتی۔ جنت بی بی لاکھ اسے چھٹی کرنے اور کھیلنے کودنے کا کہتی لیکن نور الہدیٰ کو سپارہ پڑھنا اس قدر پسند تھا کہ رات کو اپنے بستر پر بیٹھ کر بھی وہ اسی کو پڑھتی رہتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سات سال کی عمر میں وہ قرآن پاک دو بار ختم کر چکی تھی۔

سات سال کی عمر میں جو اس نے نماز شروع کی تو پھر کبھی قضا نہیں کی۔ جنت بی بی سادہ الفاظ میں اپنی سمجھ کے مطابق اسے دین کی باتیں بتاتی رہتی تھیں...... نور الہدیٰ کو اللہ کے بارے میں باتیں کرنا بے حد پسند تھا۔ وہ ہر کام کرنے سے پہلے سوچتی تھی کہ یہ کام اللہ کو کیسا لگے گا۔ خود سمجھ نہ آتا ماں سے پوچھتی۔ وہ ہر کام کو اللہ کی پسند کے مطابق کرنے کی کوشش کرتی۔ گاؤں کی عورتیں جنت بی بی پر رشک کرتی تھیں۔ اولاد ہو تو نور جیسی...... کوئی ضد، نہ کوئی ناز نخرہ، پڑھائی میں لائق، عبادت میں آگے، خدمت میں چوکس، صابر حسین کا وہ فخر تھی اور جنت بی بی کو دھڑکا ہی لگا رہتا تھا کہ اسے کہیں نظر نہ لگ جائے۔ وہ نظر کے دم پڑھ، پڑھ کر اس پر پھونکتی رہتیں۔

گاؤں کا اسکول دسویں جماعت تک ہی تھا۔ جوں ہی نور الہدیٰ نے دسویں جماعت میں اپنے

اسکول میں ٹاپ کیا صابر حسین اپنی فیملی کے ساتھ شہر شفٹ ہو گیا۔ اسے نور الہدیٰ کو اچھی تعلیم دلوانا تھی۔

☆☆☆

''کہتے ہیں انسان کو اپنا مقصدِ حیات بلند رکھنا چاہیے۔ کم از کم آسمان جتنا بلند...... میری زندگی کا بھی ایک مقصد ہے...... مجھے اس دنیا کو فتح کرنا ہے...... یہ ضرور مضحکہ خیز بات ہوتی اگر کوئی اور کرتا لیکن میرے لیے یہ ناممکن نہیں ہے کیونکہ میں...... فاتح عالم ہوں...... میں چلتا ہوں تو میرے آس پاس حرکت کرتی دنیا کی گردش تھم جاتی ہے۔ میں جس کی طرف دیکھتا ہوں، اس کا دل میری مٹھی میں آجاتا ہے۔ میری مسکراہٹ پر لوگ سانس لینا بھول جاتے ہیں۔ میری آواز سن کر دریا چلنا بند کر دیتے ہیں۔ درخت دم بخود رہ جاتے ہیں۔ ہوا ساکن ہو جاتی ہے۔ اور پوری کائنات پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔

میں فاتح عالم ہوں...... ایک دنیا میرے سحر میں گرفتار ہے، میں لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہوں...... ہزاروں حسین اور جوان آنکھوں کا خواب ہوں...... میں دلوں پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں...... ایک دن آئے گا جب میری آواز ہوا کی لہروں کے ساتھ سفر کرتی ہوئی ساری حد بندیوں کو توڑتی ہوئی دنیا کے ہر فرد کے دل پر دستک دے گی اور وہی دن میری فتح کا ہوگا۔''

☆☆☆

''تم مجھ میں بستے ہو......
میں شہر تمہارا ہوں''

فاتح عالم کی لمبی مخروطی انگلیوں نے پیانو کے سُر چھیڑے۔ وہ آرٹسٹک ہاتھ تھے۔ ایک موسیقار کے ہاتھ...... ایک فنکار کے ہاتھ۔

''تم موج ہو بہتے پانی کی
تم پہلی آس ہو
میری جوانی کی''

اس کی آواز میں جادو تھا۔ اور جادو تو اس کی پوری شخصیت میں تھا۔ وہ دراز قد تھا۔ رنگت سفید تھی اور ناک تیکھی اور کھڑی ہوئی۔ بال سیاہ تھے جنہیں اس نے کچھ دیر قبل ہاتھوں سے ہی سنوارا تھا اور اب بکھر کر پھر پیشانی پر آ چکے تھے۔ سیاہ قدرے لمبی آنکھوں میں گاتے ہوئے ایک نشے کی سی کیفیت تھی...... سُر سنگیت اور گانا درحقیقت اس کے لیے ایک نشے کی طرح ہی تھا۔ وہ ہر چیز کے بغیر رہ سکتا تھا لیکن موسیقی...... اس کے بغیر رہنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''تم میرا ہرا اک منظر ہو
میں دل ہوں
اور تم دلبر ہو
تم مجھ میں لکھتے ہو
میں قصہ تمہارا ہوں''

گاتے ہوئے اس نے اپنے دائیں جانب کھڑے بوبی کی طرف دیکھا۔ وہ گٹار پر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ بوبی کا اصل نام بابر تھا۔ وہ فاتح عالم کا بچپن کا دوست تھا۔ گردن تک آتے سلکی بالوں کو پونی میں لپیٹے وہ اس کے ساتھ گنگنا رہا تھا۔ وہ ایک ماہر گٹارسٹ تھا۔

''کیسا......؟'' فاتح عالم نے گانا ختم کر کے داد طلب نظروں سے بوبی کی طرف دیکھا۔

''شاندار......!'' بوبی نے گٹار ایک طرف رکھا۔

''شام کو اسٹوڈیو چل کر اس کی فائنل ریکارڈنگ کر لیتے ہیں۔'' فاتح عالم اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بلیو جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ اسی وقت گل زمان دروازہ بجا کر اندر داخل ہوا۔ وہ سولہ سترہ سال کا لڑکا تھا جو اوپر کے کاموں کے لیے ملازم تھا۔

''صاب...... بی جان بولتا اے یہ ناچ گانا چوڑو اور کانا کاؤ آکے۔'' لبوں میں ہنسی چھپائے اس نے من و عن بی جان کا پیغام ان تک پہنچایا۔

''آتے ہیں......'' فاتح عالم نے اسے جواب دیا۔

''بی جان انتظار کر رہا ہے تمارا...... جلدی آؤ......'' وہ چھپاک سے باہر نکل گیا۔

ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا ہوا تھا۔ اور بی جان واقعی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

''صبح سے ہنگامہ مچا رکھا ہے تم لوگوں نے گھر

میں...... اب تو کان بھی درد کرنے کو آ گئے ہیں۔ خود تو تمہیں سکون ہے نہیں۔ دوسروں کو بھی بے سکون کرتے ہو۔" بی جان نے انہیں آتے دیکھ کر شکایتاً کہا۔

"سوری... بی جان......" فاتح عالم کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بس اس بار ٹرپ سے واپس آ جاؤں تو اپنا کمرا ساؤنڈ پروف کرواتا ہوں......"

"کمرا ساؤنڈ پروف کروالینا اپنی ساؤنڈ نہ آف کرنا۔" بی جان کو غصہ آ گیا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے کمرا ساؤنڈ پروف کروانے کی...... سوا ئیر جنسی ہو جاتی ہے۔ ایسے کمرے سے تو آواز ہی باہر نہیں آتی۔"

"بی جان......!" بوبی نے کھانا کھاتے ہوئے بی جان کی طرف دیکھا۔ "جس آواز کو آپ کوستی ہیں، اس آواز کی ایک دنیا دیوانی ہے۔"

"میں آواز کو نہیں کوستی بچے...... میں اس گانے بجانے کو کوستی ہوں۔ ہماری سات نسلوں میں کسی نے یہ کام نہیں کیا...... اس کی ماں اگر آج زندہ ہوتی تو میں اسے الزام دیتی کہ اس نے بگاڑا ہے اسے لیکن خیر......" بی جان نے گہری سانس لی۔

"جب تک وہ زندہ تھی اللہ بخشے اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اسے بگاڑنے میں...... اس کے منہ سے بات بعد میں نکلتی تھی پوری وہ پہلے کرتی تھی۔ اور اب یہی حال اس کے باپ کا ہے۔"

"بی جان...... ساری دنیا میری فین ہو سکتی ہے سوائے آپ کے۔" فاتح عالم نے افسوس سے سر ہلایا اور اپنی پلیٹ میں چاول ڈالے۔

"اسے کہتے ہیں گھر کی مرغی دال برابر......" بوبی نے ہنس کر لقمہ دیا۔

"بھئی سچ بات ہے...... تمہاری محبت میں، میں غلط کو صحیح نہیں کہہ سکتی......" بی جان نے ہاتھ اٹھا کر واضح کیا۔ "تم یہ سب فضول مشغلے چھوڑو اور باپ کا بزنس سنبھالو...... وہ بیچارہ کب تک اکیلا ڈیوٹی دے گا۔"

"یہ فضول مشغلہ نہیں ہے۔" فاتح عالم نے احتجاج کیا۔ "میرا پیشن (passion) ہے اور پروفیشن بھی...... ایک دن آئے گا جب میری آواز دنیا کے ہر کونے تک پہنچے گی۔"

"ان شاء اللہ......" بوبی نے صدقِ دل سے اضافہ کیا۔ اس کی زیادہ توجہ کھانے کی طرف تھی۔

"اللہ ہی ہے جو تمہیں ہدایت دے۔" بی جان نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"بی جان...... آپ کھانا کھائیں، ٹینشن نہ لیں۔" فاتح عالم اٹھ کر ان کے پاس آیا۔ بازو اُن کے گرد حمائل کر کے ان کے رخسار پر بوسہ دیا۔ جواباً انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"تمہارے بھلے کو ہی کہتی ہوں بیٹے، اگر تم سمجھو تو......"

"ہائے کاش میرے گھر والے بھی اتنے سویٹ ہوتے۔" بوبی کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرے ابا تو بولتے بعد میں ہیں دُھلائی پہلے کرتے ہیں۔"

"اس کے باوجود تیرا یہ حال ہے۔" فاتح عالم نے مسکرا کر طنز کیا۔

"تیری صحبت کا اثر ہے۔" بوبی کہاں چپ رہنے والا تھا۔

"اب کدھر جا رہے ہو؟" بی جان نے انہیں باہر کا رخ کرتے دیکھ کر پیچھے سے آواز دی۔

"آپ کو آرام اور سکون دینے کی خاطر ہم تھوڑی دیر کے لیے گھر سے باہر جا رہے ہیں۔" فاتح عالم نے مڑ کر جواب دیا اور بوبی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"میرے پروردگار...... میرے بچے کے دل میں ہدایت ڈال...... اسے نیکی کا رستہ دکھا۔" بی جان ہاتھ پھیلا کر دعا مانگ رہی تھیں۔

☆☆☆

رات تین چوتھائی بیت چکی تھی۔ سیاہ آسمان پر گول چاند کسی برف کی ڈلی کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ درخت مجسموں کے مانند ساکت تھے۔ ہوا چلتی محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن فضا میں اچھی خاصی ٹھنڈک تھی۔ نور الہدیٰ کا کمرا نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اپنے نرم گرم بستر میں لحاف سر تک اوڑھے بے خبر سو رہی تھی۔ دفعتاً اس کے... سرہانے پڑا ہوا موبائل فون بج اٹھا۔ بیل کی آواز پر وہ کسمسائی۔ لحاف منہ سے ہٹا کر موبائل اٹھایا اور مندی

آنکھوں سے اس پر وقت دیکھ کر الارم بند کیا۔ کچھ پل وہ اسی طرح خاموشی سے لیٹی رہی۔ پھر دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر اٹھ بیٹھی۔ لحاف ایک طرف کیا تو سردی سے جسم کپکپا اٹھا۔ اس نے تکیے کے پاس پڑی ہوئی جرسی اٹھا کر پہنی...... لمبے کھلے بالوں کو اکٹھا کر کے اوپر کیا اور جوڑے کی شکل میں باندھ لیا۔ بستر سے اٹھ کر کونے میں رکھے ہیٹر کو آن کرنے کی کوشش کی لیکن گیس نہیں تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد جب وہ باتھ روم سے نکلی تو اس کا چہرہ گیلا تھا۔ کمرے کی واحد الماری کو کھول کر اس میں سے جائنماز اور نماز کے لیے خاص دوپٹا نکالا۔ اسے چہرے کے گرد لپیٹا اور مصلیٰ بچھا کر نوافل کی نیت باندھ لی۔ تاریک رات کی سخت ٹھنڈک میں گرم بستر چھوڑنے پر اسے مجبور کرنے والی وہ محبت تھی جو ازل سے اس کی گھٹی میں تھی۔ وہ بلاوا تھا جو دور کہیں آسمانوں سے آیا تھا اور جسے صرف نصیب والے ہی سنتے ہیں۔ نور الہدیٰ جب سجدے میں تھی تو دروازہ دھیرے سے کھلا اور جنت بی بی نے اندر جھانکا۔ اسے جائے نماز پر دیکھ کر چند پل وہ یونہی کھڑی اسے دیکھتی رہیں پھر دروازہ بند کر کے واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''بی بی رات کو تم کہاں گھوم رہی ہو......؟'' اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے صابر حسین کی آواز سنی۔ کھٹکے سے وہ جاگ گیا تھا۔

''پانی پینے گئی تھی۔'' جنت بی بی اپنے بستر پر آ بیٹھیں اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

''پانی راتی کول رکھ لیا کر...... انی سردی وچ راتی باہر جانا ٹھیک نئیں۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' صابر حسین آج بھی اس کی ایسے ہی فکر کرتا تھا جیسے سالوں پہلے اس کی عادت تھی۔

''ہوں......'' جنت بی بی نے ہنکارا بھرا...... پھر نائٹ بلب کی روشنی میں صابر حسین کی طرف دیکھا۔

''نوری کے ابا......''

''بول......'' صابر حسین نیند کی وادی میں جاتے، جاتے رکا۔

''ہم کتنے گناہ گار لوگ ہیں...... کتنے وڈے جاہل...... پھر بھی اللہ نے ہمیں نوری جیسی نیک، پاک دھی دے دی ہے۔'' جنت بی بی کے لہجے میں اپنی کم مائیگی کے احساس کے ساتھ، ساتھ ایک تعجب کی کیفیت بھی تھی۔

''بس مولا کا احسان ہے ہم غریبوں پر۔'' صابر حسین نے نیند سے بھاری ہوتی آواز میں کہا اور سو گیا۔

''ہاں......!'' جنت بی بی نے گہری سانس لی۔ ''شکر ہے مولا کا۔'' پھر رضائی اوپر کی۔ ''آج تو کج زیادہ ای سردی ہے۔''

☆☆☆

گل زمان نے بی جان کے کمرے میں جھانکا...... وہ اپنے بستر پر تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں...... ہاتھ میں تسبیح تھی۔

''بی جان کوئی بی بی آیا اے۔''

''کون ہے؟'' بی جان نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''پتا نئیں بی جان...... پہلی بار آیا اے...... کہتا ہے فاتح صاب کی دادی سے ملنا اے۔'' گل زمان نے اطلاع دی۔

''اچھا......!'' بی جان بستر سے اترنے لگیں۔ ''کدھر ہے۔''

''ڈرائنگ روم میں بٹھایا اے۔'' وہ کہہ کر غائب ہو گیا، بی جان ڈرائنگ روم میں پہنچیں تو وہاں صوفے پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ ٹائٹ جینز پر سلیولیس شرٹ اور باب کٹ بال...... حلیے اور انداز سے وہ کافی بولڈ نظر آ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''السلام علیکم......!''

''وعلیکم السلام...... بیٹھو، بیٹھو......'' بی جان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آپ...... فاتح عالم کی دادی...... مطلب...... بی جان ہیں۔'' لڑکی نے ذرا جھجک کر ان کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ہاں...... میں اس کی بی جان ہی ہوں۔'' بی جان سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے اس کے سامنے

والے صوفے پر بیٹھ گئیں اور جانچتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''فاتح تو گھر پر نہیں ہے۔''

''میں آپ سے ملنے آئی ہوں...... فاتح بہت ذکر کرتا ہے آپ کا......'' بولڈ نظر آنے کے باوجود بات کرتے ہوئے وہ ذرا گھبرا رہی تھی۔ پھر جیسے اسے یاد آیا۔ ''میں زینیا ہوں...... فاتح کی دوست......''

''اچھا، اچھا۔'' بی جان نے سر ہلایا اور منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

''دراصل بی جان......'' زینیا نے نچلا لب دانتوں تلے لیا۔ ''میں بہت آس لے کر آپ کے پاس آئی ہوں...... مجھے لگتا ہے صرف آپ ہی میری مدد کر سکتی ہیں۔''

''کہو بیٹا...... میں سن رہی ہوں......'' بی جان نے شفقت سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ زینیا نے اپنے ہاتھ آپس میں رگڑنے۔

''پچھلے چھ ماہ سے...... میں فاتح عالم کے ساتھ ریلیشن شپ میں ہوں۔ ہماری بہت اچھی دوستی اور انڈراسٹینڈنگ تھی...... لیکن اب اچانک اس نے نظریں پھیر لی ہیں۔ کہتا ہے کہ میں اس کے ٹائپ کی نہیں ہوں جبکہ میں اس کے ساتھ اتنی دور تک جا چکی ہوں کہ واپس پلٹنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ پلیز آپ اسے سمجھائیں کہ وہ میرے ساتھ ایسا نہ کرے۔''

بی جان کا دماغ گھوم گیا۔ فاتح کا کسی لڑکی کے ساتھ تعلق...... یہ آخری بات تھی جو وہ فاتح کے بارے میں سوچ سکتی تھیں۔ وہ سنگر تھا۔ ایک اسٹار تھا۔ شوبز کی چکا چوند روشنیوں سے اس کا تعلق تھا۔ اکثر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ رات گئے تک گھر سے باہر رہتا تھا۔ اپنے کنسرٹس کے لیے بیرون ملک بھی جاتا رہتا تھا لیکن پھر بھی وہ انہیں اتنا معصوم لگتا تھا کہ ان کے خیال میں اس کی زندگی میں لڑکیوں کا کوئی چکر نہیں تھا۔ آج یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ انہوں نے گہری سانس لے کر خود کو بڑی مشکل سے کمپوز کیا۔

''بیٹا...... لڑکیوں کو بہت سنبھل کر رہنا چاہیے۔ فاتح عالم تو ایک لاابالی سا لڑکا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں سیریس نہیں ہے تو اس نے کسی اور کے ساتھ کیا سیریس ہونا ہے۔''

''وہ سیریس تھا...... میرے ساتھ بہت سیریس تھا۔'' زینیا نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''ہم نے بہت اچھا وقت ساتھ گزارہ ہے۔ بس اب کچھ دنوں سے وہ بدل گیا ہے۔ مجھ سے بات ہی نہیں کرتا...... ملتا ہے نہ فون اٹینڈ کرتا ہے...... شاید اس کی زندگی میں کوئی اور لڑکی آگئی ہے۔'' زینیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''آپ پلیز اس سے بات کریں۔ اسے کہیں کہ وہ مجھے نہ چھوڑے...... میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''والدین کیا کرتے ہیں تمہارے؟'' بی جان نے افسوس سے اسے دیکھا۔

''پاپا ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں اور مما سوشل ورکر......''

''انہیں معلوم ہے اس بارے میں......''

''نہیں......'' زینیا نے نفی میں سر ہلایا۔

بی جان کو حقیقتاً دکھ ہوا۔ کیسے ماں، باپ تھے جو اپنی دنیا میں مگن تھے۔ بیٹی کی انہیں کوئی فکر ہی نہیں تھی جو ایک غیر مرد سے تعلقات بنا کر بیٹھی ہوئی تھی اور اب ان تعلقات کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں بھی خود ہی مار رہی تھی۔

''میں فاتح سے بہت محبت کرتی ہوں...... بی جان۔'' زینیا نے انہیں خاموش دیکھ کر قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اگر وہ مجھے نہیں ملا تو میں مر جاؤں گی۔ تین دن سے میں سو نہیں سکی۔ پاگلوں کی طرح اس کو کالز کر رہی ہوں۔ ہر اس جگہ جا رہی ہوں جہاں اس کے ملنے کی امید ہوئی ہے۔ وہ میرے ساتھ ایسے کیوں کر رہا ہے۔ آپ اس سے پوچھیں تو سہی......''

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''اچھا بس اب رونا تو بند کرو......'' بی جان نے پریشان ہو کر قدرے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''آپ بات کریں گی ناں اس سے؟'' زینیا نے آنسو صاف کر کے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

"بات تو میں اس سے کروں گی۔" بی جان نے دانت کچکچائے۔ "گھر آتا ہے تو لیتی ہوں اس کی خبر میں۔"

"تھینک یو......" زینیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بہت شکریہ آپ کا......"

اس کے جانے کے بعد بی جان سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ کن راہوں پر چل نکلا تھا فاتح عالم...... ایک لڑکی تو چل کر گھر تک آ گئی۔ پتا نہیں اور کتنی لڑکیوں کے ساتھ اس نے چکر چلا رکھے ہیں۔ کیا کریں وہ...... کس طرح سمجھائیں اسے۔ وہ کافی دیر سوچتی رہیں پھر انہوں نے گل زمان کو آواز دی۔

"گل زمان...... گل زمان......"

"جی...... بی جان......" وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

"میرا موبائل لاؤ......" کچھ دیر بعد وہ موبائل فون پر سکندر عالم سے مخاطب تھیں۔

"صبح سویرے تم گھر سے نکلتے ہو اور رات گئے لوٹتے ہو۔ یہ دولت جسے کمانے کے چکر میں تم نے دنیا بھلا رکھی ہے کسی کام کی نہیں ہے اگر تمہارا بیٹا تمہارے ہاتھوں سے نکل گیا تو......"

"کیا ہوا بی جان...... خیریت تو ہے؟" سکندر عالم نے تشویش سے پوچھا۔

"خیریت ہوتی تو یوں فون کرتی تمہیں...... آج جلدی آؤ گھر...... ضروری بات کرنی ہے تم سے......"

انہوں نے کہہ کر کھٹ سے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

نور الہدیٰ اپنی عزیز دوست اور کلاس فیلو شیبا کے ساتھ کلاس اٹینڈ کر کے باہر نکلی تو باہر ہر طرف دھوپ پھیلی تھی۔

"وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔" شیبا نے گراؤنڈ میں لگے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں اس طرف چل پڑیں۔

شیبا کے ساتھ اس کی دوستی یونیورسٹی کے پہلے دن سے تھی۔ وہ ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک سادہ مزاج لڑکی تھی۔

"وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔" شیبا نے چیونگ گم چباتے ہوئے نور الہدیٰ کا بازو تھاما۔ "مڑ کر مت دیکھنا۔"

نور الہدیٰ سمجھ گئی کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے۔ وہ خاموشی سے چلتی رہی۔ وہ سیاہ عبایا پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ اسکارف کے ہالے میں اس کا بیضوی چہرہ دمک رہا تھا۔ سنہری آنکھوں کی چمک ہر دفعہ پلک جھپکنے پر بڑھ جاتی تھی۔

"یار کیا چیز ہے یہ عمار حسیب......" مطلوبہ بینچ پر بیٹھ کر شیبا نے جھنجلا کر کہا۔ "اتنے عرصے سے وہ تمہیں پسند کرتا ہے پھر بات کیوں نہیں کرتا آخر؟"

"یہ تمہارا ہی کہنا ہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔" نور الہدیٰ نے پلٹ کر دیکھا۔ عمار حسیب کافی دور رک کر کسی سے بات کر رہا تھا۔

"ہاں کرتا ہے ناں...... اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔" شیبا نے اپنے لمبے بالوں کو پونی میں ٹائٹ کیا۔ "جب وہ تمہاری طرف دیکھتا ہے تو اس کی نظروں میں ایک خاص قسم کی چمک ہوتی ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ وہ دل سے فدا ہے تم پر لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آخر وہ منہ سے پھوٹتا کیوں نہیں ہے کچھ۔"

"اچھا ہی ہے جو وہ کچھ نہیں کہتا۔" نور الہدیٰ نے اپنا بیگ کھول کر اس میں کچھ تلاش کیا۔

"ارے ظالم تم نے پی ہی نہیں......" شیبا نے لوفرانہ انداز میں ایک آنکھ میچی۔ "محبت وہ نشہ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نشہ ہی نہیں۔"

"یاسر سے منگنی کے بعد تم کچھ زیادہ ہی بیہودہ ہوگئی ہو۔" نور نے بالآخر بیگ سے مونگ پھلی کا پیکٹ برآمد کر ہی لیا تھا۔ اب وہ اسے کھولتے ہوئے شیبا کا تجزیہ کر رہی تھی۔

"ارے ہاں...... میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔" شیبا پُرجوش ہو کر اس کی طرف مڑی۔ "یاسر کو پروگرام مل گیا ہے۔"

اس کا منگیتر یاسر ایک مشہور نیوز چینل میں کام کرتا تھا۔

"تو......" نور الہدیٰ نے کندھے اچکا کر بے نیازی سے اسے دیکھا۔

"او ڈفر...... اب وہ اینکر بن گیا ہے۔ پورا

پروگرام ہوسٹ کرے گا۔ ٹوڈے وِدھ یاسر صدیقی۔''
شیبا نے جیسے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے تفصیل بتائی..... ''اب دیکھنا کس قدر جلد وہ مشہور ہو جائے گا۔''

''واقعی..... دیٹس گریٹ.....!'' نورالہدیٰ نے سمجھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ ''تو اب تمہیں اس پر زیادہ نظر رکھنی پڑے گی۔''

''ہاں یہ تو ہے.....'' شیبا ذرا دھیمی پڑی۔ ''لیکن خیر..... بنیادی طور پر وہ ایک شریف انسان ہے۔ وہ تو میں ذرا اسے ٹائٹ رکھتی ہوں تاکہ سیدھا رہے۔''

''عمار آرہا ہے۔'' نورالہدیٰ کی نظر اس کے عقب میں سڑک پر سے اپنی طرف آتے عمار پر پڑی تو اس نے چپکے سے کہا۔ دونوں منہ سیدھا کر کے بیٹھ گئیں۔ شیبا نے سامنے والے درخت کے پتے گننے شروع کر دیے اور نورالہدیٰ اپنا بیگ کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

''ہیلو گرلز..... کیا ہو رہا ہے؟'' عمار حبیب ان سے کچھ فاصلے پر آ کھڑا ہوا۔

''کرکٹ کھیل رہے ہیں۔'' شیبا ہنسی۔

عمار حبیب جواباً مسکرایا اور ہاتھ میں پکڑے نوٹس نورالہدیٰ کی طرف بڑھائے۔

''یہ آپ کے نوٹس..... تھینک یو.....''

نورالہدیٰ نے خاموشی سے نوٹس تھام لیے۔

''شکریہ تو خیر بہت سے لوگوں کو ادا کرنا چاہیے نور کا..... اتنی محنت سے بنائے گئے نوٹس آرام سے سب کے حوالے کر دیتی ہے۔'' شیبا نے جل کر کہا۔

''یہ تو اچھائی ہے ان کی۔'' عمار حبیب نے میٹھی نظروں سے نورالہدیٰ کو دیکھا۔ ''او کے..... پھر ملتے ہیں۔'' وہ کہہ کر مڑ گیا۔

''دھت تیرے کی۔'' شیبا نے غصے سے پاس پڑے پتھر کو ٹھوکر ماری۔

''تمہیں کیوں غصہ آرہا ہے؟'' نورالہدیٰ نے نوٹس بیگ میں ڈالے۔

''یہ بندہ بھی ناں.....!'' شیبا نے جھنجلا کر ہاتھ کا مکا بنایا۔ ''اس کی نظریں کوئی اور بات کرتی ہیں اور منہ

سے یہ کچھ اور بولتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو...... آؤ چلیں...... اگلی کلاس ہونے والی ہے۔" نورالہدیٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

"اب بتاؤ......" بی جان نے ساری بات سکندر عالم کے گوش گزار کی اور منتظر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بی جان آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" سکندر عالم نے گہری سانس لی اور پُرسکون ہو کر مسکرائے۔ "میں سمجھا پتا نہیں کون سی بات ہوگئی ہے۔"

"ایک لڑکی میاں صاحبزادے کے پیچھے گھر تک پہنچ گئی ہے اور تمہارے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہے۔" بی جان نے ناگواری سے کہا۔

"فاتح ایک اسٹار ہے۔ آپ ٹی وی نہیں دیکھتیں، نہ ہی سوشل میڈیا یوز کرتی ہیں، اس لیے آپ نہیں جانتیں کہ وہ آج کل کس قدر ہٹ ہے۔ ایک دنیا دیوانی ہے اس کے پیچھے...... وہ اب شوبز سے تعلق رکھتا ہے وہاں ایسی باتیں عام ہیں آپ ٹینشن نہ لیں۔" سکندر عالم نے رسانیت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"سکندر میں نے تم سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ تم باپ ہو...... تمہاری بات اس پر اثر رکھے گی۔ مجھے تو ٹال جاتا ہے وہ...... تم اس کی ہر غلطی کو یوں نظر انداز کرو گے...... مجھے امید نہیں تھی تم سے۔" بی جان نے ناراضی سے کہا۔

"زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اولاد پر زیادہ پابندیاں نہیں لگائی جاسکتیں۔" سکندر نے کہنا چاہا لیکن بی جان نے غصیلے لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔

"زمانہ چاہے آسمان پر پہنچ جائے۔ مذہب اور اخلاقیات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ میں نے اس کا ناچ گانا برداشت کرلیا ہے لیکن عورتوں کے ساتھ تعلقات...... میں برداشت نہیں کروں گی۔"

"اچھا، اچھا...... آپ پریشان نہ ہوں......" سکندر عالم اُن کے غصے سے گھبرا گئے۔ "میں کروں گا اس سے بات۔"

"بیٹا...... والدین، اولاد کی صرف دنیا ہی نہیں آخرت کے بھی ذمے دار ہوتے ہیں۔ فاتح جس چکاچوند میں ہے وہاں اس کے بگڑنے کا بہت زیادہ خطرہ ہے۔ اگر ہم اس کی ڈور ڈھیلی چھوڑ دیں گے تو نہ جانے وہ کس دلدل میں جا دھنسے۔" بی جان دھیمی پڑ گئیں۔

"جی آپ درست کہہ رہی ہیں۔" سکندر عالم نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں خبر لیتا ہوں اس کی۔"

بی جان نے مایوسی سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ سکندر عالم صرف انہیں تسلی دے رہے ہیں۔ انہوں نے بچپن سے ہی بے تحاشا لاڈ پیار کر کے فاتح عالم کو سر پر چڑھا رکھا تھا اور اب بھی وہ اس کی ہر غلطی اور کوتاہی کو نظر انداز کر کے صرف اس کی خوشی میں خوش رہتے تھے۔ انہیں خود ہی کچھ کرنا تھا۔ فاتح عالم کو باہر کی لڑکیوں کے چکر سے بچانے کے لیے وہ کیا کرسکتی تھیں۔ وہ سوچتی رہیں۔ بالآخر انہیں اپنی پرانی سہیلی قمر النسا کا خیال آیا۔

☆☆☆

انسان کی شخصی آزادی کا راگ الاپنے والے نہیں جانتے کہ انسانی آزادی کا تصور بھی محال ہے۔ انسان درحقیقت ان گنت بیڑیوں میں بندھا ہوا ہے۔ لاتعداد پھندوں میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ بیڑیاں محبت کی ہیں۔ یہ پھندے رشتوں کے ہیں۔ اس محبت سے آزادی، ان رشتوں سے فرار گویا اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ کر اسے بے وزن کر کے خلا کی وسعتوں میں دھکیل دینا ہے۔ اس لیے انسان کو اپنی یہ قید بے حد عزیز ہے۔ یہ اس کے ہونے کا احساس ہے۔ اس کے وجود کی ضمانت...... چاند پر پہنچ جانے والے انسان کو اپنے قدموں کے نیچے کی زمین بے حد پیاری ہے۔

"بہاروں جیسی لڑکی میری ہے
نظاروں جیسی لڑکی میری ہے"

وہ حسب عادت گنگناتا ہوا ٹی وی لاؤنج سے گزر رہا تھا جب اس کے کانوں سے وہ آواز ٹکرائی۔ مترنم، خوب صورت نسوانی آواز...... وہ قرآن پاک کی تلاوت کی

آواز تھی۔ اس کی آواز میں سوز تھا اور گداز بھی...... اس تلاوت میں پہاڑی جھرنے کی سی روانی تھی۔ کسی بہتی ندی کا سا سکون...... مقدس کلام کی اثر آفرینی اس کے دل کا گھیراؤ کرنے لگی۔ وہ کچھ دیر ٹھٹک کر وہیں کھڑا رہا...... مبہوت ہو کر سنتا رہا۔ پھر اس کے دل میں اس خوب صورت آواز کی مالک کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ آواز کے منبع پر غور کیا تو پتا چلا کہ آواز بی جان کے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ کشاں، کشاں ان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر دیکھا تو بی جان کے بستر سے تھوڑی دور کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی کلام پاک کی تلاوت میں محو تھی۔ بی جان اپنے بستر پر نیم دراز آنکھیں بند کیے تلاوت سن رہی تھیں۔ لڑکی کو فاتح کی آمد کا احساس ہوا تو اس نے تلاوت موقوف کر کے کلام پاک بند کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بی جان نے آنکھیں کھول کر دروازے میں کھڑے فاتح عالم کو دیکھا تو شفقت سے مسکرائیں۔

''آؤ بیٹا...... اندر آ جاؤ......'' وہ اندر آیا اور بی جان کے پاس ہی ان کے بستر پر بیٹھ گیا۔ لڑکی اب قرآن پاک دیوار گیر الماری میں رکھ رہی تھی۔

''یہ سبیلہ ہے...... میری بچپن کی سہیلی قمر النسا کی نواسی۔'' بی جان نے تعارف کروایا۔ فاتح عالم نے دیکھا وہ ایک سانولی سی قبول صورت لڑکی تھی۔ سر کے گرد دوپٹا لپیٹے اس دھان پان سی لڑکی کو دیکھ کر قطعاً اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس قدر خوب صورت آواز کی مالک ہو گی۔ اپنے تعارف پر اس نے غیر مقدمی انداز میں ہلکا سا مسکرا کر فاتح کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔

''یہ یہاں کیسے؟'' فاتح نے پوچھا۔

''بیچاری کے ماں، باپ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ماں تو اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی، اب باپ بھی گزر گیا۔ بہن، بھائی کوئی ہے نہیں۔ ددھیال والوں نے رکھنے سے انکار کر دیا تو قمر النسا کے پاس آ گئی۔ وہ خود بیٹوں کی محتاج ہے۔ مجھے پتا چلا تو میں نے کہا میرے پاس بھیج دو...... کوئی اچھی جگہ دیکھ کر شادی کر دوں گی...... کیوں صحیح کہا ناں......'' بی جان نے تفصیل بتا کر آخر میں اس کی تائید چاہی۔

''آپ بھلا غلط کہہ سکتی ہیں۔'' فاتح عالم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''تمہارے لیے کیسی رہے گی؟'' بی جان نے مسکرا کر اپنے وجیہہ پوتے کو دیکھا۔

''بی جان......!'' فاتح عالم ہکا بکا رہ گیا۔

''آپ مذاق کر رہی ہیں؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''بالکل نہیں...... میں بہت سیریس ہوں۔''

''یہ اسٹینڈرڈ ہے آپ کے نزدیک میرا۔'' وہ خفا ہو گیا۔

''کیا کمی ہے اس میں...... خاندانی ہے، پڑھی لکھی ہے...... ایم بی اے کیا ہوا ہے اس نے۔ شریف اور باکردار ہے...... اور کیا چاہیے؟'' بی جان نے سبیلہ کی خوبیاں گنوائیں۔

''میرا اور اس کا کوئی میچ نہیں ہے... بی جان......'' فاتح عالم کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''دیکھو فاتح...... جن رنگ برنگی لڑکیوں کے ساتھ تم باہر گھومتے پھرتے ہو ان میں سے کسی کو میں گھر لانے والی نہیں ہوں...... گھر بسانے کے لیے مجھے نیک اور شریف لڑکی چاہیے۔'' بی جان نے اس پر واضح کیا۔

''تو نیک اور شریف لڑکیاں اس دنیا میں اور بھی تو ہیں ناں بی جان۔'' فاتح عالم جھنجلا گیا۔ ''آپ اپنے سرکل میں دیکھیں۔ ایسی لڑکی تو ہو جو میرے ساتھ چلتی اچھی لگے۔''

''میں گھر میں بیٹھی عورت ہوں...... مجھے کسی کے اندر باہر کا کیا پتا...... سبیلہ ایسی لڑکی ہے جس کے کردار کی میں گارنٹی دے سکتی ہوں۔ میری آئندہ آنے والی نسل ایسی لڑکی کے ہاتھ میں ہو گی تو میں سکون سے مر سکوں گی۔ پھر عورت پاکباز ہو تو مرد کبھی نہ کبھی راہِ راست پر آ ہی جاتا ہے۔'' بی جان نہایت سنجیدہ تھیں۔

''آپ میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط سوچنے لگی ہیں۔'' فاتح عالم کچھ دل گرفتہ سا ہو گیا۔

''زینیا گھر آئی تھی۔'' بی جان نے کاٹ دار لہجے میں بتایا۔

"اوہ......" فاتح عالم نے خفیف سا ہو کر نظریں چرائیں۔ "کیا کہہ رہی تھی؟"

"وہی سب کچھ جس کے بارے میں، میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ فاتح اگر تمہاری نظر میں میری بات کی ذرا سی بھی اہمیت ہے تو تم سبیلہ سے شادی کرلو......" بی جان نے اسے شرمندہ کرنے کے ساتھ، ساتھ اپنی بات منوانے کے لیے دباؤ ڈالا۔

"کہیں سے بھی کوئی اٹھ کر آجائے اور میرے بارے میں کچھ بھی غلط سلط آپ سے کہہ دے تو کیا آپ یقین کرلیں گی اس کا؟" فاتح عالم نے بی جان کا دل صاف کرنے کی کوشش کی۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کے اس نے تمہارے بارے میں کچھ غلط ہی کہا ہوگا۔" بی جان نے اس کی بات کو پکڑا۔ فاتح عالم خفیف سا ہو کر خاموش ہو گیا۔

"تم گناہ کے راستے پر چل نکلے ہو فاتح......اور یہ بات بہت تکلیف دہ ہے میرے لیے۔ تم اگر اپنی غلط حرکتیں نہیں چھوڑ سکتے ہو تو کم از کم اپنی زندگی میں ایک پارسا عورت کو شامل کرلو......تمہاری اولاد نیک ہاتھوں میں پرورش پائے گی۔ تمہاری بیوی کے ہاتھ تمہاری خاطر دعا کو اٹھیں گے تو واپسی کا راستہ کھلا رہے گا تمہارے لیے۔" بی جان نے دکھی لہجے میں کہا۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بی جان سے بے حد محبت کرتا تھا اور ان کی دل آزاری سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ اپنی ذات کا ایک تاریک رخ ان کے سامنے آنے اور پھر ان کے دکھی ہونے نے اسے بری طرح شرمسار کر دیا تھا لیکن سبیلہ بہرحال ایسی لڑکی تھی جس کے بارے میں وہ خود کبھی سوچنا بھی گوارا نہ کرتا جبکہ بی جان اسے اس کے لیے آئیڈیل قرار دے رہی تھیں۔

"آپ کی ساری باتیں ٹھیک ہیں بی جان لیکن یہ لڑکی......کیا نام ہے اس کا......؟" فاتح نے رک کر اس کا نام یاد کرنے کی کوشش کی۔

"سبیلہ......" بی جان نے لقمہ دیا۔

"مجھے پسند نہیں ہے۔" اس نے بیچارگی اور کسی قدر لجاجت سے بی جان کو بتایا۔

"تمہیں مجھ پر بھروسا ہے......ہے یا نہیں؟" انہوں نے دوٹوک الفاظ میں پوچھا۔

"وہ تو ہے لیکن......"

"بس پھر خاموش ہو جاؤ......اسے میرا حکم سمجھو یا آخری خواہش......جو تمہاری مرضی......اگر زندگی کے ہر معاملے میں تم نے اپنی من مانی کرنی ہے تو سمجھو مر گئی میں تمہارے لیے......" بی جان کا لہجہ غصیلا ہو گیا۔

"آپ جانتی ہیں، آپ پر تو میری جان بھی قربان ہے۔" فاتح عالم نے گہری سانس لی اور ان کے پاس لیٹ گیا۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

"اللہ تمہیں نیک ہدایت دے۔" انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

ان گنت لفظ ہیں جو ہم بولتے ہیں۔ ایک دن میں ہزاروں الفاظ، ہزار طرح کے الفاظ......تیز، نوکیلے، نشتر نما الفاظ، نرم، دھیمے، زخمی دل پر پھاہا رکھتے، مانند مرہم، مسیحا صفت الفاظ......پرتکبر، مغرور، خود اپنی ذات سے بھی بڑے بڑے فرعون صفت الفاظ......شیخی بھرے، بڑھکیں مارتے، ذاتی توصیف سے معمور، حباب صفت الفاظ، الفاظ دوست بھی ہیں اور دشمن بھی......الفاظ تسلی بھی ہیں اور بھروسا بھی......الفاظ زخم بھی ہیں اور مداوا بھی......الفاظ کبھی نہیں مرتے، ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ یہ اپنا وجود کبھی نہیں کھوتے۔ یہ کبھی تحلیل نہیں ہوتے ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ہماری یادوں کی کتاب میں ان مٹ روشنائی کے ساتھ تحریر ہو جاتے ہیں۔ ہوا میں تیرتے رہتے ہیں۔ ہم اپنی دانست میں اپنی زندگی میں آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن الفاظ ہمارے پیچھے، پیچھے آتے ہیں۔ کبھی زہر بن کر، کبھی شفا بن کر، کبھی آئینہ بن کر......کبھی پچھتاوا بن کر......کبھی مجسم حقیقت بن کر۔

☆☆☆

وہ دونوں کیمپس کی سڑک پر چل رہی تھیں۔ رخ لائبریری کی طرف تھا جب عمار حسیب سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

''ہیلو!'' وہ ان کے پاس آکر رک گیا تھا۔ مجبوراً انہیں بھی رکنا پڑا۔

''مس نور...... کیا آپ کے پاس ٹائم ہوگا...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' شیبا نے معنی خیز نظروں سے نور الہدیٰ کی طرف دیکھا۔

''میں لائبریری جارہی ہوں۔ تم بات کرلو......''

وہ کہہ کر فوراً ہی رفو چکر ہوگئی۔

وہ دونوں راستے میں کھڑے تھے۔ سیاہ عبائے کے اوپر اس نے سیاہ بٹنوں والی جرسی پہن رکھی تھی جس کے بٹن آگے سے کھلے تھے۔ دونوں ہاتھ جرسی کی جیبوں میں ڈالے وہ ذرا نروس تھی۔ سیاہ اسکارف کے ہالے میں لپٹے دمکتے چہرے پر سنجیدگی کی چھاپ نمایاں تھی۔ عمار حسیب نے بے حد اپنائیت سے اس کے حسین روپ کو دیکھا۔

''کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں؟''

نور الہدیٰ نے ایک پل کو اس کی بات پر غور کیا لیکن اس کی احتیاط پسندی کو گوارا نہیں ہوا کہ وہ اس کے ساتھ اکیلی بیٹھی کسی کی نظروں میں آئے۔

''اِدھر آجائیں......'' اس نے کچھ دور کھڑے برگد کے درخت کا رخ کیا۔ عمار کوئی اعتراض کیے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ درخت کے نیچے پہنچ کر نور الہدیٰ نے منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ لب کاٹتے ہوئے وہ کچھ نروس لگ رہا تھا۔

''ایکچوئیلی...... مس نور...... میں اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔'' بالآخر ہمت کرکے اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیوں......؟'' نور الہدیٰ نے بے ساختہ پوچھا۔ سوال اگرچہ احمقانہ تھا لیکن ضروری تھا۔ عمار حسیب اب قدرے اعتماد سے مسکرایا۔

''میں آپ کو بہت پسند کرتا ہوں نور...... اپنی زندگی میں آپ کو شامل کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' نور الہدیٰ نے سڑک سے گزرتے اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر انکار کیا۔

''کیوں......؟'' وہ بے چین ہوا۔ ''کیا آپ...... کہیں انگیجڈ ہیں۔''

''نہیں......'' نور الہدیٰ نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر...... وجہ جان سکتا ہوں......؟'' عمار حسیب کے لہجے میں اصرار تھا۔

''میں یونیورسٹی آنے والی اپنی فیملی کی پہلی لڑکی ہوں...... میرے یہاں آنے کا مقصد صرف علم حاصل کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی ایسی بات ہو جس کی وجہ سے میرا سر میرے والدین کے آگے جھک جائے۔'' نور الہدیٰ نے واضح الفاظ میں اپنے انکار کی وجہ بتائی۔

''لیکن...... اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میں جائز طریقے سے آپ کے گھر رشتہ بھیجنا چاہتا ہوں۔ معاشرہ اور مذہب دونوں اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔'' عمار حسیب نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''آپ اپنے گھر میں بات کریں گے۔ پھر میرے گھر میں بات ہوگی۔ میرے والدین کیا سوچیں گے میرے بارے میں کہ میں یونیورسٹی میں نہ جانے کیا، کیا کرتی رہی ہوں۔ نہیں عمار...... میرے لیے میرا کیریکٹر ہر چیز سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس پر ایک دھبا بھی برداشت نہیں کرسکتی۔'' نور الہدیٰ بات ختم کرکے وہاں رکی نہیں...... عمار حسیب وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ بوڑھے برگد نے اپنی رازوں کی پوٹلی کھولی اور سارا واقعہ وہاں رکھ دیا۔ ہوا نے اپنے دامن میں لکھے الفاظ کو سنبھال کر رکھ لیا۔ وقت نے خاموشی سے یہ سارا منظر دیکھا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں طنز......

☆☆☆

فاتح نے گانا ریکارڈ کروایا اور ریکارڈنگ روم سے ملحقہ ریسٹ روم میں آگیا۔ اب وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا باہر سڑک پر چلتے ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔

''شوٹنگ کا کیا پلان ہے؟ پاکستان میں کرنی ہے یا باہر۔'' اس نے پلٹ کر دیکھا...... بوبی ہاتھ میں کافی کے دو مگ پکڑے کھڑا تھا۔

''دیکھتے ہیں یار......'' فاتح نے اس کے ہاتھ سے کافی کا مگ لیا اور واپس کھڑکی کی طرف رخ موڑ

لیا۔ بوبی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''نیہا تو کسی شو کے سلسلے میں ناروے گئی ہوئی ہے۔'' بوبی نے اس کی فیورٹ ماڈل کے بارے میں اطلاع دی۔ فاتح عالم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کافی کے سپ لیتا رہا۔

''کوئی پریشانی ہے؟'' چند لمحے اسے غور سے دیکھنے کے بعد بوبی نے ایک دفعہ پھر اسے مخاطب کیا۔ بچپن کا دوست ہونے کی وجہ سے وہ اس کی رگ، رگ سے واقف تھا اور اس کے رویے کے ہر رنگ سے بخوبی آگاہ......

''بی جان میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔'' فاتح عالم نے رخ موڑ کر کھڑکی سے پشت ٹکائی۔

''یہ تو گڈ نیوز ہے یار......'' بوبی نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا پھر فاتح کی سنجیدہ صورت دیکھی۔

''لیکن تیرا منہ کیوں اترا ہوا ہے؟''

''وہ جس لڑکی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں ہے۔'' فاتح عالم نے پریشان لہجے میں اپنا مسئلہ بتایا۔

''تو نے بتایا بی جان کو؟''

''ہاں...... لیکن وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔''

''ہوں......'' بوبی نے سر ہلایا۔ ''آخر انہوں نے بھی کچھ دیکھا ہوگا۔ تجھے کیوں پسند نہیں ہے وہ لڑکی؟''

''میرے ٹائپ کی نہیں ہے یار...... معمولی شکل صورت کی ہے، بالکل گھریلو سی۔''

''اگر بات کو گہرائی سے سوچ تو ایک لحاظ سے... بی جان ٹھیک ہیں۔'' بوبی نے انداز متفکرانہ ہوگیا۔

''اب تو میرا مذاق اڑا رہا ہے۔'' فاتح برا مان گیا۔

''نہیں یار...... بات سن میری۔ فرض کر اگر تو کسی حسین وجمیل، طرح دار لڑکی سے شادی کر لیتا ہے جو ہر لحاظ سے تیرے لیول کی ہو تو دو باتیں ہوں گی۔''

بوبی انکشاف کرنے والے انداز میں بول کر چپ ہوگیا۔ خیال تھا کہ فاتح تجسس سے سوال کرے گا لیکن جب وہ منہ بنائے خاموشی سے کھڑا رہا تو اسے خود ہی بات آگے بڑھانی پڑی۔

''پوچھے گا نہیں کہ کون سی دو باتیں......؟''

''جو بکواس تو نے سوچی ہوئی ہے وہ تو نے کرنی ہی ہے، اس لیے یہ ڈرامے مت کر اور سیدھی طرح بات کر......'' فاتح بگڑ گیا۔ اس کا موڈ پہلے ہی بہت خراب تھا۔

''اول تو میڈیا کی چکا چوند دیکھ کر ایسی لڑکی گھر میں ٹکے گی نہیں۔ خود بھی اس فیلڈ میں قدم رکھ دے گی اور اگر ٹک گئی تو تیرا جینا حرام کر دے گی۔''

''وہ کیسے......!''

''اپنی حرکتیں تو اچھی طرح جانتا ہے تو...... کبھی یہ لڑکی تو کبھی وہ...... بیگم تیرے لیول کی ہوئی تو تیرے پل، پل کی خبر رکھے گی۔ گھر آنے جانے کا حساب دینا پڑے گا تجھے...... زندگی جہنم ہو جائے گی تیری۔''

''بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہو تم......'' فاتح عالم نے منہ بنایا۔

''یہ سچائی ہے میرے دوست...... حقیقت...... جو ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔''

''اچھا تو بی جان کی پسند کردہ...... گھریلو عام سی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا کیا فائدہ ہے؟''

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں...... فائدے ہی فائدے ہیں...... ایسی لڑکی دب کر رہے گی۔ تم سے...... ہمت نہیں ہوگی اس کی کہ تم سے کچھ پوچھے۔ آرام سے گھر میں بیٹھ کر بچے پالے گی۔ باہر ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے تمہیں...... گھر میں بھی سکون اور باہر بھی مزے۔''

''ہمم...... یہ تو ہے۔'' فاتح عالم نے قائل ہو کر سر ہلایا۔

''تم نے غور نہیں کیا...... یہ جتنے بڑے، بڑے اسٹارز ہیں ناں، ان کی بیویاں معمولی شکل صورت کی ہوتی ہیں۔''

''اچھا خیر...... تو سنا...... تیرے گھر کے حالات کیسے چل رہے ہیں؟'' فاتح نے موضوع بدلا۔

''کچھ نہ پوچھو یار...... بہن کی منگنی ہوگئی ہے۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔''

''ہاں......'' بوبی نے گہری سانس لی...... ''لیکن وہ بہت مذہبی قسم کے لوگ ہیں۔ ابا نے صاف منع کر دیا ہے کہ میں ان کے سامنے نہ آؤں ورنہ بہن کی منگنی

خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''چل کوئی بات نہیں ...... تم جہیز وغیرہ بنانے میں کھلے دل سے خرچ کر دینا تو سب خوش ہو جائیں گے۔'' فاتح نے اسے تسلی دی۔

''بات اتنی آسان اور سادہ نہیں ہے۔'' بوبی کچھ دلبرداشتہ نظر آ رہا تھا۔'' ابا مجھ سے ایک روپیہ بھی لینے کے روادار نہیں ہیں۔''

''کیوں......؟'' فاتح عالم کو حیرت ہوئی۔

''کہتے ہیں کہ میری کمائی حرام کی ہے۔'' بوبی نے اداس لہجے میں بتایا۔ فاتح ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کندھے اچکائے۔

''اچھا تم ٹینشن مت لو...... ایک دن آئے گا جب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

☆☆☆

''تو تم نے انکار کر دیا؟'' شیبا نے اس سے پوچھا۔ وہ دونوں یونیورسٹی میں اپنے کیمپس کے گراؤنڈ میں گھاس پر بیٹھی تھیں۔ ''بندہ اچھا تھا ویسے۔'' شیبا نے اپنا موبائل استعمال کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''میری اپنی لمٹس ہیں......'' نورالہدیٰ نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''ارے دیکھو...... فاتح عالم آ رہا ہے۔'' شیبا موبائل کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے خوشی سے چہکی۔

''کون فاتح عالم......؟'' نورالہدیٰ نے تعجب سے پوچھا۔

''فاتح عالم...... دی گریٹ سنگر...... تم نہیں جانتیں اسے؟'' شیبا نے باچھیں پھیلا کر حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔

''اچھا وہ...... کہاں آ رہا ہے؟ ہماری یونیورسٹی میں؟'' نورالہدیٰ میوزک نہیں سنتی تھی لیکن فاتح عالم آج کل جس قدر مشہور تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

''ہماری ایسی قسمت کہاں...... اسلام آباد آ رہا ہے...... کانسرٹ ہے اس کا یہاں......'' شیبا نے فون رکھ دیا۔ ''میں اس سے ملنا چاہتی ہوں......''

''چلی جانا کانسرٹ میں......'' نورالہدیٰ نے تجویز پیش کی۔

''اونہوں...... میری فیملی ابھی لڑکیوں کے معاملے میں اتنی لبرل نہیں ہوئی۔ اور یہ کانسرٹس عموماً رات کو ہوتے ہیں۔ ممی کبھی مجھے جانے نہیں دیں گی۔'' شیبا نے مایوسی سے کہا پھر دفعتاً چٹکی بجائی۔ ''یاسر سے بات کروں گی۔ وہ یقیناً کوئی طریقہ نکال لے گا۔''

''تم بھی شیبا...... سچ میں پاگل ہو......'' نورالہدیٰ ہنسی...... ''کیا ضرورت ہے ایک آدمی کے پیچھے اتنا ایکسائٹڈ ہونے کی۔''

''وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے، وہ فاتح ہے...... فاتح عالم......'' شیبا نے زور دے کر کہا۔ ''اس جیسا ہینڈسم شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں، اس کی شفاف اسکن...... اس کی خوب صورت ناک...... اس کا لمبا قد...... وہ سراپا حسن ہے اور پھر اس کی آواز...... جادو ہے اس کی آواز میں...... میں دیکھنا چاہتی ہوں...... جس قدر خوب صورت وہ اسکرین پر نظر آتا ہے کیا عام زندگی میں بھی ایسا ہی ہے......'' شیبا نے فاتح عالم کی شخصیت پر پوری تقریر کر دی۔

''کس قدر غلط بات ہے...... ایک غیر آدمی کو اتنے غور سے دیکھنا کہ آپ کو اس کا ایک، ایک نقش زبانی یاد ہو جائے۔'' نورالہدیٰ نے ملامت کی۔

''تم بہت نیک ہو نور...... میں تم جیسی نہیں ہوں......'' شیبا شرمندہ ہوئی۔

''تم بھی نیک ہو سکتی ہو...... کوشش تو کرو......'' نورالہدیٰ نے اسے ترغیب دی۔

''میں کبھی تم جیسی نہیں بن سکتی۔ تم ہر گناہ سے خود کو بچاتی ہو...... ہر بات میں اللہ کی رضا کا خیال رکھتی ہو...... کبھی تم نے اپنے نفس کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا...... کبھی کوئی خواہش تمہارے قدموں کی زنجیر نہیں بنی...... تمہارا دل ہر قسم کی دنیاوی لذت سے پاک ہے۔ تمہارے دماغ میں کسی وسوسے کی کوئی دھند نہیں ہے...... تم بہت سیدھے اور صاف رستے پر ہو نور......'' شیبا نے توصیفی لہجے میں کہا۔

نورالہدیٰ نے اس کی بات کا انکار نہیں کیا...... وہ خود جانتی تھی کہ وہ نیک ہے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس

نے اپنی پوری زندگی میں جان بوجھ کر کوئی گناہ کیا ہو......اس نے اپنے ہوش وحواس میں آج تک کوئی نماز قضا نہیں کی تھی۔ کوئی روزہ نہیں چھوڑا تھا۔ کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ حقوق اللہ پورے کیے تھے۔ حقوق العباد کا خیال رکھا تھا۔ اپنے کردار کی حفاظت کی تھی۔ اسے اپنی عبادت پر مان تھا۔ اسے اپنی ریاضت پر فخر تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ انسان جس چیز کا مان کرتا ہے اسی سے آزمایا جاتا ہے۔ وہ بھول گئی تھی کہ نیکی فخر نہیں ہے، توفیق ہے، مان نہیں ہے صرف اور صرف اللہ کا احسان ہے۔

☆☆☆

''محبت سے پوچھو
کہاں رہ گئی ہے
میں چل تو پڑا ہوں
وہ لیکن نہیں ہے
کہیں بھی نہیں ہے''

فاتح عالم گنگناتا ہوا بی جان کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھی تھیں۔ چہرے پر پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔ فاتح نے ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے غور سے ان کا جائزہ لیا۔

''بی جان......اب تو میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہے پھر بھی آپ پریشان ہیں، یہ تو کوئی مناسب بات نہیں ہے......''

بی جان اس کی شکل دیکھ کر رہ گئیں۔ اب وہ اسے کیا بتاتیں کہ پریشان تو وہ تب سے تھیں جب انہوں نے سبیلہ سے فاتح کے رشتے کے لیے بات کی تھی۔ ان کی بات سن کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

''بی جان......میں بہت معمولی لڑکی ہوں......آپ پلیز میرے لیے کسی اور کو دیکھیں......'' بالآخر اس نے کہا تھا۔

''نہ بچے......میں نے تمہیں اپنے فاتح کے لیے پسند کیا ہے، تم بس مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔'' بی جان نے شفقت سے پوچھا تھا۔ سبیلہ نے اپنے ہاتھ آپس میں رگڑے......وہ نروس نظر آ رہی تھی۔

''برا مت مانیے گا بی جان......میں نے اپنے لیے کبھی کوئی بڑے خواب نہیں دیکھے......صرف ایک خواہش ہے کہ جس سے بھی میری شادی ہو چاہے وہ غریب ہو......تھوڑا کماتا ہو لیکن......کمائی حلال کی ہو۔ آپ تو جانتی ہیں، حرام کھانے والے کی تو دعا ہی قبول نہیں ہوتی۔'' اس نے رک، رک کر اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے بی جان کی شکل دیکھی، وہ خاموش بیٹھی رہ گئیں۔ وہ معمولی شکل و صورت رکھنے والی عام سی لڑکی جس کے سر پر اس کے ماں، باپ موجود نہیں تھے۔ جس کی نانی اسے سہارا دینے سے قاصر تھی وہ ان کے مشہور و معروف وجیہہ پوتے کو ٹھکرا رہی تھی اور اس کی بیان کردہ وجہ سن کر وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں۔

''بی جان!'' فاتح عالم نے ان کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ''کن سوچوں میں گم ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں بیٹا......تم سناؤ......'' بی جان نے خود کو سنبھال کر اس کی طرف توجہ دلائی۔

''رشتہ طے کر دیا آپ نے میرا؟'' فاتح عالم نے پوچھا۔

''نہیں......تمہاری مرضی جو نہیں تھی، اس لیے میں نے سوچا۔ کہیں اور دیکھ لوں گی۔'' انہوں نے نظریں چرائیں۔

''چلیں شکر ہے آپ نے میرے بارے میں بھی سوچا۔'' فاتح عالم خوش ہو گیا۔

''تمہارے بارے میں ہی تو سوچتی رہتی ہوں سارا وقت......'' بی جان نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔

''جانتا ہوں......اسی لیے آپ سے اتنی محبت کرتا ہوں۔'' فاتح عالم ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''جیتا رہ میرا بچہ......'' انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

''ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔'' فاتح عالم نے آنکھیں موندتے ہوئے بتایا۔

''کہاں ٹھہرو گے؟ ہوٹل میں......؟''

''نہیں......اپنے بنگلے میں......ذرا پرائیویسی رہتی ہے۔''

''اللہ تمہیں کامیاب کرے۔'' بی جان نے اسے دعا دی۔

''اور نیک ہدایت دے۔'' فاتح عالم نے شرارت سے انہیں ان کی وہ دعا یاد دلائی جو وہ اکثر اسے دیتی تھیں۔

''ہاں...... اللہ تمہیں نیک ہدایت دے......'' بی جان ہنس پڑیں۔

☆☆☆

''میں نے یاسر سے بات کی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کی فاتح عالم سے اچھی سلام دعا ہے۔ جب یاسر نے اسے بتایا کہ میری فیانسی تمہاری بہت بڑی فین ہے اور تم سے ملنا چاہتی ہے تو اس نے کل تین بجے کا ٹائم دیا ہے۔'' تین دن بعد شیبا نے نور الہدیٰ کو بتایا۔

''کہاں جانا ہوگا اس سے ملنے......؟'' نور الہدیٰ نے پوچھا۔ اس وقت وہ دونوں یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود تھیں۔

''یہاں اس کا اپنا بنگلا ہے، جب بھی وہ اسلام آباد آتا ہے وہیں ٹھہرتا ہے۔ ایڈریس بھیج دیا ہے مجھے یاسر نے...... بس ایک پرابلم ہے۔'' شیبا نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''ڈرائیور چھٹی پر ہے اور ممی مجھے اکیلے اس سے ملنے جانے نہیں دیں گی۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''میں......؟'' نور الہدیٰ ہچکچائی۔

''ہاں تم...... کیونکہ تم میری واحد دوست ہو اور ایسے موقعوں پر دوست ہی کام آتے ہیں۔ اس لیے میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ میں ٹیکسی لے کر تمہیں پک کرنے آجاؤں گی۔ پندرہ، بیس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرنا ہم نے وہاں پر...... پکس لیں گے اور تھوڑی سی گپ شپ کریں گے۔ بس......'' شیبا نے اپنا پورا پروگرام بتایا۔

''او کے......'' نور الہدیٰ مان گئی تھی۔

☆☆☆

موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا۔ دسمبر کی یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں۔ سردی ہڈیوں کے اندر گھس رہی تھی۔ نور الہدیٰ نے ظہر کی نماز پڑھ کر ٹائم دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ ''لگتا ہے شیبا کا پروگرام رہ گیا ہے۔'' اس نے سوچا اور پھر کھڑکی سے باہر آسمان پر جھکے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر جھرجھری لی۔

''آج تو موسم بہت ہی خراب ہے۔'' اسی وقت اس کے موبائل کی گھنٹی بجی...... دوسری طرف شیبا تھی۔

''نور...... میں تمہیں ایڈریس بھیج رہی ہوں...... تم ٹیکسی لے کر وہاں پہنچو...... میں بھی وہیں آجاتی ہوں۔''

''ساتھ چلتے تو اچھا تھا۔'' نور الہدیٰ ہچکچائی۔

''یار میں پارلر میں ہوں...... اب اگر یہاں سے پہلے میں تمہارے گھر آتی ہوں اور پھر ہم فاتح کے گھر جاتے ہیں تو بہت دیر ہو جائے گی۔ وہ کوئی عام بندہ تو ہے نہیں...... اتنی بڑی سلیبریٹی ہے، شکر ہے اس نے ٹائم دے دیا ہے۔ اب انتظار کروانا مناسب نہیں لگتا۔''

''اچھا چلو ٹھیک ہے......'' نور الہدیٰ نے گہری سانس لے کر فون بند کر دیا۔ ٹیکسی بک کروا کر اس نے اپنا عبایا اور اسکارف پہن کر اوپر اپنی جرسی پہنی اور جنت بی بی کے کمرے میں چلی آئی۔

''اماں میں ذرا شیبا کے ساتھ جا رہی ہوں......''

''پر دیسے موسم دیکھ......'' جنت بی بی پریشان ہو گئیں۔ ''اس خراب موسم وچ کون سا کام پڑ گیا تمہیں۔''

''شیبا کو کام ہے اماں...... میں نے ساتھ جانا ہے، بس گھنٹے تک واپس آجاؤں گی۔'' نور الہدیٰ نے موبائل دیکھتے ہوئے بتایا۔

''وہ آرہی ہے تجھے لینے......؟'' جنت بی بی نے پوچھا۔

''نہیں اماں...... وہ وہاں پہنچ جائے گی...... میں نے بھی وہیں جانا ہے۔ ٹیکسی آگئی ہے، میں چلتی ہوں۔''

''اللہ دے حوالے...... دھیان سے میرا بچہ...... تو منع کر دیتی اسے۔ انکار بھی تو نہیں کرتی کسی کو......'' جنت بی بی بولتی ہوئی دروازے تک آئی تھیں اور اب موسم کے تیور دیکھ کر دہل رہی تھیں۔

ٹیکسی جب فاتح عالم کے بنگلے کے سامنے رکی تو بادل برسنے کو بالکل تیار تھے۔ نور الہدیٰ نے پریشانی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ڈور بیل بجائی...... دروازہ فاتح عالم نے خود کھولا تھا۔

''آپ؟'' وہ دروازے میں کھڑا ہو کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یاسر صدیقی نے آپ سے ذکر تو کیا ہوگا۔'' نورالہدیٰ نے نروس انداز میں شیبا کے منگیتر کا حوالہ دیا۔

''اوکے..... آجائیں۔'' فاتح عالم نے پیچھے ہٹ کر اسے راستہ دیا اور پھر گیٹ بند کر کے اس کے آگے چل پڑا۔ وہ بلیک جینز کے ساتھ اسکائی بلیو ٹی شرٹ کے اوپر بلیک ہی لیدر کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اگر اس کے لاکھوں کی تعداد میں فینز تھے تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ یقیناً ایسی ہی سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے نورالہدیٰ نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ داخلی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا اور ساتھ نورالہدیٰ کو بھی اندر آنے کی دعوت دی۔ یہ ایک بڑے سائز کا سجا سجایا لونگ روم تھا۔ بائیں جانب دیوار کے ساتھ بنا آتش دان جلتی ہوئی لکڑیوں سے دہک رہا تھا۔ کمرے کے باقی سازو سامان سے الگ دو سنگل صوفے آتش دان کے سامنے ایک دوسرے کی طرف رخ کیے رکھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی ٹیبل پر کوئی میگزین دھرا ہوا تھا۔ جونہی نورالہدیٰ نے اندر قدم رکھا۔ بادل زور سے گرجے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

''آیئے پلیز..... اِدھر آجائیں.....'' فاتح عالم نے ایک اچھے میزبان کی طرح اسے آتش دان کے پاس پڑے ایک صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی.....

نورالہدیٰ جھجکتے ہوئے آگے بڑھی۔ شیبا ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ گھر میں فاتح عالم کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا۔ پتا نہیں یہاں کوئی اور تھا بھی یا نہیں..... وہ صوفے پر بیٹھ گئی تو فاتح عالم کمرے کے اندرونی دروازے سے اندر کہیں غائب ہوگیا۔

''کہاں رہ گئی ہو تم؟'' نورالہدیٰ نے شیبا کا نمبر ملایا۔

''یار گھر پر ہوں..... تیز بارش ہے، ٹیکسی والا بھی بھاگ گیا ہے اور ممی نکلنے نہیں دے رہیں مجھے۔'' شیبا نے پہلے اپنا دکھڑا رویا اور پھر اس سے پوچھا۔ ''تم پہنچ گئی ہو کیا.....؟''

''تم نے پارلر سے سیدھا یہاں آنا تھا ناں..... گھر کیوں گئی ہو؟'' نورالہدیٰ غصے سے لب بھینچ کر رہ گئی۔

''جوتا چینج کرنا تھا اس لیے گھر آنا پڑا۔ دیکھو ناں قسمت کی بات فل تیار ہو کر گھر میں بیٹھی ہوں..... تم نے بتایا نہیں کہ پہنچی ہو کہ نہیں.....''

''پہنچ گئی ہوں میں.....'' نورالہدیٰ نے غصے سے اس کی بات کاٹی..... ''آئندہ اپنے کسی پروگرام میں مجھے شامل کرنے کا خیال بھی دل میں مت لانا۔ سمجھیں تم!'' نورالہدیٰ نے فون بند کر دیا۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھی۔ بغیر اپنی کسی ذاتی دلچسپی کے صرف شیبا کی خاطر وہ اس سخت خراب موسم میں بنا کچھ سوچے سمجھے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اور وہ محترمہ خود آرام سے گھر میں بیٹھی تھیں۔ اسی وقت فاتح ہاتھ میں چند سوکھی لکڑیاں لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے لکڑیاں آتش دان میں ڈالیں اور جلتی ہوئی لکڑیاں سیٹ کرتے ہوئے نورالہدیٰ کی طرف مڑا۔

''کمروں میں جو گیس کے والو ہیں وہ کہیں سے بند ہیں۔ وہ تو شکر ہے لان میں کافی ساری سوکھی لکڑیاں پڑی تھیں جو میں نے اٹھا کر اندر رکھ لی تھیں اور پھر یہ آتش دان بھی کام آگیا۔'' وہ رک کر ذرا سا ہنسا۔ ''ورنہ اس موسم میں مکینک کہاں ملتا ہے۔'' جلتی ہوئی لکڑیوں کی سرخی مائل روشنی میں اس کی سفید رنگت گلابی ہو رہی تھی۔ ایک گھٹنا موڑ کر کارپٹ پر بیٹھا ہوا آتش دان کی لکڑیوں کو چھیڑتے ہوئے وہ اس قدر سادہ انداز میں نورالہدیٰ سے مخاطب تھا جیسے وہ کچھ دیر پہلے ملنے والے اجنبی نہ ہوں بلکہ ان کے درمیان زمانوں سے شناسائی موجود ہو۔ نورالہدیٰ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس کے گھر کے کمروں میں گیس کیوں نہیں آرہی تھی۔ یا مدتوں پرانے آتش دان کو کام میں لا کر وہ کس قدر خوش تھا۔ وہ بس اب یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ لیکن منہ اٹھا کر ایسے ہی کیسے چل دیتی۔ اپنے آنے اور جانے کی کچھ وضاحت تو کرنی ہی تھی۔ وہ مناسب الفاظ تلاش کر رہی تھی کہ فاتح عالم نے خود ہی اس مشکل آسان کر دی۔

''آپ یاسر صدیقی کی فیانسی ہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔
''نہیں...... دراصل میں یاسر صدیقی کی فیانسی کی دوست ہوں...... ہم دونوں نے اکٹھے ہی آنا تھا۔ لیکن بارش کی وجہ سے وہ آنہیں سکی۔ بہت بڑی فین ہے وہ آپ کی......'' نورالہدیٰ نے بتایا۔
''اوہ......'' فاتح عالم نے افسوس کا اظہار کیا۔
''میں چلتی ہوں اب......'' نور الہدیٰ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ ''اس خراب موسم میں جو آپ کو تکلیف دی اس کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔''
وہ اختتامی کلمات ادا کر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ فاتح عالم وہیں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ نور الہدیٰ نے بیرونی دروازہ کھولا تو ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اندر تک کپکپا کر رہ گئی۔ باہر بارش بھی اور اس قدر تیز کہ گیٹ تک پہنچنا تو درکنار کمرے سے باہر قدم نکالنا بھی محال تھا۔ وہ چند لمحوں تک وہیں کھڑی بے بسی سے زمین سے ٹکریں مارتی بارش کو دیکھتی رہی۔
''دروازہ بند کردیں۔ بارش رکے گی تو چلی جایئے گا۔'' فاتح عالم نے اسے مشورہ دیا۔ نور الہدیٰ دروازہ بند کر کے ڈھیلے قدموں سے چلتی دوبارہ اپنے صوفے پر آبیٹھی۔
''آپ کا نام جان سکتا ہوں......'' فاتح عالم بھی بالآخر لکڑیوں کا پیچھا چھوڑ کر سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگیا تھا۔
''نورالہدیٰ......''
''میرے کون سے سانگز...... آپ کو زیادہ پسند ہیں۔'' فاتح عالم کے لہجے میں وہ خاص اپنائیت اور شیرینی تھی جو اپنے فینز سے مخاطب ہوتے وقت استعمال کرتا تھا۔
''کوئی بھی نہیں......'' نور الہدیٰ کا موڈ بے حد خراب تھا اور وہ پریشان بھی تھی۔ باہر بارش جیسے کسی کے ساتھ شرط لگا کر برس رہی تھی اور اندر اس کمرے میں وہ ایک اجنبی کے ساتھ محصور ہو چکی تھی۔ اس کا سارا دھیان بارش کی طرف تھا۔ بارش رکے تو وہ یہاں سے نکلے۔
''کوئی بھی نہیں......؟'' فاتح عالم نے حیرت

غزل

سوچ کر میں نے یہ قدم اٹھایا تھا
ارمانوں سے تمہیں دل میں سجایا تھا
جانے کس غلطی کی سزا ملی ہے مجھے
میں نے کب کسی کے دل کو دکھایا تھا
چاہت کے سب سپنے ادھورے رہ گئے
آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو تنہا پایا تھا
اب کس کے انتظار میں راستے کو تکتا ہوں
سوائے غم کے کون ہے جو اس راستے پہ آ تھا
سکھ کی تلاش میں در بدر ہوگئی ہے زندگی
جہاں بھی گیا دکھ کو ہمیشہ پیچھے پایا تھا
جس نے مجھے دیکھا وہ ہنس کر کیوں گزرا
میں نے کسی کو دکھ اپنا کب سنایا تھا

کلام: ذیشان سلطان، سندھ

سے اس کا جواب دُہرایا۔ اسے زندگی میں پہلی بار ایسے جواب سے واسطہ پڑا تھا۔
''کیا آپ کو کوئی اور سنگر پسند ہے؟''
''دراصل......'' نور الہدیٰ کو اپنی بے رخی کا احساس ہوا تو اس نے وضاحت کی۔
''میں میوزک نہیں سنتی۔''
فاتح عالم نے اب ذرا غور سے اس کے حلیے کو دیکھا اور بے اختیار گہری سانس لی۔ اس کی بہت سی فینز بھی عبایا پہنتی تھیں لیکن سامنے بیٹھی لڑکی اس کی فین نہیں تھی اگرچہ موسم کی خرابی کی وجہ سے وہ آج گھر میں ہی رہنے پر مجبور تھا لیکن ایک ایسی لڑکی کے ساتھ اپنی شام برباد ہونے پر وہ جی بھر کر بیزار ہوا جو سرے سے میوزک ہی نہیں سنتی تھی۔ اس کو نور الہدیٰ سے ایک، ایک عجیب سی چڑ محسوس ہوئی۔ یہ شاید وہی چڑ تھی جو ہر دنیا دار کو دین دار سے ہوتی ہے۔ جس طرح دین دار کو ہر دنیا دار جہنمی لگتا ہے۔ بالکل ویسے ہی دنیا دار کو ہر دین دار اپنے دین کی نمائش کرنے والا منافق اور ریا

کار محسوس ہوتا ہے۔ اس فطری نفرت کو ختم کرنے کے لیے دین دار کو دنیا ترک کرنے سے منع کیا گیا ہے اور دنیا دار کو دنیا میں دل لگانے سے منع کیا گیا ہے۔ دین اور دنیا اگر ساتھ، ساتھ نہ چلیں تو ایک دوسرے سے متنفر اور برگشتہ رہتے ہیں۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں میں میوزک کو ناپسند کرنے کی؟'' فاتح عالم نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''دیکھیں...... یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' نور الہدیٰ کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''یہ آپ کا ذاتی معاملہ نہیں ہے...... میں میوزک اپنے لیے نہیں بناتا، لوگوں کے لیے بناتا ہوں۔ اپنا ٹائم، انرجی اور پیسہ لگاتا ہوں اس پر...... میرے جذبات انوالو ہوتے ہیں اس میں ...... آپ میوزک نہیں سنتیں اور یقیناً اپنے اردگرد موجود لوگوں پر بھی اس حوالے سے اثر انداز ہوتی ہوں گی تو اس طرح ان ڈائریکٹلی آپ میرے لیے نقصان کا باعث بن رہی ہیں...... یہ آپ کا ذاتی معاملہ کیسے ہوا؟''

اتنا بے تکا الزام لگانے کا مقصد صرف اور صرف نور الہدیٰ کو زچ کرنا تھا۔ وہ فاتح عالم کے مخالف نظریے سے تھی۔ اس لیے اس کو کھری، کھری سنا کر وہ کم از کم اپنے دل کی بھڑاس تو نکال ہی سکتا تھا۔ ایک ناپسندیدہ شخصیت کے ساتھ اپنی شام برباد ہونے کا کچھ انتقام تو لے ہی سکتا تھا۔

''اللہ نے موسیقی حرام قرار دی ہے اس لیے میں نہیں سنتی......'' بالآخر نور الہدیٰ کو واضح کرنا پڑا۔ وہ یہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی، جانتی تھی کہ میوزک کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے فاتح عالم کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی لیکن اس کی باتوں سے مجبور ہو کر کہنا ہی پڑا۔

''اوہ......'' فاتح عالم نے جیسے سمجھ کر سر ہلایا۔ ''تو آپ ایک نیک خاتون ہیں...... یعنی آپ اس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں جن کے خیال میں اللہ اور اس کی بنائی ہوئی جنت پر صرف انہی کا حق ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' نور الہدیٰ نے کہنا چاہا۔

''پھر آپ کے خیال میں تو میں ایک کنفرمڈ جہنمی شخص ہوں......'' فاتح عالم نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے اسے گھورا۔ نور الہدیٰ کو تنگ کرنے میں اب اسے مزہ آنے لگا تھا۔

''ہر انسان اپنے اعمال کے لیے اللہ کو جواب دہ ہے۔'' نور الہدیٰ جتنا اس متنازعہ بحث سے بچنا چاہتی تھی وہ اسے اتنا ہی اس میں گھسیٹ رہا تھا۔

''آپ اپنے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟ کیا آپ جنت میں جائیں گی؟''

''اگر میں نیک اعمال کرتی ہوں...... ہر برے کام سے بچنے کی کوشش کرتی ہوں تو مجھے اللہ سے یہ خوش گمانی تو ہونی چاہیے کہ وہ مجھے جہنم سے بچائے گا اور جنت میں جگہ دے گا۔''

''تو کیا میں اللہ سے یہ گمان نہیں رکھ سکتا؟'' فاتح عالم نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''اللہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ آپ اس سے رحمت کی امید رکھیں لیکن اس کے ساتھ آپ کو اس کا حکم بھی ماننا ہوگا۔ برائیوں اور گناہوں سے بچنے کی کوشش بھی کرنی ہوگی۔'' نور الہدیٰ نے گہری سانس لے کر واضح کیا۔

''آپ نیک اور دین دار لوگ ہر جگہ تبلیغ کیوں شروع کر دیتے ہیں؟'' فاتح عالم نے پوچھا۔ اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

''کیونکہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو......'' نور الہدیٰ تلملا اٹھی۔

''ہوں......اوکے......'' فاتح عالم نے سر ہلا کر غور سے اس کے ناراض چہرے کی جانب دیکھا اور اٹھ کر لونگ روم کے اندرونی دروازے سے اندر کہیں غائب ہوگیا۔ نور الہدیٰ نے تشویش سے کھڑکی سے باہر ہوتی موسلا دھار بارش کو دیکھا۔ بادل زور، زور سے گرج رہے تھے۔ شیبا کی مہربانی سے وہ آج بری طرح سے پھنس گئی تھی۔ ایک اجنبی کے ساتھ تنہا اس طوفانی موسم میں وقت گزارنا کس قدر مشکل تھا یہ وہی جانتی تھی۔ اوپر سے اس کی باتیں جو سراسر غصہ دلانے والی تھیں، نور الہدیٰ کو خواہ مخواہ برداشت کرنی پڑ رہی تھیں اور بارش کا یہ حال تھا کہ ختم ہونا تو دور کی بات فی الحال

اس کے ہلکا ہونے کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔
کچھ دیر بعد فاتح عالم دوبارہ نمودار ہوا۔ اس دفعہ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی۔ اس پر کافی کے دو مگ رکھے تھے۔ اس نے ٹرے درمیان میں رکھی چھوٹی میز پر رکھی۔
"اگر آپ چائے پسند کرتی ہیں تو معذرت...... کیونکہ کچن میں صرف کافی کا سامان ہی موجود ہے اور شکر ہے کہ یہ بھی ہے ورنہ اس بارش میں تو کچھ آرڈر بھی نہیں ہو سکتا؟" اب وہ اس کے سامنے کھڑا بڑے دوستانہ انداز میں اس سے مخاطب تھا۔
"آپ اکیلے ہیں یہاں......؟" نورالہدیٰ نے موقع پا کر پوچھا۔
"جی ہاں...... میں تنہائی کو کافی انجوائے کرتا ہوں...... آپ کافی لیں...... یقین کریں میں مسلمان ہوں۔" فاتح عالم نے اپنا مگ اٹھاتے ہوئے بے ساختہ طنز کیا۔ نورالہدیٰ نے خفیف سا ہو کر مگ اٹھا لیا۔
فاتح عالم لان کی طرف کھلنے والی گلاس ونڈو کی طرف بڑھ گیا۔ کھڑکی بند تھی لیکن پردے ہٹے ہوئے تھے۔ پانی کی بوندیں شیشے پر گرتی تھیں اور فوراً ہی نیچے پھسل جاتی تھیں...... شیشے پر دھند تھی۔ دھند کے اس پار منظر واضح نہ تھا۔ بارش بھی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے کچھ دیر دھندلے منظر کو دیکھتا رہا۔ کالے بادلوں نے شام سے پہلے شام کر رکھی تھی۔ وقت کسی جادو اثر لمحے کی زد میں تھا یا ہر برستی بارش کا اپنا ایک سحر تھا۔ آتش دان میں بھڑکتے شعلے جیسے کوئی منتر پڑھ رہے تھے۔ نورالہدیٰ کی نظریں آگ کے شعلوں پر تھیں۔
"میری بی جان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی پارسا عورت میری زندگی میں آ جائے تو میری زندگی کا رخ بھی نیکی کی طرف ہو جائے گا۔" وہ دھندلے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ نورالہدیٰ نے آتشدان سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ اب وہ پلٹ کر اسے دیکھ رہا تھا۔
"اگر میں آپ سے کہوں کہ مجھے نیکی کے راستے پر لانے میں آپ میری مدد کریں تو کیا آپ کریں گی؟"
"میں کیا کر سکتی ہوں؟" نورالہدیٰ نے پہلو بچایا۔
"یاد رہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرو۔" فاتح عالم نے اسی کے الفاظ اسے لوٹائے۔
"جس قدر ممکن ہو سکا میں آپ کی مدد کروں گی۔" نورالہدیٰ نے گہری سانس لی۔
"کیا آپ میری زندگی میں شامل ہونا پسند کریں گی...... شادی کریں گی مجھ سے؟" فاتح عالم نے اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکا۔
"کیا بکواس ہے یہ؟" نورالہدیٰ کو غصہ آ گیا۔
"ایک انسان کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے کیا آپ اتنا سا کام نہیں کر سکتیں؟" فاتح عالم کی نظروں میں طنز تھا اور لبوں پر زہریلی مسکراہٹ...... اس کی ساری بات چیت کا مقصد نورالہدیٰ کی پاکبازی کو ریاکاری ثابت کرنا تھا...... وہ اپنی دانست میں جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانا چاہتا تھا۔
"معاف کیجیے گا لیکن نیک عورتیں، نیک مردوں کے لیے ہوتی ہیں۔" غصے سے نورالہدیٰ کی آواز اونچی ہو گئی۔
"تو اس کا مطلب ہے کہ میری قسمت میں کوئی بری عورت لکھی ہے۔" فاتح عالم جلدی سے آیا اور اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔
نورالہدیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں بہت سی نیک عورتیں، برے مردوں کے ساتھ تعلق کی ڈور میں بندھ جاتی ہیں اور اسی طرح بہت سے نیک مرد، بری عورتوں کے ساتھ گزارہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"
وہ خاموش رہی۔
"شاید اس لیے کہ اللہ ہر برے انسان کو اچھا بننے کا ایک موقع ضرور دیتا ہے۔" فاتح عالم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔
"وہ تو کئی مواقع دیتا ہے۔" نورالہدیٰ نے لقمہ دیا۔
"یقیناً......" فاتح عالم نے متفق ہو کر سر ہلایا۔
"تو پھر مس نورالہدیٰ...... کیا آپ اس برے انسان کی نیکی کے راستے پر چلنے میں مدد کریں گی؟"
"آپ ایک عقل مند آدمی ہیں، اچھائی اور برائی

دونوں راستے آپ پر واضح ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'' نورالہدیٰ نے پہلو بچایا۔

''لیکن یہ سوچیں کہ اگر میری زندگی میں میرے ہی جیسی کوئی لڑکی شامل ہوگئی تو پھر گناہوں بھری جو زندگی میں گزار رہا ہوں اس سے پلٹنا میرے لیے.... بے حد مشکل ہو جائے گا۔'' فاتح عالم خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ آخر نورالہدیٰ سے اس قدر اصرار کیوں کر رہا تھا۔ وہ خود سیریس نہیں تھا لیکن نورالہدیٰ کو اس بارے میں سیریس ہو جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو اس کے سحر کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کی آواز کی شیدائی تھی، نہ ہی اس پر اس کی شخصیت کا جادو چلا تھا۔ فاتح عالم کی انا پر کاری ضرب پڑی تھی۔ یہ اس کی انا کی تلملاہٹ تھی جو وہ نورالہدیٰ پر نکال رہا تھا۔ وہ کسی بھی طرح اسے اپنے لیے سوچنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔

''یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''اور پھر ایک ہی ملاقات میں، میں آپ سے شادی کے لیے کیسے تیار ہو سکتی ہوں؟''

''اس سلسلے میں ہم دوبارہ بھی مل سکتے ہیں۔'' فاتح عالم کی آنکھیں مسکرائیں۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے...... میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں......'' نورالہدیٰ نے تلخ لہجے میں کہا۔ فاتح عالم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

چند لمحات کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو اذان کی آواز نے توڑا۔ فاتح عالم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اور نورالہدیٰ نے اپنے موبائل کو جو اذان کا الارم دے رہا تھا۔ عصر ہو چکی تھی۔ وہ الارم بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''واش روم کدھر ہے؟''

فاتح عالم نے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں سے جائیں گی تو دائیں طرف۔'' اس کے جانے کے بعد فاتح عالم نے انٹرنیٹ سے قبلے کی سمت معلوم کی۔ کم از کم اس معاملے میں وہ اس کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

نورالہدیٰ کی واپسی پانچ منٹ کے اندر ہی ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ گیلا تھا۔ وہ یقیناً وضو کر کے آئی تھی۔ صوفے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے سوالیہ نظروں سے فاتح عالم کی طرف دیکھا۔

''قبلہ اس طرف ہے۔'' فاتح عالم نے اس کا سوال سمجھ کر ایک طرف اشارہ کیا۔ وہ وہیں قالین پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ وہ کچھ دیر وہیں بیٹھا اسے دیکھتا رہا پھر اندر چلا گیا۔

نورالہدیٰ نماز سے فارغ ہو کر دوبارہ صوفے پر آ بیٹھی...... اس دفعہ فاتح عالم کی واپسی کافی دیر بعد ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بار پھر کچھ لکڑیاں تھیں جنہیں اس نے آتشدان میں ڈالا......سوکھی لکڑیوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی تھی۔

''پھر کیا سوچا آپ نے میرے پروپوزل کے بارے میں......'' وہ نورالہدیٰ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی آنکھوں کی شرارت واضح طور پر بتا رہی تھی کہ وہ صرف اسے تنگ کر رہا تھا۔ وہ بھنا کر رہ گئی۔ کیا یہ مذاق کی بات تھی؟ کیا ان کے دونوں کے درمیان کوئی مذاق کا تعلق تھا؟

''آپ کو یہاں آئے تین گھنٹے ہونے والے ہیں۔ کیا اتنی دیر میں آپ نے میرے بارے میں بالکل بھی نہیں سوچا؟'' وہ ایک دفعہ پھر اس کے مقابل صوفے پر تھا۔

''بس بہت ہو گیا۔'' نورالہدیٰ کے خیال میں اب اس کی طبیعت صاف کرنی ضروری ہو گئی تھی۔

''دیکھیں فاتح عالم صاحب......'' اس نے چبا، چبا کر کہنا شروع کیا۔ ''میں نے اپنی زندگی بہت پاکبازی میں گزاری ہے۔ میں نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا جس کی پاداش میں ایک ایسا شخص میرے نصیب میں لکھ دیا جائے جو عورتوں کے ساتھ ناچتا ہو۔''

فاتح عالم کا چہرہ جس تیزی سے سرخ ہوا تھا نورالہدیٰ کو احساس ہوا کہ اس نے بہت کاری وار کر دیا تھا۔ اس کی ذات پر ڈائریکٹ حملہ کر دیا تھا۔ وہ خفیف سی ہو کر خاموش ہو گئی۔ فاتح عالم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاید وہ اپنے

غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ نور الہدیٰ کو افسوس ہونے لگا۔ اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن وہ بھی تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ کوئی پہلی ملاقات میں بھی کسی کو پرپوز کرتا ہے اور وہ بھی ایسے انداز میں جو صاف مذاق محسوس ہورہا ہو...... اس نے جو کیا ٹھیک کیا...... آخر وہ کتنی دیر اس کی باتیں برداشت کرتی......

نور الہدیٰ نے ڈرتے، ڈرتے ایک بار پھر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ناراضی تھی اور چہرے پر غصہ...... پھر وہ اٹھا اور اپنی پسندیدہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوگئی۔ آخر کیا ضرورت تھی اسے ایسا کہنے کی۔ تھوڑی دیر کی ہی تو بات تھی۔ کیا وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ کیا وہ صبر سے اس کی باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اکیلی تھی یہاں پر...... اس کے رحم و کرم پر تھی۔ اگر وہ بدلہ لینے پر آ جاتا تو...... اب اسے ایک نئی فکر ستانے لگی۔ وہ معذرت کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگی۔ اسی ادھیڑ بن اسے محسوس ہوا بارش ہلکی ہوگئی تھی۔ اس نے جلدی سے ٹیکسی بک کرائی۔ اب اسے فاتح عالم کی خاموشی سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ آخر وہ کیا سوچ رہا تھا۔ نور الہدیٰ نے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا اسے معذرت کرنی چاہیے؟ ٹیکسی آ گئی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاتح نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کا انداز سنجیدہ تھا۔ اور چہرہ سپاٹ...... نور الہدیٰ نے معذرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ فاتح عالم کی سنجیدگی کو دیکھ کر اس کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی۔

''میں چلتی ہوں اب......'' دھیمی آواز میں اسے بتا کر وہ باہر نکلی۔ بارش کے اکا دکا چھینٹے پڑ رہے تھے۔ ہوا البتہ تیز تھی۔ وہ گیٹ تک اس کے پیچھے آیا تھا۔ اس نے نور الہدیٰ کو ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھا اور پھر گیٹ بند کر دیا۔

لونگ روم کے آتش دان میں لکڑیاں اب بھی چیخ رہی تھیں۔ میز پر کافی کے دو خالی مگ پڑے تھے...... نور الہدیٰ جا چکی تھی لیکن کمرے میں اس کی موجودگی زندہ تھی۔ دو اجنبی...... ایک دوسرے سے مختلف دو انسانوں کو وقت نے تین گھنٹوں کے لیے ایک ہی مقام پر باندھ کر رکھا تھا۔ تین گھنٹوں کے بعد جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو بہت کچھ بدل چکا تھا۔ ان کی ذات کے اندر جو کچھ بدلا تھا وہ اس سے ناواقف تھے۔ ان کے مقدر میں جو تبدیلی آئی تھی وہ اس سے بھی آگاہ نہیں تھے۔ ان کے مقدر میں لکھا ہوا تھا کہ وہ بدلے گا...... یہ ملاقات ایک ٹرننگ پوائنٹ تھی۔ نور الہدیٰ غلط نہیں تھی۔ ایک مضبوط کردار کی لڑکی کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ فاتح عالم کی شخصیت کے سحر میں نہیں تھی۔ وہ اس کی باتوں کے فریب کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ وہ غلط نہیں تھی...... وہ ہرگز غلط نہیں تھی۔ لیکن اس کی سوچ میں اپنی ذات کے لیے جو تفاخر تھا وہ یقیناً غلط تھا۔ اپنی نیکی اور پاکبازی کے حوالے سے جو برتری کا احساس اس کے دل میں جاگزیں ہو چکا تھا وہ غلط تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیڑھی، سیڑھی چڑھ کر بلند مقام پر پہنچنے والا جب گردن اکڑا کر حقارت سے نیچے دیکھتا ہے تو پھسل کر نیچے آ گرتا ہے۔ کبھی ہوا کا کوئی بگولا یوں بھی چلتا ہے کہ کسی پاتال میں رہنے والے کو اڑا کر بلندی پر لے جاتا ہے۔ یہی مقدر ہے۔ مقدر کا بدل جانا بھی مقدر ہے۔ اکیس سال نیکی کا دم بھرنے والی نور الہدیٰ نہیں جانتی تھی کہ نیکی کا حسن عجز ہے...... قبولیت کا ڈر ہی قبولیت کی کنجی ہے۔

دن رات ... گناہوں میں زندگی بسر کرنے والا فاتح عالم بھی نہیں جانتا تھا کہ تین گھنٹے اس کے ساتھ تنہائی میں گزار کر جو لڑکی ابھی، ابھی بحفاظت یہاں سے واپس گئی تھی، اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا خیال بھی دل میں نہ لا کر اس نے کوئی نیکی کی تھی۔ لیکن اللہ کے حساب کتاب کے پیمانوں میں کسی بھول چوک کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ وہاں ہر نیکی تلتی ہے۔ نیکی جو انسان کے لیے بند دروازے کھولنے کا کام کرتی ہے...... وہاں ہر گناہ ریکارڈ ہوتا ہے، گناہ جو راستے کا پتھر بن جاتا ہے۔ وہ 31 دسمبر کی شام تھی۔ سال کی آخری شام...... وقت ایک نئے باب میں داخل ہو رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

جمانے شروع کر دیے تھے۔ فیروز آباد کے اس قدیم ترین محلے کے خستہ حال مکانات میں زندگی کی رمق عود آئی تھی۔ صبح نور کے تڑکے کام کاج کے لیے روانہ ہونے والے مزدور، خواتین کا صبح سویرے اپنے شوہر حضرات کے لیے پیٹ پوجا کا انتظام کرنے کے لیے باورچی خانے کا رخ کرنا، اور کچھ گھروں میں نوزائدہ بچوں کے رونے کی صدائیں، ٹریفک کا اژدھام اور اس ٹریفک میں موٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ، کریانہ اسٹور کے سامنے ہی اندر کی طرف اشیائے خورونوش اور پانی .....کے بڑے کین اٹھا، اٹھا کر باہر کی طرف سجاوٹ کی جارہی تھی۔ اس طرح باسی روٹیاں لینے کے

الغرض زندگی عروج پر تھی۔ ایک نئی صبح نے اپنے پر کھول دیے تھے۔ اور تمام انسان اس نئی صبح کو ایک نئے عزم کے ساتھ جینے کے لیے تگ ودو میں مصروفِ عمل تھے۔

اس گلی کے نکڑ پر موجود مولوی کرامت علی صاحب کا بھی آشیانہ موجود تھا۔ مکان خستہ حال تھا اور بے حد بوسیدہ دیواریں رنگ وروغن سے دور اپنی سفید پوشی کا بھرم تک رکھنے میں ناکام ٹھہری تھیں۔ لکڑی کا دروازہ جو پرانے وقتوں کی دین تھا اور اس کے باہر ٹمیالے رنگ کا بوسیدہ حال پردہ لٹک رہا تھا۔ جو ماہ و سال کے تھپیڑے سہتے، سہتے اپنی خستہ حالی پر ماتم کناں تھا۔ بارش کی وجہ سے وہ جابجا ملگجا اور پھٹنے کے



قریب تھا۔ مگر گزارہ تو کرنا ہی تھا۔ سوچل سوچل کا عالم تھا۔ مولوی صاحب کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا عدنان، اس کے بعد منجھلی بیٹی ساجدہ اور سب سے چھوٹی بیٹی عابدہ۔ مولوی صاحب اکثر اوقات اپنے وعظ و نصیحت سے اہلِ محلہ کو راہِ راست پر لانے کے لیے کوشاں و سرگرداں رہا کرتے تھے۔ انہیں آج کل سب سے زیادہ اعتراض حال ہی میں یہاں اس گلی میں دوسرے نمبر والے مکان میں شفٹ کر جانے والی فیملی سے تھا۔ رستم نامی وہ لڑکا جس نے گلی کے نکڑ پر ان کے گھر کے عین سامنے بنی ہوئی دکان کو کرائے پر لے رکھا تھا اور اب وہاں پان شاپ ان کا منہ چڑا رہی تھی۔ رات گئے وہاں لوفر، لفنگے لڑکے کھڑے سگریٹ کے کش پر کش لگاتے اور پان کھاتے گانے کے بولوں کو برملا اونچی آواز میں گاتے ہوئے کچھ ٹھرکی معلوم ہوتے۔ مولوی صاحب بچیوں والے تھے۔ اور اپنی بیٹیوں کی کیا، سب کی بیٹیوں کی عزت وحمیت کے پاس دار بھی تھے۔ اس طرح کی حرکات ان کے لیے سخت کوفت اور اذیت کا سبب بن رہی تھیں۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ مولوی صاحب نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہی محلے کے معتبر و نامی گرامی ہستی ساجد صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ ساجد صاحب چندہ وغیرہ اکٹھا کرنے میں مولوی صاحب کی خاصی مدد کر دیا کرتے تھے۔ اس لیے مولوی صاحب کے ان سے خاصے اچھے اور قریبی تعلقات تھے۔

''ارے ماشاء اللہ تشریف لائیں۔ بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔'' وہ اندر کی طرف مڑے۔

شوہر کا اشارہ پاتے ہی رخسانہ بیگم نے صحن کے وسط میں پانی کا چھڑکاؤ کرتی بچیوں کو اشارہ کیا تھا۔ وہ جھٹ پٹ کچن کا رخ کر چکی تھیں۔ خود رخسانہ بیگم نے بھی سر پر مزید چادر سرکا کر اندر کمرے کا رخ کر لیا تھا۔

کرامت صاحب تو چند روز سے اندر ہی اندر ابل رہے تھے۔ گویا دوست کو دیکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا۔

''توبہ خدایا، یہ حیا سوز نظارے، یہ چلن، یہ چلتر کہاں گئی غیرت! اب اگر ان نوجوانوں کو دو لفظ نصیحت کے کہہ دیں تو الٹا مجھے ہی متعصب اور کینہ پرور قرار دے دیتے ہیں۔ دقیانوسی اور فرسودہ قرار دیتے ہیں۔''

کرامت صاحب شروع ہو چکے تھے۔ ساجد صاحب نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ تو آپ ٹھیک ہی رہے ہیں مگر ماجرا کیا ہے؟''

''بس بھائی صاحب......! جب سے محلے میں یہ نئی فیملی آ کر آباد ہوئی ہے۔ خرافات سے اہلِ محلہ کو مزید گمراہی میں مبتلا کر رہے ہیں۔ سرِ شام ہی واہیات گیت اونچی آواز میں ڈیک پر لگا دیے جاتے ہیں اور پھر یہی کیا کم ہے کہ بانکے سجیلے لڑکے ان دُھنوں کو خود بھی گاتے ہوئے ہنسی ٹھٹھول میں مشغول رہتے ہیں۔'' انہوں نے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا شروع کر دیے۔

''ارے امام صاحب...... اس طرح کے لوگ تو ہر جگہ موجود ہوا کرتے ہیں۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں اور دل میلا نہ کریں۔'' ساجد صاحب نے ٹالتے ہوئے ان کی تشفی کی خاطر کہا۔

کرامت صاحب نے ہنکارا بھرا تھا۔

''کل کی بات ہے کہ میں مغرب کے وقت مسجد نماز کے لیے جا رہا تھا۔ اس رستم نامی لڑکے کی دکان کے سامنے سے گزر ہوا تو کیا ہی...... بیہودہ گانا کوئی لڑکی گا رہی تھی۔ ڈیک کی آواز بلند اور میرے ہوش کے ناخن دلانے پر پہلے تو اس لڑکے کو چند منٹ میری بات ہی سمجھ نہیں آئی جب آئی تو ڈیک بند کرنے کے بعد مجھ سے معافی تلافی کی درخواست کرنے لگا۔ میں نے خیر اس وقت تو بات ختم کر دی۔ مگر دکان پر بیٹھے ایک لوفر نے لفنگے پن سے کہا۔

''بڈھے نے سارا مزہ کرکرا کر دیا، کیا ہی لطف آ رہا تھا۔''

توبہ، توبہ...... قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں یہ سب......'' مولوی کرامت نے اپنے کانوں کو باقاعدہ طور پر ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

ساجد صاحب ایک مصروف شخصیت تھے۔ اس طرح سے بیٹھ کر لمبی تقریریں اور پند و نصائح کے موڈ

میں ہرگز نہیں لگتے تھے۔ وہ دین کے کاموں میں معاونت تو کرتے تھے مگر مکمل طور پر دین کی پیروی وہ بھی نہیں کر پاتے تھے۔ دین کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تھے مگر من وعن احکامات کی تعمیل ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

''میاں صاحب...... وہ چھڑا چھانٹ لڑکا ہے۔ اس نے نئی دکان کھولی ہے۔ مگر اتنا بھی برا نہیں ہے۔ نہ ہی قصور سراسر اس کا ہے۔ نت نئے بھانت، بھانت کے لڑکے آ کر اس کو گھیر گھار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ وہ تو مجھ سے بڑا مؤدب ہو کر ملتا ہے۔ پھر یہ تو دنیا کا چلن ہے۔''

ساجد صاحب کی بات سے کرامت صاحب بالکل بھی متفق نہیں تھے اور ان کے پاس جوابی دلائل کے لیے بھی بحث و جواز و دلائل موجود تھے مگر ساجد صاحب کے پاس وقت تھا نہ ہی مزید تکرار چاہتے تھے سوجھٹ ہزار کے نوٹوں کی گڈی انہوں نے کرامت صاحب کی طرف بڑھا دی تھی۔

''یہ لیجیے چندہ......''

کرامت صاحب کو یہ رقم معمول سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

''یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' ان کے ہاتھ رقم لیتے ہوئے کپکپا رہے تھے۔

''جی ہاں...... بالکل درست، دراصل کرم دین صاحب نے حج کی ادائیگی سے پہلے یہ وعدے کی رقم جمع کرانا چاہی ہے۔ آپ اپنے پاس بطور امانت سنبھال کر رکھیں۔''

ساجد صاحب کی بات پر کرامت صاحب نے ان کی بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''موصوف ابھی بیٹھیں تو۔ چائے ناشتا کر کے جائیے گا۔'' مولوی صاحب بضد تھے۔

''جی ابھی تو رخصت چاہتا ہوں۔ پھر کبھی سہی۔ دیر ہو رہی ہے۔ پھر کسی دن حاضر ہو جاؤں گا۔'' اس بار کچھ سوچ کر ساجد صاحب نے مولوی صاحب کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے......''

''جی، جی فرمایئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' مولوی صاحب چونک گئے۔

''بس ناشتا کر لیتے تو مجھے بخدا خوشی ہوتی۔''

ساجد صاحب مسکرا دیے۔ وہ مولوی صاحب کے گھر کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے۔ جانتے تھے کہ ان کا کیا ہوا ناشتا یہاں اہلِ خانہ کے دو افراد کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ پھر وہ تو کسی بھی ڈھابے پر جا کر ناشتا کر سکتے تھے۔ جی میں خیال تھا کہ کسی جگہ بیٹھ کر حلوا پوری کا ناشتا تناول فرمائیں گے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ مولوی صاحب بڑے دل سے بخوشی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر ان کے لب سے کبھی شکوہ نہیں بلکہ شکر اللہ کے ہی کلمات نکلتے رہیں گے۔

''دراصل کہنا یہ تھا کہ وہ لڑکا رستم خصوصی شفقت کا مستحق ہے۔ دل کا برا نہیں ہے۔ ایک بڑی بہن بیاہی ہے۔ اکیلا ہے تو جینے کا اب قرینہ نہیں رہا۔ والدین تو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت میں جا چکے۔ یہ نیا کاروبار ہے، نا سمجھ ہے۔ پھر ایسے بچے ہی تو راہِ راست کے طلبگار ہوا کرتے ہیں۔ بے فکر رہیں۔ شریف النفس لڑکا ہے۔ اور کہنا یہ تھا کہ یہ لیں خطیر سا تحفہ نذرانہ۔ اس کو چندہ جات میں ہرگز شمار مت کیجیے گا۔'' ساجد صاحب نے جیب سے رقم کا لفافہ الگ سے جو مولوی صاحب کے لیے رکھا تھا ان کو تھماتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

''آپ کی نوازش ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کا کرم بہت ہے۔'' وہ خفت زدہ سا لہجہ لیے بولے۔ کندھے کچھ جھک اور گئے تھے۔

غربت بھی ایک سزا بن جایا کرتی ہے۔ کچھ دیر والا ان کا وہ کڑک دار، رعب داب والا لہجہ بیٹھ گیا تھا۔ پھر ساجد صاحب مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ مگر پھر دو قدم چل کر وہ رک گئے تھے اور پھر انہوں نے پلٹ کر امام صاحب کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور ہموار لہجہ بنا کر بولے تھے۔

''مولوی صاحب چندہ جات کا ایک خطیر حصہ اس رستم نامی نوجوان نے بھی دیا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی اس نیکی کی کسی کو بھنک بھی نہ ملنے

پائے۔ سب لوگ ایک سے نہیں ہوا کرتے ہیں۔ دل کے احوال اور نیت تو اللہ رب العالمین ہی بہتر جان سکتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ خصوصی طور پر شفقت کا سلوک روا رکھیں۔'' ساجد صاحب یہ کہہ کر رکے نہیں تھے۔ وہ مولوی صاحب کو الجھن زدہ آمیز انداز میں کھڑا چھوڑ کر چل دیے تھے۔ وہ تحیر آمیز انداز میں مٹیالے پردے کو ہلتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ جب رخسانہ بیگم نے راشن منگوایا اور دینے والے کو ہاتھ اٹھا، اٹھا کر دعائیں دیں تو وہ سب دعاؤں کا حقدار رستم ہی تھا کہ الگ سے گھر خرچ کی رقم بھی اس کی طرف سے ہی ہدیہ تھا۔

☆☆☆

وہ جون کی ایک چلچلاتی ہوئی دوپہر تھی۔ کالج وین سے تمام لڑکیاں اپنے، اپنے گھر روانہ ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر عابی کو ایسی کوئی سہولت بھی میسر نہ تھی۔ وہ اس وقت پسینے سے شرابور کالج کے مین گیٹ سے گزر کر مین روڈ پر آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ شدید پیاسی تھی۔ اس کے گلے میں پیاس کی شدت سے گویا کانٹے سے اگ آئے تھے۔ پانی کی بوتل بھی خالی ہو چکی تھی۔

''یا اللہ کوئی بس بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔''

عابی نے مسمسی صورت بنا کر مین روڈ پر ٹریفک کو دیکھا جہاں رکشے چل رہے تھے۔ گاڑیاں رواں دواں تھیں مگر ابھی تک اس کی مطلوبہ بس نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ ہراساں سی تھی۔

''کاش ہم بھی امیر ہوتے۔ وہ میمونہ کی بچی تو کتنا شو آف کرتی ہے۔ اور میرے یونیفارم پر بھی تنقید کرتی رہتی ہے۔ کب تک یہ یونیفارم چلاؤ گی۔ کہو تو میں نیا لے دوں۔ مجھے تو اس گھسے ہوئے یونیفارم کو دیکھ، دیکھ کر ہی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔'' یہ سب سوچ کر ہی عابی کی آنکھ نم ہونے لگی تھی۔ میمونہ کا تضحیک آمیز رویہ اس کی نگاہوں میں از سر نو گھومنے لگا تھا۔

میمونہ کہنے کو تو اس کی دوست تھی اور یہ دوستی صرف کالج تک ہی محدود تھی۔ وہ تو کسی امیر کبیر گھرانے کی پروردہ تھی۔ جبکہ وہ اس کے مقابل ایک انتہائی نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں سانس تک لینے کا شاید کرایہ لینا جائز قرار دیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کا تعلیمی وظیفہ مقرر تھا سو یہ تعلیمی سلسلہ جاری تھا اور سفید پوشی کا بھرم برقرار تھا۔

اس نے اپنی چادر کو مزید سر پر اچھی طرح جسم کے گرد جما کے اطراف میں دیکھا تھا۔ تبھی اس کو میرون شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس وہ وجیہہ نوجوان دکھائی دیا تھا جو اس کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ ہولے، ہولے بائیک لہراتا اس کے عین پاس آ کر رک گیا تھا۔

''آپ پلیز برا نہ منائیں تو میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔'' اس نوجوان نے قدرے مہذبانہ انداز میں اسے آفر کی تھی۔

گرمی اور آگ برساتے سورج کو دیکھ کر تو حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وہ چپ چاپ اس کی بات مان لیتی مگر وہ مولوی کرامت کی بیٹی تھی۔ جس کی تربیت پر مولوی صاحب نے سالوں صرف کیے تھے اور جہاں کوئی کمی رہ گئی تھی تو عابی کی والدہ محترمہ نے پوری کر دی تھی۔

''جی! مجھے آپ کی مدد نہیں چاہیے۔'' عابی نے نفی میں سر ہلا کر اپنی چادر سے چہرے پر آئے ہوئے پسینے کے ننھے، ننھے قطروں کو خشک کرنا چاہا تھا۔

نہ جانے کیوں عابی کو لگ رہا تھا کہ اس نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے مگر اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

''میری بات مانیں میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ پچھلے آدھے گھنٹے سے یونہی کھڑی ہیں۔ میں صرف آپ کی پریشانی دور کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا تھا۔

''اور آپ کو کیا ملے گا۔ میری پریشانی دور کر کے؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

بظاہر غصہ کرتی وہ اندر سے بری طرح ہراساں تھی۔ یہاں اسٹاپ پر اِکّا دُکّا جو لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ بھی مطلوبہ پوائنٹ میں بیٹھ کر جا چکی تھیں۔ وہ اس وقت اس جھلساتی گرمی میں اکیلی ہی تھی۔ اس کے اندر شدید اضطراب تھا۔ اس نے سچے دل سے اللہ کو پکارا تھا۔ اسے اس۔ وجیہہ اور مضطرب آنکھوں والے

اس اجنبی سے سخت خوف سا محسوس ہونے لگا تھا مگر وہ نیچی نظریں کیے اس سے مخاطب تھا۔

''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں ہے۔ میں آپ کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ میں......''

ابھی وہ لڑکا نہ جانے کیا، کیا تاویلات پیش کرنے والا تھا کہ اچانک ہی اس کی مطلوبہ بس آ گئی۔ اس میں بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ مگر اس نے پائدان پر کھڑے ہو کر جانا ہی گوارا کر لیا۔۔۔ بجائے یہ کہ وہ اس اجنبی کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر گھر جاتی۔

جب وہ ہانپتی کانپتی گھر پہنچی تو اسے گھر میں معمول سے ہٹ کر چہل پہل محسوس ہو رہی تھی۔ گھر میں سجاوٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ ساتھ والے گھر سے نئی کرسیاں منگوائی گئی تھیں اور میز کرسیوں سے بیٹھک سجا دی گئی تھی۔ پردے بھی مستعار لیے گئے تھے۔ اور کچن سے اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو بتا رہی تھی کہ آج کچھ خاص ہوا ہے۔ کچھ الگ سی بات ہے۔ ورنہ روزانہ کے معمولاتِ زندگی میں یہ سب کب شامل تھا۔

اس نے کمرے میں جا کر اپنا بیگ رکھا اور سیدھا واش روم میں فریش ہونے کے لیے گھس گئی۔

منہ پر مسلسل ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اس شخص کا خوب صورت چہرہ آنکھوں کے سامنے عکس بن کر لہرا تا رہا تھا۔

''نہ جانے کون تھا؟'' وہ سوچ کر رہ گئی۔ وہ لباس تبدیل کر کے باہر نکلی تو ساجدہ نک سک سے تیار ملی۔

''اوہ......تو یہ بات ہے۔'' اس نے معاملہ فہمی سے اپنے ہونٹ سکیڑے تھے۔

خوب صورت خد و خال تو اللہ رب العزت کی دین تھے ہی۔ اس وقت ذرا سی توجہ کے بعد مزید کھل سے گئے تھے۔

اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص کرم تھا۔ کہ دونوں بہنیں ہی اللہ تعالیٰ کی صناعی کا انمول پیکر تھیں۔ وہ دونوں ہی بے حد حسین تھیں۔ اور عابی تو انتہائی دلکش نین نقش کی مالک تھی۔ چہرے پر قدرتی بھولپن تھا۔ ساجدہ کے بھی کئی رشتے آ چکے تھے فوری پسند بھی کر جاتے مگر ہر بار محض غربت کی وجہ سے انکار ہو جاتا۔ اس سے قبل تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اماں نے کسی کے گھر سے ایک ماچس کی تیلی بھی مانگی ہو اور آج گھر کی سب آرائش و زیبائش اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

''بات سنو......تمہارے ابا دو دن کے لیے تبلیغی دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ محلے کی آپا عظمیٰ نے رشتہ بتایا ہے.... اور یہ سارے مشورے انہوں نے ہی دیے۔ کیا حرج ہے کہ گھر میں ادھار کی چند اشیا لے لی جائیں۔ میں نے بھی سوچا کہ میں قسطوں میں ادا ئیگی کر دوں گی۔ اس طرح سے یہ کوئی جھوٹ بھی نہیں ہوگا۔ اور تمہارے ابا بھی خفا نہیں ہوں گے۔'' اماں نہ جانے کیوں اسے صفائیاں پیش کر رہی تھیں۔

''اماں آپ نے بالکل درست کیا ہے۔ ساجدہ آپی کی عمر تو اگرچہ اتنی زیادہ نہیں ہے مگر پھر بھی...... اب ان کا کوئی بھی مناسب رشتہ آتا ہے تو شادی کر دینی چاہیے۔ یوں بھی آپا نے تو کب سے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ باقی آپ بہتر سمجھتی ہیں۔''

عابی کو گھر میں یوں بھی زیادہ سیانی سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ اول تو یہ کہ ساجدہ نے رو دھو کر میٹرک کیا تھا۔ اس کے برعکس عابی تعلیم یافتہ تھی۔ بیٹا اکرام بھی واجبی تعلیم حاصل کر سکا تھا اس کے بعد بہت کم تنخواہ پر کسی جگہ ملازم ہوا تھا۔ جبکہ عابی گھر بیٹھے بچوں کو پڑھاتی تھی۔ اس نے اپنی محنت کے بل بوتے پر میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لیا۔ معاشی بحران کی وجہ سے یہ مشکل ضرور تھا مگر اس نے خوب محنت کی تھی اور تعلیمی وظیفہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ ابا اگرچہ زیادہ پڑھنے لکھنے کے حق میں بھی نہ تھے۔ مگر یہاں اماں آڑے آ گئی تھیں۔

''اکرام کے ابا میں کہتی ہوں کسی ایک کو تو پڑھ لکھ لینے دیں۔ دو بچے تو نکھٹو نکلے۔ کوئی تو ہو جو ہمارا نام روشن کرے۔''

وہ چپ کر گئے تھے۔

''دیکھ لو۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ ایسا نہ ہو نام روشن کرتے، کرتے نام ہی ڈبو دے۔ تم اس کی ذمے داری

لیتی ہو تو ٹھیک ہے۔''

اس کے بعد عابی کی پڑھائی کا سفر جاری وساری تھا۔ اس نے بہت محنت کی تھی اور ہر ممکن جتن کر کے ہر سال اعلیٰ سے اعلیٰ نمبر لینے لگی تھی۔

''اچھا اماں آپ کدھر کھو گئیں۔ میں کب سے پوچھ رہی ہوں کہ کون لوگ ہیں۔'' اس کے پوچھنے پر اماں ہولے سے مسکرا دیں اور ساری تفصیلات اس کے گوش گزار کرنے لگیں۔ آخر کو وہ ان کی سب سے قابل اور سمجھدار بیٹی تھی۔

اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ مہمان آ چکے تھے۔ اماں نے اس رقم سے اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ کیک رس، نمکو، سموسے اور چائے ان کے نزدیک تو یہ بھی کسی مرغ مسلم سے کم نہ تھا۔ جس قدر سادگی سے یہ لوگ زندگی کی گاڑی کھینچتے تھے۔ اس میں تو دو وقت کی دال روٹی ہی عزت کے ساتھ پوری ہو سکتی تھی۔ عیاشی کے تو وہ لوگ کسی طور بھی متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

معمر خاتون اور ساتھ میں دو لڑکیاں، سب سے زیادہ عجیب صورت حال یہ تھی کہ لڑکا بھی ساتھ ہی تھا۔ ان دونوں بہنوں نے ڈیوڑھی کے عقب میں نکلتی جالی سے جھانکا تھا۔ پھر وہ مہمان خانے میں بیٹھ چکے تو ساجدہ سارا سامان ٹرے میں سجا کر اندر لے گئی تھی۔

معمر خاتون اور ان کے ساتھ دونوں جوان لڑکیاں ان کی طرح ہی کسی متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ مگر بہرحال ان کا لباس اس بات کا اشارہ کرتا تھا کہ وہ ان سے اچھے حالات میں ہیں۔

''یہ میرا بیٹا ہے الیاس...... پہلے تو میں نے سوچا کہ ہم عورتیں ہی آ جاتی ہیں۔ میرا پھر ارادہ بدل گیا، میں چاہتی تھی آپ بھی الیاس کو دیکھ بھال لیں۔ ہم بھی آپ کی طرح شریف النفس لوگ ہیں۔ عظمیٰ بہن نے آپ کی اتنی تعریفیں کی، آپ کی شرافت کی اور گھرانے کی۔ بیٹی کتنی سگھڑ ہے۔ ہم نے تو یقین کریں دیکھے بنا ہی دل سے ہاں کر دی تھی۔ آپ اسے رسمی طور پر آنا سمجھ لیں۔ الیاس کو ساتھ لانے کا مقصد یہی تھا کہ آج ہی رشتہ پکا کر دیتے ہیں۔ دو منٹ بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ آج کل وہ دور بھی نہیں رہا ہے۔ پھر بہن، زندگی تو بچوں نے ہی گزارنی ہوتی ہے۔ آپ سمجھیں یہ بس رسمی کارروائی ہے۔ رشتہ پکا ہی سمجھیں......'' وہ...... بے حد خوشگوار لب و لہجے میں بول رہی تھیں۔

ساجدہ تو ٹرے رکھ کر ہی پلٹ چکی تھی اور اب وہ دونوں بہنیں اس وقت جالی کی اوٹ سے سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔

ساجدہ شادی کے ذکر پر کھل اٹھی تھی۔ عابدہ کے دل میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے ساجدہ کے بازو پر چٹکی بھری اور اسے چھیڑا تھا۔

عابی کی حرکت پر ساجدہ کے گال گلنار ہو چکے تھے۔

''جی وہ سب تو ٹھیک ہے مگر......'' رخسانہ بیگم ایک مولوی کی بیوی تھیں خاندان کے لڑکوں کے سامنے بھی لڑکیاں نہیں آتی تھیں اور اب اچانک ہی ایک نامحرم کے سامنے بیٹی کو کرنے سے گھبرا رہی تھیں۔'' آج بات پکی نہ ہو سکے گی مگر میں راضی ہوں۔ دراصل ان کے ابا تبلیغی دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ فیصلے گھر کے مرد ہی کرتے ہیں۔'' رخسانہ نے وضاحتی انداز اختیار کیا تھا۔ انہوں نے الیاس کو بغور دیکھا تھا۔ قدرے فربہی مائل سا لڑکا تھا۔ سر کے بال کچھ کم تھے۔ مگر خوش شکل اور خوش مزاج ہونے کے ساتھ، ساتھ سب سے بڑھ کر برسر روزگار تھا اور وہ لوگ بے حد چاہت سے رشتے کے طلبگار تھے۔ سو اُن کے دل کو قدرے اطمینان ہوا تھا۔ آنے والی لڑکیاں خاموش تھیں۔ ان کی والدہ ہی اب تک بول رہی تھیں۔

''یہ میری بچیاں ہیں۔ بڑی کی شادی ہو چکی ہے اور چھوٹی بیاہ کر جائے گی تو آپ کی بچی میرے گھر کی رونق بن کر آ جائے گی۔'' معمر خاتون نے مسکرا کر کہا تھا۔

''آنٹی ہماری ہونے والی بھابی کو تو بلا دیں پلیز......'' ایک لڑکی بولی۔

اب انکار کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔

''آؤ ساجدہ......''

ماں کی آواز پر ساجدہ سر پر دوپٹا جمائے سُبک روی سے بیٹھک میں داخل ہو گئی۔ اسے دیکھ کر الیاس

اپنی جگہ سے احتراماً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ساجدہ کو یہ بات بہت اچھی لگی تھی یہی بات عابدہ کو بھی بہت اچھی لگی تھی۔ زندگی بھر کا سفر طے کرنے والے ہم سفر کو کم از کم عورت کی توقیر کا عادی تو ہونا ہی چاہیے۔

''آؤ بیٹی اِدھر بیٹھو......'' معمر خاتون نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

وہ پاس بٹھا کر اس سے چھوٹے، چھوٹے کچھ سوالات کرنے لگی تھیں۔ الیاس فطرتاً نیک لڑکا تھا۔ تبھی سرسری طور پر نگاہ ڈال کر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دوبارہ نگاہ نہیں ڈالی تھی مگر اس کے چہرے پر پھیلی روشنی اور خوشی بتاتی تھی کہ اسے لڑکی بہت اچھی لگی ہے۔ دھیمے، دھیمے لہجے میں بولنے والی، سُبک روی سے چلنے والی اسے بھا گئی تھی۔ یہی حال ہونے والی ساس کا بھی تھا۔

وہ سر پہ دست شفقت رکھ کر ہزار کے چند نوٹ اس کی گلابی ہتھیلی میں رکھ گئی تھیں۔

ساجدہ نے جاتے، جاتے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر الیاس کو دیکھا تھا۔ جو اشتیاق سے اس پر ہی نظر لگائے تھا۔ دونوں کی نگاہوں کا خوب صورت تصادم ہوا تھا۔ اور دونوں طرف دل میں اٹک سا گیا تھا جو محبت کا حسین احساس دلا گیا تھا۔

ساجدہ باہر نکلی تو عابدہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ساجدہ کے گال خوشی سے تمتمار ہے تھے۔ وہ لوگ اپنی دانست میں پیسے شگن کے لیے دے کر گئے تھے اور مٹھائی بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ اور جاتے ہوئے اپنے گھر بھی مدعو کر گئے تھے۔ ایک جانب سے تو رشتہ پکا ہو چکا تھا۔ ابا کی ہی آمد اور ہاں کا انتظار تھا۔ جی ہی جی میں سارے اہلِ خانہ راضی ہو چکے تھے۔

☆☆☆

آج وہ بے تحاشا خوش تھا۔ اتنا خوش کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہر راہ چلتے سے اپنی اس خوشی کو بانٹ لے۔ آج اللہ تعالیٰ نے اس کی بڑی بہن کو اولادِ نرینہ سے نوازا تھا۔ اور وہ ماموں بن گیا تھا۔ ابھی وہ بہن سے ملنے گیا تھا۔

''کاش اماں زندہ ہوتیں تو میں آپ کو گھر لے آتا۔'' بہن سے کہتے ہوئے اس کا لہجہ اداس تھا۔

''بھیا اداس نہ ہو۔ خوشی کے موقع پر اداسی کی بات نہیں کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اماں کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے مگر قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ لیکن ہم ہیں ناں ایک دوسرے کے سگے۔ دکھ سکھ کے ساتھی۔'' وہ گلوگیر لہجہ میں بولی تھی۔

سچ تو یہی تھا کہ وہ دونوں والدین کے بعد ایک دوسرے کے لیے ہی سب کچھ تھے۔ جہاں ایک کا غم دوسرے کے دل کو رنجور کر دیتا تھا وہیں یہ بھی سچ تھا کہ ایک کی خوشی دوسرے کے لبوں پر مسکان کے پھول کھلا دیتی تھی۔

رستم اس وقت ایک پرائیویٹ اسپتال کے روم میں موجود تھا۔ جہاں اس کی آپا داخل تھیں۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھیں اور ساتھ ہی بے بی کاٹ میں ایک نومولود بچہ گہری نیند میں گم تھا۔ مگر رستم نے اس کا ننھا منا سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کا یہ لمس اس کو اندر تک سرشار کر رہا تھا۔ یہ اس کا اپنا خون تھا۔ اس دنیا میں اب تک وہ دونوں ہی واحد رشتہ تھے اب اس میں ایک اور ننھے منے وجود کا اضافہ ہو گیا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر اس طرح خوشی کے رنگوں میں کسی اپنے کے رنگ کی کمی کا احساس زندگی میں عجیب سی تشنگی اور آزردگی اداسی گھول دیتا ہے۔ کیا کروں۔ کبھی، کبھی ہو جاتا ہے احساس۔ بہت تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ جب گھر جاتا ہوں تو سوچتا ہوں تنہائی کا آسیب مجھے نگل نہ لے۔'' وہ بہت افسردگی سے بول رہا تھا۔

''بس بھیا...... اسی لیے کہتی ہوں...... کہ اب تم اپنا گھر بسالو۔ میری بھابی لے آؤ۔ میں بھی اس سے نت نئے فرمائشی پکوان بنوا، بنوا کر کھایا کروں گی۔ سچ کہوں میری نظر میں تو دو چار لڑکیاں بھی ہیں۔ بس تم ہاں کرنے والے بنو...... گھر کی اداسی بھی اڑن چھو ہو جائے گی۔ پھر تو دوڑ، دوڑ کر گھر جایا کرو گے......''

وہ شرما سا گیا تھا۔ ایک خوب صورت سا احساس اس کے دل کو گدگدا رہا تھا۔

اب وہ بہن کو کیا بتاتا کہ وہ ایک کامنی سی لڑکی کو دل دے چکا ہے۔ مگر وہ لڑکی اس کے سچے جذبوں سے نا آشنا ہے۔ اس کی محبت کی ریل گاڑی آگے بڑھنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس موضوع سے پہلو تہی کر رہا تھا۔ سامنے بھی اس کی اپنی بہن تھی کوئی غیر نہ تھی کہ اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے رنگ نہ بھانپ لیتی۔

''کون ہے وہ...... مجھے نہیں بتاؤ گے۔'' بہن نے تاڑ لیا تھا۔

''بس ہے کوئی آپا...... وقت آنے پر بتادوں گا۔ فی الحال تو مجھے یہ تک نہیں معلوم کہ اس کے دل میں کچھ ہے بھی کہ نہیں......'' وہ سر جھکا کر رہ گیا تھا۔

''اچھا اس کا کوئی آتا پتا ہی بتادو......'' وہ بضد تھیں۔

''کچھ وقت دیں آپا۔ میں سب کچھ بتادوں گا۔ آپ کو نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا۔ اب مجھے اجازت دیں۔ اب چلتا ہوں آپا...... پھر آؤں گا۔'' وہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

''سنو...... یہ اچھا موقع ہے۔ قریب اریب گھروں میں تو مٹھائی لے جانا...... ان مواقع سے ہی جان پہچان بڑھتی ہے۔'' آپا نے اپنی دانست میں اچھے مشورے سے نوازا تھا۔

سو وہ مسکرا کر نکلا تھا۔

مشورہ اسے واقعی اچھا لگا تھا اسی لیے اس نے واپسی کے سفر پر گامزن راستے میں مٹھائی کی دکان پر اپنی بائیک روک لی تھی۔ مٹھائی پیک کروا کر اس نے اپنے گھر کی راہ لی تھی۔ گھر کے عین سامنے والا گھر ہی تو تھا اس کا۔ کون سا دوری پر تھا۔ اس نے بائیک کے شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اپنے بالوں کو سنوارا۔ قمیص کا کالر درست کیا اور پھر بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ اس وقت اس کا دل معمول سے کچھ زیادہ ہی تیز دھڑک رہا تھا۔

''کون ہے......؟'' اندر سے زنانہ آواز سنائی دی تھی۔ مترنم سا لہجہ۔ اسے پہچاننے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کے لیے وہ شدت سے سوچتا تھا۔ جس کے لیے وہ دل میں تڑپ رکھتا تھا۔

جس کی ایک نظر کے لیے کبھی تو تپتی ہوئی دوپہر میں کالج کے مین گیٹ کے باہر کھڑا رہتا تو کبھی کہیں مگر وہ تو اسے دیکھتی ہی نہ تھی۔ اپنی ہی رو میں اپنی سکھیوں سے بولتی ہوئی اپنے گھر کی راہ لے لیتی۔ اس دن جب عابی کو روک کر گھر چھوڑنے کی آفر کی تھی اس کی نگاہوں میں پنپتی ہوئی اجنبیت اس بات کا عین ثبوت تھا کہ وہ لڑکی اس کے جذبوں سے واقف نہیں ہے۔

''جی یہ مٹھائی دینی تھی۔''

اس کی بات پر دوسری جانب خاموشی چھا گئی تھی۔ گویا اس کے متعلق فیصلہ کیا جا رہا تھا کہ اسے اندر بلانا ہے کہ نہیں......

اسی وقت رخسانہ بیگم نے دروازہ کھولا۔ وہ ادب سے کھڑا رہا۔

''بیٹا کیا اس گرمی میں باہر ہی کھڑے رہو گے۔ اندر آجاؤ۔''

اس نے دہلیز پار کر کے ادب سے مٹھائی کا بڑا سا ڈبا ان کو تھما دیا تھا۔

''میں آپ کے محلے میں ہی رہتا ہوں۔ میرا نام رستم ہے۔ آپ کے سامنے ہی گھر لیا ہے۔''

رخسانہ بیگم اگرچہ گھر سے بہت کم نکلا کرتی تھیں۔ مگر وہ سارے محلے کو جانتی تھیں۔ محلے کے بچے ان سے قاعدہ قرآن مجید پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس لیے تقریباً سب ہی گھروں سے ان کی سلام دعا کا معاملہ تھا۔ وہ پہچان چکی تھیں کہ یہ لوگ محلے میں نئے تھے۔

''اچھا آپ لوگ نئے شفٹ ہوئے ہیں...... گھر سیٹ ہوگیا...... بیٹھو بیٹا...... شربت پی کر جانا...... عابی بیٹا، شربت لے آؤ......''

''نہیں آنٹی، میں چلتا ہوں۔ تکلف نہ کریں۔ دراصل ہمارے پرکھوں کی بہت بڑی حویلی ہے لیکن والدین کی وفات کے بعد وہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ میری آپا کا گھر قریب ہی واقع ہے۔ اس لیے میں نے بھی قریب ہی گھر لے لیا۔ اس طرح میں اور آپی قریب ہوگئے ہیں۔'' وہ مسکرایا تھا۔

اسی وقت اچانک ہی عابی شربت کا گلاس لے

آئی تھی۔
"لو بیٹا...... پی لو...... مہمان تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتے ہیں۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جو صحن کے وسط میں رکھی تھی۔ وہ حوصلے سے بیٹھ گیا۔ اسے اپنی آپا پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا۔ ان کی وجہ سے ہی وہ یہ ہمت کر سکا تھا۔
عالی نے اسے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پہچان لیا اور اسی لیے جھٹ گلاس دے کر اندر کچن میں غائب ہوگئی تھی۔
رستم کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر امید کی جوت جل اٹھی تھی۔
رخسانہ کو یہ وجیہہ نوجوان بہت بھلا معلوم ہوا تھا۔
"آپ بھی کسی دن ہمارے غریب خانے میں تشریف لائیں......" اس نے غٹا غٹ شربت پی کر دعوت دے ڈالی تھی۔
"تم نے کہہ دیا۔ بہت بات ہے مگر میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم خم کہاں۔"
"مگر عقیقے پر تو آپ کو آنا ہی ہوگا۔ وہ ہم حویلی میں ہی کریں گے۔ سارا خاندان اکٹھا ہوگا۔ آپ اور مولوی صاحب کی آمد بابرکت ثابت ہوگی۔" وہ خوشدلی سے بولا تھا۔
"اچھا بضد ہو تو دیکھیں گے...... مگر وعدہ نہیں کرتی...... میں دراصل ان سے پوچھے بنا کچھ نہیں کرتی۔" وہ مسکرا دی تھیں۔ ان کے چہرے پر ملاحت تھی۔
رستم کو تو وہ اور بھی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کی محبت کی اس کی اولین چاہت کی والدہ تھیں۔
"عالی یہ مٹھائی لے جاؤ۔"
عالی، رستم کے سامنے جانے سے کترا رہی تھی۔ اسے رستم کی نگاہوں میں چھپا ہوا پیغام صاف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر ماں کی پکار پر تو جانا ہی تھا۔ وہ ڈیوڑھی عبور کر کے آئی۔ اس کی چمکتی سیدھی مانگ میں جیسے رستم اپنے دل کا کوئی گزر چاہتا تھا۔
وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ تبھی مولوی صاحب السلام علیکم کہتے گھر میں داخل ہوئے تھے۔
صحن کے بیچوں بیچ رستم کو دیکھ کر وہ تحیر زدہ رہ گئے تھے۔ رستم ان سے گھبراتا تھا، وہ بھی بوکھلا گیا تھا۔ وہ مولوی صاحب کے غصے سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اکثر اس کو آتے جاتے کڑے تیوروں سے دیکھتے تھے۔ اس وقت بھی ان کے چہرے پر واضح برہمی کے آثار موجود تھے۔
اس نے جھٹ کھڑے ہو کر مؤدب ہو کر سلام پیش کیا تھا۔ جس کا مولوی صاحب نے بالکل بھی جواب دینا گوارا نہ کیا۔
رستم اتنا بیوقوف نہیں تھا کہ مزید ٹھہرتا ویسے بھی سلام دعا کا مقصد تو پورا ہو ہی چکا تھا۔
"اچھا آنٹی اب اجازت چاہوں گا پھر ملاقات ہو گی۔" وہ لمبے، لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔
"آپ نے یہ کیا، کیا۔ گھر آئے مہمان کے سلام کا جواب بھی سیدھے طرح سے نہ دیا۔ مہمان تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتے ہیں۔"
مولوی نے ان کو تیکھی نگاہ سے دیکھا۔
"تم ان باتوں کو کیا خاک سمجھتی ہو۔ دین کی تو تمہیں بالکل بھی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ میں یہاں تبلیغی دورے پر نکلا ہوا تھا۔ اِدھر تم بچوں کے ہوتے ہوئے اس نامحرم لفنگے کو گھر میں گھسا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے تو اپنے گھر کے حالات بگڑے ہوئے ہیں یہاں میں دوسروں کو وعظ و نصیحت کرتا پھر رہا ہوں، یہ تو وہی بات ہو گی کہ دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت...... افسوس صد افسوس......" وہ سخت برافروختہ ہو رہے تھے۔ "کان کھول کر سن لو مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔"
"آپ بھی حد کرتے ہیں وہ سیدھا سادہ لڑکا ہے۔ اس کا بھانجا ہوا ہے تو مٹھائی دینے چلا آیا ہے۔ اور تو اور اپنے بھانجے کے عقیقے کی بھی دعوت دے کر گیا ہے۔ تو کیا گلی میں کھڑا کر کے اس کی بات سنتی۔ اب ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ مہمان کو پانی تک نہ پلا سکیں۔" آج رخسانہ بھی دوبدو بولی تھیں۔
"تو یوں کہو نا کہ مٹھائی دیکھ کر ریجھ گئی ہو۔ اور اس کے سادہ پن کی تو تم نے بہت ہی خوب کہی اور اس لفنگے کو کاروبار کے لیے کچھ اور نہ سوجھی۔ اس کے سیاہ

کرتوت کا تو میں خود چشم دید گواہ ہوں۔ تم اس گھر کی چار دیواری میں عزت سے بیٹھی ہو ناں تمہیں کیا معلوم باہر کی دنیا کس قدر مکروہ اور گندی ہے۔'' ان کا لہجہ عموماً طنزیہ ہو جایا کرتا تھا۔

''آپ کی کسی بات کی کبھی نفی نہیں کی میں نے مگر میں دو، دو بیٹیوں کی ماں ہوں۔ سو ملنے ملانے والے گھر آتے ہیں آگے رشتے ناتے کرنے ہیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی تھیں مگر کرامت صاحب کو تو پتنگے ہی لگ گئے تھے۔

''رشتے ناتے کیا اب ہم لفنگوں میں کریں گے۔ کرامت پر ابھی اتنے برے دن بھی نہیں آئے کہ ان ٹٹ پونجیوں سے بچیوں کی شادی کر دوں اور یہ صوفے، کرسیاں کدھر سے آئی ہیں۔ میں ایک ہفتے کے لیے گھر سے کیا نکلا یہاں کی تو ہوا ہی بدلی ہوئی ہے۔'' وہ بولتے ہوئے چلتے، چلتے بیٹھک میں پہنچے تو ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

کچھ دیر کے لیے رخسانہ چپ کر گئی تھیں۔

''بولتی کیوں نہیں۔ اب کس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے۔'' وہ انہیں گھور رہے تھے۔ ''میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم پتھر کا بت بنی کھڑی ہو۔''

''رشتے آتے ہیں بچیوں کے۔ مہمانوں کو ڈھنگ سے بٹھانے کے لیے کوئی شے نہیں...... میں نے رعایتی قیمت پر قسطوں میں یہ سامان خریدا ہے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔'' وہ نرم لہجے میں بولیں تو کرامت صاحب بھی کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔

گھر آنے والے رشتے کی بابت بھی انہوں نے ساری بات بتا دی تھی کہ وہ لوگ ان کی بڑی بیٹی کو پسند کر گئے ہیں۔ ان کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں گھر پر بلایا ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ کل چلے چلتے ہیں۔ تم اتنی تعریفیں کر رہی ہو تو پھر تو جانا ہی پڑے گا۔ جا کر ہی دیکھیں گے کیسے لوگ ہیں۔'' کرامت صاحب کا نیم رضامند لہجہ بیگم کو ہی نہیں اندر کان لگائے سنتی بیٹیوں کو بھی اندر تک طمانیت بخش سرشاری بھر گیا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ابا اور اماں تو ساجدہ کے رشتے کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ اکرام بھی گھر پر نہ تھا۔

''یہ اس بے وقت کون آ گیا؟'' ساجدہ نے کہا۔

''میں دیکھتی ہوں۔ تم پریشان نہ ہو......'' عابی نے دروازہ کھول کر پردہ ہٹا کر دیکھا تو اپنے عین سامنے اسی اجنبی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

''جی......!'' وہ کچھ پزل سی ہو گئی۔

''میں یہ حلیم لایا تھا۔ میلاد کروائی تھی آج۔''

عابی نے چپ چاپ ڈونگا اس کے ہاتھ سے تھام لیا تھا۔

وہ جانے لگی تھی جب اس نے پکارا تھا۔

''بات سنیں...... میں اپنی آپی کو آپ کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہ جی آپ کے رشتے کے لیے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں......؟'' اس کی آواز میں آس گھلی ہوئی تھی۔

وہ تو دم بخود رہ گئی تھی۔

ہراساں ہو کر اس نے دروازہ ہی جھٹ بند کر دیا۔

جب وہ پلٹی تو قدرے فاصلے پر ساجدہ تھی۔

''کیا ہوا تمہارے چہرے پر یہ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں...... یہ حلیم لایا تھا کوئی...... میں کچن میں رکھ دوں......''

''چلو آج پکانے کی چھٹی......'' ساجدہ بولی۔

جاتے، جاتے رخسانہ ان کو دال چڑھانے کا کہہ کر گئی تھیں۔

☆☆☆

''لاحول ولا قوۃ...... سارا دن غارت کر دیا۔'' گھر آتے ہی کرامت صاحب چیخنے لگے تھے۔

''ارے آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں۔ اتنا اچھا گھر بار تو ہے لڑکے کا۔ ماشاء اللہ سے اتنا کشادہ گھر۔ کھلا کھانا پینا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لڑکا برسرِ روزگار بھی ہے......'' رخسانہ بیگم اپنا برقع اتارتے ہوئے سخت حیران ہو گئی تھیں۔

رخسانہ کی بات پر تو انہیں پتنگے ہی لگ گئے۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں مولوی کرامت اپنی بیٹی کی شادی اس کیبل آپریٹر سے کر دوں گا استغفر اللہ۔'' کرامت صاحب نے کانوں کو باقاعدہ طور پر ہاتھ لگا کر توبہ استغفار کی تھی۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ شریف لوگ ہیں۔ چاہت سے رشتہ مانگ رہے ہیں۔ انہوں نے صاف، صاف کہہ دیا ہے کہ انہیں جہیز نہیں چاہیے۔ لڑکی چاہے دو جوڑے میں بیاہ کر آ جائے۔ اور ہم تو شاید ڈھنگ کے دو جوڑے بھی نہ دے سکیں۔ اور لڑکا کون سا شغل میلا کرتا ہے کام ہی تو کرتا ہے۔ اور پھر یہ بھی تو ایک کام ہی ہے......'' رخسانہ کی لمبی چوڑی دلیلوں کا بھی کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔

''میری بات اچھی طرح سے کان کھول کر سن لو۔ میں نے ایک بار کہہ دیا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی ہے تو نہیں ہوگی۔ سمجھیں!'' کرامت صاحب نے اشتعال سے کہا تھا۔

اسی وقت اکرام گھر میں داخل ہوا تھا۔

''برخوردار تم آج کل دکھائی نہیں دیتے کدھر جاتے ہو۔ مسجد میں نماز پر بھی نہیں تھے۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ میرا اپنا ہی بیٹا مسجد میں موجود نہیں ہے۔'' وہ اب اپنا سارا ملبہ اس پر گرانا چاہتے تھے۔

''ابا نماز تو میں نے پڑھ لی تھی دوسری مسجد میں۔ دراصل میرے ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اس کی ہی عیادت میں لگا ہوا تھا۔'' اکرام نے مودب ہو کر کہا تھا۔

''دیکھ لیا' یہ ہوتا ہے خون...... وہ نہ جانے کس قماش کے لوگ ہیں وہ۔ بہرحال شاباش بیٹا۔ عیادت کرنا تو بہت اچھی بات ہوتی ہے۔ بہن سے کہو کھانا نکال دے۔ اب آرام کرو تھکے ہوئے ہو گے۔'' ان کے کہتے ہی وہ سیدھا چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ کالج سے واپس لوٹ رہی تھی۔ جب اسے گلی کے نکڑ پر اس نے پکارا تھا۔

''ہائے اللہ......'' اسے گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''میری بات کا اس دن آپ نے جواب نہیں دیا تھا۔'' وہ اپنی ہی ترنگ میں بول رہا تھا۔

''ابا آپ کے بارے میں بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ لفنگے ہیں۔ خدارا میرا راستہ چھوڑ دیں۔ اپنی نہیں تو کم از کم میری ہی عزت کا پاس رکھ لیں۔''

اس کے منہ سے لفظ لفنگا سن کر رستم گنگ رہ گیا تھا۔ وہ جہاں تھا وہیں رک گیا تھا۔ بے یقینی سی آنکھوں میں پھیل گئی۔ پھر وہ رکا نہیں تھا۔ تیز تیز چلتا اس سے واقعی دور چلا گیا تھا۔

نہ جانے کیوں اس کو دور جاتا دیکھ کر اس کی آنکھیں دھندلا سی گئی تھیں۔

☆☆☆

کرامت صاحب نے چرمی بیگ میں چندے کی رقم ڈال رکھی تھی اور بیگ کو اپنے سینے سے یوں لگا رکھا تھا۔ جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ ہو۔

وہ جیسے ہی بینک میں داخل ہوئے ان کو رستم دکھائی دیا تھا۔ رستم نے مؤدب ہو کر سلام کیا تھا مگر کرامت صاحب تو ایسوں کے سلام کا جواب تک دینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ سو رخ پھیر گئے۔

داخلی دروازے پر گارڈ گن تھامے مستعد کھڑا ہوا تھا۔ اسی وقت بینک میں ایک مرد اور نقاب میں ایک عورت داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کاؤنٹر پر کھڑے کیشئر سے نہ جانے کیا کہا کہ وہ گھبرا گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ بوکھلا سا گیا۔ اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ نقاب پوش نے اپنا نقاب الٹ دیا اس کے پیچھے ایک مرد کا چہرہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔

رستم نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔

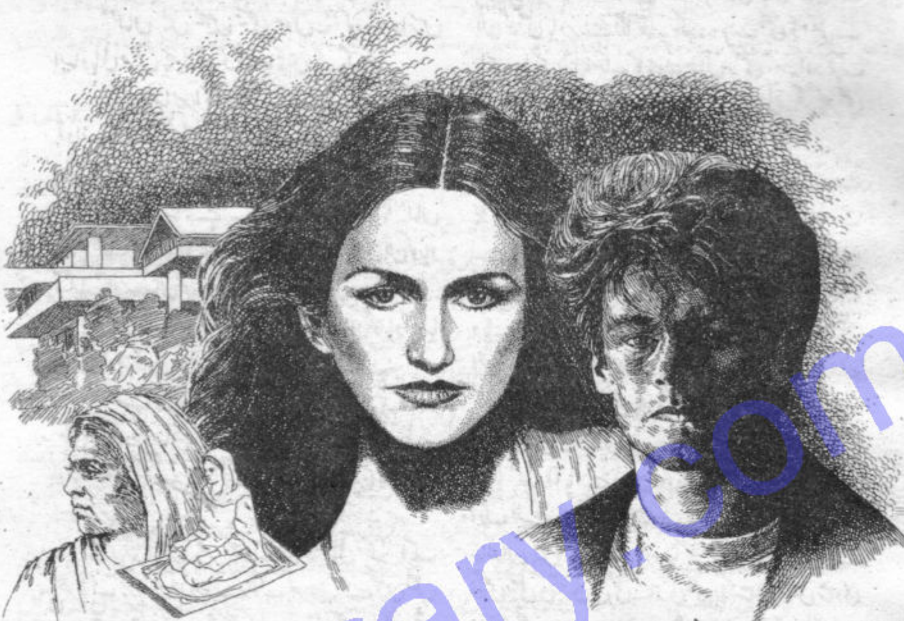
اچانک اس دراز قامت مرد نے پسٹل نکال کر گارڈ پر پہلا فائر کر دیا تھا وہ وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

کیشئر نے جلدی سے ساری نقدی بیگ میں بھرنا شروع کر دی تھی۔

اچانک اس اسلحہ بردار آدمی کی نگاہ لائن میں کھڑے کرامت کے چرمی بیگ پر پڑی تھی۔

''اے بڈھے یہ بیگ ہمارے حوالے کر دے۔''

کرامت تھر، تھر کانپنے لگے تھے۔
''نہیں، میں یہ بیگ نہیں دوں گا۔'' انہوں نے بیگ مزید مضبوطی سے سینے سے لگا لیا تھا۔
رستم کو لگا کہ اب وہ آدمی کرامت صاحب پر فائر کھولنے ہی لگا ہے۔ اس نے اچانک بڑھ کر اس آدمی سے پسٹل چھیننے کی کوشش کی اس ہاتھا پائی میں گولی رستم کے کندھے میں جا لگی۔
رستم کو لگا جیسے سلگتا ہوا شرارہ اس کے کندھے پر جا گرا ہو۔ مگر اس نے پسٹل چھین لی تھی۔ اور اس مرد کی ناک پر زوردار گھونسا بھی رسید کیا تھا جس کے نتیجے میں اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی۔ دوسرا حواس باختہ باہر کو بھاگا تھا۔ مگر باہر پولیس آ گئی تھی۔ کرامت صاحب نے رستم کو سہارا دیا تھا پہلی بار اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا تھا۔ ورنہ وہ سب کو کیا منہ دکھاتے، یہ اس رستم کے مرہونِ منت تھا کہ رقم بچ گئی۔ مگر اصل چھت تو ان کے سر پر تب گری جب اپنے بیٹے اکرام کو ان دو ساتھیوں کے ساتھ ہتھکڑی میں دیکھا۔
پولیس افسر نے مولوی کرامت کو پہچان لیا تھا۔ وہ مسجد میں امامت کرواتے تھے۔ ان کی نظر جھک گئی تھی۔ ولی کے گھر شیطان بھی جنم لے سکتا ہے۔ وہ جان چکے تھے۔ ان کا باطن بدل چکا تھا۔
''میاں صاحب سب سے پہلے اپنے ہی گھر سے اصلاح شروع کریں تو ہی اصلاح معاشرہ تشکیل پاتا ہے ورنہ یہ تو وہی مثال صادق ہوتی ہے۔ دوسروں کو نصیحت خود میاں فصیحت۔''
پولیس افسر نے ضمانت پر مار کٹائی کے بعد اکرام کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر جگ ہنسائی تو ہو ہی گئی تھی۔
کرامت صاحب شرمندہ تھے۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ رستم کی عیادت کے لیے گئے تھے۔
''آپ نے کیوں زحمت کی۔'' رستم نے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر کراہ کر رہ گیا تھا۔
''زحمت کیسی، ہم تو شکر گزار ہیں کہ تمہاری بدولت شرمندگی سے بچ گئے۔'' وہ بولے۔
''جی ہاں۔ میرا بھائی تو شہزادہ ہے۔ آخر کو خاندانی جو ہوا۔''
آپا کی محبت پر رستم مسکرا دیا تھا۔
''ماشاءاللہ...... ماشاءاللہ......'' مولوی صاحب کو لفظ ہی نہیں مل رہے تھے۔
''پھر یہ کاروبار......'' وہ جھجک کر رک گئے تھے۔
''انکل میری تو سادہ سی پان شاپ ہے کچھ لڑکے آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اب پان شاپ بند کر کے میں نے بچوں کے کھلونے کی دکان کھول لی ہے۔'' وہ سعادت مندی سے بولا تھا۔
مولوی صاحب خوش ہو گئے تھے۔
''انکل میں تو خود آپ کے گھر آپ کی چھوٹی بیٹی کا رشتہ لے کر آنے والی تھی مگر یہ سانحہ ہو گیا۔''
''پریشان نہ ہوں۔ مجھے یہ رشتہ منظور ہے اس لڑکے نے میرا دل جیت لیا ہے۔''
سب خوشی سے نہال ہو گئے تھے اور رستم کی خوشی تو دیدنی تھی۔
''ہم نے بڑی بیٹی کا رشتہ بھی طے کر دیا ہے۔ اچھا ہے کہ دونوں بچیوں کے فرض سے ایک ساتھ سبکدوش ہو جائیں گے۔''
پھر وہ لفنگا اچانک ہی ہیرو بن کر اس کی زندگی میں شامل ہو گیا تھا۔ ابا ہی کہتے تھے وہ لفنگا ہے اب وہی اس کے نام کی مالا جپتے رہتے تھے۔
وہ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس اس کی نظروں کے عین سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔
اس نے کہا تھا پیچھا چھوڑ دو۔ اور وہ قول کا اتنا پکا نکلا کہ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔
اس نے کتنے دن اس کے قدموں کی چاپ اپنے عقب میں محسوس کی تھی مگر وہ تو جیسے واقعی اسے بھول گیا تھا مگر جہاں سے وہ بھولا تھا اسے وہ از بر ہو گیا تھا۔ وہی انجان اس وقت اس کا مجازی خدا بنا بیٹھا تھا۔
''کیا ساری باتیں نظروں سے ہی کرنی ہیں۔''
وہ جو کافی دیر سے چپ چاپ بیٹھی، اس کو تک رہی تھی اس کے شوخ لب و لہجے پر سر جھکا گئی تھی۔ اس کی دل آویز مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہی اس کے دل کا اصل مکین ہے۔
❁❁❁



دھوپ چھاؤں

رعنا کوثر

پیاری دبلی پتلی، ہنستی مسکراتی اماں سن وسال کے مراحل طے کرتی ہوئی عمر رسیدہ ہونے کو آ رہی تھیں۔ عمر کے ساتھ کچھ اعضا نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور کچھ اب بھی کام کے تھے۔ جیسے کے کان جن سے اب سننا ممکن نہیں رہا تھا...... مگر بھلا ہو نئے آلات کا کہ ان کو کان میں لگانے والا آلہ خرید کر دے دیا گیا تھا اور وہ اس سے کچھ سن لیتی تھیں۔ آنکھوں کا آپریشن ہو چکا تھا اس لیے دکھائی دے جاتا تھا۔ ہاتھ پیر ابھی چل رہے تھے۔ دل میں بھی ایک آلہ فٹ تھا۔ مگر حوصلہ، ہمت جوان تھا اس لیے رعب سے رہتیں اور کڑک دار آواز میں بات کرتیں۔

کہنے کو پانچ بچے تین بیٹیاں اور دو بیٹے سب امریکا میں آباد...... وہیں اماں کو بھی بلالیا تھا۔ وہ نیویارک میں ایک اونچی بلڈنگ کے دو کمروں کے فلیٹ میں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی ثنا کے ساتھ رہتیں۔ کمرا بہت آرام دہ تھا اس میں لگے نئے زمانے کے پُرسکون سے بستر پر اماں کا بسیرا تھا۔ وہ سامنے کی کھڑکی سے جھانک کر باہر بھی دیکھ لیتیں، سڑک پر کھڑکی کھلتی اور گاڑیاں، چلتے پھرتے لوگ نظر آتے تو ان کا دل بہل جاتا۔ ثنا تو کام پر چلی جاتی۔

اتوار کا دن ثنا گھر میں گزارتی' صفائی ستھرائی کر کے وہ فون لے کر اب اماں کے کمرے میں آ گئی۔

''اماں میں یہیں بیٹھی ہوں۔'' کورونا وائرس ایسا وبائی مرض پھیلا تھا کہ آنا جانا ہی رک گیا تھا۔

''بیٹی ذرا میرا کان کا آلہ تو دے، دے۔'' ثنا کی آواز نہ سننے کے باعث انہیں آلے کی یاد آئی۔ ثنا نے احتیاط سے آلہ ان کے کان میں پہنایا۔

''باہر بڑا سناٹا ہے اب ٹریفک نہیں چلتا کیا؟'' اماں نے پوچھا۔ ''اور کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔'' پھر خود ہی ان کو یاد آ گیا۔ ''ارے ہاں تم نے تو بتایا تھا کوئی وبا چلی ہے۔''

''جی اماں۔'' ثنا نے کہا۔ شکر ہے اماں کو یاد آ گیا ورنہ وہ اکثر بھول ہی جاتیں اور ثنا سے پوچھتیں۔

''سب خیریت ہے کہیں کوئی بیمار تو نہیں۔'' اور کبھی تو بہت رسان سے کہتیں۔ ''بیٹا سب کو کھانے پر بلا لیا کرو۔ بہت بری عادت ہے۔ اپنے بہن بھائیوں سے ملا کرو۔''

اور ثنا انہیں پھر سمجھانے بیٹھ جاتی کہ ''ایک خطرناک جراثیم کی وجہ سے لوگ گھروں سے نہیں نکل رہے ہیں۔ حکومت نے منع کیا ہے۔'' کبھی وہ خاموشی سے سر ہلاتی اور کبھی کہتی۔

''اچھا بلا لوں گی آپ فکر نہیں کریں۔''

وقت کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔ وہ سب کی عمر بڑھاتا رہتا ہے، سب کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ آنا جانا تو ویسے ہی کم تھا مگر فون ضرور آتے۔ وہ نئی ایجادات پر خوش ہوتیں۔

''دیکھو اللہ کا شکر ادا کرو کتنی دور بیٹھے ہیں اور سب سے بات بھی ہو جاتی ہے اور شکل بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' اماں کی یادداشت کبھی کبھار بالکل جواب دے جاتی ایک دن ثنا سے پوچھ بیٹھیں۔

''بیٹا میرے کتنے بچے ہیں؟'' وہ ان کے دکھ کو محسوس کر کے بھی شگفتگی سے بولی۔

''اماں! آپ تو اپنے بچے بھی بھول گئیں۔''

''پانچ ہیں ناں دو لڑکے اور تین لڑکیاں.....'' انہوں نے ذہن پر زور دیا اور بولیں۔ ''بہت عرصے سے کوئی آیا نہیں ناں اس وبا کی وجہ سے۔'' اتنی دفعہ یہ لفظ دُہرایا گیا تھا کہ اماں جو اکثر بھول جاتی تھیں اب ان کو بھی یاد رہنے لگا تھا۔ بلکہ وہ جب بھی ڈاکٹر کے پاس جاتیں ثنا ماسک کا بہت خیال رکھتی، منہ اور ناک بند ہونے سے ان پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ مگر پھر بھی اس کی بات مان لیتیں۔

ثنا، اماں کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ اس سے بڑی ناز تھی پھر دو بھائی عاطف اور عاکف اور پھر سب سے بڑی آپا عذرا۔ عاطف نے جب فارمیسی کا امتحان پاس کیا تو امریکا والوں نے آسانی سے انہیں ویزا دے دیا۔ وہ یہاں آ کر جیسے ہی بہتر طور پر کام کرنے لگے انہوں نے سب کو بلا لیا۔ اماں بہت خوش تھیں۔ جب آئی تھیں تو خوب چلتی پھرتی تھیں، طاقت بھی تھی' ظاہر ہے اتنی ضعیف نہ تھیں۔

عذرا آپا اپنے میاں اور بچوں سمیت آئی تھیں، وہ تو الگ فلیٹ میں تھیں۔ عاطف کی شادی پاکستان میں خاندان میں ہی کر دی اور عاکف کو نیویارک کی ایک اچھی فیملی کی لڑکی مل گئی۔ ناز کی بھی پاکستان میں ہی شادی کر دی تھی۔ اماں، عاطف اور ثنا ہی اب اس فلیٹ میں رہ گئے تھے۔ عاطف کی بیوی کو پاکستان سے آنا تھا۔ اسی دوران ثنا نے کالج میں داخلہ لے لیا..... وہ گریجویشن کرنے کی دُھن میں تھی کہ اس کی بھابی نے ایک رشتہ بتایا اچھے لوگ تھے۔ پاکستان سے آئے چند سال ہوئے تھے۔ لڑکا انجینئر تھا مگر گرین کارڈ نہیں تھا۔ ثنا کا فوراً وہاں رشتہ کر دیا گیا۔ بلکہ لڑکے والوں کے کہنے پر نکاح ہی کر دیا کہ جب وہ ایک سال بعد پڑھائی ختم کرے گی تو رخصتی کر دی جائے گی۔ اس دوران لڑکے کے پیپرز بھی بن جائیں گے اور جاب بھی مل جائے گی۔ چلو جی فرصت ہوئی، اماں خوش تھیں۔ عاطف کی بیوی بھی پاکستان سے آ گئی تھی۔ اس نے بھی الگ فلیٹ لے لیا۔ اب اماں اور ثنا ساتھ رہتیں۔ ثنا اکثر اس لڑکے سے بات کر لیتی جس سے اس کا نکاح ہوا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس کی منکوحہ تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ لڑکا اس کی ذات سے زیادہ اس کے گرین کارڈ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ

خودغرضی اور خود پرستی اس میں نظر آنے لگی۔ آخر ثنا نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اماں نے بہت کہا کہ ”یہ سب تمہارا وہم ہے۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔“ وہ کافی ناراض بھی ہوئیں مگر ثنا نہ مانی اور وہ نکاح ختم ہو گیا۔

بہن، بھائیوں کی اپنی مصروفیات بڑھ رہی تھیں۔ عذرا آپا نوکری کرتیں، بچوں کے اخراجات تھے۔ میاں پاکستان سے آئے تھے ان کی کوئی لگ کر کام کرنے کی عادت نہ تھی سو گھر کے کام کا بوجھ بھی پورا آپا پر تھا۔ ناز اکثر بچوں کو لے کر آتی وہ قریب ہی رہتی تھی۔ عاطف، عاکف نے الگ، الگ گھر خرید لیے تھے۔ وہ بہت مصروف رہتے۔

ثنا کا نکاح ٹوٹے کچھ سال ہونے کو آرہے تھے۔ اس کی تعلیم اور نوکری اچھی تھی مگر اس کے نکاح ختم ہونے نے اسے طلاق یافتہ بنا دیا تھا۔ اب جتنے بھی رشتے آتے وہ یا تو اس کے گرین کارڈ میں دلچسپی لیتے جس سے اس کو چڑ تھی یا پھر خود طلاق یافتہ اور کئی بچوں کے باپ ہوتے۔ اماں اب بھی چاق و چوبند تھیں مگر دل کی بیماری کا شکار ہو گئی تھیں۔ شوگر، بلڈ پریشر بھی ہوتا جا رہا تھا۔

ثنا ان کا بہت خیال رکھتی، وہ جانتی تھی اور کوئی اپنی مصروف زندگی سے وقت نہیں نکال سکتا۔ اماں بھی اسی گھر اور اسی بیٹی کی عادی ہو گئی تھیں۔ وہ آپا کے ہاں جاتیں تو ان کے بچے انہیں امریکا آنے کے بعد بدلے ہوئے نظر آتے۔ وہ ان کی انگلش سے پریشان ہو جاتیں۔ اماں جہاندیدہ ہوشمند خاتون تھیں۔

”اے انگریزو! اردو تو ایسے بھول گئے جیسے یہیں پیدا ہوئے تھے۔“ وہ تنک کر کہتیں۔ گھر آکر بھی ثنا کو سناتیں۔

”وہ گڑیا ابھی ساتویں میں گئی ہے فیشن دیکھ لو اس کے۔“

عاطف اور عاکف کی بیویاں نوکری کرتی تھیں اماں جیسے ہی ان کے ہاں رہنے جاتیں۔ وہ بہت تھکاوٹ سے بولتیں۔

”اماں ہم تھک جاتے ہیں، اب جب تک آپ ہیں، ہمیں کھانا پکا دیا کریں۔“ اماں ایک دو دن تو پکا دیتیں پھر خود بھی تھک کر بیٹھ جاتیں۔ اس دن سب بےمزا کھاتے

غزل

یہیں سے جان گیا میں کہ بخت ڈھلنے لگے
میں تھک کے سائے میں بیٹھا تو پیڑ چلنے لگے

میں دے رہا تھا سہارے تو اک ہجوم میں تھا
جو گر پڑا تو سبھی راستہ بدلنے لگے

نہ مرنے دیتے ہیں مجھ کو نہ جینے دیتے ہیں
یہ کیسے سانپ میری آستیں میں پلنے لگے ہیں

از: فرخندہ جعفری، گجرات

جو اماں کو ہضم نہ ہوتا آخر وہ اپنے گھر آکر ثنا سے کہتیں۔

”شکر ہے اپنا چھوٹا سا فلیٹ ہے ورنہ یہ لوگ تو مجھے نوکر ہی بنا لیتیں۔“

اماں بھی اب ثنا کو محبت سے دیکھ کر دعا دیتیں کہ اس کا رشتہ طے ہو جائے، وہ خود بھی اب بوڑھی ہو رہی تھیں۔ ثنا کام سے واپس آتی تو کھانا بنا ہوا ہوتا ویسے تو وہ اکثر پکا کر جاتی تھی اماں چاول پکا لیتیں اور اس کا انتظار کرتیں، دونوں کھانا کھاتیں ثنا کو اماں دن بھر کی کہانیاں سناتیں۔ کس بچے کا فون آیا، کون سی پڑوسن گھر آئیں اکثر ان کے گھر میں دن میں خواتین کا آنا جانا رہتا۔ کافی انڈین، پاکستانی مسلمان آس پاس آباد تھے۔ کہیں درس ہوتا تو اماں چلی جاتیں۔ دن اچھا گزر جاتا۔

کبھی کوئی بہن یا بھائی آجاتا یا اماں کو اپنے گھر بھی لے جاتا، ویسے تو ثنا ان سے بہت محبت کرتی مگر جب وہ کہیں جاتیں تو اس کو لگتا اسے آزادی مل گئی ہے۔ وہ جاب سے واپسی پر شاپنگ کرتی، کبھی کسی سہیلی کے پاس چلی جاتی ورنہ اماں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوتیں، اسے دیر ہو جاتی تو دس فون کرتیں۔

”کہاں ہو بیٹی، اتنی دیر کر دی۔“ وہ گھبرا کر کہتیں۔ اس لیے وہ سیدھا گھر ہی آجاتی۔ پھر اماں کی

عادت تھی وہ چاہتیں ہر کام فوراً ہی ہو جائے۔" یہ کھانا کیوں ٹیبل پر رکھا ہے ابھی تک، برتن دھونے میں دیر کیوں کر رہی ہو۔" وہ اسے ٹوکتی رہتیں۔ وہ اکثر جھنجلا جاتی مگر جواب دیے بغیر کام کرتی رہتی۔ کبھی کبھی تو اس کی اور اماں کی ہلکی پھلکی ضد شروع ہو جاتی۔ وہ جیسے ہی کھڑکی کے پردے روشنی کے لیے ہٹاتی اماں فوراً کہتیں "باہر سے سب دکھ رہا ہے پردہ گراؤ۔" وہ سمجھاتی "اماں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ روشنی بہت ضروری ہے۔" وہ بھی بند نہ کرتی جب تک گھر میں دن کی روشنی اور دھوپ آتی وہ پردہ ہٹا کر رکھتی اور اماں ناراض ہوتی رہتیں۔ حالانکہ وہ بہت تحمل مزاج تھی اماں کو جواب نہیں دیتی تھی کہ ان کو ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی بس کبھی کبھار کی چھیڑ چھاڑ تھی۔

اماں بھی دھوپ چھاؤں جیسی تھیں، ماں تھیں ناں آخر...... اس کی تنہائی کا سوچ کر گھر میں ہر بات کا دھیان رکھتیں۔ ہر کھڑکی، دروازہ ان کی نظر میں ہوتا۔ دھوپ کی طرح تھیں۔ وہ ہر آئے گئے کو اپنی ایسی تپش دکھاتیں کہ کوئی اس کڑکتی دھوپ میں کھڑا ہو کر ثنا کو تنگ نہ کر سکتا۔ کوئی دروازے کے قریب بھی آتا تو ایسی کڑک دار آواز میں بولتیں کہ وہ بھاگ جاتا۔ کوئی ان کے سوالوں کی گرمی برداشت نہ کر پاتا۔ حالانکہ سماعت کمزور ہو چکی تھی مگر ساری حسیں بیدار تھیں اور چھاؤں بن کر اس کو بہت سکون پہنچاتیں محبت بھری باتیں کرتیں۔ ہمت بندھاتیں، تسلی و تشفی بھی دیتیں۔ پرانے قصے سناتیں، گھر کا بے حد خیال رکھتیں کوئی کھڑکی دروازہ کھلا نہ ہو رات کو چولہے بند ہوں، لائٹ بند ہو، ثنا کو ہر فکر سے دور رکھنے کی کوشش کرتیں۔

جہاں اماں عمر کے حساب سے اس کے لیے دھوپ چھاؤں تھیں وہیں ثنا ایک بادِ صبا۔ کبھی، کبھی اس کو آزادی اچھی لگتی۔ وہ سوچتی وہ بھی اپنی دوستوں کی طرح گھومے پھرے۔ مگر سب غافل ہو چکے تھے سب نے اماں کو ثنا کی ذمے داری سمجھ کر کبھی کبھار آنا یا فون کرنا ہی اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ ثنا بھی اماں کہیں جاتی تو ان کے بغیر دو دن ہی خوش ہوتی پھر گھر کی فضا بہت سونی لگتی۔ اور پھر اماں کا بھی کہیں دل نہ لگتا۔ انہیں ثنا کی فکر ہونے لگتی۔ اب بہن بھائی اس انتظار میں ہوتے کہ اماں بولیں تو ہم ان کو گھر چھوڑ کر آئیں۔ اماں بھی اپنے گھر آ کر خوش ہوتیں اپنا کمرا، بستر، تکیہ حتیٰ کے باتھ روم بھی وہ یاد کرتیں۔

☆☆☆

ماہ و سال گزر رہے تھے۔ اماں اب اسی سال کی ہونے والی تھیں۔ بڑے بھیا عاطف جن کی یہاں پر سالگرہ خوب دھوم سے منائی جاتی انہوں نے اماں کی برتھ ڈے بھی منانے کا سوچا۔ ان کے بچوں نے گھر سجایا۔ ہر جگہ ہپی برتھ ڈے کے بینر لگے تھے۔ پانچ فریم میں پانچ تصاویر لگی تھیں۔ ہر ایک میں اماں اپنا ایک بچہ اٹھائے مسکرا رہی تھیں۔ شاید ماں کو کوئی بچہ بوجھ نہیں لگتا۔ کیک پر اسی کے ہندسے کی موم بتی لگی تھی۔ اماں خوش بھی ہوئیں اور حیران بھی۔ آج تک ان کی سالگرہ نہیں منائی گئی تھی ان کے بچپن میں صرف محبتیں تھیں۔ پیدائش کا دن آ کر کب گزر جاتا پتا بھی نہ چلتا۔ رات گئے اماں کی سالگرہ کی تقریب ختم ہوئی۔ بچے کیک کھا کر خوش تھے اور بڑے اماں کو خوش کر کے سکونِ دل محسوس کر رہے تھے۔

دن یوں ہی گزر رہے تھے کہ عجیب سی ایک وبا جسے کورونا وائرس کا نام دیا گیا، ہر طرف پھیل گئی۔ چھوت کی وبا تھی لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو گئے۔ اپنے آپ کو اور گھر کے بوڑھوں کو بچانے کے لیے خاص زور دیا جا رہا تھا۔ سال بھر ہو گیا تھا کوئی ایک دوسرے کے گھر نہیں گیا تھا۔ اماں بھی سب کو یاد کرنے لگی تھیں۔

"سب کہاں گئے۔ میرے بچے، میرے پوتا، پوتی، نواسا، نواسی میرے محلے والے۔" وہ پوچھتیں۔ پھر کبھی یاد آ جاتا تو خود ہی خاموش ہو جاتیں کبھی ثنا کو بتانا پڑتا۔ اب تو وہ بھولنے کی بیماری میں بھی مبتلا ہوتی جا رہی تھیں۔

آخر کار وبا کا توڑ نکالا گیا۔ "ویکسین" کا وجود سکون کا باعث تھا۔ اماں کو بھی لگوائی گئی۔ ان کے سارے بچوں نے بھی لگوائی۔ سب کو سکون آیا۔

سب اماں کو یاد کر رہے تھے۔ ناز تو بہت دور بھی نہیں رہتی تھی مگر لگتا تھا ایک صدی گزر گئی اماں کو دیکھے۔

اس نے اداس ہو کر عذرا آپا کو فون ملایا۔
''آپا آپ سب کو دیکھے بہت عرصہ گزر گیا، خاص طور سے اماں کو دیکھنے کا بہت دل کرتا ہے۔''
''ہاں ناز مجھے بھی رہ، رہ کر اماں کا خیال آتا ہے۔'' آپا یاسیت سے بولیں۔ ''بس اپنے بچوں میں کھو کر فرصت ہی نہیں ملتی۔'' آپا کو بہت احساس ہو رہا تھا۔
''ہاں آپا سچ کہہ رہی ہیں۔'' ناز بولی۔
''اب تو بھائیوں کے بھی فون آرہے ہیں سب اماں کو یاد کررہے ہیں۔ دو قدم کی دوری اب دو سو قدم لگنے لگی ہے...... ہم نے بھی ذمے داری ثنا پر ہی ڈالی ہوئی ہے۔'' ناز نے دل گرفتگی سے کہا۔
''تم کو تو پتا ہے مجھے کورونا وائرس ہو چکا ہے تنہائی کی اذیت بھگت چکی ہوں۔ اسی دوران میں نے ثنا کے بارے میں بہت سوچا اگر اماں کو کچھ ہو گیا تو وہ کتنی اکیلی ہو جائے گی۔ میں تو اب اس کا رشتہ کرا کر ہی رہوں گی۔'' آپا بولیں۔
سب لوگ ویکسین لگوا کر بہت خوش تھے۔ اماں کو بھی صحت مند پا کر سب شکر ادا کر رہے تھے۔
آخرکار سب کے مشورے سے بڑے بھائی نے اپنے گھر میں محفل سجائی تھی۔ سب خوشی، خوشی شریک تھے۔ ہال میں صوفوں پر گھر والے بیٹھے تھے۔ باہر کے کمرے میں مرد تھے۔ آج ''نکاح مبارک'' دیوار پر خوب صورت طریقے سے لکھا گیا تھا۔ بڑے دنوں بعد سب کے چہروں پر رونق تھی۔ اچھے کپڑے نکل آئے تھے، سب اچھے سے کپڑے پہنے بیٹھے تھے...... آج ثنا کا نکاح تھا۔ صرف گھر والے تھے۔ وبا کی وجہ سے کسی اور کو نہیں بلایا تھا۔ نکاح بہت سادگی سے انجام دیا گیا۔ سب بہن بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اس فرض سے کتنا غافل رہے تھے۔ گھر کے اندر بیٹھ کر موت کے خوف نے سب کو بہت سارے فرائض یاد دلا دیے تھے۔
اماں کچھ مطمئن مگر کچھ اداس سی بیٹھی تھیں۔
''کیا ہوا اماں؟ آپا نے کہا۔ ''ثنا رخصت ہو گئی آپ خوش ہیں ناں؟''
''ہاں بہت خوش ہوں۔'' اماں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ دوسرے دن ثنا آئی تو بہت خوش تھی اس کے شوہر اشفاق خوش اخلاق، سنجیدہ، پڑھے لکھے انسان تھے۔ بہن، بھائیوں کو امریکا بلایا۔ سیٹ کیا اور اب اپنی شادی کا سوچا۔
''اماں میں آپ کو لینے آئی ہوں۔'' ثنا نے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔
''نہیں بیٹا، میں اپنے گھر جاؤں گی۔ تمہارے گھر مجھے نیند نہ آئے گی۔'' اماں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ثناء کو جھٹکا لگا
''کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ وہ صرف میرا گھر نہیں ہے۔ میں نے اشفاق سے پہلے ہی بات کر لی تھی، آپ کے لیے ایک الگ کمرا بھی ہے۔'' اماں نے پیار سے اسے دیکھا اور بولیں۔
''میری بیٹی تم اپنی زندگی خوشی سے جیو ابھی تو شروعات ہے۔''
''وہ گھر آپ کا بھی ہے اماں۔'' اتنے میں اشفاق آگے بڑھ کر بولے۔ اب عاطف بھائی آگے بڑھے انہوں نے ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔
''اماں اب آپ میرے ساتھ رہیں گی۔'' انہوں نے بہو کے چہرے پر ہلکا سا رنگ آتے ہوئے دیکھا۔ مگر پھر بھی حامی بھر لی۔
''اماں اب سب کے ساتھ رہیں گی ہم سب اماں کو اپنے گھر لے جایا کریں گے۔'' آپا بھی جوش سے بولیں۔
''سب بچے میرے اپنے ہیں جہاں کہو گے چلے جائیں گے ہمیں کون سا ایک گھر میں رہنے کا شوق ہے وہ تو ہم ثنا کی وجہ سے رہتے تھے۔'' اماں نے خوش دلی سے کہا۔
''میری پیاری ماں یہ ساری باتیں آپ میری خوشی اور آزادی کے لیے کہہ رہی ہیں۔'' ثنا نے دل میں کہا۔
سب خوش تھے۔ مگر ثنا بھی ایک فیصلہ کر کے اٹھی تھی اس سے پہلے کہ اس کو اپنی ماں کے بغیر رہنے کی عادت پڑے اور وہ اپنی زندگی میں مگن ہو جائے وہ انہیں چند دنوں میں اپنے گھر لے جائے گی۔ وہ بھی بہت خوشی کے ساتھ۔

❁❁❁

وقت کا پہیا

فوزیہ سرور



''اماں جان آخر کب تک میں کولہو کا بیل بنا رہوں گا۔ سمجھاتی کیوں نہیں آپ ارسل کو...... بزنس، بزنس آخر یہ کون سا بزنس ہے جو وقت کھائے جا رہا ہے۔ اُگل کچھ بھی نہیں رہا۔ ارسل کی پتا نہیں کل کب آئے گی جب میرا محنت کر کر کے بُھرکس نکل جائے گا۔'' سعد نے اماں جان کے ہاتھ پر ماہانہ خرچ رکھتے ہوئے ہر ماہ کی طرح اپنی کھولن باہر نکالی۔

''کیا ہو گیا ہے سعد تمہیں...... تمہارا چھوٹا بھائی ہے ارسل۔ کر تو رہا ہے وہ کوشش، آج اگر وہ تمہارا دستِ نگر ہے تو اللہ اسے ضرور اس قابل کرے گا کہ تمہیں بھی

کوئی ضرورت پڑی تو وہ ایک لمحہ بھی نہیں سوچے گا مدد کرنے میں......بس تھوڑا صبر کرو......اور اسے اتنی باتیں نہ سنایا کرو......'' اماں جان نے سعد کو سمجھانے کے لیے ناصحانہ انداز اختیار کیا انہیں سعد کے الفاظ اور لہجہ ہرگز اچھے نہیں لگے تھے۔

''اوہ......تو وہ میری مدد کرے گا۔ پہلے اپنی مدد تو کرلے یہی بڑی بات ہوگی...... ہونہہ۔'' سعد کا انداز استہزائیہ ہوگیا۔ اماں جان نے تاسف اور دکھ سے بڑے بیٹے کو دیکھا جو کتنے چھوٹے دل کا مالک تھا۔

☆☆☆

''ارسل بیٹا آج مجھے بتا ہی دو آخر کب تم اس قابل ہو گے کہ گھر میں کچھ خرچ دے سکو......سعد آخر کب تک تن تنہا ذمے داریاں نبھائے گا۔'' اماں جان نے آفس کے لیے تیار ہوتے ارسل کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں دونوں بھائیوں کے درمیان خرچے کے معاملے میں ان بن ہو۔

''اماں جان پلیز صرف چھ ماہ دے دیں۔ پھر دیکھیے گا پیسہ ہی پیسہ ہوگا۔'' ارسل کا لہجہ التجائیہ تھا۔

''ٹھیک ہے صرف چھ ماہ......یاد رکھنا......اب مزید مہلت نہیں ملے گی۔'' اماں جان نے بھی سخت لہجے میں وارننگ دی تھی۔ وہ ارسل کے سسرال والوں کی وجہ سے بھی آج کل کافی پریشان تھیں۔

ہمسائے میں ارسل کا سسرال تھا۔ ثوبیہ، ارسل کی محبت اور چاہت تھی۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کو چاہیے کرتے ۔دونوں کی پسندیدگی اور محبت دیکھتے ہوئے گھر والوں نے انہیں منگنی کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔ دوسال ہونے کو تھے ان کی منگنی کو......ارسل کا کاروبار نہیں چلا تھا۔ وہ جوں کا توں تھا۔ ارسل کی ثوبیہ سے تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی۔ وہ بھی اب ارسل کو باتیں سنانے لگی تھی۔ ارسل ہنس، ہنس کر سن لیتا لیکن اماں جان کو ثوبیہ کے گھر والوں کے رویے میں واضح فرق اور کھنچاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ اب تو وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اماں جان کو بہت کچھ سنا جاتے تھے کہ ان کی بیٹی کو رشتوں کی کمی تھوڑی ہے۔ اماں جان کو ان کی باتیں دہلا دیتیں، کتنے چاؤ اور ارمانوں سے انہوں نے بیٹے کی منگنی کی تھی لیکن ارسل کا بزنس تھا کہ وقت ہی نگلے جا رہا تھا۔ کہیں یہ رشتہ بھی نہ نگل لے اسی فکر میں وہ ارسل کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئیں۔

''اوکے اماں جان......! میں اب چلتا ہوں، اور یقین کریں خوش کردوں گا آپ کو۔'' ارسل نے اماں جان سے زیادہ خود کو گویا تسلی دی تھی۔ وہ اچھی خاصی مشکل میں گھر چکا تھا۔ طعن و تشنیع، نکمے پن کے طعنے، یہ سب وہ کس دل سے برداشت کرتا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا یا اس کا رب......اور رب اسے کبھی ناامید نہیں چھوڑے گا۔ اسے یقین تھا۔

☆☆☆

ارسل اور سعد بھائی تھے، ان کی تین بہنیں تھیں جو ابھی زیرِ تعلیم تھیں۔ ابا بیچارے معذور تھے، اماں جان بہت نیک و پرہیز گار خاتون تھیں۔ رب کے ساتھ تعلق ان کا بہت گہرا تھا۔ اولاد کے لیے ہمہ وقت دعاؤں کے خزانے لٹاتی رہتیں۔ سعد کا بھی چھوٹا موٹا بزنس تھا۔ آمدن تو اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔ وہ بچت کرکے بزنس کو وسعت دینا چاہتا تھا لیکن گھر کے بڑھتے اخراجات کے باعث یہ ممکن نہ تھا۔ اسی لیے وہ چڑچڑا بھی ہو جاتا۔ ایک کمانے والا بیوی، تین بچے پھر بہنوں اور ماں، باپ کے علاوہ بھائی کا خرچ بھی اس پر تھا۔ وہ اچھی خاصی بدلحاظی کا مظاہرہ اکثر و بیشتر ارسل کے ساتھ کرجاتا۔ ارسل جواباً ضبط کا بے مثال مظاہرہ کرتا کبھی پلٹ کر بڑے بھائی کو جواب نہ دیا۔ ارسل نے اپنے دوست کے ساتھ بزنس شروع کیا تھا جو تا حال صرف رقم کھا رہا تھا۔ سعد ہر ماہ جب بھی خرچے کی رقم اماں جان کے ہاتھ پر رکھتا تب اپنا غصہ اور کھولن ضرور اگلتا۔

''میرے اکیلے کی ذمے داری نہیں ہے یہ...... ارسل کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے آپ نے......اور مجھے ذمے داریاں نبھانے میں کھپا رکھا ہے۔'' الفاظ تو الفاظ لہجہ بھی اماں جان کا دل چھلنی کردیتا تھا۔

''اگر آج ارسل تنگدست ہے تو اللہ اس کے رزق میں بھی کشادگی عطا کرے گا۔ آخر دل اتنے

کیوں تنگ پڑ جاتے ہیں کہ ہم دوسروں کے نوالے گننے لگتے ہیں۔ جیسے ہم ہی کھلانے والے ہوں۔ اللہ ارسل کے حصے کا رزق بھی سعد کو دے رہا ہے۔ سعد کو یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی۔'' وہ ارسل کے لیے مزید دعائیں کرنے لگتیں۔

''ارسل...... امی، ابو بہت پریشان ہیں۔''

ثوبیہ، ارسل کے ہم قدم پارک کی روش پر چلتی قدرے کٹھور لہجے میں بولی۔ موسم بہت سہانا تھا۔ ہر سو مست ہوا اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی تھی۔ ارسل کا دل چاہا یہ سہانا موسم ثوبیہ کے سنگ گزارے۔ وہ آفس سے جلدی اٹھ گیا اور اپنی بائیک پر ثوبیہ کے اسکول جا پہنچا...... ثوبیہ ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی تھی۔

''کیوں پریشان ہیں تمہارے امی، ابا......؟''

ارسل جان کر بھی انجان بنا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو ارسل وہ کیوں پریشان ہیں۔'' اب کے ثوبیہ کا لہجہ سرد تھا۔ ارسل کو ثوبیہ کے انداز اور لہجے نے دکھ پہنچایا تھا۔

''تم ان کو پریشان سے نکالتی کیوں نہیں ہو...... تم تو مجھے اچھی طرح جانتی ہو ناں۔ ان کو یقین دلاؤ ثوبی کہ ایک دن ان کی بیٹی راج کرے گی۔'' ارسل نے مستقبل کا حسین ٹمٹماتا پُرامید جگنو ثوبیہ کی ہتھیلی پر رکھا۔ ثوبیہ نے وہ جگنو استہزائیہ انداز میں ہنستے ایک جھٹکے سے زمین پر پٹخا تھا۔ جگنو بلبلا اٹھا تھا۔

''تم اور تمہاری خوش فہمیاں...... دو سال ہو گئے ہیں یہ راگ سنتے، سنتے۔ تم نے میرے سامنے رونے ہی روئے ہیں۔ نہ کوئی گفٹ نہ عید، شبِ برات پر تحائف، تمہارا بزنس تب ترقی کرے گا جب میری خواہشات بوڑھی ہو جائیں گی۔ میں ایسی زندگی نہیں جی سکتی ارسل جو خوش فہمیوں پر مبنی ہو...... ٹھیک ہے میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن صرف محبت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ شادی کے بعد بھی کیا تم سعد بھائی کے سامنے میری ضروریات کے لیے ہاتھ پھیلاؤ گے۔'' زہر میں ڈوبے الفاظ کی برچھیاں ارسل کے دل میں اتارتے ثوبیہ نے تنفر سے اسے دیکھا۔ احساسِ توہین اور ضبط

سے ارسل کا چہرہ لہولہو ہوا......وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے ثوبیہ کا پتھریلے تاثرات سے اٹا خوب صورت چہرہ دیکھے گیا۔ جو مزید زہر اگل رہی تھی۔

''میرے والدین دو ماہ کے اندر میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ ہے تمہاری اوقات کہ مجھے بیاہ کر لے جاؤ......؟'' زہر خند لہجہ ارسل کے وجود کو نیل و نیل کر گیا۔ اس کی محبت مادیت پرستی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ وہ کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی کوشش اور جدوجہد کا عرصہ کیا طویل ہوا۔ سب رشتے ناتے اس سے عاجز آنے لگے تھے۔ کیا دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے؟ آج سے قبل اسے اپنا وجود کبھی اتنا ناکارہ نہ لگا تھا۔ تب بھی نہیں جب سعد بھائی اٹھتے، بیٹھتے اسے نکھے پن کے طعنے دیتے تھے، اسے ملازمت کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ وہ ہنس کر سہہ جاتا لیکن ثوبیہ شاید آج اس کے ساتھ آئی ہی اس لیے تھی کہ اس کی روح پر گھاؤ پر گھاؤ لگاتی جائے۔

''امی، ابو کل پرسوں تک رشتہ ختم کرنے آئیں گے۔ میرا بہت اچھی جگہ سے ملازمت پیشہ بندے کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ میرے والدین تمہارے کاروبار کے پھلنے پھولنے کا مزید انتظار نہیں کر سکتے۔'' ثوبیہ روکھے لہجے میں اس کے وجود پر اذیت ناک کوڑے برسا کر اسے بے یقین ہکا بکا چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ جو اس کی محبت تھی، دن رات اس کی محبت کا دم بھرنے والی اسے چھوڑ کر چلی گئی صرف پیسے کی خاطر......اس پل وہ اونچا لمبا خوب صورت مرد ڈھے گیا تھا۔ اس کی کم مائیگی اس کی محبت چھین کر لے گئی تھی۔ لیکن شاید وہ اس کی محبت تھی ہی نہیں۔ محبت کو تو صرف محبت کی بھوک ہوتی ہے مادی چیزوں کی نہیں۔ ثوبیہ کو اس سے محبت تھی ہی نہیں۔ وہ بکھرے ریزہ، ریزہ وجود کو سمیٹنے کی کوشش میں ہلکان پارک کے سنگی بینچ پر بیٹھ گیا۔ رنگ برنگے دلکش پھولوں اور سرسبز درختوں نے محبت سے اس حسین نوجوان کو دیکھا تھا جس کے سر پر خوش قسمتی کا پرندہ منڈلا رہا تھا۔

''اے لو، ایسے کیسے وہ رشتہ ختم کر سکتے ہیں۔ منگنی کی تھی ہم نے کوئی مذاق نہیں کیا تھا۔'' ارسل نے گھر جا کر ٹوٹے بکھرے لہجے میں اماں جان کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ اچھی خاصی مشتعل ہو گئیں۔

''پلیز اماں جان اگر ثوبیہ کی بھی مرضی نہیں رہی تو پھر اس رشتے کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔'' ارسل نے دل پر پتھر رکھ کر فیصلہ سنایا تھا۔

لاؤنج میں اس پل گھر کے سب افراد موجود تھے۔ سعد کے بچے بڑوں کے دکھ سے بے نیاز کھیلنے میں مگن تھے۔ اس کا فیصلہ اماں، ابا دونوں کو رُلا گیا تھا۔

''میرا خیال ہے ثوبیہ نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے ایک کنگلا انسان اسے دے بھی کیا سکتا تھا۔'' سعد بھائی دل جلانے میں کیوں پیچھے رہتے۔ ارسل نے دکھ سے سعد بھائی کو دیکھا پھر سر جھکا دیا۔ اماں جان اور ابا کے دل سے بیٹے کی بے بسی اور اذیت پر دعا نکلی جو سیدھی عرش پر جا پہنچی تھی۔ بیٹے کے پاس اگر دولت کی کمی تھی تو رشتوں کا پاس بے انتہا تھا۔ وہ سعد کی کڑوی کسیلی سننے کے باوجود کبھی بڑے بھائی کا احترام نہیں بھولتا تھا۔ کبھی پلٹ کر جواب نہ دیا۔ اماں، ابا کو بھرپور توجہ اور محبت اور احترام سے نوازتا۔ چھوٹی بہنوں سے شفقت سے پیش آتا۔ صرف دولت کی کمی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اخلاق کی کمی سب سے بڑی کمی ہوتی ہے۔ ارسل اخلاق کی دولت سے مالا مال تھا تو رب اسے اس آزمائش کے بعد مالا مال تھا۔ کیوں نہ کرتا جو ماں، باپ کی دعائیں لینا جانتا تھا۔ اور پھر وقت بدلتے دیر نہیں لگتی وہ جو زیر تھا زبر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''ارسل یار! مجھے پندرہ لاکھ کی اشد ضرورت ہے، کاروبار میں رقم لگانی ہے۔'' سعد نے محبت سے ارسل کو مخاطب کیا تھا۔

''اوکے بھائی......! میں آپ کو چیک لکھ دیتا ہوں۔'' جواباً ارسل کے لہجے میں محبت و احترام تھا۔ ارسل کا کاروبار بالآخر ترقی کے زینے چڑھنے لگا تھا۔ اب دولت کی ریل پیل تھی۔ اسے اس کی محنت کا ثمر مل گیا تھا۔ ماں، باپ کی دعائیں شامل حال تھیں۔ اماں، ابا، بہنیں خوش تھیں تو سعد اپنی باتوں پر بے حد شرمندہ، ارسل نے گھر کا سارا خرچ اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اماں، ابا کو عمرے پر بھی وہ بھیج چکا تھا۔ اب انہیں حج

کرواتا تھا۔ سعد کے بزنس کی ترقی کے لیے ارسل ان کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ اب دونوں بھائیوں کے پاس شاندار گاڑیاں تھیں۔ اللہ نے چار سال کے عرصے میں ارسل کو مالا مال کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر والوں پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا۔ اللہ بدلے میں اسے مزید دُگنا دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اللہ تعالیٰ کو اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا بے حد پسند ہے۔ ثوبیہ کی شادی کے دو ماہ بعد ہی ارسل کے حالات بدل گئے تھے۔ ارسل کو کبھی اس کی یاد آتی تو وہ فوراً جھٹک دیتا۔ اللہ نے یقیناً اس کے حق میں بہتر ہی کیا تھا۔ ان دنوں اماں جان ارسل کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ جب ثوبیہ کی امی اچانک ان کے گھر آ گئیں۔ گھر کے شاندار ساز و سامان اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئیں۔

''حلیمہ کیا ارسل کا کاروبار ترقی کر گیا ہے۔'' ثوبیہ کی امی کے لہجے میں حسرت تھی۔

''الحمد للہ...... اللہ کا کرم ہو گیا ارسل پر۔ تم سناؤ، ثوبیہ خوش تو ہے ناں......'' اماں جان نے محبت سے استفسار کیا۔

''ارے کیا بتاؤں، ثوبیہ کی شادی ہوئی تو اس کے شوہر کی ملازمت چھوٹ گئی۔ آج کل لڑ کر میکے آئی ہوئی ہے۔ جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اب اسے ارسل کی قدر ہوئی ہے۔'' ثوبیہ کی امی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔

''تم ثوبیہ کو سمجھاؤ۔ گھر ایسے نہیں بستے۔ آج اس کے شوہر کی ملازمت نہیں ہی تو کل مل جائے گی۔ ثوبیہ کو اس مشکل وقت میں اپنے شوہر کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے اور ہاں مجھے ذرا ارسل کے لیے لڑکی دیکھنے جانا ہے، برا نہ ماننا وقت دیا ہوا ہے۔ تم بیٹھو بچیوں کے پاس چائے پی کر جانا۔'' اماں جان کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں بھی چلتی ہوں اب بیٹھ کر کیا کرنا ہے۔'' ثوبیہ کی امی نے حسرت بھری نگاہ چہار اطراف دوڑا کر کہا تھا۔

''چلو جیسے تمہاری مرضی......'' اماں جان الوداعی مصافحہ کر کے لاؤنج سے نکل گئیں۔ ثوبیہ کی امی نے بھی سرد آہ بھر کر لاؤنج کے بیرونی دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

''میں بہت شرمندہ ہوں ارسل...... مجھے معاف کر دو میرے بھائی...... بہت دل دکھانے والی باتیں کہہ جاتا تھا میں۔'' سعد بھائی شرمسار لہجے میں گویا ہوئے۔ ارسل کے لیے اماں جان نے گوہر نایاب ڈھونڈا تھا۔ کومل بہترین اخلاق اور سلجھی ہوئی شخصیت کی مالک تھی۔ کومل نے ارسل کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھر دیے تھے۔ دونوں میاں، بیوی ہنی مون کے لیے ترکی گئے تھے۔ واپسی پر ڈھیروں قیمتی تحائف ان کے ہمراہ تھے۔ ارسل نے فرداً فرداً گھر کے سب افراد کو تحائف دیے۔ بھتیجوں اور بھتیجی کے لیے کھلونوں کا ڈھیر لگا دیا تو سعد بھائی اب اپنے گزشتہ رویے پر شرمسار ہو گئے ...اور بے ساختہ ان کے لبوں سے اس بات کا اظہار بھی ہو گیا۔

''ارے بھائی بھول جائیں سب تلخ باتیں۔ ایسی باتیں جتنی جلدی بھول جائیں اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ میں تو کب کا بھول چکا۔'' ارسل نے جواباً محبت بھرے لہجے میں کہہ کر بڑے بھائی کو مزید شرمندگی کے سمندر میں دھکیل دیا۔ انہوں نے بھی گھر کی ذمے داری نبھائی تھی لیکن جتا، جتا کر جس کا اجر تو انہیں کیا ملتا الٹا دل کی تنگی بڑھنے لگی تھی۔ جب دل کی تنگی بڑھنے لگے تو رزق بھی تنگ ہونے لگتا ہے۔ اللہ جتانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سعد کو بھی بس اللہ کو خوش کرنا تھا۔ اپنے سے وابستہ رشتوں کا دل سے خیال رکھ کر۔ اماں، ابا اپنے دونوں بیٹوں کو ہنستا مسکراتا شاد دیکھ کر خوش تھے، وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کا پہیا ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے۔ وہ کبھی نہیں ٹھہرتا۔ وقت کا پہیا کبھی کسی کی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ اس لیے کبھی کسی کا دل نہ دکھاؤ اور نہ کبھی کسی کو کم حیثیت ہونے کا طعنہ دو اور نہ اپنے مال پر اتراؤ کیونکہ وقت کبھی کسی پر مہربان ہوتا ہے تو کبھی کسی پر...... یہ تو بڑے ظرف والے ہوتے ہیں جو اپنا رویہ ایک سا رکھتے ہیں۔ چاہے وہ زیر ہوں یا زبر......

❁❁❁

مکمل ناول

حُسنِ غارت گر

دُردانہ نوشین حنان

''اماں...... وہ دیکھ...... گاڑی والا چپاتیاں لینے آیا ہوا ہے۔'' سترہ سالہ روزینہ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر گوندھے ہوئے آٹے کی پرات پکڑانے آئی۔ گھر کے دروازے کے باہر لگے چھپر تلے اس کی ماں نصیبو کا تنور گرم ہو چکا تھا۔ محلے بھر سے لال دسترخوان سے ڈھانپے چھوٹے بڑے تھال، پرات آئے جا رہے تھے۔ یہ اماں نصیبو کی مصروفیت کا وقت تھا۔

''ایک گلاس پانی دے جا۔'' اس نے بیٹی کو آواز دی۔

جون کی گرمی اور دوپہر کے بارہ بجے، درخت کے نیچے ٹھہری گاڑی نصیبو نے دیکھ لی تھی مگر گاڑی میں سے کسی نے روٹی کے لیے آواز نہیں دی تھی۔ روزینہ پانی سے بھرا ہوا بڑا اجستی گلاس لے کر آئی۔ ٹاٹ کا پردہ چھوڑ کر گلاس تھلے پر رکھا۔

''اماں پانی......'' نصیبو تنور میں جھکی ہوئی تھی۔ گاڑی کا شیشہ اب اترا ہوا تھا اور اندر بیٹھا ادھیڑ عمر مرد اِدھر ہی دیکھ رہا تھا بلکہ روزینہ کو دیکھ رہا تھا۔ نصیبو نے گلاس اٹھایا تو اس پر نظر گئی۔ جہاں دیدہ عورت تھی۔

''روٹی لینی ہے سیٹھ جی؟'' کراری آواز میں پکاری۔ ادھر روزینہ کو ڈپٹا ''تو جا اندر۔''

کم بخت خوب صورت اتنی تھی کہ جیسے ایک، ایک نین نقش تعریف کے لیے بنایا گیا ہو۔ رنگت یوں دمکتی تھی جیسے گلگت بلتستان سے آئی ہو۔ گرمی، لو، حبس، غریبی کا اس پر اثر نہ ہوتا تھا۔ اوپر سے کسی ماڈل جیسا قد و قامت، غریب کی بیٹی خوب صورت ہو تو دُہرا عذاب ہوتا ہے۔ گاڑی والا نیچے اتر آیا۔ رنگین کنی والی سفید لنگی اور کلف لگا کرتہ چٹی سفید پگ، زمیندار لگ رہا تھا۔

''ماسی، دس روٹیاں دے، دے...... ذرا بھاری ہوں...... میں گڈی میں بیٹھتا ہوں، کتنی گرمی ہے...... جلدی کرنا۔'' وہ بار، بار ٹاٹ کے پردے کی طرف دیکھتا۔

''گڈی میں بیٹھو، ابھی دے جاتی ہوں۔'' اماں





کا ہاتھ سرعت سے چلنے لگا۔ محلے کا منا اپنی روٹیاں لینے آیا تو اماں نے اسے دس روٹیاں اخبار میں لپیٹ کر شاپر میں ڈال دیں۔

''سامنے گڈی والے کو دے آؤ...... ڈیڑھ سو روپے لے لینا۔''

''اس کے پاس کھلا نہیں تھا، وہ بولا لے جا، لے جا۔'' منا روٹیاں دے کر سَو سَو کے دو نوٹ دیتے ہوئے بولا۔

سو کے دو نوٹ ہاتھ میں لیے نصیبو سڑک کو دیکھتی رہی۔

شام کو نہا دھو کر اماں نصیبو محلے کا چکر لگاتی تھی چند گھروں سے اس کے پرانے تعلقات تھے۔ مسجد سے نکلتے فیض بخش نے اس کے سلام کا جواب عزت سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''نصیبو بہن...... شام کو بھی تندور تپا لیا کر...... آمدن بڑھ جائے گی۔''

''جتنا اوپر والا دے رہا ہے کافی ہے۔ گیارہ بجے سے تین بجے پانچ گھنٹے آگ کے سامنے بیٹھتی ہوں جگر سینک کرنے لگتا بس دھی کی فکر رہتی ہے۔''

''اللہ خیر کرے گا۔ اللہ کارساز ہے۔''

''فیض بخش بھرا (بھائی) میں ترے ہی گھر سے آ رہی ہوں۔ کرم بی بی نے بھنڈیاں دی ہیں۔'' نصیبو کے ہاتھ میں شاپر تھا۔

''اللہ نصیب کرے بی بی۔''

☆☆☆

دوسرے دن پھر وہی گاڑی تنور پر آ رکی۔ نصیبو کا ماتھا ٹھنکا۔

''سیٹھ صاحب...... کہاں سے آتے ہو......؟'' روٹیاں گنتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''سیٹھ'' کی نظریں ٹاٹ کے پردے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔

''چک نمبر ایک سوچھ سے......''

''ہائیں...... اتی دور سے؟''

''کتنے بال بچے ہیں تمہارے؟ گھر والا کیا کرتا ہے۔'' اس کی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ وہ بھی کرید میں تھا۔

''اماں نصیبو بیوہ ہے۔'' باری کے انتظار میں ٹھہرا کوئی محلے دار بولا۔

''چچ، چچ...... اس عمر میں اتنی محنت...... بلا کی گرمی ہے۔''

''سیٹھ جی...... غریبوں کو گرمی نہیں لگتی...... یہ لیں دس روٹیاں، سو روپے دیں...... کل والے پچاس کاٹ لیں...... اتنی گرمی میں کام حق حلال والے ہی کرتے ہیں۔''

سیٹھ نے بادلِ ناخواستہ پچاس روپے پکڑے۔

''اماں...... آٹا گوندھ رکھا ہے......'' ٹاٹ کے پار سے سُریلی آواز آئی۔ سیٹھ کے قدم وہیں رک گئے...... مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر جھجک کر گاڑی کی طرف بڑھا۔ ساتھ چلتے روٹی کے ایک گاہک سے پوچھا۔

''کتنے بال بچے ہیں بیچاری کے؟''

''ایک ہی بیٹی ہے......'' جواب ملا۔

سیٹھ واپس گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چلی گئی۔

اماں نصیبو، روزینہ کو لیے کرم بی بی کے گھر آئی تھی۔ روزینہ نیم کے پیڑ میں جھولا جھولنے لگی۔

''نصیبو، تیری بیٹی بالکل پریوں جیسی ہے۔'' کرم بی بی نے مسکرا کر روزینہ کو دیکھا۔

''میں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں......''

''کیوں؟ خیر تو ہے کیا بات ہے......'' چارپائی کی ادوائن کستے ہوئے کرم بی بی کے ہاتھ رک گئے۔

''چھوڑ...... میں تجھے ادوائن کس دوں......'' نصیبو آگے بڑھی۔

''ہو گئی یہ تو بس...... اپنی سنا...... پریشان کیوں ہے؟''

''آج پھر وہ گڈی والا آ گیا...... تو خود سوچ، کہتا ہے میں چک ایک سو چھ میں رہتا ہوں...... وہاں کوئی روٹی پکانے والا نہیں...... سارا وقت دروازے کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔''

''روزینہ دھی ہے بھی اتنی پیاری اسے باہر نہ نکلنے دیا کر۔'' کرم بی بی نے نیچی آواز میں مشورہ دیا۔

''میں اکیلی عورت...... لاکھ بہادر سہی...... رات کو

بہت ڈر لگتا ہے...... پتا بھی کھڑکے تو سانس نکل جاتی ہے۔"

"اللہ سب کا محافظ ہے...... کہے تو میں اپنے کاشی کو ترے ہاں سونے بھیج دوں؟"

"بھلا اتنا سا بچہ کیا کرے گا۔" کاشی کرم بی بی کا بارہ، تیرہ سالہ بیٹا تھا۔ نصیبو کو شش و پنج میں دیکھ کر کہا۔

"کاشی اور عمر آ جائیں گے...... عمر میرا بھانجا ہے...... آپس میں ہنستے بولتے رہیں گے۔"

"یہ تو تری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"پنکھا تو چلاتی ہوگی ناں......؟ میرے بچے پنکھے کے بغیر نہیں سوتے۔"

"تو بھیج دے...... میں چلا لوں گی...... اللہ مالک ہے۔"

مغرب ابھی نہیں ہوئی تھی۔ چھڑکاؤ کیے نم آلود صحن میں چار پائیاں بچھی تھیں۔ کاشی ٹرانسسٹر لگا کر لیٹا تھا جو وہ اپنے گھر سے لاتا تھا۔ مغرب کی اذان سن کر گھر جاتا کھانا کھاتا، ریڈیو واپس کر کے عشا کے بعد لوٹتا تھا۔ تب تک عمر آ جاتا۔ عمر کا گھر دوسرے محلے میں تھا چند دن وہ آتا رہا پھر اس نے آنا چھوڑ دیا۔

روزینہ اپنے گھر کی چھت کی دیوار سے اپنے صحن میں آدھی لٹکی آوازیں دے رہی تھی۔

"کاشی...... وہ دیکھو...... کاشی...... پتنگ گر رہی ہے۔"

"کہاں...... کدھر......؟" کاشی نے ریڈیو رکھا جلدی سے چپل میں پاؤں ڈالتا بھاگتا پڑا...... باہر کچھ اور لڑکے بھی پتنگ لوٹنے کے لیے بھاگ رہے تھے۔

"کاشی جلدی کرو...... وہ جھاڑ میں پھنسی ہے......"

وہ اب گلی والی سمت پر آ کر ہدایتیں دے رہی تھی۔

جانے کب سفید کار دھیرے سے آ کر رک گئی۔ کار کے اندر وہی سیٹھ تھا جو نثار ہوتی نظروں سے اوپر دیکھ رہا تھا۔

"کاشی...... اوہو...... یہ گاڑی آ گئی...... اس کے پیچھے دیکھو......" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ روزینہ سے آنکھیں چار ہوئیں تو مسکرا کر ماتھے پر ہاتھ رکھا، روزینہ جھٹ سے دیوار سے اتر گئی۔

سیٹھ اگلی شام پھر اسی وقت گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ اسے یقین تھا لڑکی دوبارہ نظر آئے گی۔ گرمی کی شاموں میں چھت کے سوا اس نے کہاں جانا تھا، لڑکی کو بھی زعم تھا اس کے حسن پر لٹو ہو جانے والا یہ "بڈھا" (اس کے حساب سے وہ بڈھا ہی تھا) اب چکر پہ چکر لگائے گا۔ خوب صورت لڑکی خواہ غریب ہو، سادہ پہنتی ہو اسے ناز ہوتا ہے کہ لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ سیٹھ نے فرش سے چھوٹا سا پتھر اٹھایا سو روپے کا نوٹ اس پر لپیٹ کر چھت پر نشانہ باندھ کر پھینکا وہ روزینہ کو اپنے ہی آنگن میں جھانکتے دیکھ چکا تھا۔ کنکر کی آواز پر وہ پلٹی...... اٹھایا، حیران رہ گئی۔ بار، بار دیکھا کہیں نقلی تو نہیں...... اصلی ہونے کا یقین کر کے پتھر آنے والی سمت دیوار سے جھانکا...... وہی "بڈھا" وہی گاڑی...... اب کی بار اس کے سلام پر روزینہ مسکرا دی...... چلا کے پوچھا۔

"تم نے پھینکا ہے؟ کیوں؟"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکایا، کچھ زبان کچھ اشارے سے کہا یہ نوٹ کیا چیز ہے جان بھی حاضر ہے۔ گھنے گھٹا جیسے بالوں والی الھڑ روزینہ جس کے گال اتنے گلابی ہوتے جیسے غازہ ملا ہو...... آنکھوں میں کاجل کے ڈورے کھینچ لیتی تو ناگن کی طرح ڈستی...... اس شوخ حسینہ نے منہ چڑایا۔

"صرف ایک نوٹ......" مخروطی انگلیاں نچا کر بتایا۔ "کنگلا کہیں کا......" سیٹھ کی محبت وغیرت دو آتشہ ہوئی۔ کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہزار کا نوٹ نکال کر دکھایا۔ وہ...... "نہ، نہ......" کرتی ہنستی ہٹ گئی، نوٹ روڑی بنا اس کے پاؤں میں آ گرا۔

"ارے، ہا...... کیا سچ مچ......"

جلدی سے نوٹ دوپٹے میں باندھتی دو، دو زینے ایک ساتھ پھلانگتی اتر گئی۔

پیار کی اس بے جوڑ کہانی کا آغاز نوٹوں سے ہوا۔ روزینہ ایسی بھی سخت دل نہ تھی کہ اسے گھر کی عسرت کا احساس نہ ہوتا۔ وہ چاہتی تھی یہ نوٹ اماں کو دے، دے، ماں کو خوشی ہوگی، یہ اس کا خیال تھا۔ یوں بھی اماں سے چھپا کر وہ انہیں کہیں خرچ نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ

وہ خود کو قصور سے دور رکھ کر ملبہ سیٹھ پر ڈال سکتی تھی۔

''اماں، میں کل جب کاشی کو کٹی پتنگ دکھا رہی تھی...... کاشی سے پوچھ پیلی، سبز پتنگ وہ ہی تو لایا تھا لوٹ کے...... تب بھی یہ گاڑی والا اوپر دیکھ رہا تھا...... وہی...... جو روٹیاں لینے آجاتا ہے۔ آج دھلے کپڑے ڈالنے گئی تو...... پھر بٹے میں باندھ کے چھت پر یہ نوٹ پھینکنے لگا۔''

''نوٹ...... ؟'' وہ دونوں قریب، قریب لیٹی سرگوشی میں بول رہی تھیں۔ رات کا وقت تھا۔

''ایک سو کا نوٹ...... دوسرا......''

''دوسرا......؟''

''دوسرا...... ہزار کا نوٹ ہے......''

''کدھر ہیں...... ؟ ہزار کا نوٹ مذاق ہے...... دکھا۔''

روزینہ نے تکیے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر نوٹ دکھائے...... اماں نصیبو نے نوٹ یوں ڈرتے، ڈرتے پکڑے جیسے بچھو ہوں...... وہ اٹھ بیٹھی۔ صحن کی چاروں دیواروں کو دیکھا کوئی دیکھتا نہ ہو، کاشی اور عمر پنکھے کے سامنے والی چارپائیوں پر بے سدھ سو رہے تھے۔

''اور کچھ کہا تمہیں......؟''

''میں پھر جھانکی ہی نہیں...... چلا گیا ہوگا انتظار کر، کر کے......''

''یا اللہ...... ہمارے پردے رکھنا...... کچھ نہیں میرے پاس عزت کے سوا۔'' وہ ہل، ہل کر کچھ پڑھتی اور دم کرتی رہی۔

نصیبو کو یقین تھا وہ روٹی کے بہانے تنور پر آئے گا تو وہ اس کی کھری بے عزتی کرے گی...... مگر اگلی دوپہر وہ نہیں آیا...... تو اس کا مطلب ہے وہ ماں کی عدم موجودگی کا وقت تاڑ چکا ہے...... تندور کی سینک سے زیادہ گرمی ان باتوں پر ہو رہی تھی۔ چنانچہ...... اب اس نے عصر کے بعد محلے کا چکر لگانا ختم کیا۔ نہا دھو کر کپڑے بدل کر دستی پنکھا لے کر صحن میں لیٹ رہی۔ روزینہ بھی چھت پر نہ گئی۔ چپ چاپ اخباروں سے لفافے بناتی رہی، روزینہ کی عمر میں لڑکیاں، لڑکیوں سے ملتی جلتی سہیلیاں بناتی اسکول، کالج جاتی ہیں، ڈرامے اور فلمیں پسند کرتی ہیں، اس زمانے میں موبائل تو تھے نہیں لیکن زندگی کی دیگر تفریحات تو تھیں پر روزینہ کو کچھ میسر نہ تھا۔ اس کا بھی قصور نہیں تھا...... اگر وہ چھت پر جا کے آس پاس گلیوں، گھروں میں تانک جھانک کرے۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز پر دونوں اپنی سوچوں سے چونکیں۔ کاشی آموں کا تھیلا رکھ کر جا رہا تھا۔

''امی نے آم بھیجے ہیں...... میں کرکٹ کھیلنے جا رہا ہوں...... مغرب تک آجاؤں گا۔''

روزینہ آموں کا سن کر خوشی سے اٹھی...... ابھی سنبھال ہی رہی تھی کہ کاشی پلٹ آیا۔

''کوئی بندے آئے ہیں...... خالہ نصیبو...... آپ کو ملنا چاہتے ہیں۔''

''بندے...... ؟ کون ہیں پتر...... ؟ نام پوچھ کاشی پتر......''

''گاڑی میں آئے ہیں دو مرد ہیں۔'' کاشی نے قریب آکر بتایا۔

گاڑی...... واضح نشانی تھی...... روزینہ کا ہاتھ بے ساختہ منہ پر گیا۔ نصیبو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کاشی پتر...... اماں صدقے ابھی نہ جائیو...... یہ کھٹولا نکال کر باہر انہیں بٹھا...... میں آتی ہوں......''

کاشی نے ہلکی پھلکی چارپائی اٹھائی، ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا۔

''اللہ ہی خیر کرے......'' نصیبو نے بڑبڑاتے ہوئے تار پر لٹکا، دھلا ہوا ململ کا دوپٹا اوڑھا۔

''اری تم اوپر جھانکنے نہ پہنچ جانا...... اور ڈیوڑھی پر آکے پانی پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں......''

''ہاں جی اماں......!''

پانی پوچھنے تو نہیں، سن گن لینے وہ دبے قدموں ڈیوڑھی کی دیوار سے لگ رہی۔ آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''بیٹھو اماں جی بیٹھو...... ہم ماؤں، بہنوں والے ہیں، عزت دار لوگ ہیں، شریف پور جھجرہ سے آئے ہیں...... یہ میرا یار بیلی ہے...... اس کا نام چودھری خیر دین ہے۔ ماشاء اللہ ساڑھے چار مربع زرعی زرخیز زمین کا مالک ہے۔ دو بھائی مالک ہیں...... ان کی

ہمشیرہ بی بیاں اپنے گھر بار والی ہیں۔ اپنے حصے لے چکی ہیں...... چودھری صاحب بال بچوں والا ہے، جھوٹ کیا بولنا...... بیوی اس کی خالہ زاد تھی...... شرع شریف میں مرد کو دوسری شادی کی کھلی ڈلی اجازت ہے...... اس میں کوئی حرج نہیں...... چودھری صاحب کو روپے پیسے کی کمی نہیں...... ان کے بیٹے اب ماشاءاللہ ... شوگر مل لگوانے کا سوچ رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے آپ بیوہ ہیں...... مگر کوئی آپ کا بھرا، دیور، جیٹھ ہو تو ہم اپنی عرضی اس کو پیش کریں......'' دوسرا بندہ نہایت تمیز و متانت سے بات کرر ہا تھا۔ مگر اماں نصیبو تو جیسے گونگی ہو گئی تھی۔ بات کی سمجھ آ رہی تھی مگر شعور قبول نہیں کرر ہا تھا۔ چودھری خیر دین نے جو ابھی تک شرمیلے پن کا مظاہرہ کرر ہا تھا اس خاموشی کو توڑا۔

''پھر کیا حکم ہے اماں......؟''

''ہوں...... ہاں......'' نصیبو، کاشی کی طرف مڑی جو سر کھجلاتا ہوا بور ہو رہا تھا۔ ''کاشی پتر...... مہمانوں کے لیے ٹھنڈی بوتلیں لا دے......'' وہ دوپٹے کے پلو سے پیسے کھولنے لگی۔

''او...... نہیں بہن جی...... نہیں...... بوتلیں بھی پئیں گے...پر اگلی بار......'' دوسرے نے روکا...... اماں نے ہونکا بھرا...... خود کو معتبر اور پکا کیا۔

''جی ہاں میرا بھرا (بھائی) ہے، فیض بخش...... آج وہ کہیں کام سے گیا ہے...... آپ کل آئیں...... ان سے مل لیں۔''

''چنگا فیر...... ہمیں اجازت...... او چھوٹے...... یہ کیا لگتا ہے آپ کا......'' چودھری خیر دین نے اپنی گاڑی کی ڈگی کھولی۔ آموں کی دو پیٹیاں نکال کر نیچے رکھیں۔ ''بیٹا...... یہ اٹھوا لے......''

نصیبو کے روکنے، منع کرنے، کچھ کہنے، ہچکچانے کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

مطلب تو سارے سمجھ آ گئے تھے۔ آنے والے کی حیثیت کی جانچ بھی ہو گئی تھی۔ مگر...... وسوسے اتنے تھے کہ دل ٹھہرتا نہ تھا۔ بال بچوں، بیوی والا ادھیڑ عمر مرد، جس کے مزاج، فطرت کا پتا نہیں...... آموں کی پیٹیاں اندر آئیں...... آموں کا تھیلا خوشی سے دیکھنے والی کے چہرے پر کوئی مسرت کی لکیر نہ ابھری...... ماں تھی نصیبو، چہرے کی تحریریں پڑھ لینے والی جاہل ماں......

نصیبو سے صبر نہ ہوا...... مغرب کے بعد کاشی کو روزینہ کے پاس چھوڑ کر کرم بی بی اور فیض بخش کو حال دینے چل دی۔

''عجیب بات ہے......'' کرم بی بی گول طے کیے بستر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ صحن چار پائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہویں اور ان کے بچے اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے تھے۔ فیض بخش سب کچھ سن کر خاموشی سے نلکے پر وضو کرنے چلا گیا۔

''بھرا فیض بخش کچھ بولا نہیں......'' نصیبو نے اپنے سامنے رکھی تازہ کھجور کی تھالی کھائے بغیر کھسکا دی۔ کرم بی بی خاوند کے دوبارہ آ کر بیٹھنے کے انتظار میں پاؤں کے تلووں پر لگی سوکھی مہندی جھاڑنے لگی۔ فیض بخش داڑھی سے پانی کے قطرے جھاڑتا زیرِ لب کلمۂ طیب دُہراتا دوسری چار پائی پر بیٹھا تو اس کی بیوی کرم بی بی نے جانچتی نگاہ ڈالی۔ (اب یہ کیا کہیں گے) فیض بخش سے پہلے نصیبو نے بات کی۔

''بھرا فیض بخش...... میں نے تجھے بھرا صرف کہا نہیں مانا ہے، کل وہ بات تجھ سے کریں گے۔ میں اکیلی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ روزینہ میرا واحد اثاثہ ہے اور واحد اولاد ہے۔ مجھے کوئی مردانہ مت دے۔''

''بے شک...... بہن نصیبو، روزینہ میری بیٹی ہے، اسی لیے تو غور کر رہا ہوں، سوچ رہا ہوں۔''

''کاشی کے ابا...... میرے خیال میں تو یہ رشتہ مناسب ہے...... شرافت، طور طریقے کا پتا کرا لیں۔ مالدار بندہ تو ہے......'' کرم بی بی نے فیصلے کی راہ آسان کی۔

''مالدار بندے ہی تو شوقین مزاج ہوتے ہیں۔ سوچنا پڑتا ہے...... ہر پہلو سے سوچنا پڑتا ہے۔''

''ہاں...... جی ہاں......'' نصیبو کا تو دماغ ایک راہ نہیں پکڑ رہا تھا۔

''آج یہ لڑکی پسند آ گئی...... کل کوئی اور آ سکتی...... اچھا...... خیر...... مت گھبراؤ...... نصیبو بہن...... کل انہیں

آنے دو...... ملوں گا، پرکھوں گا، گھر جا کر بچی کو حوصلہ دو، پیار دو، بچی پریشان ہورہی ہوگی۔ بیٹیاں بولتی نہیں ہیں۔ دیکھ سن سب کچھ رہی ہوتی ہیں۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں......'' نصیبو حوصلہ پاکر گھر چلی آئی۔

اس کے جانے کے بعد کرم بی بی نے یہی سمجھایا۔

''کاشی کے ابا...... ایک امیر خوشحال موٹر پر آنے والا غریب بیوہ کی بیٹی کو عزت سے بیاہ کر لے جانا چاہتا ہے، یہ اس کی شرافت کی دلیل ہے...... ورنہ روپے پیسے کی چمک پر نادان لڑکی کو بہکانا مشکل تو نہیں ہوتا...... آپ سمجھدار ہیں۔''

فیض بخش خاموش رہا۔

''نصیبو بیٹی کی خوش شکلی کے سبب دن رات فکر مند رہتی ہے۔ لڑکی کو بھی یہ احساس ہوجائے تو بڑی آزمائش بن جاتی ہے۔'' اس کی بات پر فیض بخش نے تائیداً سر ہلایا اور نماز کے لیے چلا گیا۔

عصر کے بعد نصیبو نے پانی کا پائپ کھینچا اور گھر کے اندر اور بیرونی دروازے کے ساتھ درخت کے نیچے تر بتر چھڑکاؤ کیا تاکہ مٹی جمی رہے۔ صحن میں پنکھے کے سامنے دو چارپائیاں رکھ کر ان میں سے ایک پر گھر کی واحد نئی چادر اور دوسری کی پائنتی پر کھیس بچھا دیا۔ گاؤ تکیے ہمسائی سے مانگے، درمیان میں لکڑی کی میز تھی جس پر پلاسٹک شیٹ تھی۔ کوکا کولا کی تین بوتلیں اور رومال میں برف بندھی رکھی تھی۔ روزینہ کو گلاس ٹرے تک سمجھا دی تھی۔ تواضع واستقبال کی اس دوڑ دھوپ میں اقراری رنگ ضرور تھا مگر روزینہ ابھی تک بے تاثر تھی۔

موٹر کا ہارن بجا...... پہلے سے موجود کاشی انہیں اندر لے آیا۔ چودھری اور اس کا کل والا ہم عمر دوست سلام کر کے بیٹھ گئے۔ کاشی بجلی کی طرح دوڑ کر اپنے باپ فیض بخش کو بلا لایا۔ فیض بخش بلند آواز میں ''السلام علیکم'' کہتا ڈیوڑھی سے نمودار ہوا۔ دونوں نے اٹھ کر سلام کیا۔

کھیس والی چارپائی پر نصیبو بیٹھی تھی اس پر فاصلے سے فیض بخش نے بیٹھتے ہوئے ان دونوں کو دوسری چارپائی پر تشریف رکھنے کو کہا۔

چودھری خیر دین نے اپنا تعارف کرا کر کہا۔

''یہ میرا قدیمی یار بیلی اور بھائیوال ملک امیر مومن ہے۔ آپ سوچو گے کہ کوئی رشتے دار سگا بھائی، بہنوئی لے آتا۔ آپ کو تو پتا ہے شادی شدہ بندہ دوسری کرے تو بہت سوں کو دشمنی ہوتی ہے۔ بات بگاڑنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ بنانے والے کم......''

فیض بخش ان کی وضاحتیں سنتا رہا۔ دوران گفتگو فیض بخش کا کوئی جاننے والا اسی علاقے کا نکل آیا تو طرفین میں بے تکلفی ہوئی...... نصیبو تو فیض بخش کے تاثرات کے ساتھ کبھی مسکراتی کبھی سنجیدہ ہوجاتی۔

''حق مہر ہماری مرضی کا ہوگا، ہماری کنواری بالڑی (بچی) ہے۔'' اب معاملہ اقرار سے شرائط پر آ گیا تھا۔

''او جی ہم شریف لوگ ہیں، آپ کی طرح سادہ لوح ہیں، دس تولے...... چلو پندرہ تولے سونا چڑھادوں گا۔''

''ہاں جی بس یہی کچھ ہوتا ہے۔'' ملک امیر مومن نے چودھری کی تائید کی۔

''اراضی لکھواؤں گا...... اس پر کوئی بحث نہیں ہوگی۔'' فیض بخش نے دوٹوک کہا۔

''کتنی...... ؟ یہ تو برادری میں فساد ہوگا۔'' چودھری کچھ دکھی ہو کر بولا۔

''آدھا بیگھ......'' وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''سوچ سمجھ لیں...... مہلت لے لیں...... ہفتہ، دس دن جب دل کرے چودھری جی...... بات یہ ہے کہ سوکن اور جوان سوتیلی اولاد پر کم عمر کنواری بچی دینا دل گردے کا کام ہے۔ ہمیں سکیورٹی چاہیے۔'' نصیبو تو فیض بخش کے بردرانہ ساتھ پر ایمان لے آئی۔ اش، اش کر اٹھی۔ وہ ایک ہفتے کی مہلت مانگ کر چلے گئے۔

ایک ہفتے کا یہ بھی فائدہ ہوا کہ نصیبو کی سوچ......

''میں تو ایک مرلہ کم نہ کراؤں'' سے ''لکھت پڑھت سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز نصیب ہے۔'' پر آ گئی۔ روزینہ

"بڈھا پینڈو" سے "پندرہ تولے سونا، اپنا الگ مکان، نئی گاڑی" پر ناز کرنے لگی۔ دوسری طرف چودھری خیر دین اور ملک امیر مومن نے عقل سے سوچا۔ عقل نے کہا غریب محنت کش تنہا عورت کون سا ملکیت حاصل کر لے گی۔ یہ لکھت تو کاغذی بات ہے، سو روپے کے اسٹامپ پیپر پر لکھ دینے سے اجناس ان کے گھر نہیں جانی۔ زمین جہاں ہے وہیں رہے گی...... وارث سلامت رہیں، چودھری خیر دین، چودھری امیر دین...... اور ان کے بیٹے۔

اثبات کی خوشخبری مٹھائی کے ڈبوں میں ڈال کر پانچویں دن وہ نصیبو کے گھر پہنچ گئے۔ اس بار چودھری خیر دین کا بھائی چودھری امیر دین بھی ساتھ تھا۔ گویا بات ان کی برادری میں کھل چکی تھی۔ آج نصیبو کھلی پڑتی تھی۔

آدھا بیگھ زرعی زمین، پندرہ تولے سونا...... نکاح پر دس جوڑے قیمتی اعلیٰ اور سب خرچہ چودھری کے ذمے...... اور کیا چاہیے تھا۔

"اگلے جمعہ نکاح دے دو...... اماں۔" نصیبو سے کوئی دس سال چھوٹا داماد کہہ رہا تھا۔ صحن میں مبارک سلامت ہو رہی تھی، مٹھائی، خشک میوے، موسمی پھلوں کے کریٹ...... جاتے، جاتے روزینہ کے میک اپ کے لیے دس ہزار روپے دے گیا...... جو اس دور اور ان کے معاشی حالات کے پیشِ نظر خطیر رقم تھی۔

"تو میں واقعی راج کماری ہوئی؟"

"میں راج کرنے کے لیے تراشی گئی ہوں......"

"میں واقعی اتنی حسین ہوں...... ایک پکی عمر کا بندہ مر مٹا...... ایک دو بار دور، دور سے دیکھا اور دنیا لٹا دی...... گویا میں تو گدڑی میں لعل تھی۔ کسی کالج پڑھتی تو ساری لڑکیوں کو لگ پتا جاتا...... فلم جاتی تو فلموں والیاں ہاتھ باندھ لیتیں۔"

آج روزینہ آئینے کے سامنے پھولوں کے زیور میں قیامت ڈھا رہی تھی اور آج نصیبو، کرم بی بی، محلے والیاں صدقے واری جاتی تھیں۔ آج محلے میں اس کے نصیب کے تذکرے تھے، رشک تھا، حسد تھا۔ چودھری اسے شہر میں الگ کوٹھی میں رکھے گا۔ کوٹھی کا سامان وہ خود مہیا کرے گا، اس کی خواہش یہ تھی کہ روزینہ کے کپڑوں، جوتوں، ہار سنگھار میں کمی نہ ہو، چنانچہ نصیبو جہیز کی فکر سے آزاد ہو کر محلے کی سمجھدار نوجوان بہوؤں کی مدد سے بہترین کپڑے، ہم رنگ جوتے، جیولری اور میک اپ لوازمات خرید رہی تھی۔ محلے کی جوان لڑکیوں نے روزینہ کو میک اپ کے سامان کا استعمال سکھایا۔ کچھ ڈھنگ بتائے، سوجھ بوجھ دی۔ نکاح کے دن خود آ کر تیار کرایا۔ وہ سرخ کامدار لہنگے، سنہری چولی اور سرخ جھلملاتے دوپٹے میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ پندرہ تولے کے سونے کے زیورات نے کلائیاں، انگلیاں، سر اور گردن کو چار چاند لگا دیے۔ جب اسے دولہا کے برابر بٹھانے کو لایا گیا تو دولہا چودھری خیر دین استقبال کو اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظروں میں تفاخر تھا اور یہ فخر ایک حسین ترین لڑکی کا شوہر ہونے کا تھا۔ بارات کی دو عورتیں چودھری کی بھابی اور ملک امیر مومن کی بیوی، دلہن کو دیکھتی رہ گئیں ایک نے دوسری کو ٹہوکا دیا۔

"کڑی تے رج کے سوہنی ہے...... تنور والی کی بٹی نیں لگتی۔"

"میری بہو سے بھی عمر میں چھوٹی ہے۔"

"پروین کا تو سمجھو قصہ ٹھپ ہو گیا...... کہاں سورج، کہاں بجھتی راکھ......"

"سوہنی دلہن، سوہنی دلہن" کے الفاظ روزینہ کے کان میں پڑتے رہے اور اس کی ہر ادا میں دولھے کے لیے "میں" تم سے بہت آگے کی چیز ہوں......" کا انداز در آیا۔

ایک کچے چھوٹے مکان سے وہ بجی سجائی کوٹھی میں آ گئی۔ چودھری نے تو اس کا گھونگٹ اٹھاتے ہی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔

"تجھے پہلی وار دیکھا ایسی بجلی دل پر گری، دل کباب ہو گیا...... پکا فیصلہ کر لیا تجھے اپنا بنا کے رہوں گا۔"

"کہاں تو پھٹے پرانے کپڑوں میں جوانی گنوا رہی تھی۔ تیری اماں نے زیادہ سے زیادہ کسی ریڑھی بان سے تیری شادی کر دینی تھی...... مجھے دیکھ تجھے

ہیرے، موتیوں میں تول کے لایا ہوں...... ناز کرتا ہوں اپنے نصیب پر تو بھی ناز کر اپنے نصیب پر......''

''میں......؟''

''اب تو روز دلہن جیسی تیار ہونا...... ملکہ بن کر رہنا...... میں ترے حکم کا غلام......'' وہ مسکرادی۔

چودھری کو جب پہلی بیوی، بچوں سے ملنے گاؤں جانا ہوتا یا اراضی پر اس کی ضرورت ہوتی تب وہ روزینہ کو ماں سے ملنے بھیج دیتا۔ سچ تو یہ تھا کہ روزینہ کا ماں کے گھر سہولیات نہ ہونے کے سبب دل اکھڑا اکھڑا سا رہتا۔ ماں سے ملنا تو اچھا لگتا مگر سہولیات کی کمی کھٹکتی تھی۔ وہ ماں کے لیے پھل، مٹھائی اور پیسے لے جاتی۔ کچھ مہینوں کے اندر اس نے اماں نصیبو کا تنور بند کرادیا۔ وہ اتنے پیسے دے جاتی کہ اماں کو کمائی کرنے کی ضرورت نہ ہوتی مگر پھر بھی وہ گھر بیٹھ کر لفافے بناتی۔ بڑیاں سکھاتی یا لحافوں میں دھاگے بھرتی...... اٹھتے بیٹھتے اللہ کا شکر ادا کرتی...... اللہ نے اچھی جگہ بیٹی کو ٹھکانے لگادیا۔ البتہ سوکن اور سوتیلی اولاد کا داغ ضرور تھا۔

''اماں...... چودھری صاحب کے بیٹے مجھ سے کئی سال بڑے ہیں...... بیٹیوں کی شادی کردی ہے، مجھے پروین، وہ بڈھی اس کی بیوی، بھٹیارن کی بیٹی کہتی ہے۔''

''حسد تو ہوگا، یہ تو کہے گی۔ اللہ تیرا آنگن تیرے بیٹوں سے بھردے۔ اولاد اور نرینہ اولاد سے عورت کی جگہ پکی ہوتی ہے۔'' یہ دعا تو اماں کی فوراً ہی قبول ہوئی۔ شادی کے ایک سال کے اندر روزینہ ایک بیٹے کی ''مما'' بن گئی۔ وہ کہیں سے بچے کی ماں لگتی نہ تھی۔

اس کی روٹین میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ پہلے اگر دو نوکر تھے تو اب تین ہوگئے۔ چودھری اسے تھکنے، مرجھانے نہ دیتا تھا۔ شہزاد، ماں کی طرح گورا، چٹا تھا۔ چودھری کا تو عمر سے بیٹا لگتا نہ شکل سے، چودھری بچے سے بہت پیار کرتا۔ شہزاد کی خدمات کے لیے ملازمہ کوثری رکھی گئی تھی۔ کوثری گاؤں کی سمجھدار کم عمر بیوہ تھی جو شہر میں مضافات میں رہتی تھی۔

اکتوبر کی سہ پہر تھی، موسم معتدل تھا۔ چودھری لان میں بیٹھا تھا۔ شہزاد کو گود میں لیے اس سے توتلی زبان میں باتیں کرتا۔ بچہ ہمکتا اور اچھلتا تو باپ قہقہے لگاتا۔ روزینہ نہا کر اندر سے نکلی۔ پیازی ملائم کاٹن کا دیدہ زیب جوڑا پہنے...... کمر سے نیچے تک آتے گیلے بال، تولیا شانوں سے نکال کر کوثری کو تار پر پھیلانے کو دیا۔ چودھری صاحب کے قریب رکھے ٹیلی فون سیٹ پر گھنٹی بجنے لگی۔ چودھری نے شہزاد کو کوثری کے حوالے کیا اور فون سننے لگے۔

فون پر کی جانے والی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بچھڑا ہوا دوست ہے۔ اس وقت رات کا کھانا بنانے کے لیے باورچن آجاتی تھی۔ پہلے چائے بناتی اہتمام کے ساتھ چودھری و بیگم صاحبہ کے پاس لاکر رکھتی۔ پھر رات کے کھانے کا پوچھتی۔ روزینہ نے چودھری کا چائے کا کپ بناتے ہوئے پوچھا۔

''کس کا فون تھا؟''

''بڑا ہی بھلا بندہ ہے، اس سے باتوں، لطیفوں میں کوئی نہیں جیت سکتا۔'' چودھری کے ہونٹوں پر ابھی تک مسکراہٹ تھی۔

''کون؟''

''ذاکر ہمیش...... مسقط رہتا ہے، پہلے بھی اِدھر ہوتا تھا، اب سال دو سال بعد چکر لگاتا ہے، میں نے شادی کا بتایا تو بولا اب تو حاضری ضروری ہوگئی ہے۔''

''شادی تو پرانی ہوگئی...... اب تو بچہ بھی ہے۔''

''ہاں بچے کا سن کر خوش ہوگیا...... بلایا ہے میں نے آئے گا۔''

''اس کی فیملی ہوگی؟''

''فیملی اُدھر مسقط میں ہے...... اولاد نہیں ہوئی...... بیگم اور والدین ہیں۔''

''یعنی اکیلا آئے گا۔'' روزینہ نے بوریت محسوس کی۔

''جہاں گرد بندہ ہے، کئی ملکوں میں گھوما ہے، کبھی اس کے ساتھ دبئی کا پروگرام بنائیں گے۔''

''اچھا...ہوگا......؟''

''کچھ پل ایسے ہوتے ہیں جن پر فلک پیر مسکراتا ہے۔ چند روز گزرے۔

ملک امیر مومن اپنے کام سے چودھری خیر دین کو کچہری لے کے گیا ہوا تھا۔ باورچن کچن میں مصروف تھی اور کوثری اس سے گپ شپ لگاتے ہوئے فیڈر دھو رہی تھی۔ روزینہ اپنے کمرے میں صوفے پر نیم دراز پسندیدہ ڈراما دیکھ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ناچار اٹھ کر سننا پڑا۔

فون پر چودھری کا بڑا بیٹا اپنے باپ کا پوچھ رہا تھا۔ روزینہ کے بتانے پر فون اس کی ماں نے لے لیا اور ایک سانس میں شروع ہوگئی۔

''ناگن، مکار، چلتر باز، چڑیل، کمین کی بیٹی...... میرے خاوند کو چھین لیا۔ میرا بسا بسایا گھر خراب کر دیا...... دو ٹکے کی بساط نہ تھی محلات میں عیش کرنے لگی۔ بیٹے کو جنم دے کر خود کو شے نہ سمجھ...... یہ وارث نہیں وارثوں کا نوکر ہوگا دیکھ لینا۔'' روزینہ غصے سے کانپنے لگی الفاظ ہی نہ بنتے تھے۔

''تم پر ہزار لعنت ہو......'' کہہ کر چیخ کر فون بند کر دیا۔ ریسیور رکھ کر رونے لگی۔

چودھری گھر لوٹا تو روزینہ کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ آنکھیں متورم، مزاج برہم......

''کیا ہوا ہے؟ خیر ہے؟ اماں خیریت سے ہے؟'' روزینہ کی آنکھیں چھلک آئیں۔

''آپ کی بیوی نے میرے بچے کو بددعائیں دی ہیں...... میرے بچے کا کیا قصور ہے......'' روزینہ کے آنسو اور اس کی سب باتیں چودھری نے سنیں تو پہلی والی کو گالیاں دے کر بولا۔

''اس کی بکواس ایسے بند نہ ہوگی...... مجھے ایک چکر لگانا پڑے گا۔ میرے جوان بیٹوں کو میرے خلاف ورغلا رہی ہے۔ زمینداروں میں شادیاں ہوتی رہتی ہیں، خود اس کے باپ کی دو بیویاں ہیں۔''

ملک امیر مومن دوپہر کے کھانے پر ساتھ تھا۔ چودھری اس سے اپنی پریشانی کا ذکر کرتا رہا۔ ملک کی جیپ پر دونوں گاؤں روانہ ہوگئے۔ رات تک چودھری نے واپس آجانا تھا۔ اور اسے منانے کی خاطر واپسی پر ہوٹل سے کھانا لانے کا وعدہ کیا تھا۔ فارغ وقت میں روزینہ کا مشغلہ ٹی وی، وی سی آر ہوتا تھا۔ شہزاد تو زیادہ تر کوثری کے پاس ہوتا۔

چوکیدار بابا نے اندر آکر اطلاع دی چودھری صاحب کا دوست آیا ہوا ہے۔

''تو کہہ دو بابا...... وہ زمینوں پر گئے ہیں۔''

روزینہ نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

''بی بی، وہ تو کہہ دیا...... مگر کہتا ہے دور سے آیا ہوں...... تحفے لایا ہوں بچے کے...... ہاں مسقط...... مسقط سے آیا ہوں......''

''مسقط والا؟'' روزینہ سوچ میں پڑ گئی۔

''بٹھا دوں بیٹھک کھول کے......؟'' بابا ہمیشہ ڈرائنگ روم کو بیٹھک ہی کہتا تھا۔

''ہاں بٹھا دو...... پیپسی بھی فریج سے نکال کر دے دو۔'' کچھ دیر بعد کوثری شہزاد کو سلانے آئی تو روزینہ کو یاد آیا۔

''بات سن کوثری...... وہ ڈرائنگ روم میں دیکھ...... مہمان چلا گیا ہے؟''

کوثری نے آکر بتایا کہ ''بیٹھے ہیں اور کہہ رہے ہیں چودھری صاحب کو فون کر کے پتا کریں کب آنا ہے۔''

روزینہ کو ایک بار پھر فون کی خاطر اٹھنا پڑا۔

''چودھری جی...... جا کے پہلی کی گود میں بیٹھ گئے ہو...... آپ کا وہ مسقط والا یار آیا ہوا ہے، گھنٹے بھر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔''

''ذاکر ہمیش...... اوہو...... میری قسمت...... اچھا سن پیاری...... جا کے سلام کر لے...... میں ابھی گاڑی لگواتا ہوں نکل رہا ہوں......''

''کیا کہا......؟ میں جاؤں......''

''وہ دیہاتی دماغ کا نہیں ہے...... انٹرنیشنل بندہ ہے...... اور ہاں چائے شائے بھجوا دے۔''

''میں چلی جاؤں... سچ؟'' روزینہ کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''ہاں، ہاں کوثری کو ساتھ بٹھا لینا...... میں بس پہنچتا ہوں......'' چودھری نے فون بند کر دیا۔

روزینہ نے حلیہ درست کیا۔ لپ اسٹک لگائی،

دوپٹا سر پر لیا۔ اس نے بلیک اینڈ وائٹ کا مبی نیشن کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہر سوٹ کی میچنگ جیولری وہ معمول میں پہنتی تھی۔ اور ہر رنگ میں کھل اٹھتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے کوثری، بیگم صاحبہ کے آنے کی اطلاع دے آئی۔

ذاکر ہمیش ہلکی سیاہ داڑھی، کانوں کے نیچے آتے لمبے بال، چمکتی سیاہ آنکھیں اور دھیمی مسکراہٹ والا بااعتماد شخص تھا۔ اسے خاتون خانہ کی آمد کی اطلاع سن کر بالوں پر ہاتھ پھیرنے، لباس کی شکنیں دور کرنے یا بیٹھنے کا زاویہ تبدیل کرنے کی کوئی گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ احتراماً اٹھا اور سلام میں پہل کی۔

''وعلیکم السلام...... بیٹھیے بھائی...... آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔'' وہ جملے سوچ کر گئی تھی۔

''آپ تشریف رکھیے میڈم......'' (یہ کیا، بھابی نہیں کہا میں کوئی اسکول کی مسٹریس ہوں)

''جی...... !'' وہ پرلے صوفے پر سمٹ رہی۔ کوثری اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''ہمارا ننھا پرنس کہاں ہے؟'' مسکرا کر پوچھا۔

''یہ اس کے لیے تحفے ہیں......'' ڈبوں اور شاپروں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

''صاحب جی...... ننھا سو رہا ہے۔'' کوثری نے جواب دیا۔

''آپ نے اتنا تکلف کیا......''

''تکلف......'' یہاں اس نے نظریں اٹھا کر روزینہ کو دیکھا اور جیسے بولنا بھول گیا...... پلکیں جھپکانا بھول گیا...... ''ماشاء اللہ......'' ہی کہا۔

''اللہ نے چودھری خیر دین کے نام میں خیر رکھی ہے...... بچے کا کیا نام رکھا ہے؟''

''شہزاد......'' روزینہ کی مسکراہٹ اسے گلگلوں کر دیتی تھی۔

''ایک گلاس ٹھنڈا پانی مل سکتا ہے؟''

''ابھی لاتی ہوں......'' کوثری بجلی کی طرح اٹھی۔

''آپ گفتگو بہت خوب کرتی ہیں......'' حالانکہ ایسی کوئی گفتگو ہوئی ہی نہیں تھی۔

''نہیں تو......''

''کیا تعلیم ہے آپ کی......''

''بس میٹرک کیا ہے۔''

''اب اتنی سی عمر میں اتنا ہی ہوسکتا ہے۔'' وہ آنکھوں میں رس گھول کر مسکرایا۔ ''پہلو نے حور والی مثل تو نہیں کہوں گا مگر...... بانصیب بندہ ہے۔'' کوثری کے پانی لانے تک آنکھیں اور زبان تحسین کا ہر ممکن گلاب پیش کر چکی تھیں۔ کوثری کے آتے وہ چائے کا کہہ کر اٹھ گئی۔

''اُف اللہ...... یہ تھا وہ انٹرنیشنل بندہ...... چودھری صاحب سے تو خاصا کم عمر ہے...... ہائے اللہ مجھے کتنی شرم آرہی تھی۔'' وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر حیران ہوگئی۔ اس قدر سرخ ہو رہی تھی۔ ''چودھری صاحب کا انٹرنیشنل بندہ میرے آگے ڈھیر ہوگیا۔'' یہ تفاخر سینے میں سماتا نہ تھا۔

ایک طرف خود پر ناز افزوں ہوتا تھا دوسری طرف ذاکر ہمیش کا چودھری سے شعوری، لاشعوری تقابل ہونے لگا۔ ''چودھری کے بال چھدرے، گنجے اور سفید ہیں، داڑھی رکھے تو ساری سفید ہے مونچھوں میں برائے نام کالے بال ہیں، آنکھیں موندی، موندی رہتی ہیں، توند نکل آئی ہے، اپنا خیال نہیں رکھتا مگر کیا خیال رکھے، عمر کا تقاضا ہے، مرد کے بڑھے ہوئے بال شاعرانہ لگتے ہیں، آنکھیں بڑی ہیں دیکھتا کیسے آنکھ بھر کے ہے...... اُف تو بہ نام سن کے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ خیر دین تو کو چوانوں جیسا نام ہے۔'' اسی اثنا میں چودھری گھر آ گیا۔ ڈرائنگ روم سے پُرجوش قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ بہت دیر بعد اسے رخصت کر کے وہ بیڈ روم میں آیا۔ روزینہ بیٹے سے کھیل رہی تھی۔

''میں تو سمجھا تم سو گئی ہو گی۔'' رات کے دس بج رہے تھے۔

''اسے نیند آرہی ہے نہ مجھے......''

''کوثری کہاں ہے؟''

''وہ نماز پڑھ رہی ہے۔''

''کھانا کھالیا......؟''

''جی...... جب آپ کو بھجوا دیا تو پھر میں کیا انتظار کرتی۔''

''میں نے سوچا تمہیں بھی کھانے کی میز پر بلالوں...... پھر سوچا شرماؤ گی۔''

''اور نہیں تو کیا...... اچھا کیا مجھے نہیں بلوایا۔''

''مبارک باد دے رہا تھا شادی کی......'' چودھری نے بڑے، بڑے نوٹ اس کے سامنے ڈالتے ہوئے بتایا۔

''اتنے پیسے؟ وہ تحفے بھی تو لایا تھا۔''

''بس ایسا ہی ہے میرا یار...... دل کا کھلا......''

''آپ سے کافی چھوٹا لگتا ہے۔''

''ابھی تو کہہ رہا تھا بھابی کے لیے تحفہ نہیں لایا...... اگلی بار سہی......''

''کب آئے گا؟'' بے ساختہ منہ سے نکلا۔

''آئے گا، ابھی اِدھر ہی ہے...... ہوٹل شوٹل میں ڈنر کرادیں گے تم بھی چلنا۔''

''میں کیوں؟''

''میری پیاری جان...... تو پروین اختر نہیں ہے، تجھے میں ہائی سوسائٹی میں ساتھ رکھنا چاہتا ہوں...... پروین اختر سے یاد آیا بڑا اکھڑاگ کیا اس نے......''

''کیا ہوا......؟''

''شہزاد، کوثری کو دے آؤ...... پھر حال سناتا ہوں۔'' روزینہ، شہزاد کو دے کر واپس آئی تو خیر دین نے بتانا شروع کیا۔'' اصل میں پروین کو نکاح نامے میں زمین لکھنے پر شروع سے غصہ تھا۔ اکبر، اصغر ماں کے ساتھ کاندھا ملا کے کھڑے ہو جاتے ہیں، میں نے سمجھایا زمین روزینہ نے اٹھا کے پرس میں نہیں ڈالی۔ جہاں تھی وہی پڑی ہے، کھاتا امیر دین کا اور میرا مشترکہ ہے...... امیر دین کے تین پتر...... میرے تین...... تیسرے اس شہزادے کا نام لوں تو انہیں آگ لگ جاتی ہے۔ بھٹیارن کا بیٹا...... وہ کہاں کا وارث......''

''بھٹیارن کا بیٹا ہے یا چمارن کا...... اپنے باپ کا وارث ہے......'' وہ رونے لگی چودھری نے سینے سے لگا کر دلا سا دیا۔

''روزی، جب تک میں زندہ ہوں تجھے گرم ہوا بھی نہ لگنے دوں گا۔ تو پریشان نہ ہو...... یہ منہ زبانی بکواس کرتی رہتی ہے اور کیا کرسکتی ہے۔ اس عمر میں بچوں کی ماں ہے چھوڑ بھی نہیں سکتا۔'' وہ تسلی دیتا رہا۔

چودھری امیر دین سمجھدار بندہ تھا وہ اپنے بیٹوں اور خیر دین کے بیٹوں کے احتجاج یا زمین کے بٹوارے کی باتوں پر خاموش رہتا تھا۔

چند دن بعد ذاکر ہمیش کا فون آیا اس کا کہنا تھا کہ وہ کل ڈیرا اسماعیل خان جارہا ہے، چودھری نے اسے ڈنر پر مدعو کر ڈالا۔

''چودھری جی...... مجھے آپ نہ لے جائیں...... میں تو آپ کے حکم پر تیار ہو جاؤں گی مگر لوگ باتیں کریں گے۔''

''لوگاں کی باتوں سے میں نہیں ڈرتا...... ڈرتا ہوتا تو تجھ سے شادی نہ کرتا...... تمہارا خاوند تمہارے ساتھ ہے، تم کیوں ڈرتی ہو......''

''میں شہزاد کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ کوثری کو بھی لے لیتے ہیں۔''

''چلو جیسے میری ملکہ کی مرضی...... اچھا سا تیار ہو جانا۔''

اچھا سا تیار ہونا تو اب اسے خوب آتا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی قیمتی جھلملاتی ساڑی، تنگ چولی، صراحی دار گردن میں سونے کا گلوبند اور لمبی سی مالا...... گھنے بالوں کا اونچا جوڑا، وہ تو اتنی چمک دمک رہی تھی کہ کوثری بے ساختہ نظر اتارنے لگی۔ چودھری اسے دیکھ، دیکھ کر پھولے نہ سماتا تھا۔

ذاکر ہمیشہ بھی غیر معمولی توجہ سے تیار دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بہت تیز مردانہ خوشبو لگا رکھی تھی۔ ہوٹل میں روزینہ کے داخل ہوتے ہی لوگوں کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔ عورتوں کا نکلنا ہی ان دنوں محال ہوتا تھا اور وہ بھی اتنی بنی سنوری عورت...... ذاکر ہمیش کے ساتھ سب ان کو کپل سمجھ رہے تھے۔ بیرا ان دونوں کو خصوصی عزت دیتا ہوا فیملی کیبن تک لایا۔

کوثری بچے کو پرام میں لیے الگ بیٹھی تھی۔ گفتگو اور لفاظی میں ذاکر چھا چکا تھا۔ چودھری اور وہ زرعی موضوع پر بول رہے تھے۔ وہ ہر کسی سے اس کے مائنڈ

سیٹ کے مطابق بات کرنے کا ہنر جانتا تھا، درمیان میں روزینہ سے بھی پوچھ لیتا۔
''کیا اچھا پکاتی ہیں؟''
''کیا پسند ہے؟''
کوثری مسکراتی اور نثار ہوتی نگاہوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھتی رہی۔
ذاکر اپنے سوالات میں مزاح کا تڑکا لگا کر کبھی بے تکلف تو کبھی باتکلف مکالمہ کرتا رہا۔
روزینہ نے ایسا فلمی ماحول کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ وہ ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ دید کا مرکز تھی۔ چودھری واش روم تک گیا تو ذاکر نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر رازدارانہ انداز میں روزینہ کی جانب کھسکایا۔
''آج کل اس نمبر پر ہوں، جب مناسب وقت ہو تو یاد کر لیجیے گا۔ رکھ لیں۔'' پھر دونوں نے کوثری کی جانب دیکھا وہ باؤل میں سے ٹرائفل نکالنے میں لگی ہوئی تھی۔ روزینہ نے مسکراتے ہوئے کارڈ پرس میں ڈال لیا۔
خفیف، لطیف بھید بھرے تعلق کا آغاز ہو گیا۔ وہ انکار کر سکتی تھی مگر نفس نے بے مروتی کی دلیل دی اور اس نے اخلاقی تقاضے کی آڑ لی۔
بل ادا کرنے پر دونوں مردوں میں تکرار ہونے لگی۔
''چودھری صاحب کمال کرتے ہو، میرا کوئی گھر بار نہیں تو مطلب میرا فرض نہیں بنتا۔''
''ذاکر یار...... میں نے تجھے کتنی بار کہا ہے کہ میرے غریب خانے کو اپنا گھر سمجھو...... تمہیں الگ دو کمرے، ایک نوکر دے دوں گا...... اور بولو......؟''
''بے شک، بے شک محبت ہے آپ کی......'' کن انکھیوں سے روزینہ کو دیکھا۔
''ڈنر تو ہماری طرف سے تھا......'' روزینہ نے مداخلت کی...... مسکرا کر تائید کی۔
''یہ آپ کی طرف تب ہو گا جب آپ پکا کر کھلائیں گی......'' پھر چودھری سے مخاطب ہوا۔
''یار چودھری...... جو کوئٹہ سے اخروٹ، خوبانی کے پودے لایا تھا وہ کیسے ہیں؟''
''نہیں، وہ اچھی طرح لگ نہیں پائے یہاں، آب و ہوا کا فرق ہوتا ہے۔''
''آڑو تو لگ گئے تھے......''
''ہاں البتہ آڑو لگ جاتا ہے۔''
''بھابی ہماری باتوں سے بور ہو رہی ہیں۔''
''آپ اپنی مسز کو لائیے گا کبھی......'' اس طرف وہی ایک ذومعنی مسکراہٹ وقت کافی ہو چکا تھا۔ چودھری نے بل ادا کر کے اجازت لی۔
گھر پہنچ کر روزینہ نے ذاکر کا کارڈ الماری میں چھپا دیا۔ دوسرے دن ذاکر کا فون آیا، چودھری نے سنا، جانے کیوں روزینہ کو ایسا لگا کہ فون اس کے لیے آیا ہے، تیسرے دن پھر فون آ گیا۔ چودھری نے وصول کیا...... پھر فون نہیں آیا۔ دو دن گزر گئے۔ چودھری مصروفیت میں گھر سے نکلا...... وہ بارہا ٹیلی فون کی طرف بڑھی مگر جھجک غالب آئی۔ اگلے دن چودھری نے کچہری اور ڈی سی آفس جانا تھا۔
''مجھے کافی ٹائم لگے گا، پریشان نہ ہونا۔'' کہہ کر گیا۔
وہ تو چلا گیا۔ روزینہ کو عجب سی بے چینی لگ گئی۔
''آج موقع ہے۔ بات کرنے میں کیا حرج ہے...... جاہل لگی ہوں گی کہ بات ہی نہیں کی......'' وہ بلاسبب الماری کا سامان نکال اور رکھ رہی تھی۔ خود کو مصروف کیا ہوا تھا۔ پھر سوچا بہت دن ہو گئے اماں کی طرف نہیں گئی۔ یہ سوچ کر کچھ پھل، فروٹ، بیکری کی اشیا الگ کرنے لگی۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دل زور سے دھڑکا...... فون اٹھایا وہی تھا۔
''ہیلو......!''
''شکر خدایا...... پہلے سجدۂ شکر ادا کروں...... کہ بات کروں......''
''آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں۔''
''آپ کہہ سکتی ہیں...... میرا تو کھانا پینا چھوٹ گیا ہے۔''
''خیریت ہے؟''
''چودھری کہاں ہے؟''
''دفتروں کے کام سے گئے ہیں...... ٹائم لگے گا......''
''آج تو شکر ہی شکر واجب ہو گئے۔'' وہ چپ رہی۔

''میں خود کو بجھا بہلا کے ہار گیا۔ مجھے تو مسمرائزڈ کر دیا آپ نے۔''

''جی......؟''

''مجھے ڈی آئی خان جانا تھا مگر پاؤں یہ زمین ہی نہیں چھوڑتے۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی ہے۔''

''دنیا کا حسن دیکھا ہے...... بہت حسینائیں دیکھی ہیں...... مگر سنگ مرمر کی مورتی میں جان اب دیکھی...... یہ مہتاب سا چہرہ کہاں تھا اب تک......؟ آنکھیں ساون روتی ہیں، چودھری سے پہلے مجھے تم کیوں نہ دکھائی دے گئیں......'' آپ سے تم اور کھلا اظہار۔

''کیا مطلب؟''

''چودھری نے سونے میں تولا ہوگا...... میں ہیروں میں تولتا......''

''آپ شادی شدہ ہیں۔''

''تو کیا ہوا...... چودھری شادی شدہ نہیں تھا؟''

''آپ یہ باتیں کیوں کر رہے ہیں؟''

''دل نہیں مانتا......'' وہ آہ بھر کر بولا۔

''آپ کب تک جا رہے ہیں؟''

''جا نہیں رہا، آ رہا ہوں......''

''کہاں......؟''

''کیا میں آ جاؤں......؟''

''کیسی بہکی، بہکی باتیں کر رہے ہیں آپ...... میرا گھر بار ہے، کوثری ہے، میں بچے کی ماں ہوں، چوکیدار ہوتا ہے...... چودھری صاحب بے خبر نہیں رہیں گے......'' اس نے اظہار، اقرار، خدشات کا ملغوبہ کہہ ڈالا۔

''کسی طرح پلان کرو...... پلیز مجھ پر رحم کرو۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی...... میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں...... اپنے دل میں تمہاری تصویر محفوظ کرنا چاہتا ہوں......'' وہ خاموش رہی۔

''بولو...... کیا سوچ رہی ہو......؟''

''کچھ نہیں......''

''مجھے سزا تجویز کرنا چاہتی ہو...... کر دو، چودھری کو بتا دو گی...... بتا دو۔ مجھے ہر سزا قبول ہے، روزینہ، زندگی ایک بار ملتی ہے، کیا تم اس عمر رسیدہ بندے کے ساتھ خوش ہو؟''

''اس نے مجھے دنیا کی ہر آسائش دے رکھی ہے۔''

''آسائش ملنے کے باوجود جیل، جیل ہی رہتی ہے۔''

''میں ایک غریب گھر کی لڑکی تھی۔''

''مجھے پتا ہوتا یہ غریب لڑکی اتنی سی باتوں پر راضی ہے...... شہر خرید دیتا تمہیں...... بڑی معمولی قیمت لگائی تم نے اپنی......'' یہ ہوتا ہے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچانا۔

''بولو...... کب آؤں......؟ تمہاری خاطر انتظار کر سکتا ہوں......''

''پتا نہیں......''

مختصر مختصر

☆ میری بیوی سے بڑا جادوگر دنیا میں کوئی نہیں ہوا، اس کی طرح روپے غائب کرنا کوئی نہیں جانتا۔

☆ آخر تم نے اپنی بہن کو کیسے کہہ دیا کہ وہ احمق ہے، اچھے لڑکے بنو اور اس سے معذرت کرو۔
پیاری بہن! مجھے افسوس ہے کہ تم احمق ہو۔

☆ ایسی کون سی ٹیبل (میز) ہے جس کی ٹانگیں نہیں ہوتیں۔
ٹائم ٹیبل......!

☆ کل میری بیوی کہیں غائب ہوگئی۔
پھر کیا تم نے اسے تلاش کیا؟
میں نے ارادہ کیا تھا پھر اپنا ارادہ منسوخ کر دیا۔

☆ پندرہ برس تک تصنیف و تالیف کرنے کے بعد مجھ پر ظاہر ہوا کہ مجھ میں تو لکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے لیکن اب میں مجبور تھا کیونکہ میں مشہور ہو چکا تھا۔

مرسلہ: انیقہ انا، چکوال

"کہوتو کوئی کام نکال دوں چودھری کے لیے......"

"اچھا نہیں لگتا......"

"مجھے کچھ ہو گیا تو اچھا لگے گا تمہیں......؟"

"اچھا...... دیکھوں گی......"

"بات سنو ڈیئر...... ہم روز، روز بات کرنے کا موقع نہیں پا سکتے۔ آج فائنل کر لیتے ہیں...... چودھری کو میں بزی کر دوں گا...... چوکیدار کو ایسی مٹھائی کھلاؤں گا، کھا کے سو جائے گا......"

روزینہ کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں...... دل کی دھڑکن کانوں میں دھمال ڈال رہی تھی۔ سانس پھولنے لگی۔

"ہمت کرو...... پریوں کی شہزادی...... صرف ایک بار......"

"ہوں......"

"یہ ملازمہ بچے کو لے کر کہیں باہر نہیں جاتی؟"

"ایک بار اپنے گھر لے گئی تھی...... میں ناراض ہوئی تھی...... پھر نہیں لے گئی۔"

"اس کا گھر کہاں ہے؟"

"اُدھر کمہار نگر میں ہے...... پیدل آدھے گھنٹے کا ہے۔"

"تو اسے دے دو اجازت، دو گھنٹے گھما آئے......"

"آپ فون پر بات کر لیا کریں......"

"میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں...... سامنے بٹھا کر پوجا کرنا چاہتا ہوں...... دیوی بنانا چاہتا ہوں...... میں چلا جاؤں گا...... دور چلا جاؤں گا...... اپنا گھر آباد رکھنا۔"

وہ چپ رہی۔

"میں شریف بندہ ہوں، مجھ سے نہیں ڈرو......"

"جی...... وہ تو ٹھیک ہے۔"

"پھر کیا ہے جو ٹھیک نہیں ہے۔"

"اچھا...... میں کوشش کرتی ہوں......"

"بات سنو...... غور سے سنو...... جس دن چودھری کنو والے باغ میں جائے تو سمجھ لینا میں بھیج رہا ہوں...... یہ اشارہ ہے...... اس مائی کو منا دے کر نکال دینا۔ او کے...... پکا وعدہ......"

مگر جواب سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

فون کا چونگا ہاتھ میں لیے تا دیر وہ بے تاب دھڑکنیں سنبھالتی رہی۔ ریسیور رکھا۔ اندر آئی تو یاد آیا اماں کی طرف جانا ہے مگر اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

چودھری گھر آیا تو روزینہ کو اندر ہی اندر ندامت کا احساس رہا۔ اس کی روزمرہ سے زیادہ خدمت کرتی رہی مگر ساتھ بیٹھنے سے گھبراہٹ ہوتی۔ چودھری اکثر باہر سے آ کر کہتا میں تھک گیا ہوں، اس کی ٹانگیں دباتے ہوئے اسے لگا وہ بہت بوڑھا ہو رہا ہے۔ سر کے بال بکثرت سفید ہیں۔ رخسار لٹک گئے ہیں، دیکھتے ہی پتا چلتا ہے کہ یہ بندہ جوان اولاد کا باپ ہے۔

کھانے پر چودھری نے کہا۔

"نمک ذرا کم ڈالا کرو...... زیادہ نمک ٹھیک نہیں ہوتا...... بی پی رہنے لگا ہے مجھے۔"

"عمر کا تقاضا ہے......" منہ سے نکلا۔

"تو ساتھ ہوتی ہے تو جوان ہو جاتا ہوں......" وہ مسکرایا۔ "چلو آج سینما چلتے ہیں۔" چودھری نے محبت بھری پیشکش کی۔

"وحید مراد کی فلم ہو گی تو جاؤں گی۔"

"شبنم کی ہو گی تو میں جاؤں گا......" اس نے جوابی وار کیا۔

"وہ سانولی کیا چیز ہے آپ کی شبنم تو سامنے بیٹھی ہے۔" وہ کہہ نہ سکا تمہارا وحید مراد بھی سامنے بیٹھا ہے۔ کھسیا کر گنجے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

روزینہ تو سینما بھی پوری تیاری سے جاتی تھی۔ اس کے لیے کیبن بک ہوتا تھا۔ بچہ بھی ہوتا تو بچے کے سامان کا چھوٹا بیگ بھر جاتا۔ اگر اندھیرے ماحول سے بچہ روتا تو اسے باہر کوثری ٹہلا لاتی۔ روزینہ صاحبہ تو ریشمی ملبوس، جیولری سے لدی پھندی، ناک میں ہیرے کی لونگ شعاعیں مارتی، ان دنوں بندیا کا رواج تھا۔ ہر سوٹ کی ہم رنگ بندیا پیشانی پر جھلملاتی رہتی۔ اس کے آگے تو اسکرین پر جلوہ گر ہیروئن کو مات تھی۔

سینما سے نکلے تو کھانے پینے کا کافی سامان بچ رہا تھا۔ روزینہ نے تجویز دی کہ وہ اماں کو سلام کرتے جاتے ہیں۔"

''اس وقت......؟رات کے دس بج رہے ہیں۔''
''اماں کو کون سی پکی نیند آتی ہے، ایک دستک پر جاگ جاتی ہیں۔''
''دیکھ لو......تنگ نہ ہوں......''
''بلکہ مجھے دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔'' گلیوں میں اندھیرا تھا۔ تنور والا چھپرا گرا کر اماں نے جگہ ہموار کرادی تھی۔ دروازے کے ساتھ سبز پتوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ دیوار پر سفیدی بھی ہو گئی تھی۔ مکان کی بیرونی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ دروازے پر دستک اور گاڑی کے ہارن نے اماں نصیبو کو جگانے میں دیر نہ کی۔ کمرے میں کمبل اوڑھ کے سوتی تھی اب اس کے پاس کاشی بھی نہیں ہوتا تھا پھر بھی اکیلی نہیں ڈرتی تھی۔ دستک ہمیشہ اس کے گھر خیر کی خبر لاتی تھی۔

نصیبو شال اوڑھتی صحن میں آئی۔ دروازے پر پوچھ تاچھ کی ضرورت نہ پڑی۔ روزینہ کی آواز آرہی تھی مگر یہ سوچا ''الٰہی خیر......اس وقت روزینہ آئی ہے۔'' لپک کر دروازہ کھولا۔

''شالا خیر ہووے......میری دھی آئی ہے......خیر ہوسی۔''
''جی......جی اماں......خیر ہے......اماں السلام علیکم۔'' روزینہ کی مسکراہٹ نے سکون بخشا۔
''خالہ......سلام......ہم سینما سے آرہے ہیں۔ تری دھی کا حکم تھا اماں کا گھر قریب ہے......سلام کرتے جائیں......''
''جیوندے رہو......خوش رہو......''
''چودھری صاحب......آپ گاڑی میں بیٹھیں، میں ابھی اندر سے پانچ منٹ میں آتی ہوں......''

ماں، بیٹی گھر میں داخل ہوئیں۔ نصیبو نے اسے دیکھتے ہوئے غصہ کیا۔
''اری تو پاگل ہے، جھلی ہے، اتنا زیور پہن کے آدھی رات کو گھوم رہی ہے......سمجھ کیا کر بیٹی......سینما میں زیور پہن کر نہ جایا کرو......''
''اچھا اماں پیاری......نہیں پہنوں گی......یہ رکھو، سنبھالو......'' وہ بھرا ہوا شاپر پکڑانے کے بعد ہزار، ہزار کے نوٹ ماں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔
''اتنے سارے نوٹ......چودھری تری ماں کو کھلانے کا ذمے دار تو نہیں ہے......کیا سوچتا ہوگا......''
''اماں......وہ کچھ نہیں سوچتا......اسے پتا نہیں ہوتا......وہ مجھے دیتا رہتا ہے، میں بچا لیتی ہوں......اچھا یہ چیزیں صبح گرم کر کے کھا لینا......اب چلتی ہوں، کسی دن پھر تسلی سے آؤں گی۔''
''روزینہ بیٹی......چودھری اچھا بندہ ہے، تیرا بہت خیال رکھتا ہے تو بھی اس کا خیال رکھا کر......اللہ جوڑی سلامت رکھے، نظرِ بد سے بچائے۔'' اماں دروازے تک دعائیں دیتی ہوئی آئی۔
''اچھا اماں، اللہ حافظ......میں چلتی ہوں......''
''دروازہ بند کر لو خالہ......رات بہت ہو رہی ہے۔'' چودھری نے شیشہ چڑھایا اور گاڑی چل دی۔

روزینہ نہا کر نکلی تو ہیٹر آن کرنے لگی۔ کوثری کو آواز دے کر کہا۔ ''شہزاد کو اسی کمرے میں لے بیٹھو......''
''بیگم صاحبہ ابھی وہ چڑیوں سے کھیل رہا ہے۔'' وہ بولی۔ چڑیوں کا پنجرہ نیا خریدا گیا تھا۔
''چودھری صاحب کہاں ہیں؟'' وہ لاؤنج میں جھانکی۔
''لو جی میں حاضر ہو گیا ہوں......'' اندر آتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ہیٹر آن کر لیا......ابھی تو دسمبر شروع ہوا ہے۔''
''آپ جوان بندے ہیں مجھے ٹھنڈ لگتی ہے......گیزر چلوائیں......''
''ابھی چلوا کے جاتا ہوں......''
''کہاں جا رہے ہیں؟''
''کنو کے باغ میں......''
''یہ اچانک کیسے خیال آگیا؟''
''ذاکر کنو، سنگترے، مالٹے کے پودوں کا لوڈر بھروا کے پہنچ رہا ہے اُدھر......میں شام تک آ جاؤں گا۔''
''کنو کا باغ......'' روزینہ کا دل زور سے دھڑکا......''سمجھ لینا میں بھیج رہا ہوں......مگر وہ خود بھی اِدھر پہنچ رہا ہے......'' روزینہ ادھیڑ بن میں لگ گئی۔

چودھری نے جانے سے پہلے کمرے میں جھانکا۔

''خیر ہے روزی...... جب سے ویسے ہی بیٹھی ہے کس سوچ میں پڑ گئی ہے۔ سردی لگ رہی ہے تو چا بنوا لے......''

''نہیں...... سردی نہیں لگ رہی...... وہ...... آپ اکیلے جارہے ہیں؟''

''میں کوئی منا کا کا ہوں کہ اکیلا نہیں جا سکتا۔ اچھا رب راکھا۔ آجاؤں گا جلدی......'' حالانکہ اس نے نہیں کہا تھا(جلدی آنا......) روزینہ اٹھ کھڑی ہوئی......

''اسے مجھے فون کرنا چاہیے تھا...... اس نے کہا تھا کوثری کو بچہ دے کر نکال دینا...... لیکن کوثری کو کیوں نکالوں......؟ اگر وہ موجود ہے تو کیا قباحت ہے، شاید یہ کہ کوثری، چودھری صاحب کو بتا سکتی ہے۔ چودھری سوچے گا جب ذاکر مجھے باغ میں بلا رہا ہے تو خود اِدھر کیوں آیا......''

ان سوچوں کے ساتھ وہ ڈرائر سے بال خشک کرتی جارہی تھی۔ مسکارا اور کاجل لگا رہی تھی۔ ہیر اسپرے اور پرفیوم چھڑک رہی تھی۔ اس کا ذہن دو متوازی راستوں پر چل رہا تھا۔ اگرچہ وہ خود کو تسلی دے رہی تھی کہ ''میں اس کے آنے کی پروا نہیں کرتی' آگیا تو آگیا نہ آیا تو نہ آیا۔'' دوسری طرف تیاری پر خصوصی توجہ تعریف کا نشہ تھا۔ ہیٹر آف کر کے وہ لاؤنج میں آئی۔

''کوثری...... ترے گھر میں نیم کا درخت ہے......؟'' وہ جانتی تھی کہ اس کے گھر نیم کا درخت ہے۔

''ہاں جی بیگم جی......''

''آج مجھے نیم کی ٹہنیاں لادے...... لان کے کپڑوں میں رکھتی ہوں......''

''آج......؟ ابھی جاؤں......''

''ٹھہر گڑ والے چاولوں کا ڈونگا رکھا ہے وہ لیتی جانا...... اور چاولوں کا آٹا اپنی ساس سے لے آنا اگر تازہ آیا ہو......''

''شہزاد کو لے جاتی ہوں...... یہ بہت خوش ہوتا ہے بکری کے بچے دیکھتا ہے، اسے آپ ٹوپی، جرابیں پہنا دیں۔''

''چلو لے جاؤ مگر خیال رکھنا باہر میدان میں نہ بھیجنا...... دو گھنٹے کے اندر واپس آجانا۔''

''اچھا جی......'' کوثری چیزیں اٹھاتی شہزاد کو لے کر خوشی، خوشی روانہ ہوگئی۔ رکشا چوکیدار نے لادیا۔

روزینہ ٹہلتی ہوئی گیٹ تک جھانکی چوکیدار حقہ لیے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ ''کیا وہ اس کو مٹھائی کھلائے گا؟ پھر یہ بھی جاگ کر بتا دے گا کہ ذاکر آیا تھا...... پتا نہیں کیا چکر چلائے گا......'' وہ کمرے میں آگئی۔ ٹی وی آن کر دیا...... سماعتیں فون اور گیٹ کی گھنٹی پر مرکوز رہیں۔ اچانک لگا کوئی مردانہ آواز آئی ہے' دیکھا تو وہ بیڈ روم کے دروازے پر کھڑا تھا۔

''السلام علیکم......''

وہ ڈر کر اچھل پڑی...... کھڑی ہوتے، ہوتے... لڑکھڑا گئی۔

''اوخیر...... خیر......'' سنبھالنے کا زریں موقع مل گیا۔ وہ اس کی بانہوں میں تھی۔ تکلفات کی زنجیریں پل بھر میں ٹوٹ گئیں۔

''چھوڑیں......'' وہ گھبرا کر الگ ہوگئی......

''چوکیدار نے آپ کو نہیں دیکھا۔''

''بالکل دیکھا......''

''اندر کیسے آگئے......؟''

''میں بتاتا ہوں...... میں نے گیٹ کے باہر گاڑی روکی...... چوکیدار کو بلایا۔ اسے مٹھائی کا لفافہ پکڑایا...... کہا...... ''چاچا جی گرما گرم جلیبیاں ہیں کھالو......'' اسے بتایا کہ چودھری صاحب کی طرف جارہا ہوں...... مجھے پکا یقین تھا وہ جلیبیاں ابھی کھائے گا' میں لفافہ دے کر بظاہر چلا گیا...... دس منٹ بعد جھانکا...... نہ اسے کھلے گیٹ کی پروا نہ دنیا کی سدھ بدھ...... وہ ٹانگیں لٹکائے خراٹے لے رہا تھا۔ گھنٹے دو گھنٹے سے پہلے تو نہیں جاگتا۔''

''اور اگر......''

''اتنا بیوقوف نہیں ہوں......اسے کچھ نہیں ہوگا...... اب سارے خدشات مٹا کر میرے سامنے بیٹھو میری جان......'' اسے شانے سے پکڑ کر سامنے بٹھا دیا۔

''او شہزادی...... تو اتنی خوب صورت ہے اتنی خوب صورت ہے، کوئی مونالیزا، ریکھا، سری دیوی، تیرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مکھن ملائی کی گڑیا ہے۔'' ایسی چھے دار باتیں، مبالغہ آرائیاں انتہا کی تعریفیں، تنہائی، اس

کے بعد جو ہونا تھا وہی ہوا۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔ وہ مسلسل ''بے جوڑ، بچاری، بدقسمت، مظلوم'' سنتی اور بنتی چلی گئی۔

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''جب، جب موقع ملا ہم ملا کریں گے...... موقع خود نکالنا پڑتا ہے۔ بس ڈرنا نہیں ہے...... اگلی بار ماں کے گھر جانے کا کہہ کر نکل آنا...... میں لے جاؤں گا محفوظ جگہ......''

وہ سبق سکھا کر اس کی دنیا بدل کر رخصت ہوا۔

مغرب تک چودھری گھر آ گیا۔

''آپ نے کتنی دیر لگا دی، میں بور ہو گئی تھی۔'' انسان کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔

''مجھے تو تم پہلے سے زیادہ مستانی دکھائی دے رہی ہو...... اچھا حال بتاتا ہوں آج کا۔'' وہ اس کی دور بنی پر دل ہی دل میں ہنسی۔

''ماشاء اللہ باغ بھر گیا ہے نئے پودوں سے...... ذاکر پہنچا تو دیر سے مگر آتے ساتھ رونق لگا دی۔ جلیبیوں کے بھرے لفافے مزدوروں میں بانٹتا رہا۔ بستی والے بھی لے گئے۔ دعا کرائی اس نے...... اللہ کرے گا سارے بوٹے لگ جائیں گے۔''

''اب بھلا چوکیدار کہتا بھی رہے کہ جلیبیاں کھاتے ہی نیند کیوں آ گئی...... اس کی اس بات پر کس نے یقین کرنا تھا۔ واقعی وہ ایول جینئس تھا۔''

جوں، جوں وقت گزرا۔ چودھری اپنی پہلی بیوی اور بڑی اولاد کی طرف زیادہ جانے لگا کیونکہ زمینوں کو لمبے عرصے نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ نکلنے لگا تھا کہ اس کا بھائی امیر دین زیادہ مفاد اٹھانے لگا۔ مزارعے اس کو بھی مختارِ کل سمجھنے لگے۔ وہ ان کے ہر دکھ سکھ میں حاضر ہوتا تھا۔ ان کی فریاد پر پہنچ جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے جوان بیٹے اسے اپنے چونچلوں میں لگا رہنے والا باپ جان کر نالاں ہونے لگے۔ اور وہ اس عمر میں بھی اپنے مضبوط آسرے نہیں ختم کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی مجبوریاں روزینہ کو پاس بٹھا کر سمجھائیں۔ روزینہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے جواب دیا۔

''چودھری جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں...... میں اتنی نادان نہیں کہ زندگی کے حقائق نہ سمجھ سکوں...... آپ کی مجبوری اور میں ساتھ نہ دوں...... مجھے کوئی گلہ شکوہ نہیں آپ بے شک روزانہ جائیں...... اپنا کام دیکھیں...... بس یہ کیا کریں رات تک آ جایا کریں۔ رات کو اکیلے ڈر لگتا ہے......''

''حیادار، شریف لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں...... میں کوشش کروں گا رات نہیں رہوں...... اگر کوئی زیادہ ضرورت ہوئی تو اِدھر چوکیدار کے پاس اپنا کوئی بھانجا، بھتیجا یا اعتباری بندہ بھیج دوں گا...... تمہارا خیال رہتا ہے مجھے......''

اگرچہ روزینہ اور ذاکر کو ملاقات کے زیادہ مواقع ملنے لگے پھر بھی وہ چوکیدار اور کوثری کی جانب سے ہوشیار رہتے تھے۔ کئی بار تو روزینہ تھوڑی دیر کے لیے اماں کے ہاں جانے کا بہانہ کر کے نکل گئی۔ چوکیدار حیران ہوتا تھوڑی دیر کے لیے جاتی ہے تو بچے اور کوثری کو کیوں نہیں لے جاتی...... وہ دونوں یہی سوچتے کہ غریب ماں کی مدد کے بہانے اکیلی جاتی ہے۔

''یار...... ہوٹلوں میں چھاپے کا ڈر ہوتا ہے، ایسے کب تک چلے گا۔''

''تو...... کیا ہو سکتا ہے؟''

''تجھے نہیں پتا ان کے خفیہ کیمرے لگے ہوتے ہیں...... کاش یہ چودھری مر جائے......''

''یہ ایک ایسا خواب ہے جسے سوچا جا سکتا ہے...... ہو نہیں سکتا......''

''اب ترے بغیر رہا بھی نہیں جاتا......'' وہ اس کی زلفیں سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم واپس چلے جاؤ...... ایک دن تو جاؤ گے۔''

''تم جی لو گی میرے بغیر...... اب نہ تم جی سکتی ہو نہ میں......''

''میں...... دل پر پتھر رکھ لوں گی......'' وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر آنسو بہا رہی تھی۔

''روؤ تو نہیں...... میرا دل تمہارے آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔''

''ذاکر...... میں ہر وقت خوفزدہ رہتی ہوں......''

''سنو...... ایک ہمت کرو گی......'' اس کا چہرہ

ہاتھوں میں لے کر سامنے کیا۔
"کیسی ہمت؟ ہمت ہی تو کر رہی ہوں......"
"میرا ساتھ دوگی؟ ڈرو گی نہیں......"
"ساتھ دے تو رہی ہوں......"
"میری میٹھی شہد کی بوتل...... اس کانٹے کو نکال...... دیکھ میں ترا اور بچے کا پاسپورٹ بنواتا ہوں......ہم تینوں ملک سے باہر نکل جائیں گے۔"
"اور...... تیری بیوی......؟"
"وہ مسئلہ نہیں ہے......مسئلہ سارا اِدھر ہے۔"
"پھر......؟"
"جو تجھے لا دوں...... چودھری کو کھلانا ہے...... بس اتنا سا کام ہے......"
"ہائے اللہ......"
"سوہنی...... یہ کرنا پڑے گا......"
"پولیس پکڑ لے گی۔"
"سوچ سمجھ کر کریں گے۔"
"تو ایسے ہی ملک سے نکل جاتے ہیں۔"
"ایسے تو وہ ڈھونڈ لے گا۔"
"پاسپورٹ کیسے بنتا ہے؟"
"وہ میرا کام ہے......
تم پہلے یہ کام کرو...... پھر سوچتے ہیں......" اس روز روزینہ رکشے سے اتر کر گھر میں داخل ہوئی تو غیر متوقع طور پر چودھری کو موجود پایا۔
"آج آپ جلدی آ گئے......؟" رنگ متغیر ہو گیا بظاہر مسکرا کر بولی۔
"ایسی کیا مصیبت تھی کہ تو شہزاد کو چھوڑ کر اکیلی اماں کے گھر چلی گئی۔ میں آیا تو رو رہا تھا۔" چودھری اس لہجے میں پہلی بار بولا تھا۔
"اماں نے فون کروایا تھا۔ اماں کی طبیعت خراب تھی۔ میں نے سوچا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی تو شہزاد تنگ ہوگا......" برموقع جھوٹ گھڑ لیا گیا۔
"بابا کہہ رہا تھا...... جاتی رہتی ہو اکثر...... یہ کیا طریقہ ہے...... اکیلی دھکے کھاتی رہتی ہو......"
روزینہ نے موٹی، موٹی آنکھوں میں آنسو بھر لیے...... چودھری کا دل پسیج گیا۔
"اچھا چل چھوڑ...... شہزاد کو دیکھ......" وہ کمرے کی طرف بڑھا...... پھر رک کر کہا۔" روٹی شوٹی کھا لے...... آرام کر پھر رات کو اماں کی طرف چکر لگا لیں گے۔"
روزینہ بچے کی طرف بڑھ گئی۔
رات کو روزینہ نے سر میں شدید درد بتایا اور بقول اس کے وہ گولی لے کر سونا چاہتی ہے۔ اماں کی طرف پھر کسی دن جائیں گے۔ اس نے اشارتاً فون پر ذاکر کو کچھ دن کے لیے روک دیا۔ ذاکر نے رابطہ نہ کیا۔ دس دن گزر گئے۔ اس پر بے قراری اور وحشت طاری ہونے لگی...... وہ ہر وقت کھوئی، کھوئی سی رہتی۔ پہلے کی طرح بننے، سنورنے کی پروانہ کرتی۔ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ ٹی وی کی طرف بھی اس کی توجہ کم ہو گئی تھی۔ کوثری نے تو پوچھ ڈالا کہ "دوسری خوشخبری ہے؟"
"نہیں تو...... ابھی تو شہزاد اتنا چھوٹا ہے......" وہ لیٹے، لیٹے بولی۔
"اچھا...... آپ کی طبیعت گری، گری رہتی ہے...... میں سوچا شہزاد کا بھائی آئے گا......" کوثری نے دانت نکالے۔
گیارھویں دن ذاکر کا فون آیا مگر چودھری نے سنا......فون رکھ کر اس نے تعجب کیا۔
"اس دفعہ لمبا ہی رک گیا ہے...... میں تو سمجھا تھا چلا گیا ہوگا......"
"کیا پتا اِدھر کاروبار شفٹ کر رہا ہو......" روزینہ نے شہزاد کا ڈائپر بدلتے ہوئے کہا۔
"اس کا کام کاج سب کچھ باہر ہے...... یہ کاہے کو اِدھر رہے گا۔ چوکیدار بتا رہا تھا کہ کوئی پندرہ دن پہلے آیا تھا...... تم نے بتایا نہیں......"
"مجھے کیا پتا...... باہر سے چلا گیا ہوگا۔"
شہزاد اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ روزینہ اسے چھوڑ کر نکلتی تو روتا اور پیچھے بھاگتا تھا۔ اگرچہ پختہ عمر کوثری اسے پیدائش سے سنبھال رہی تھی دوسری طرف اب کوثری کے بارے میں سننے کو آ رہا تھا کہ وہ کہیں نکاح

کرنے والی ہے۔ وہ اڑتیس سالہ بیوہ تھی۔ اس لیے اس کی دلچسپی شہزاد میں کم ہونے لگی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ذاکر نے فون کر کے حکم دیا کہ وہ دو گھنٹے تک گاڑی لے کر آرہا ہے گاڑی دور روک کر کسی پی سی او سے فون کرے گا اسے باہر آجانا ہے۔ پاسپورٹ آفس میں اس کے دستخط اور فوٹو کی ضرورت ہے۔ شناختی کارڈ ساتھ لائے اور ماں کے گھر کے بہانے سے نکل آئے۔ روزینہ پہلے بھی ذاکر کو بتا چکی تھی کہ ماں کے بہانے سے نکلنا اب ناممکن ہے۔ کوثری صاف کہہ دیتی کہ وہ بچہ لے کر ساتھ چلے گی کیونکہ بچہ اسے تنگ کرتا تھا۔ روزینہ نے یہ حل نکالا کہ وہ بچے کو ساتھ لے کر اماں کی طرف جائے گی۔ کوثری کے ذمے کام لگا دیے۔

فون کی گھنٹی بجی...... وہ ''ہوں، ہاں'' کر کے اندر گئی چادر اوڑھ کر شہزاد کو اٹھا کر چلی گئی۔ کوثری کی نظروں میں پہلی بار شک اترا۔

''فون کس کا تھا؟ فون کے فوراً بعد وہ کیوں چلی گئی؟'' وہ گیٹ تک آئی۔ چوکیدار حقہ گرم کر رہا تھا۔

''بیگم جی نے رکشا منگوایا......؟''

''ہائیں......؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''چلی گئی ہیں؟''

''ہاں چلی گئی ہیں۔''

''رکشا آیا تھا؟''

''نہیں، بولی...... میں پکڑلوں گی سڑک سے......''

''کمال ہے......'' کوثری بڑبڑائی۔

''تو نہیں گئی؟ کہاں بچے کو سنبھالتی پھرے گی وہ......''

''مجھے تو وہ خود ہی نہیں لے گئی۔'' کوثری اندر لوٹ گئی۔

دفتر میں دیر لگ گئی۔ اپنی عدم موجودگی کے جواز کو پکا کرنے کے لیے اس نے ذاکر سے کہا اماں کے ہاں چھوڑ آئے۔ ذاکر نے واضح کیا کہ وہ اماں کی گلی سے دور اتار دے گا۔ جب وہ اسے بڑی گلی پر اتار کر سڑک پر آیا تو ایک کار اس کے برابر سے گزری اس میں چودھری امیر دین تھا۔ چودھری خیر دین کی دوسری شادی سے پہلے اس سے کئی محفلوں میں ملاقات رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بخوبی جانتے تھے۔ گاڑی خیر دین کا بیٹا چلا رہا تھا۔ آپس میں تینوں کی آنکھیں چار ہوئیں بدحواسی میں ذاکر ان دیکھا کر کے گاڑی نکال گیا۔ جہاں اس کا ماتھا ٹھنکا وہاں وہ دونوں بھی حیرت میں پڑ گئے۔ ذاکر یہاں کیا کرنے آیا ہوگا؟ کیا اسے چودھری خیر دین نے کسی کام سے روزینہ کی ماں کے گھر بھیجا؟ یہی سوال خیر دین تک پہنچ گیا۔

شام کو چودھری خیر دین گھر آیا تو چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ اس نے چوکیدار اور کوثری سے بھی پوچھ گچھ کی۔ روزینہ کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

''ذاکر کے ساتھ گاڑی میں تم کیوں گئی تھیں......؟''

روزینہ کا کلیجا اچھل کر حلق میں آیا۔ رنگ اڑ گیا۔ زبان ہکلا گئی مگر جھوٹ گھڑ لیا۔

''ذاکر کہنے کا کیا مطلب......؟ میں رکشا کر کے شہزاد کے ساتھ اماں کی طرف گئی تھی۔ نوکروں کو پتا ہے......''

''تیری ماں اب روز، روز مرنے لگی ہے...... تو مجھے کیوں نہیں کہتی، میرے ساتھ کیوں نہیں چلتی...... کوثری کو کیوں نہیں لے گئی؟ یہ تو بعد کے سوال ہیں، پہلے یہ بتا...... ذاکر ہمیشہ وہاں کیا کر رہا تھا...... بھرا امیر دین اور اکبر نے اپنی آنکھوں سے اسے گاڑی لیے وہیں سے نکلتے دیکھا ہے......''

اب روزینہ نے ایک دم پینترا بدلا اور چمک کر بولی۔

''یہ مترئے (سوتیلے) اس طرح میرے گھر میں آگ بڑھکائیں گے۔ میرے خلاف آپ کے کان بھریں گے۔ میں نے یہ نہ سوچا تھا کہ وہاں آپ کے روز جانے سے وہ آپ پر پورا قبضہ کرنے کے لیے مجھ پر وار کریں گے...... مجھے تو یہ بھی نہیں پتا ذاکر یہاں ہے یا چلا گیا ہے...... یہ بتائیں یہ اس گلی میں کیا کر رہے تھے...... نرا جھوٹ بکتے ہیں...... کوثری کو اس لیے چھوڑ گئی تھی کہ کپڑے دھولے گی، کام نمٹائے گی...... وہاں جا کے یہ ہمارے ساتھ جڑ بیٹھتی ہے، باتوں میں ٹوہ لیتی ہے...... اب مجھے ہر کام کی وضاحتیں دینی ہوں گی......

مشروط وغیر مشروط محبتیں

زندگی میں سب سے زیادہ ظلم ہم ماں، باپ کی طرف سے دی گئی محبتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ساری زندگی وصول کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر بھی نہیں تھکتے۔ بے غرض، بے لوث اور ریا کاری سے پاک محبت صرف ماں، باپ ہی کی ہوتی ہے۔ وہ ہمارا خیال رکھے چلے جاتے ہیں اور ہم بے پروا، وہ فکر کیے جاتے ہیں، وہ ہمارے لیے دعائیں مانگ، مانگ کر گھلے جاتے ہیں اور ہم اپنی موج مستی میں مگن...... کچھ عجیب سی محبت ہوتی ہے ماں، باپ کی اولاد سے۔ چھوٹے سے بیج کی آبیاری کرتے، کرتے اس کا خیال رکھتے، رکھتے جب اس کو تناور درخت کے روپ میں دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان بڑھتے پودوں کا محور ومرکز کوئی اور ہے۔ موبائل، انٹرنیٹ، فیس بک اور دوستی یاری...... یہ کس قدر کم عقلی اور عاقبت نا اندیشی ہے کہ نئی نسل اس وقتی اور غرض مند پیار کے پیچھے لگ کر اس بے لوث محبت کو بھی چھوڑنے کو تیار ہوجاتی ہے اور جب اپنی من مانی کرلیتے ہیں اور نتیجہ صفر...... تو پتا چلتا ہے کہ اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت......

ان محبتوں کے علاوہ کتابوں، رسالوں میں افسانوی طرز کی محبتیں بھی ایک جہان سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہیرو کو ہیروئن سے محبت میں مبتلا دکھانا ہو تو یہ شرطِ اول ہوتی ہے کہ وہ بلا کی خوب صورت ہوتا کہ ہیرو لازماً اس سے محبت کرسکے اگر خوب صورت نہیں تو پھر ذہانت میں آئن اسٹائن اور نیوٹن کو تو ضرور مات دیتی ہو۔ آخر کوئی تو خوبی ایسی ہو جس سے ہیرو، ہیروئن کی طرف کھنچا چلا آئے۔ چلو ذہانت بھی نہیں تو سیرت میں وہ، وہ خوبیاں ہوں کہ خود ہیروئن کو بھی یقین نہ آئے کہ یہ میں ہی ہوں...... دوسری طرف اگر ہیروئن نے ہیرو سے محبت کرنی ہے تو وہ کچھ اور ہو نہ

آپ نے مجھے میری نظروں میں گرادیا۔'' یہ سب کہتے، کہتے وہ رونے لگی۔

''ایسی عادت تو نہیں میرے وڈے بھائی کی...... وہ...... جھوٹ بولے گا۔''

مگر وہ ہچکیاں لے کر روئے گئی تو چودھری نے ہار مانی سوچا بیچاری اتنی ہلکان ہو رہی ہے' یہ جھوٹی نہیں ہوسکتی۔ غریب ماں کی بیٹی ہے...... چلی جاتی ہے...... چاہتی ہوگی ساتھ کوئی نہ جائے...... لیکن...... میرے بھائی نے۔'' یہ لیکن ''دماغ'' میں گڑسی گئی۔

''چل اچھا ایسے تو نہ رو...... میری چندا...... تجھے پہلے بھی سمجھایا تھا اس طرح رکشوں میں نہ جایا کرو...... لوگوں کو باتیں گھڑنے کا موقع نہ دے...... جب جانا ہو تو مجھے رات کو بتادو، میں صبح نہیں جاؤں گا میری کوئی اُدھر حاضری تو نہیں لگنی......'' پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''اچھا بات تو سن...... تو خوش ہوجائے گی سن کر......''

''کیا؟'' چہرہ اوپر اٹھا کر پوچھا۔ پرنم بڑی، بڑی آنکھیں، سرخ ناک اور لال ہونٹوں والا چہرہ......

''کیوں ناں ہم اماں کو اِدھر بلوالیں...... میرا مطلب ہے اتنا بڑا گھر ہے...... تمہاری ماں میری بھی ماں کی طرح ہے...... وہ یہاں آکر سکھ چین سے رہے...... تمہاری بھی فکر ختم ہوجائے گی اماں بھی اکیلی نہیں رہے گی...... بلکہ مجھے بھی تسلی رہے گی ٹھیک ہے ناں......؟'' چودھری اس کا ہاتھ چوم کر بولا۔

''اماں نہیں مانے گی۔''

''ہم منالیں گے، تو منالے...... کیوں نہیں مانے گی۔''

''وہ بڑی غیرت والی ہے، وہ داماد کے گھر نہیں رہے گی۔ وہ تو ملنے بھی نہیں آتی ہے۔''

''یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں، داماد کے گھر کا پانی حرام ہے۔ میں بات کروں گا۔''

موضوع بدل گیا۔ شک کا طوفان دب گیا۔

روزینہ اب حد درجہ محتاط ہوگئی تھی۔ ذاکر کو صاف کہہ دیا وہ اس طرف ہرگز نہ آئے اور نہ ہی فون کرے اور نہ اسے بلائے۔ یہ تو ذاکر بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ

ہو...... dashing ضرور ہو۔ ہاں دولت مند بھی خوب ہو...... نیک، شریف، سیدھے، سادے لوگوں کی تو یہاں دال ہی نہیں گلتی۔ مشروط محبتوں کا انجام بھی شرائط ناموں پر ختم ہوتا ہے اور جب زندگی کی بہاریں گزر جاتی ہیں اور اولاد تناور درخت بن جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ ساری زندگی تو ماں باپ کی محبتوں کو for granted لیا۔ درخور اعتنا ہی نہ جانا...... جب ان کے لیے کچھ کرنے کا ٹائم تھا تو کچھ نہیں کیا اور اب جب وہ چلے گئے تو پچھتاوے مقدر بن جاتے ہیں۔

بہت خوش نصیب ہوتی ہے وہ اولاد جو اپنی زندگی میں اپنے ماں، باپ کے لیے کچھ کرے، ان کے کام آئے، ان کے دل سے نکلی دعائیں سمیٹے اور اپنی عاقبت سنوارے۔

جانا تو سب کو ہے کم از کم پچھتاوؤں کو تو اپنے اعمال کا حصہ نہ بنائیں۔

از: اسما شاہد، لاہور

ہنسنا منع ہے

☆ ”ڈھونڈ لیا تجھ سے ملنے کا طریقہ...... ہم تیری گلی میں سردیوں میں انڈے بیچیں گے۔“

☆ ”جرابیں ہمیشہ دھو کر پہنا کریں ایسا نہ ہو کامیابی آپ کے قدم چومے اور فوت ہو جائے۔“

☆ ”دل والے دلہن لے کر جاتے ہیں اور دماغ والے اس کی سہیلی کا نمبر بھی۔“

☆ ”یہ سن کر محبت سے اعتبار ہی اٹھ گیا کہ آپ کا ملایا ہوا نمبر دوسری لائن پر مصروف ہے۔“

از: انشال، پنجاب

چودھری امیر دین وغیرہ کی نظر میں آ گیا ہے۔ اسے کچھ عرصہ روپوش ہونا پڑے گا۔

دونوں طرف وقتی طور پر خاموشی چھا گئی۔ مگر خاموشی کو وہ مستقل اپنانے کے روادار نہیں تھے۔ جوں، جوں دن گزرے یہی خیال غالب ہوا اس کا کوئی حل... نکالا جائے، روزینہ کو چودھری کی قربت زہر لگتی تھی۔ شوہر اس کے دل سے نکل چکا تھا۔ بناوٹ کی زندگی گزار رہی تھی۔ تین ہفتے گزر گئے۔ کبھی، کبھی روزینہ کو لگتا وہ واپس چلا گیا ہے۔ یہ سوچ کر ہی دل ڈوبنے لگتا تھا۔ دل چاہتا گلیوں، سڑکوں میں نکل جائے اسے تلاش کرے، من میں ایک یقین تھا وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ تو اس سے بڑھ کر اس کا دیوانہ تھا۔ روزینہ ایک اندھے کنویں میں بند تھی۔ جس میں روشنی باہر سے آئے تو آئے اندر روشنی لانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ پھر ایک دن اس کا فون آ گیا۔ فون چودھری کے باہر نکلنے کے پانچ منٹ بعد آنے کا مطلب یہ تھا کہ چودھری کے نکل جانے کا باقاعدہ انتظار اور تصدیق کی گئی ہے۔ اس کی آواز سن کر روزینہ جی اٹھی ایسے لگا بہار آ گئی ہو...... اردگرد پھول کھل گئے ہوں دل کو سکون مل گیا ہو۔

”ہائے ذاکر...... میں مرنے والی ہو چکی تھی۔“

”نہ پوچھو حال...... مگر خیر ابھی یہ بات نہیں کرتے......“ جذباتی گفتگو سے گریز کرتے ہوئے ذاکر نے اسے آئندہ کے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس منصوبے پر مزید غور کرنے کا اب وقت نہ تھا۔ جدائی اپنا کام کر چکی تھی دونوں نے جان لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خطرات مول لینے ہی تھے۔

کپڑے بیچنے والی ایک عورت نے آنا تھا اور روزینہ کو کچھ دے جانا تھا...... روزینہ نے وہ ”کچھ“ تیسری رات، روٹین کے گرم دودھ میں ملا کر چودھری کو پلانا تھا۔ پینے کے بعد گہری نیند کی حالت میں اس نے تین سے چار گھنٹے کے اندر ختم ہو جانا تھا۔

”دودھ کتنے بجے دیتی ہو؟“

”دس بجے......“

”تمہارے آس پاس کوئی ہو تو جواب اس

طرح دو جیسے محلے کی کسی ہمسائی کا فون ہے۔"

"کوئی نہیں ہے......"

"خود اپنا بھی گلاس بنا کر اس کے سامنے پینا...... پیتے ہی اسے بھی کچھ نہیں ہوگا جب ہوگا وہ بولنے، ہلنے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس کا گلاس خالی ہوجائے تو دھو کے عام دودھ ڈال کر کچھ بچا ہوا کر کے رکھنا۔"

"اچھا......"

"دو بجے تک کام ہوجائے گا۔"

"خون کی الٹی وغیرہ آگئی تو......"

"نہیں آئے گی...... اعلیٰ معیار کی چیز ہے۔ تم نے صبح روٹین پر جاگنا ہے اور واویلا کرنا ہے۔"

"یہ مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔"

"یہ ضروری ہے...... تم بیوہ ہوگئی ہو...... اسے ہارٹ اٹیک ہوا ہے، وہ رات سونے سے پہلے کہہ رہے تھے کہ سینے پر بوجھ ہے......" وہ سرگوشیوں میں بتاتا رہا۔

"ڈاکٹر...... اس کے بیٹے پوسٹ مارٹم کرالیں تو......"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے میرا نام مت لو...... اس کے بیٹے اور بھائی پہلا کام یہی کریں گے کہ تمہیں گھر سے نکال دیں...... یہ پڑھے لکھوں والے خیال انہیں نہیں آئیں گے...... وہ ملکیتوں پر قبضہ کرنے کی فکر کریں گے۔"

"پھر......؟"

"آگے منزل دور نہیں......"

"اللہ کرے......" روزینہ کو خود پر حیرت تھی کہ اسے یہ سب سن کر ڈر نہیں لگا۔ کپڑے بیچنے والی آئی۔ اس کے پاس کڑھائی والے سوٹ، چادریں اور دوپٹے تھے۔ کوثری بھی شوق سے دیکھنے آبیٹھی۔ روزینہ نے کوثری کو ایک کڑھائی والی کالی چادر دلوائی۔ چودھری بھی گھر پر تھا۔ کوثری نے وہ چادر چودھری صاحب کو دکھا کر خوشی سے بتایا کہ بیگم صاحبہ نے اسے لے کر دی ہے۔ چودھری نے کہا اسے اپنے لیے کچھ پسند کرلے۔ روزینہ نے اپنے لیے کچھ پسند نہیں کیا۔ کپڑے والی نے کہا وہ اگلی بار اس سے اچھا مال لائے گی۔

اس ساری سرگرمی کے دوران مطلوبہ چیز کا تبادلہ اتنے خفیہ انداز میں ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

چودھری اب تین دن اور دو راتوں کا مہمان تھا۔ اس لیے روزینہ اس کی ہر خدمت ہنسی خوشی کر رہی تھی، وہ سر جھکائے محبت سے اس کے پاؤں پر مالش کر رہی تھی چودھری نے کہا۔

"میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسی بیوی ملی...... شریکوں کے کہنے پر تم پر شک کر بیٹھا تھا...... غصہ کر بیٹھا...... مجھے معاف کر دینا۔"

"ایسے نہ کہیں...... آپ تو میرے سر تاج ہیں...... آپ نے میری زندگی سجا دی ہے۔ شریکوں کے منہ میں خاک ہو......"

"جیوندی رہ میری روزی...... چل اٹھ بس کر...... آرام کر......"

وہ رات آگئی۔ مقررہ کام ہوتے چلے گئے۔ ادا کے ساتھ دودھ پیش کیا گیا۔ مسکرا کر پیا گیا۔

"گلاس رکھ کر میرے پاس آجا......"

"جی......" وہ مسکرائی۔ پندرہ منٹ بعد چودھری کے خراٹے گونج رہے تھے۔

روزینہ نے گھر کا جائزہ لیا...... کوثری تو عصر کے بعد چلی گئی تھی۔ چوکیدار اور اس کا پوتا گیٹ کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں سو رہے تھے۔ اڑھائی سالہ شہزاد ان کے بیڈ کے ساتھ جھولے میں سو رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ روزینہ نے ایک بار پھر چودھری کی نیند کی تصدیق کی پھر لاؤنج میں آکر دھیرے سے ٹیلی فون اٹھایا۔ دوسری طرف ڈاکٹر موجود تھا۔

"سو گیا ہے۔"

"پی لیا......؟"

"ہاں......"

"اب فون نہ کرنا......"

روزینہ نے آہستہ سے ریسیور رکھا اور کمرے میں آکر چودھری کے ساتھ ڈبل بیڈ پر لیٹ رہی...... نیند کہاں آنا تھی مگر وقت تو پورا کرنا تھا۔ گھنٹے بعد شہزاد دودھ کے لیے رویا، اس نے اٹھ کر فیڈر بنا کر دی۔ چودھری بے حس وحرکت سوتا رہا لیکن اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ رات کے دو بج گئے۔ وہ ہچکیوں سے

سانس لے رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑے آکسیجن حاصل کرنے کے لیے زور لگا رہے تھے، یہ خوفناک حالت رات کے تین بجے تک جاری تھی۔ روزینہ کے اعصاب جواب دینے لگے اس پر شدید خوف طاری تھا۔ ایسے لگتا تھا وہ کسی پل چیخ کے جاگ جائے گا یا وہ صبح تک ایسے رہے گا تو کیا ہوگا...... اس نے اپنا تکیہ اٹھا کر اس کی ناک پر دبا دیا یہ ایک اضطراری حرکت تھی یہ منصوبے کا حصہ نہ تھی۔

چودھری کا بدن زور سے تڑپا...... اور پھر سانس ٹوٹ گئی۔ آواز ختم ہوگئی۔

روزینہ نے آہستہ سے تکیہ سرکایا۔ چودھری کا منہ کھلا ہوا تھا...... باچھوں سے پتلا خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ٹشو سے خون صاف کیا اور کھلا ہوا منہ بند کر دیا پھر اس پر آڑا ترچھا کمبل ڈال دیا۔

اب اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ کچھ دیر بعد اسے نیند آگئی جیسے وہ بڑی ذمے داری ادا کر کے پُرسکون ہوگئی ہو۔

آنکھ کھلی تو صبح کا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا، کلاک پر نگاہ گئی سرما کے سات بجے کا وقت تھا۔ سب کچھ یاد آگیا۔ وہ ایک مُردے کے ساتھ سو رہی تھی۔ اسے ابھی ایک ہولناک دن کا سامنا کرنا ہے، بھرپور سمجھداری سے کام لینا ہے۔

کیا اسے یہ شو کرنا چاہیے کہ وہ فجر کی نماز کے لیے جاگی تو...... نہیں فجر کی نماز اس کی روٹین کا حصہ نہیں ہے...... اسے کس وقت غل ڈالنا چاہیے...... مختلف تراکیب سوچتے اور رد کرتے آدھا گھنٹا گزر گیا۔

آٹھ بجے وہ گیلے چہرے (جیسے منہ دھویا سکھانے کا ہوش نہ رہا) دوپٹا ہاتھوں میں لیے کمرے اور پھر لاؤنج کے دروازے کھولتی، کانپتی آواز سے ”ہائے اللہ، چودھری جی...... ہائے اللہ...... چودھری جی۔“ پکارتی گیٹ کی سائڈ پر پہنچی۔ چوکیدار کے کمرے کی بتی جل رہی تھی وہ نماز، قرآن کے لیے اٹھ جاتا تھا۔

”خیر ہووے شالا...... بیگم صاحبہ......“ سارے ملازموں کو چودھری نے بیگم صاحبہ سکھایا ہوا تھا۔

”چودھری صاحب کو ہارٹ اٹیک آگیا ہے......“ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ”کچھ ہوگیا ہے......“ نہیں کہے گی بلکہ سب کے کانوں میں ”ہارٹ اٹیک“ کہہ کر بیٹھا دے گی۔

وہ دونوں (چوکیدار اور پوتا) اس کے ساتھ اندر کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ پوتے سے کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

”سانول، جلدی کر...... چودھری امیر دین کا نمبر لگا۔“

کمبل میں آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا مگر کمبل ہٹاتے ہی چوکیدار دفعتاً ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ الفاظ منہ پر آئے مگر کہہ نہ پایا۔ ترس آمیز نظروں سے بیگم صاحبہ کو دیکھا جو اب دوپٹا لپیٹ چکی تھی اور تھر، تھر کانپ رہی تھی۔

”ڈاکٹر کے پاس...... لے چلو بابا...... انہیں اٹیک ہوگیا ہے۔“

”بی بی، بیگم صاحبہ...... چودھری صاحب اب نہیں رہے۔“ چوکیدار نے کمبل کا پلو چہرے پر ڈال دیا۔

”ہائے اماں...... اللہ جی...... ایسے نہیں ہوسکتا۔“ وہ پچھاڑ کھا کے گر گئی۔

سماں بدل گیا، گیٹ پر جانے کس، کس کی گاڑیاں رک رہی تھیں۔ گھر چودھری کی برادری سے بھرتا جا رہا تھا۔ پروین بیگم نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

”کھا گئی ڈائن، میرے سرو کو......“

”ابا، ابا...... یہ تجھے کیا ہوگیا۔ پہلے تو کبھی اٹیک نہ آیا تھا۔“ جوان بیٹے رو رہے تھے۔

”ہمارا ابا ہمیں لوٹا دے...... قاتل ہے تو ہمارے باپ کی......“ یہ بیٹیاں تھیں ہر جملے کے ساتھ اسے کوسا جا رہا تھا۔ اسے میت کے قریب نہیں آنے دیا جا رہا تھا وہ دیوار سے لگی سمٹی بیٹھی تھی۔ اپنا ہی گھر اپنا نہیں رہا تھا، اس کی حیثیت ختم ہوگئی تھی۔ شہزاد بھی اس کی گود میں دُبکتا کبھی کوثری اٹھا لے جاتی۔

غسل کے بعد جنازہ گاؤں لے جانا تھا۔ روزینہ چادر اٹھا کر چلنے کے لیے تیار ہوئی۔ پروین (سوکن) نے چادر سر سے کھینچ کے پھینکی اور چلانے لگی۔

”منحوس...... ترا وہاں قدم بھی نہ پڑے...... جو

تعلق جوڑا تھا وہ ختم ہوگیا۔ دفع ہو...... مر جا کے بھٹیارن کے پاس...... نکل اس گھر سے ابھی نکل...... ترے عیش آرام، محل ماڑیاں میرے گبرو کے دم کے ساتھ تھیں۔ دے چودھری کا بچہ...... اور نکل...... چھین لو، اس سے چودھری کا بچہ۔''

دو تین عورتیں اس کی طرف بچہ چھیننے بڑھیں۔

''دیکھیں...... یہ میرا بچہ ہے...... میں کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ خبردار، ہٹو پیچھے...... میں چلی جاؤں گی...... چلی جاتی ہوں اس گھر سے۔'' وہ پھٹے گلے سے چیخ رہی تھی۔ دھکے، مکے اور کوسنے کھا رہی تھی۔ اس وقت وہ بپھرے ہوئے شیروں کے نرغے میں تھی۔ کسی نے بال نوچے، کسی نے دوپٹا کھینچا، کسی نے بچے کو چھیننے کی کوشش کی۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان کے بیچ سے نکل آئی اور گیٹ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ اُدھر میت روانہ ہوئی اِدھر ایک بیگ اٹھانے جتنی مہلت اسے ملی اور وہ بچہ لے کر نکل گئی۔ گھر کو تالا پڑ گیا۔

بظاہر وہ بے در، بے گھر، بے آسرا و وسیلہ ہوگئی تھی۔ اصل میں اس کے منصوبے کا ایک حصہ توقع کے مطابق مکمل ہوا۔ کسی نے پوسٹ مارٹم کا سوال نہ اٹھایا، طبعی موت تسلیم کرلی گئی تھی۔ دستک کی ضرورت نہ پڑی نصیبو دن کو دروازہ بند نہیں کرتی تھی۔ محلے سے عورتوں کی آمد و رفت رہتی۔ عزت و شرافت سے عمر بسر کی تھی۔ کرم بی بی آئی ہوئی تھیں۔ فرش پر دری بچھائے دونوں لحاف کے دھاگے اُدھیڑ رہی تھیں کہ دروازے پر چاپ کے ساتھ روزینہ بیگ ایک طرف رکھتی بچے کو لیے داخل ہوتی دکھائی دی۔ اجڑی صورت، بکھرے بال، روتی آنکھیں، اس نے دھاڑ مار کر کہا۔

''اماں......''

''کیا ہوگیا۔ کیا ہوگیا میری دھی......'' اماں کے کلیجے پر خنجر چلا، تڑپ کر اٹھی۔

''خیر ہووے شالا......'' کرم بی بی کے ہاتھ سے لحاف چھوٹا...... اٹھ کر اس نے بچے کو لیا۔

''اماں تری دھی بیوہ ہوگئی......'' وہ ماں کے گلے لگ کر رونے لگی [illegible]

میں اترا تھا۔ پہاڑ گر گیا تھا۔

''بیوہ ہوگئی؟ چودھری مر گیا؟ اِدھر اس حال میں کیسے آئی؟ مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟'' آسماں ایک بار نہیں کئی بار ٹوٹ پڑا...... دل ریزہ، ریزہ ہوتا رہا۔ بیٹی اپنے بین میں جو بیتی تھی سناتی گئی۔ ماں ہر لفظ پر مرتی رہی...... کتنی دیر دونوں گلے لگ کے روتی رہیں...... بچہ اس شور شرابے میں رونے لگا۔ کرم بی بی بچے کو اتار کر پانی لے آئی۔ روزینہ کو پانی پلایا۔ اس نے بچہ گود میں سمیٹ لیا اور فرش پر بیٹھ گئی۔

محلے والیاں باری، باری آنے لگیں۔ دن یونہی ڈھل گیا۔ کسی نے کھانا بھجوایا، کسی نے بچے کے لیے دودھ تو کسی نے چائے...... رات ہوگئی۔ ایک طرف غم تھا (غم تو تھا ہی) دوسری طرف انجانا خوف تھا۔ نصیبو کے تفکرات واضح تھے، رانیوں جیسی زندگی بسر کرتی، کاروں میں سفر کرنے والی بیٹی عرش سے فرش پر آرہی۔ ناز و نعم میں پلنے والا بچہ اس کچے پکے گھر میں پلے گا...... یہ گھر بھی تو اب روزینہ کی امداد پر چل رہا تھا۔ جس کے ساتھ خاوند کی میت کے سامنے بدترین سلوک کیا گیا، ان سے کسی قسم کی پشت پناہی، وراثت میں حصہ، بیوہ کا آٹھواں حصہ، یتیم کا حصہ کی امید ہی فضول تھی۔ ملکیت وہی جو عملاً ملکیت ہو، کاغذوں کے لفظوں نے پیٹ نہیں پالنے تھے۔ تگڑے اور بدلحاظ لوگ تھے۔ آخر اب کیا ہوگا؟

روزینہ کو یہ فکر تھی کہ ''کب تک اسے یہ ڈراما رچا کر یہاں رہنا پڑے گا۔ ذاکر اسے کیسے نکالے گا۔ یہ نہ ہو راز کھل جائے۔ اماں کا کیا ہوگا...... چلو اماں کو سارے زیور پیسے دے جاؤں گی......'' پہلی رات بیت گئی۔ دوسرا دن ڈھل گیا۔ دوسری رات دونوں ماں، بیٹی کمرے کا دروازہ بند کیے جاگ رہی تھیں۔ شہزاد چمچ پلیٹ کو کھلونے بنا کر کھیل رہا تھا۔ روزینہ لیٹے، لیٹے بولی۔

''اماں، یہاں ڈر لگتا ہے ڈر کیوں ہے یہاں؟''

''یہاں ڈر نہیں تھا، میں تو نو بجے رات تک دروازہ بند نہیں کرتی تھی۔ گلیاں اب روشن ہوگئی ہیں بلب لگ گئے ہیں۔''

''اماں...... ڈر زندگی سے نہیں جاتا۔''

تعلق جوڑا تھا وہ ختم ہوگیا۔ دفع ہو...... مر جا کے بھٹیارن کے پاس...... نکل اس گھر سے ابھی نکل...... ترے عیش آرام، محل ماڑیاں میرے گبرو کے دم کے ساتھ تھیں۔ دے چودھری کا بچہ...... اور نکل...... چھین لو، اس سے چودھری کا بچہ۔''

دو تین عورتیں اس کی طرف بچہ چھیننے بڑھیں۔

''خبردار...... یہ میرا بچہ ہے...... میں کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ خبردار، ہٹو پیچھے...... میں چلی جاؤں گی...... چلی جاتی ہوں اس گھر سے۔'' وہ پھٹے گلے سے چیخ رہی تھی۔ دھکے، مکے اور کوسنے کھا رہی تھی۔ اس وقت وہ بپھرے ہوئے شیروں کے نرغے میں تھی۔ کسی نے بال نوچے، کسی نے دوپٹا کھینچا، کسی نے بچے کو چھیننے کی کوشش کی۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان کے بیچ سے نکل آئی اور گیٹ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ اُدھر میت روانہ ہوئی اِدھر ایک بیگ اٹھانے جتنی مہلت اسے ملی اور وہ بچہ لے کر نکل گئی۔ گھر کو تالا پڑ گیا۔

بظاہر وہ بے در، بے گھر، بے آسرا و وسیلہ ہوگئی تھی۔ اصل میں اس کے منصوبے کا ایک حصہ توقع کے مطابق مکمل ہوا۔ کسی نے پوسٹ مارٹم کا سوال نہ اٹھایا، طبعی موت تسلیم کرلی گئی تھی۔ دستک کی ضرورت نہ پڑی نصیبو دن کو دروازہ بند نہیں کرتی تھی۔ محلے سے عورتوں کی آمدورفت رہتی۔ عزت و شرافت سے عمر بسر کی تھی۔ کرم بی بی آئی ہوئی تھیں۔ فرش پر دری بچھائے دونوں لحاف کے دھاگے اُدھیڑ رہی تھیں کہ دروازے پر چاپ کے ساتھ روزینہ بیگ ایک طرف رکھتی بچے کو لیے داخل ہوتی دکھائی دی۔ اجڑی صورت، بکھرے بال، روتی آنکھیں، اس نے دھاڑ مار کر کہا۔

''اماں......''

''کیا ہوگیا۔ کیا ہوگیا میری دھی......؟'' اماں کے کلیجے پر خنجر چلا، تڑپ کر اٹھی۔

''خیر ہووے شالا......'' کرم بی بی کے ہاتھ سے لحاف چھوٹا...... اٹھ کر اس نے بچے کو لیا۔

''اماں تری دھی بیوہ ہوگئی......'' وہ ماں کے گلے لگ کر رونے لگی الفاظ نہیں تھے پگھلا ہوا سیسہ سماعت میں اترا تھا۔ پہاڑ گر گیا تھا۔

''بیوہ ہوگئی؟ چودھری مرگیا؟ اِدھر اس حال میں کیسے آئی؟ مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟'' آسماں ایک بار نہیں کئی بار ٹوٹ پڑا...... دل ریزہ، ریزہ ہوتا رہا۔ بیٹی اپنے بین میں جو بیتی تھی سناتی گئی۔ ماں ہر لفظ پر مرتی رہی...... کتنی دیر دونوں گلے لگ کے روتی رہیں...... بچہ اس شور شرابے میں رونے لگا۔ کرم بی بی بچے کو اتار کر پانی لے آئی۔ روزینہ کو پانی پلایا۔ اس نے بچہ گود میں سمیٹ لیا اور فرش پر بیٹھ گئی۔

محلے والیاں باری، باری آنے لگیں۔ دن یونہی ڈھل گیا۔ کسی نے کھانا بھجوایا، کسی نے بچے کے لیے دودھ تو کسی نے چائے...... رات ہوگئی۔ ایک طرف غم تھا (غم تو تھا ہی) دوسری طرف انجانا خوف تھا۔ نصیبو کے تفکرات واضح تھے، رانیوں جیسی زندگی بسر کرتی، کاروں میں سفر کرنے والی بیٹی عرش سے فرش پر آرہی۔ ناز و نعم میں پلنے والا بچہ اس کچے پکے گھر میں پلے گا...... یہ گھر بھی تو اب روزینہ کی امداد پر چل رہا تھا۔ جس کے ساتھ خاوند کی میت کے سامنے بدترین سلوک کیا گیا، ان سے کسی قسم کی پشت پناہی، وراثت میں حصہ، بیوہ کا آٹھواں حصہ، یتیم کا حصہ کی امید ہی فضول تھی۔ ملکیت وہی جو عملاً ملکیت ہو، کاغذوں کے لفظوں نے پیٹ نہیں پالنے تھے۔ تگڑے اور بدلحاظ لوگ تھے۔ آخر اب کیا ہوگا؟

روزینہ کو یہ فکر تھی کہ ''کب تک اسے یہ ڈراما رچا کر یہاں رہنا پڑے گا۔ ذاکر اسے کیسے نکالے گا۔ یہ نہ ہو راز کھل جائے۔ اماں کا کیا ہوگا...... چلو اماں کو سارے زیور پیسے دے جاؤں گی......'' پہلی رات بیت گئی۔ دوسرا دن ڈھل گیا۔ دوسری رات دونوں ماں، بیٹی کمرے کا دروازہ بند کیے جاگ رہی تھیں۔ شہزادہ چمچ پلیٹ کو کھلونے بنا کر کھیل رہا تھا۔ روزینہ لیٹے، لیٹے بولی۔

''اماں، یہاں ڈر لگتا ہے ڈر کیوں ہے یہاں؟''

''یہاں ڈر نہیں تھا، میں تو نو بجے رات تک دروازہ بند نہیں کرتی تھی۔ گلیاں اب روشن ہوگئی ہیں بلب لگ گئے ہیں۔''

''اماں...... ڈر روشنی سے نہیں جاتا۔''

"ڈر تمہارے ساتھ آیا ہے...... اب یہ ویسا ڈر نہیں کہ محلے کے بچوں کو سلا کر محفوظ ہو جائیں......"

"پھر یہ کیسا ڈر ہے......؟"

"ڈر ہمارے اندر کی کمزوری کا ہے۔ چودھری کو دل کا دورہ پڑا۔ اس کی لکھی تھی آ گئی تم اس کی بیوی تھیں، سب سے بڑا نقصان تمہارا ہوا ہے۔ تم مظلوم تھیں مگر تمہارا سسرال اور سوتیلے آپس میں مل گئے وہ خود غرض اور وحشی ہو گئے۔ ان کے رویے سے ڈر لگتا ہے......" پھر نصیبو نے لمبی آہ بھری۔ "کیسے گزرے گی روزینہ...... ترا لاڈ میں پلا بچہ...... کیا ہو گیا ربا۔"

روزینہ کو خیال آیا اس نے کیا کر دیا...... بچے سے باپ چھین لیا...... مگر جلد ہی اس نے اپنے خدشات کو جھٹکا اپنی آس تازہ کی "ذاکر اچھا انسان ہے، وہ شہزاد کو یتیمی کا احساس نہیں ہونے دے گا...... ورنہ وہ اس کا پاسپورٹ نہ بنواتا...... وہ مجھ سے...... بے پناہ محبت کرتا ہے وہ جانتا ہے میرا بچہ میری جان ہے۔"

رفتہ، رفتہ آنے جانے والیوں کا سلسلہ کم ہوتا گیا۔ کھانا بھی محلے سے آنا ختم ہو گیا۔ محلے والوں کو دکھ تھا۔ سب کہتے لڑکی کے نصیب کیا تھے۔ شادی ہوئی تو سب نے رشک کیا، چمکی تو سورج کی طرح چمکی اور زوال ہوا تو ایسا کہ گھپ اندھیرا۔

روزینہ بیگ میں اپنے زیور اور کافی رقم لے آئی تھی۔ شروع کے دن تو اس نے بیگ جوں کا توں رکھا جیسے جانے کب ذاکر اسے بلا لے...... بعد میں اس نے حفاظت کے نقطۂ نظر سے زیور ماں کو بتا کر پوٹلی میں باندھ کر گھڑے میں رکھا اور فرش کھود کر گھڑا دبا دیا۔

نصیبو چنگیر میں گوبھی لیے آہستہ، آہستہ کاٹتے ہوئے سوچوں میں گم تھی۔ روزینہ ماتھے پر بانہہ رکھے لیٹی تھی اس کے پہلو میں بچہ سو رہا تھا۔ روزینہ کا دایاں پاؤں اضطراری کیفیت میں متحرک تھا۔

"روزینہ......" نصیبو نے آہستہ سے آواز دی۔

"ہوں......"

"میں سوچ رہی ہوں......" وہ چاقو چنگیر میں ڈال کر اس کی طرف مڑی...... "کیوں ناں ہم پہل کر لیں...... ہم بچے کو لے کر گاؤں چلے جائیں...... میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔ چودھری خیر دین نے تم سے نکاح کیا تھا۔ چودھری امیر دین نکاح میں تھا۔ وہ امیر مومن گواہ ہے، ہم نرمی سے بات کریں گے۔ فیض بخش بھائی کو بھی لے چلوں گی۔"

روزینہ ماں کی طرف دیکھتی رہی۔

"اماں جان، جب میری سوکن نے میرے سر سے چادر چھین کے کہا تھا۔ "ترا وہاں کوئی تعلق نہیں...... جو تھا وہ ختم ہو گیا۔ تو اس وقت چاچا امیر دین اور اس کے گھر کی عورتیں بھی وہیں تھیں۔ اب ہم جا کر ان کو یاد دلائیں گے...... کہ چودھری نے نکاح کیا تھا۔"

"آخر کوئی راستہ تو نکالنا ہے...... تو نے کیا سوچا ہے؟"

"اچھا فرض کر...... میں وہاں جا کے زبردستی بیٹھ بھی گئی تو کیا حیثیت ہو گی میری وہاں......؟ سوکن اور اس کی اولاد کی خادمہ......؟ خادمہ جتنی عزت بھی وہ نہیں دیں گے......" پھر کچھ وقفے کے بعد کہا۔ "میرا نصیب اس گھر سے اٹھ گیا اماں......"

"پھر...... آگے کیا کریں؟"

"اللہ کوئی سبیل نکالے گا۔"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ دروازہ کھلا، روزینہ نے سر اٹھا کر دیکھا...... دیکھا تو کوثری آ رہی تھی۔

"یا اللہ خیر......" اس کا دل دھڑک اٹھا۔

نصیبو نے چنگیر پرے کھسکائی سر پر دوپٹا ڈالا، تعزیت کے لیے تیار ہو بیٹھی، روزینہ بچے پر کمبل پھیلا کر اماں کے ساتھ آ بیٹھی۔ کوثری نے سلام کر کے کہا۔

"بیگم جی...... اکیلے میں آ کے میری بات سن لو......"

روزینہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ نصیبو کو بھی ٹوہ لگ گئی۔ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ دونوں دوسرے کمرے میں گئی تو یہ چپکے سے دروازے سے لگ کر سننے لگی۔

"کچھ نہ پوچھو...... بیگم جی...... آپ بری طرح پھنس گئی ہو...... چودھری صاحب کو دفنانے کے بعد رات کو سارے اکٹھے بیٹھے تھے۔ چودھری اکبر نے کہا۔ "ہمیں ابا کی موت پر شک ہے۔" اس پر اس کے بھائی

چودھری اصغر نے کہا۔ ”شک نہیں ہے سو فیصد پکا ہے۔“ میں وہیں روٹی دیتی پھر رہی تھی۔ ”ہمیں نہیں لگتا ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔“ وہ پھر بولے تو چاچا وڈا کہنے لگا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا..... کھل کر بات کرو.....“ پھر انہوں نے سر جوڑ لیے کانا پھوسی کرنے لگے۔ باتیں میرے پلے نہ پڑیں..... مگر بات خاص تھی۔“

وہ رکی، رک کر روزینہ کے تاثرات کو تاڑا۔

”اگلے دن پتا چلا کہ قبر کشائی کروانے جا رہے ہیں۔“

”قبر کشائی کیا ہوتا ہے؟“ روزینہ نے تھوک نگل کر پوچھا۔

”قبر کھود کے مرنے والے کو نکالا جاتا ہے..... پھر اس کا پوسٹ مارٹم..... وہ کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے کہ ڈاکٹر پتا چلاتے ہیں کیا کھایا، کہیں کوئی ضرب لگی..... پھر ڈاکٹر لکھ کر رپورٹ دیتے ہیں۔“

”کیا پتا چلا؟“

”دوسرے دن رپورٹ آگئی.....“ وہ پھر چپ ہوگئی۔

”آگے بول..... کیا رپورٹ آگئی..... یہی کہ اٹیک ہوا ہے.....“

”نہ..... چودھری کو زہر دیا گیا تھا۔“

”بکواس..... بکواس..... پیسے بھر کر رپورٹ لکھوالی۔“

”زہر کا کوئی انگریزی نام بتایا ہے جس سے بندہ گہری بے ہوشی میں چلا جاتا ہے..... پھر اس کی سانس کسی بھاری چیز سے بند کی گئی..... جیسے تکیہ پر زور لگا کر.....“

”یہ کیا بکواس ہے.....؟ وہ رات تک ٹھیک ٹھاک تھا، کھانا کھایا، میں نے اس کے سر اور پاؤں میں مالش کی، ہاں یہ کہا تھا میرے سینے پر بوجھ ہے..... اس رات کوئی نہیں آیا تھا تو.....“

”کوئی نہیں آیا تھا یہی تو بات ہے.....“

”مطلب.....؟“

”وہ تیرے پر شک کر رہے ہیں.....“ کوثری آپ جناب، سے تیرے پر آگئی۔

”تیرے کو ہتھکڑیاں لگوائیں گے..... جیل ڈلوائیں گے، میں چھپ چھپا کر آئی ہوں..... تمہاری نمک خوار ہوں..... تمہیں خبر کر دوں.....“

اماں نصیبو کے تو پیٹ میں ایسا مروڑ اٹھا کہ پیٹ سنبھالے دوڑتی ہوئی واش روم گئی۔ ہاتھ پاؤں کی جان نکل گئی۔ وہاں سے دیواریں پکڑتی نکلی اور سیدھے کمرے میں پہنچ گئی۔ جہاں روزینہ چیخ رہی تھی۔

”میں ایسا کیوں کروں گی۔ سارا نقصان میرا ہوا ہے، میری شاہی چھن گئی ہے مگر ان کا انتقام ختم نہیں ہوتا۔“

اماں نصیبو سینے پر دوہتڑ مار کر دہائی دینے لگی۔

”مجھ سے غلطی ہوگئی سوتیلی جوان اولاد کے ہوتے اپنی معصوم کم سن بیٹی بڈھے کو بیاہ دی۔ مجھے کیا پتا تھا سوتیلے ایسا کینہ پالیں گے۔“

اماں نے سب سن لیا ہے اس پر حیرت کرنے کی کسی کو فرصت نہیں تھی۔ کوثری، اماں کو یوں دیکھنے لگی بیچاری کو پوری بات پتا نہیں ہے..... پوری بات بتانے کی یہ خواہش اس نے رکتے جھجکتے کہہ ڈالی۔

”ذاکر ہمیش پر شک ہے انہیں..... چودھری مرحوم کے بیٹے اور بھائی کہتے ہیں انہوں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں اس کے ساتھ گاڑی میں دیکھا..... گاڑی تمہاری ماں کی گلیوں سے نکلتی دیکھی..... وہ کہتے ہم نے چودھری مرحوم کو بتایا مگر اس کی آنکھوں پر بیوی کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے ٹیلی فون کی کالیں نکلوائیں بہت سی کالیں نامعلوم نمبروں کی ہیں..... وہ ایک، ایک بات کی ٹوہ لگا رہے ہیں..... ثبوت اکٹھے کر رہے ہیں۔“

سانس لینے کو کوثری رکی..... ماں، بیٹی بے جان مورتیوں کے مانند بیٹھی تھیں۔ کوثری کی آواز پھر بلند ہوئی۔

”روزینہ بی بی، میں کہتی تھی اماں کے گھر اکیلی نہ جایا کرو..... اب دیکھ لیا ناں.....!“

”چودھری کا دوست تھا وہ..... فون تو آتا رہتا تھا یہ کون سا ثبوت ہے، اور ماں کے گھر جانا میرا گناہ نہیں ہے۔“ اماں پر نظر گئی تو اپنی ہی نظروں میں خجل ہوگئی۔ سفید سر والی نصیبو سینے پر دونوں ہاتھ دھرے زمین میں نظریں گاڑے نیم مردہ ہو چکی تھی۔ اسے لگا وہ کوثری اور اماں کے بیچ ننگی ہوگئی ہے، سارے پردے

اتر گئے ہیں۔

کوثری اٹھی دونوں کو باری، باری دیکھا۔

''میں چلتی ہوں...... کوئی پتا نہیں کس، کس کا پیچھا کر رہے ہیں...... میرا منا کہاں ہے؟''

کوئی جواب نہ پا کر وہ چلی گئی۔

روزینہ نے خود کو گھسیٹ کر اٹھایا اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر رو دی۔

''اماں...... یہ سچ نہیں ہے۔''

اماں نے اس کے بازو جھٹک کر دور کیے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اماں کے قدموں میں بیٹھتی چلی گئی۔

''اماں، تو، تو مجھے اکیلا نہ کر...... میرا اعتبار کر...... میرا ذاکر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تو کب روز، روز اکیلی میرے پاس آتی تھی۔ ایک بار آئی تھی۔ اور وہ تجھے ذاکر گاڑی میں لایا تھا؟ تیرا اعتبار کروں...... تیرے تو منہ پر بھی لکھا ہے کہ یہ سب سچ ہے...... ٹسوے نہ بہا۔''

''اماں...... خدا کے واسطے......''

''اچھا چل میں نے اعتبار کرلیا...... چلو کرلیا...... میرے اندھے اعتبار نے تجھے پھانسی سے نہیں بچایا...... روزینہ...... کیا تو میری بیٹی ہی نہیں تھی؟''

''اماں کچھ نہیں ہوگا...... ہم بھاگ جاتے ہیں، ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ کچھ دن کہیں اور چلے جاتے ہیں، تم پریشان نہ ہو میرے پاس پیسے ہیں، زیور بھی ہیں، تم نے دیکھے تو ہیں۔''

''روزینہ تجھے چودھری پسند نہیں تھا تو مجھے بتا دیتی۔ تیری چھپر والی ماں کے پاس ایک عزت ہی تھی...... تو نے عزت ڈبو دی۔ تو نے یہ کیا کر دیا۔ تو نے یہ کر کیسے لیا...... تجھے اچھی طرح پتا تھا کہ بھٹیارن قانون کی جنگ نہیں لڑ سکتی۔ ہائے او میرے ربا......''

وہ مٹی پر ہاتھ مار، مار کر ماتم کرنے لگی۔

روزینہ بچے کے رونے کی آواز پر اندر چلی گئی۔

نصیبو لاکھ روئی، رو، رو کر تھک گئی۔ لاچار و بے بس ہو کر بیٹی اور نواسے کو دیکھتی رہی۔ بھاگ جائیں؟ کہاں؟ ہوسکتا ہے اس کی نگرانی ہو رہی ہو...... یہاں

روزینہ کا اعتبار کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ تو پہلا، پہلا اشتعال تھا، سوال اب یہ تھا کہ وہ جو سوچ رہے ہیں وہ اس پر عمل کریں گے۔

دو عورتیں...... تعلیم کی عدم موجودگی، کمزور ترین پس منظر...... راہنمائی، پیسہ، مردانہ تعلقات عامہ، ہر خانہ خالی...... مگر روزینہ کو یقین تھا ذاکر زندہ ہے تو ضرور آئے گا۔ ''میرا ساتھ دے گی، ڈرے گی نہیں۔'' اس کی آواز کان میں گونجی...... وہ تو آخر دم تک ساتھ دے گی نہیں ڈری...... کیا ذاکر ڈر گیا؟

ذاکر کا کوئی مستقل فون نمبر نہیں تھا۔ وہ جو اس نے کارڈ دیا تھا مسقط کے پتے تھے۔ وہ ہمیشہ پی سی او سے کال کرتا تھا۔ اس کا یہاں کوئی مستقل گھر نہ تھا۔ کوئی ایڈریس نہیں تھا۔ وہ ہوٹلوں میں رہتا تھا۔ روزینہ کے پاس اسے رابطہ کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا وہ سوائے راہ دیکھنے کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ جبکہ وہ لمبی مدت تک راہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ خطرے کے نشانے میں تھی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دشمنوں کا انتظار بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ بالآخر ماں، بیٹی کا فیصلہ ہوگیا وہ کسی اور شہر نکل جائیں۔ نصیبو نے اپنے ننھیال کا کوئی گھر سوچ لیا تھا۔

راتوں رات انہوں نے سامان گٹھروں میں بند کیا۔ ساتھ لے جانے والا ایک بڑا اٹیچی کیس اور ایک ہینڈ بیگ تیار کر کے رکھا۔ الٹا سیدھا ناشتا کیا، بچے کو کھلایا بقایا ساتھ رکھ لیا۔ نصیبو نے کہا وہ گلی کا چکر لگا کر حالات دیکھتی ہوئی رکشا لے کر آئے گی...... لیکن چند منٹ میں وہ کانپتی، لرزتی پلٹ آئی۔

''روزینہ...... جلدی سے بچے کو لے کر چھت پر چلی جا...... جلدی کر...... امیر دین آرہا ہے، اپنی آنکھوں سے اسے کار سے نکلتے دیکھ کر آرہی ہوں...... ضرورت پڑے تو چھلانگ لگا کر برابر والوں کی چھت پر کود جانا...... نیچے نہ آنا...... ہینڈ بیگ اٹھا...... بھاگ......''

''اماں...... تم......'' وہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں پھلانگتی جارہی تھی۔

''مجھے وہ کچھ نہیں کہیں گے...... بس جا......''

روزینہ نے اوپر جاکر سیڑھیوں کا دروازہ اوپر

سے بند کرلیا۔ بچے کی آواز نیچے نہ پہنچے اس خوف سے چھت کے پرلے کونے میں چلی گئی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ نصیبو اپنے آپ کو مضبوط کرتی دروازے پر آئی۔ چودھری (داماد) کے بھائی چودھری امیر دین نے بغیر دعا سلام کے کہا۔

''اندر نہیں آؤں گا...... تم نے پہلے دن اسی نیم کے نیچے بٹھا کر بات کی تھی۔ وہیں آ کے بات سن لو، اپنی بیٹی کو بھی بلا لو......''

''وہ یہاں نہیں ہے، بچے کی طبیعت خراب تھی وہ ڈاکٹر کے گئی ہے جو بات کرنی ہے مجھ سے کرلو......''

باہر آ کے اس نے مزید کہا۔ ''شودی بیوہ کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔''

''لمبی کہانی ابھی بند رہنے دے...... آگے بھی بڑے ثبوت ہیں ہمارے پاس قصہ مختصر میرا بھرا (بھائی) مرا نہیں مارا گیا ہے۔''

نصیبو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''شہزاد چودھری کی نانی...... تم سے صفائیاں نہیں چاہیے۔ بیٹی۔ اسے شہزاد کی ماں ہونے کی رعایت دی ہے۔ بے فکر ہو کر ماں کے گھر رہے چاہے چھپر پھر لگالے یا لوگوں کے جھاڑو بہارو کرے، ہمارا پوتا سات سال کا ہوگا آ کے لے جائیں گے...... ایک تو، تو یہ دعا کر کہ میرے فیصلے پر جوان خون راضی رہے...... دوسرا یہ یاد رکھنا اس گھر سے وہ نکلی تو زندہ نہیں رہے گی۔'' اور وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔

نصیبو اس کے ایک، ایک لفظ کو حافظے میں دہراتی اور غور کرتی رہی لیکن اس کی جان میں جان آ گئی تھی کہ فی الوقت، بلا ٹل گئی۔ دروازہ بند کر کے رکی رہی...... پھر خاموشی کا یقین کر کے سیڑھیوں پر چڑھی اور دروازے پر دستک دی۔

''روزینہ دروازہ کھول دے۔''

روزینہ نے ڈرتے، ڈرتے دروازہ کھولا۔ اماں کو اکیلا پا کر اطمینان کیا۔

''چلا گیا......؟''

''ہاں چلا گیا......''

''کیا کہتا تھا؟''

''ابھی تو ٹل گیا ہے......'' اماں نے لفظ بہ لفظ پیغام سنا دیا۔

''سچ......؟ اماں...... مجھے یقین نہیں آرہا......'' روزینہ کھل اٹھی۔ ''سات سال کا کیوں لے جائیں گے۔ میرا بیٹا ہے میں کیوں دوں......'' وہ بچے کو چومنے لگی...... نصیبو چار پائی پر بیٹھ رہی...... اتنا بڑا طوفان تھا، کیسے ٹل گیا۔

''اماں، وہ یہ کہنے کیوں آیا...... وہ نہ آتا...... ہمیں خوف کی سولی پر لٹکا کر رکھتا...... وہ کر سکتا تھا۔''

''نفرت اور غصہ اس کے منہ پر لکھا تھا۔''

''اچھا...... اب بیگ تو کھول دوں......''

''پڑا رہنے دے ابھی......''

''چائے بناتی ہوں...... پیو گی ناں...... طبیعت تازہ ہو جائے گی۔'' وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ سوچتی رہی۔ ''اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذاکر کہیں نہ کہیں سے رابطہ کرے گا، شکر ہے گھر نہیں چھوڑنا پڑا اور نہ وہ مجھے کہاں تلاش کرتا...... بیچارا جانے کس حال میں کہاں روپوش ہوگا۔ جدائی کے یہ ہولناک دن کب ختم ہوں گے۔'' وہ چائے دم کر کے دو کپ بنا کے اماں کے پاس آئی۔ اماں کو چائے کا کپ تھمایا۔ کپ لے کر رکھتے ہوئے وہ جیسے خود سے ہمکلام تھی۔

''بہت بڑا دل کیا ہے چودھری امیر دین نے...... خیر دین بھی اچھا انسان تھا۔ تو آتی تھی محلے میں دھوم مچ جاتی تھی۔ یہ بڑی کار میرے غریب در پر رکتی۔ چھتوں سے جھانک، جھانک کر عورتیں دیکھتیں۔ ترے کپڑے، زیور ترے بچے کے کھلونے، نت نئے فیڈر، بے بی بیگ، پتا نہیں کیسی، کیسی چیزیں ہمسائیاں نت رشک کرتیں۔ سب کو پتا تھا کہ میرے دن بیٹی نے پھیرے ہیں۔ بلکہ داماد نے پھیرے ہیں تنور کی آگ سے اٹھ کر گھر بیٹھ کر کھانے لگی...... ہزار، ہزار کے نوٹ جو میں نے کبھی حیاتی میں دیکھے نہ تھے مجھے تو دے جاتی...... ترے خاوند کو پتا بھی ہوتا ہوگا، یہ اس کا بڑا پن

تھا وہ انجان بنا رہتا...... ترے نام آدھا بیگھ زمین لکھوائی تھی، لکھ تو دی اس نے......'' چائے کا ایک گھونٹ لے کر روزینہ کو دیکھا۔

''یہ ذاکر کون ہے؟''

''چودھری کا دوست تھا۔ مسقط سے آیا ہوا تھا۔ چلا بھی گیا ہوگا......'' جھوٹ تو اسے ہر بات پر بولنا پڑتا تھا۔

''اس کے بال بچے بھی ہوں گے؟''

''چودھری کے سن کا نہ تھا۔ چالیس بیالیس کا ہوگا۔''

''گھر کے اندر آتا جاتا تھا؟ تو سامنے ہوتی تھی؟''

''چودھری نے خود مجھے اس کے سامنے کیا، اجازت دی، کہتا تھا اچھا بندہ ہے۔''

''اچھا بندہ کون کب تک ہے کسی کے منہ پر نہیں لکھا ہوتا......''

''ہوں......''

''اس کا فون آتا تھا تو؟''

''اماں، گھر پر فون لگا ہوا ہے، چودھری نہ ہوتا تو میں نے ہی فون سننا تھا چاہے جس کا ہو......''

''روزینہ تو اکیلی میرے پاس بہت کم آئی ہے...... شاید ایک بار ہی آئی ہے، کوثری تو کہہ رہی تھی روز اکیلی میری طرف جاتی تھی...... میرا کہہ کر کہاں جاتی تھی۔''

وہ چپ رہی بچے کو بسکٹ کھلاتی رہی۔

''میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں، چکر تو کوئی ضرور تھا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔''

اماں نصیبو کو روزینہ کے انکار اور تردید پر کوئی یقین نہیں تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے باریک، باریک سوال کرتی، اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی دلیلیں ڈھونڈتی مگر دل کہتا سچ یہ نہیں ہے جو روزینہ کہتی ہے۔ پھر وہ سوچ میں گم ہو جاتی۔

شہزاد کا حلیہ رفتہ، رفتہ ماحول کے مطابق بدلنے لگا۔ محلے کے بچوں کے ساتھ ریت، مٹی میں کھیلتا اگرچہ اسے گھر سے باہر نہیں جانے دیتے تھے مگر گھر کے اندر بھی اس کے لیے کون سے جھولے کھلونے تھے۔

روزینہ اپنے پیسے اضافی چیزوں پر خرچ نہیں کرنا چاہتی تھی اسے مسقط چلے جانا تھا۔ خواب کے تعبیر کی انتظار نے وقت زیادہ ہی کھینچ لیا تھا یا پھر انتظار لمبا لگتا ہے، جب وہ آئی تھی فروری کا مہینہ تھا سردیاں تھیں وہ اندر سوتی تھیں۔ اب مارچ ختم ہونے کو تھا۔ اماں اور روزینہ روزانہ صحن میں چار پائیاں لگانے اور سونے کا سوچتی پھر ملتوی کر دیتیں اندر پنکھے پر گزارہ ہو رہا تھا۔

روزینہ نہا کر نکلی اس نے پچھلے سال کا لان کا سوٹ پہنا تھا۔ یہ سوٹ اماں کے گھر رکھے ہوئے کچھ کپڑوں میں تھا۔ اس نے پہنا تو یادیں تازہ ہو گئیں۔ جب وہ پہلی بار ذاکر کے سامنے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں گئی تھی تو یہی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ذاکر کی نظریں جیسے اس پر ٹھہر سی گئی تھیں۔ مبہوت ہو گیا تھا۔ اس کے تاثرات میں تحسین اور گہری دلچسپی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

''پہلوئے حور والی مثل تو نہیں کہوں گا مگر...... بانصیب بندہ ہے۔'' اس یاد کے ساتھ ہر ملاقات اور والہانہ اظہارات یاد آتے چلے گئے۔ دل شدت سے چاہنے لگا وہ آ جائے'' وہ کہیں سے تو رابطہ کرے، وہ آئے گا تو روٹھ جاؤں گی کیسے روپوش ہو گیا تھا۔ دو مہینے ہونے کو آئے۔ وہ میرے چہرے سے لٹ ہٹاتے ہوئے کہے گا۔ ''تم نے سوچ کیسے لیا کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں...... بھول ہی جانا تھا تو یہ سب نہ کرواتا......'' ہاں واقعی اگر اس نے مجھے چھوڑ دینا تھا تو کسی بھی وقت چلا جاتا۔ یہ سب کروانے کی ضرورت کب تھی۔ وہ ابھی خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا ہوگا مگر جو دشمن مجھے معاف کر گئے ہیں وہ اس کو کیوں پکڑیں گے...... اس کو پکڑنا تو مجھے بھی کٹہرے میں لانا ہے۔ سمجھ نہیں آتی...... یہ خوف ہمارے دلوں سے کب دور ہوں گے......'' وہ ان ہی خیالوں میں کھوئی دھیرے، دھیرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ بے کھٹکے کوئی عورت سامنے آ گئی۔

''بات سنو...... باجی......''

وہ اچھل ہی تو پڑی۔ یہ تو وہی کپڑے بیچنے والی تھی۔

''کون ہو تم......؟ کیوں اندر آ گئی ہو......؟''

''باجی...... آپ کی ماں کو گھر سے نکلتے دیکھ کر تسلی

کر کے داخل ہوئی ہوں۔''

روزینہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اماں واقعی گھر پر نہیں تھی کچھ دیر پہلے محلے کی دکان پر جانے کی بات کر رہی تھی۔ شاید وہ ابھی سامنے سے گزری تھی کچھ کہہ کے بھی گئی تھی اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ شہزاد بلی کے بچے سے کھیل رہا تھا۔

''باجی...... یہ لے لو......'' اس نے تہ شدہ کاغذ شلوار کے نیفے سے نکال کر اسے دیا۔ روزینہ نے ہاتھ نہ بڑھایا تو آہستہ سے بولی۔

''ذاکر ہمیش جی کا ہے...... نمبر لکھ دیا ہے بات کر لینا...... میں جا رہی ہوں۔''

''ٹھہرو...... وہ تمہیں کہاں ملا؟'' مگر وہ نہ رکی اور تیزی سے نکل گئی۔ روزینہ نے رقعہ کھول کر پڑھا۔

''اس نمبر پر آج کسی وقت بات کرو...... بہت ضروری ہے، صرف تمہارا ذکر کرنے والا۔''

''تمہارا ذکر کرنے والا'' پڑا سے ہنسی آ گئی۔ گلے شکوے از خود دور ہو گئے۔ رقعہ کیا ملا دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ابھی میں کتنا یاد کر رہی تھی۔ یہ کپڑے والی گئی کدھر......'' وہ اٹھ کر بھاگی، دروازے سے باہر جھانکا۔ کہیں دکھائی نہیں دی۔ خوش ہو چکنے کے بعد وہ اس ادھیڑ بن میں لگ گئی۔ ''آج ٹیلی فون کیسے کرے......''

اماں دوائیوں کا شاپر ہاتھ میں لیے داخل ہوئی۔

''کہا بھی تھا دروازہ بند کر لو...... جیسے کھلا چھوڑ گئی تھی ویسے کھلا دھرا ہے...... کچھ اپنے بچے کا ہی خیال رکھا کرو...... یہ باہر نکل جائے۔''

''دھیان تھا میرا...... اسے دیکھ رہی تھی۔''

روزینہ نے دوپہر کی روٹی پکا کر چارپائی پر چھابی، سالن اور دہی رکھی۔ شہزاد کے منہ میں دہی کا چمچ دیتے ہوئے کہا۔

''اماں ایک بات کی اجازت دو گی؟''

''ایسی کون سی بات ہے۔'' نصیبو نے نوالہ توڑا۔

''اماں...... تمہیں پتا ہے شادی کے بعد میں تھریڈنگ کراتی رہتی تھی...... اب اتنی آئی برو پھیل رہی ہیں، جنگل چہرے پر اُگ آیا ہے، میں شہزاد کو لے کر اُدھر گلی باجی کے پارلر سے دس منٹ لگا کے تھریڈنگ کرواؤں؟''

''توبہ، توبہ عدت میں سنگار کی پڑی ہے؟''

''سنگار نہیں ہے...... یہ ضرورت ہے......''

''ویسے بھی تمہیں یہاں کون دیکھتا ہے......''

اماں نے گلاس میں پانی ڈالا۔

''عورتیں آتی رہتی ہیں...... کوئی نہ بھی آئے شیشہ دیکھ کر برا لگتا ہے۔''

''عدت میں بلا ضرورت نہیں نکلتے......''

''عدت کی ایک رہی...... عدت والے گھر سے مجھے نکال دیا گیا...... اب کیسی عدت......؟''

''میں لوگوں کی باتوں سے ڈرتی ہوں......''

روزینہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ اماں نے اس کو خاموش پا کر ترس کھایا۔

''میں ساتھ چلوں گی۔''

''میں ان گلیوں میں پلی بڑھی ہوں...... شہزاد کو ساتھ لے جاؤں گی، یہ بھی ذرا باہر کی ہوا کھا لے۔ بس دس منٹ لگاؤں گی۔''

اماں نے ہتھیار ڈال دیے۔

پی سی او کیبن کے اندر شہزاد کو پہلو میں بٹھائے وہ جلدی کے مارے کانپتی انگلیوں سے نمبر ملا رہی تھی۔ دوسری گھنٹی پر ہی فون اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو...... روزینہ......؟'' مردانہ آواز آئی۔

''ذا...... ذاکر......؟''

''ہاں...... کیسی ہو......؟''

''بہت ناراض...... ابھی یہ چھوڑو...... آگے کی بات کرو......''

''وہ سارا راز جان چکے ہیں۔''

''ہاں، یہ مجھے پتا ہے......''

''تمہیں کیسے پتا......؟''

''چاچا امیر دین آیا تھا۔ کہتا تھا جب بچہ سات سال کا ہو گا لے لیں گے، بچے کی وجہ سے جان بخشی کرتا ہوں......''

''چلو یہ تو اچھا ہو گیا۔''

''تم کہاں ہو......؟''

''کہیں چھپا ہوا ہوں......''

''صاف بولو...... تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے۔''

''اچھا سن...... پرسوں رات دس بجے ٹیکسی لے کر آؤں گا...... سیدھے ائرپورٹ......''

''شہزاد کی بھی ٹکٹ لانا۔''

''یہ بتا...... تو نے بڈھے کا گلا دبایا تھا؟''

''گلا کیوں دباتی...... یہ باتیں نہ کرو......''

''تیار رہنا...... پرسوں......''

''پکا وعدہ......؟''

''تو نکلے گی کیسے؟''

''میں بہادر ہوں......''

''ہاں وہ تو، تو ہے......'' وہ ہنسنے لگا۔ فون بند ہوا وہ گل باجی کے پارلر پر گئی جلدی، جلدی مچا کر آئی برو بنوائی اور بھاگتی ہوئی گھر پہنچی اماں دروازے میں کھڑی تھی۔

''لو...... بس آ گئی ہوں......''

اماں نے شہزاد کو پکڑ کر اتارا۔

چودھری 12 فروری کو فوت ہوا تھا۔ آج اپریل کی 5 تاریخ تھی موسم کافی حدت پکڑ چکا تھا۔ آمد گرما کی پہلی رات دونوں ماں بیٹی صحن میں سونے لگی تھیں۔ روزینہ سوچ رہی تھی کل رات کے بعد اماں یہاں اکیلی سوئے گی۔ اسے ترس بھی آ رہا تھا مگر وہ اماں کے لیے کافی کچھ چھوڑے جا رہی تھی۔

تین چار پائیاں دو کمروں کے آگے بچھی تھیں۔ درمیان میں شہزاد کو سلایا جاتا تھا۔ صحن کی لائٹ آف کر کے بیرونی دروازے پر لگا ہوا بلب جلتا رہتا تھا۔ نصیبو عشا کی نماز ادا کر کے اپنے بستر پر آئی۔ شہزاد تینوں ... چارپائیوں پر اچھل کود کر رہا تھا۔ ٹی وی تو ان کے گھر نہ تھا رونق کی خاطر ریڈیو چلتا رہتا تھا۔

''اماں، یہ جگہ اب چھوڑ دینا......'' وہ لیٹے، لیٹے بولی۔

''تمہاری عدت پوری ہو جائے تو سوچیں گے۔''

''عدت کی کہانی چھوڑو...... بہتر فیصلے کرو......''

''جو ہوا اچھا نہ ہوا......'' اماں کی وہی پرانی راگنی۔

''اللہ کی مرضی......'' روزینہ نے بیزاری سے کہا۔ ''آؤ شہزاد آ جاؤ ماما کے پاس...... سوتے ہیں۔''

''فیڈر بنا دو...... آرام سے لیٹ رہے گا۔''

روزینہ نے فیڈر بنا کر تین سالہ شہزاد کو ساتھ لٹا لیا جب سو جاتا تھا تو اسے اٹھا کر درمیان والے بستر پر سلا دیتی تھی۔ بہت دیر تک روزینہ کروٹیں بدلتی رہی۔ قسم، قسم کے خیال آتے رہے۔ پھر اسے نیند آ گئی۔

دھما کا سا سنائی دیا۔ جیسے کوئی کود کے اندر آیا ہو...... نصیبو کی فوراً آنکھ کھل گئی۔

''کون ہے؟'' وہ زور سے بولی۔

کوئی سایہ پرانی اینٹوں، روڑوں کی ڈھیری کے پیچھے ہو گیا۔ روزینہ جاگ گئی۔

''کیا ہوا ہے اماں......؟''

اتنے میں وہی سایہ دوڑ کر کمروں کے دروازے باہر سے بند کرنے لگا۔ خوف وحشت سے دونوں چیخنے لگیں۔

''کون ہو تم...... کون ہو...... لوگوں مدد کرو......''

دیکھا تو صحن کی چار دیواری پر دو مردوں کے سر نکلے ہوئے تھے اندر والے نے کمروں کی زنجیریں چڑھا کر بیرونی دروازہ کھول دیا۔ اب گھر کے اندر تین مرد ٹوٹی اینٹیں اٹھا کر تاک، تاک کر روزینہ کو مارنے لگے تھے۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا ہو رہا ہے وہ کوئی چور، ڈاکو نہیں تھے۔

دونوں ماں، بیٹیاں بچاؤ، بچاؤ کرتی اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں بچہ زور، زور سے رونے لگا۔ نصیبو نے بچہ اٹھانا چاہا تو وہی مرد جس نے دروازے بند کیے تھے۔ اس نے جھپٹ کر بچہ لے لیا۔

''چھوڑو میرے بیٹے کو...... چھوڑو......'' روزینہ پتھروں کی یلغار میں اپنے بچے کی طرف لپکی۔

''وہ امیر دین تھا جو تجھے معافی دے گیا...... ہم تجھے رنگے ہاتھوں پکڑ کر مارنے کے انتظار میں تھے۔''

نصیبو بچے کو پکڑنے بیٹی کو بچانے آگے آئی تو کہا۔

''ہٹ جا تو بڈھی...... ورنہ بے موت ماری جائے گی...... ہم تجھے نہیں مارنا چاہتے۔''

''معاف کر دو...... میری دھی کو معاف کر دو...... اللہ، رسول کے واسطے معاف کر دو...... تجھے تری ماں کا واسطہ......'' وہ روزینہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہے

تھے، پتھر مار رہے تھے اور وہی مرد بول رہا تھا۔
''آج فون تو نے اپنے یار کو نہیں کیا تھا...... مجھے کیا تھا...... میں چودھری اکبر...... فون نمبر میرے گھر ہی کا تھا، ریکارڈ کر لیا ہے...... وہ ترا اقبالِ جرم ہے...... مگر ہم عدالت سے سزا نہیں دلوائیں گے...... زانی کی سزا سنگسار ہے...... مارو...... اوئے مارو...... وڈی تو دلیر ہے ناں...... یار کے ساتھ خاوند کو قتل کر کے بھاگ رہی تھی...... اب دلیری سے موت کا مقابلہ کر......''
انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ روزینہ لہولہان ہو چکی تھی اس کی آواز چیخ، چیخ کے بیٹھ گئی تھی۔ نصیبو کی مدد کی پکار بیکار جا رہی تھی۔ محشر کا سماں تھا۔ نصیبو چیختی، چلاتی دروازہ کھول کر گلیوں میں بھاگ رہی تھی۔
''میری بیٹی کو بچاؤ...... محلے والو...... میری دھی کو بچاؤ...... وہ اسے مار دیں گے......''
وہ فیض بخش کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے کوٹنے لگی۔
''فیض بخش میری دھی مر گئی...... مدد کر...... مدد کر۔''
''اوئے کون؟'' کہہ کر وہ نکلا۔ گلی میں آٹھ دس بندے اور ساتھ شامل ہوتے گئے۔ آگے، آگے نصیبو بھاگ رہی تھی۔ فیض بخش محلے والوں کو آوازیں دیتا چلا جا رہا تھا۔
وہ نصیبو کے گھر پہنچے...... صحن میں خون ہی خون کے چھینٹے تھے۔ روڑے...... پتھر...... اینٹیں بکھری ہوئی تھیں...... روزینہ دم توڑ رہی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ مارنے والے بھاگ چکے تھے اور بچہ وہاں نہیں تھا۔
نصیبو اپنی بیٹی کے اوپر جا گری...... آنے والے مردوں میں سے آدھے تو چپ چاپ کھسک گئے تھے۔
''قتل ہو گیا ہے۔''
''اسپتال لے چلیں......''
''حالت تو دیکھو...... ہاتھ مت لگاؤ کسی چیز کو...... پولیس کو اطلاع کرو۔'' ان آوازوں میں پولیس وین اور ایمبولینس کے ہارن بجنے کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ رش لگ گیا۔ دروازے کے باہر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ مگر چشم دید گواہ کوئی نہ تھا۔
چونکہ پولیس آ گئی تھی لہٰذا مقدمہ بنتا تھا۔
مدعی نصیبو تھی۔ جس کا بیان تھا کہ چودھری اکبر ولد چودھری خیر دین نے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے اس کی بیٹی روزینہ کو بے دردی سے مارا پیٹا، گھر میں پڑی ہوئی آدھی اینٹیں، روڑے، پتھر نشانہ لگا، لگا کر مارے اور قتل کر دیا۔ اس کے تین سالہ بچے شہزاد کو چودھری اکبر نے چھین لیا اور فرار ہو گئے۔
ملزمان تگڑے، مال دار، عیار چودھری تھے جنہوں نے مقدمے میں بے دریغ پیسہ خرچ کیا۔ ان کا بیان تھا کہ ذاکر ہمیش اور روزینہ کے درمیان ناجائز تعلقات تھے۔ اس کے ثبوت میں ٹیلی فون کالیں، اس ہوٹل کے مالک کا بیان جہاں ذاکر کے ساتھ روزینہ نے وقت بسر کیا۔ کوثری کا بیان کہ روزینہ متعدد بار اکیلی گھر سے گئی۔ کپڑے بیچنے والی کا بیان کہ اسے ذاکر ہمیش نے حکیم کی دوا کہہ کر پڑیا دی جو چودھری صاحب کے لیے چودھرانی کو چھپا کر دینی تھی۔ پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ زہر اور گلا گھونٹ کر مارنے کی تصدیق تھی۔ قتل کی رات ذاکر، روزینہ کے ساتھ تھا۔ دونوں نے دادِ عیش دی بعد میں وہ فرار ہو گیا چوکیدار نے کسی مرد کو دیوار سے کود کر جاتے دیکھا مگر صبح موت کے ہنگامے میں یہ بات یاد نہ رہی۔ مقتول چودھری کے بڑے بھائی نے یتیم پوتے کی خاطر مقتول کے بیٹوں کے رنج کے باوجود انہیں معاف کرنے پر آمادہ کیا اور خود روزینہ کی والدہ کے پاس جا کر معاف کر دینے سے آگاہ کیا۔ روزینہ کے قتل کے بارے میں ان کو کچھ معلوم نہیں۔ غلہ منڈی نصیبو کے محلے کے قریب ہے۔ غلہ منڈے سے صبح منہ اندھیرے چودھری کے ایک مزارعے نے بچے کو گلی میں روتے دیکھا۔ وہ پہچان گیا کہ یہ چودھری خیر دین کا بچہ ہے (اس مزارعے نے گواہی دی) یوں وہ بچہ اٹھا کر گاؤں لے آیا۔ جبکہ مدعی کی جانب سے ایک مخبوط الحواس ساٹھ سالہ عورت نصیبو تھی۔ فیض بخش نے مقتولہ کو قتل کے بعد دیکھنے کی گواہی دی یہی گواہی چند اہلِ محلّہ نے دی۔
سچ تو یہ تھا کہ فیض بخش غریب پرور سہی، پرانا محلے دار سہی مگر وہ کب تک عدالتوں میں خود کو گھسیٹتا، اپنا کام

کا وقت برباد کرتا اور جبکہ روزینہ کے ناجائز مراسم کے کھلنے کے سبب لوگوں کی اس کے ساتھ ہمدردی ختم ہوگئی تھی۔ وہ محض عبرت کی ایک کہانی بن کر رہ گئی تھی۔

روزینہ کا زیور بحق یتیم بیٹا چاچے نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

اس بوڑھی بدنصیب بیوہ بھٹیارن سے کوئی پوچھو جو اپنی عمر بھر کی ہی نہیں نسل در نسل کی کمائی لٹا بیٹھی تھی۔ جس عزت و حیا کا پندار لیے تپتے سورج تلے تندور جھونکتی تھی، وہ عزت و حیا بازاروں اور اخباروں کی زینت بن گئی تھی۔ جس بیٹی کو سانجھ چھپا کے پردوں اور دیواروں کے اندر رکھتی تھی، اس کے کٹے پھٹے بدن کی تصاویر چھپ گئیں۔ بیوہ کی بیٹی بیوہ، ہوکر نہیں آئی تھی وہ تو قتل کر کے آئی تھی۔ ماں ایک قاتلہ، زانیہ کو اپنے پروں میں چھپا کر بیٹھی تھی، ہائے ممتا بھی کیا چیز ہوتی ہے...... یہی کچھ زبان زد خاص و عوام تھا۔

شہر کی گلیوں میں اب سفید پھونس الجھے بالوں والی بڑھیا (جو اپنی عمر سے کئی عشرے بوڑھی ہوچکی تھی) پرانے چیتھڑوں میں ملبوس بغیر دوپٹے، بغیر جوتا گھومتی رہتی ہے۔ اس نے بھی کھانا پانی نہیں مانگا۔ جو کوئی ہاتھ میں تھما دے تو کھا لیتی ہے۔ وہ کسی بے جان پتھر کی طرح دن بھر ایک جگہ پڑی رہتی ہے۔ اچانک اٹھ کر ''بچاؤ، بچاؤ، میری دھی کو نہ مارو'' ٹوٹی پھوٹی غیر واضح آواز میں کہتی بھاگ پڑتی ہے۔ دیوانہ وار بھاگتی ہے...... بازو لہراتی ہے، آسمان سے مدد مانگتی ہے...... کہیں جا کے نڈھال ہو کے گر پڑتی ہے۔

ذاکر ہمیش کہاں گیا؟ تباہی کی راہ دکھانے والا غائب ہوگیا اور ساری سزا اس کی دکھائی ہوئی راہ پر چل پڑنے والی کے حصے میں آگئی۔

اس سوال کا جواب برسوں بعد ملا۔

ذاکر ہمیش، چودھری کی موت کے بعد غافل نہ تھا۔ اس نے اپنا مخبر جنازے اور تعزیت کی دری پر بیٹھنے والوں میں شامل کیا ہوا تھا، قبر کشائی کی اطلاع اس کے لیے دھماکا خیز تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے قتل پر حتمی مہر لگا دی۔ قتل کے آخری سرے پر وہ تھا۔

لہٰذا اسی دن اس نے محبوبہ کا پاسپورٹ جلا دیا حتیٰ المقدور شواہد مٹائے اور شہر آرزو سے پرواز کر گیا۔ ناجائز محبت اپنی جان سے زیادہ پیاری نہیں ہوتی۔ ''میری جان'' کہنے سے کوئی جان نہیں بن جاتا۔ جو رشتے واقعی جان ہوتے ہیں انہیں ''میری جان'' کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محبوب کب کا ان فضاؤں، راہوں سے نکل چکا تھا اور محبوبہ اس کے لفظوں اور وعدوں کا ایمان لیے دن گنتی رہی، راہ تکتی رہی۔

دشمن اگر کھوج لگاتے اس کا پیچھا کرتے تو اس کا پھندے میں آجانا مشکل نہ تھا مگر ان کے انتقام کا مرکز روزینہ رہی۔

انہوں نے روزینہ سے ابا کی بیوی بننے سے لے کر ابا کی قاتلہ بننے تک کا انتقام زدوکوب، سنگسار، لہولہان کر کے لیا اور موذی ناگن کا سر کچل ڈالا۔

اس انتقام کا مستقبل ایک جمیل صورت نوکر نما لڑکا ہے جس کا نام لوگ بھول چکے ہیں۔ اسے ''سوہنی داپتر'' کی گالی سے پکارا جاتا ہے۔ یہ سوہنی داپتر مالکوں کی بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ آدھی رات کو اٹھ کر کھیتوں کو پانی لگاتا ہے۔ سویرے منہ اندھیرے مویشیوں کا چارہ تیار کرتا ہے۔ کمر میں رسہ باندھ کر اونچی کھجوروں پر چڑھ کر پھل توڑ کر لاتا ہے۔ اس کی وراثت کے غاصب سخت کلامی اور بدزبانی کرتے ہیں۔ اس کا تمسخر اڑایا جاتا ہے، دھتکارا جاتا ہے۔ بچی کھچی، روکھی سوکھی کھانے کو ملتی ہے۔ گاؤں کی کوئی نرم دل عورت اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر جب کہتی ہے۔

''ہو بہو ماں کی طرح چٹا سوہنا ہے بیچارا یتیم......''

تب ہر ظلم و زیادتی پر خاموش رہنے والے لڑکے کی آنکھوں میں غصے کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے چہرے کو کیچڑ، گارے سے گندا کر لیتا ہے۔ اسے ماں کی طرح حسین ہونے کی گالی کسی قیمت پر منظور نہیں۔

کیا حسن اس درجہ غارت گر ہوسکتا ہے کہ آپ ہی سزا اور گناہ بن جائے؟

۞۞۞



آخرت ...... احتسابِ الٰہی

تمام تر تعریف حمد و ثنا اللہ رب العزت کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا خالق، مالک اور رازق ہے۔

اللہ معبودِ برحق ہے وہی اپنے بندوں کو بندگی کی توفیق دیتا ہے۔ اللہ رحمان ہے، اپنے بندوں پر رحمت کی بارش کرتا ہے۔ اللہ عظیم ہے جس نے اس کی عظمت کا پرچار کیا، اس نے اسے بھی عظمت بخش دی۔ اللہ غفور ہے جس نے مغفرت چاہی اس نے اس کے گناہ بخش دیے۔ اللہ قدوس ہے وہ اپنے بندے کے ظاہر و باطن کو پاک کر دیتا ہے۔

اللہ مجیب الدعوات ہے وہ اپنے بندوں (دوستوں) کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور اللہ کا دوست وہی ہو سکتا ہے جو صرف اس کی ہی عبادت کرے، اسی سے مانگے، اسی کے آگے دستِ سوال دراز کرے، اسی پر بھروسا کرے اپنے دکھ اسی کو سنائے، اسی کے حضور سجدے کرے، جو اپنا رزق اللہ سے مانگے اور جو وہ عطا فرما دے اس پر قناعت کرے، اس کی عطا کردہ ہر نعمت پر شکر کرے۔ اللہ کی طرف سے دکھ ملے یا سکھ سب اپنے مولیٰ کا عطیہ سمجھ کر اسے قبول کرے۔ غرضیکہ جو بندہ اللہ کی دوستی کا طلب گار ہو تو پھر یہ سب کچھ کر کے اس کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔ اور جسے اللہ کا قرب نصیب ہو جائے اس سے زیادہ کسی بندے کی خوش بختی کیا ہو گی۔

اللہ سے دوستی فیضانِ نبوت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضان صحبت سے ولایت کی شمعیں روشن ہوئیں، نورِ ولایت صرف ان کو ملا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی دوستی کا شرف بخشا...... اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنا قرب عطا کرے، آمین۔

کروڑوں درود و سلام ہو پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آلؓ پر اور ان کے اصحابؓ پر......

آج ہمارا موضوع ''آخرت'' ہے۔ لفظ عقیدہ عقد سے ماخوذ ہے اور عربی زبان میں عقد سے مراد گرہ لگانا۔ کسی چیز کو مضبوط کرنا ہے۔ اور اس کے لغوی معنی ہیں، دل میں جمایا ہوا یقین...... ایمان...... اس لحاظ سے عقیدہ سے مراد وہ نظریات ہیں جنہیں غور و غوض کے بعد بندے کا دل قبول کر لے وہ اس پر پختہ یقین رکھے۔ چنانچہ ایمان اور عقیدہ کا یہ مطلب ہوا کہ کسی بات کو انسان اپنے قلب میں اس طرح جمع کرے کہ اب دوسری بات کے داخل ہونے کا ڈر باقی نہ رہے۔

تو ایمان چند بنیادی عقائد پر یقین کا نام ہے۔ ایمان کی حقیقت دل کی تصدیق اور زبان کا اظہار ہے۔ جب تک کسی نے زبان سے اقرار نہیں کیا آپ اسے مسلمان نہیں کہہ سکتے...... تو وہ عقائد جو ہمارے تمام اعمال کی اساس قرار پاتے ہیں پانچ ہیں۔

۱۔ اللہ پر ایمان۔ ۲۔ فرشتوں پر ایمان۔
۳۔ رسولوں پر ایمان۔ ۴۔ کتابوں پر ایمان۔ ۵۔ اور یومِ آخرت، قیامت اور جزا و سزا پر ایمان......

سلسلۂ ایمانیات کی بہت اہم اور آخری کڑی روزِ جزا (آخرت) پر ایمان لانا ہے۔ اگر اعمال کی جواب دہی کا خوف نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود یہ دنیا ظلم و ستم کی آماجگاہ بن جائے گی۔ آخرت میں حساب کتاب کا ڈر ہی انسان خصوصاً مسلمان کو اس کے فرائض کا احساس دلاتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کے نیک اعمال کا معاوضہ دنیا میں

ملے یا نہ ملے لیکن دائمی اور ابدی زندگی میں اس کا صلہ ملنا یقینی ہے۔ چنانچہ دنیاوی خسارے کے باوجود وہ اعمال صالح اختیار کرتا ہے۔

اسلام کے سلسلۂ عقائد کا یہ آخری جز اس حقیقت پر ایمان لانا ہے کہ ایک دن یہ دنیا فنا ہو جائے گی، یہاں کی زندگی اور عیش و آرام چند روزہ ہے۔ یہاں پر جو بھی افعال کیے گئے ہیں ان کا محاسبہ ہوگا اور پورا، پورا بدلہ دیا جائے گا۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ عقیدۂ آخرت دراصل بندے کو نیکیوں کی انجام دہی کے لیے آمادہ کرتا ہے...... اگر یہ خوف نہ ہو تو فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے۔ آخرت میں حساب کتاب کا ڈر ہی انسان کو اس کے فرائض کا احساس دلاتا ہے۔ اللہ کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے جس منصب کا وہ اہل ہے۔ اس کے تقاضوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں محرک ہوتا ہے...... چنانچہ دنیاوی خسارے کے باوجود وہ اعمال صالح اختیار کرتا ہے۔

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔'' دنیا میں جو بیج بوئے گئے ہیں ان کا ثمر آخرت میں حاصل ہوگا۔ لہٰذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم آخرت میں بہتر فصل کے مستحق قرار پائیں۔ عقیدۂ آخرت اللہ کے انصاف کا دن ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کے قلب میں قائم ایسی پولیس کی چوکی کا کام دیتا ہے جو ہر وقت اسے شریعت کی حدود توڑنے سے باز رکھتی ہے۔ جو اسے خواہشِ نفس کی اطاعت سے روکتی ہے جو اسے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ جس کے خوف سے وہ خطاؤں اور گناہوں سے اپنا دامن بچاتا ہے۔ جس کے باعث وہ ظاہری اور مخفی دونوں حالتوں میں نیکی پر قائم رہتا ہے۔ قرآن کریم نے آخرت کے عقیدے سے متعلق جو کچھ بیان کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو تین قسم کی زندگیاں عطا ہوئیں۔

۱۔ دنیاوی زندگی۔ یہاں پر نیکیوں اور برائیوں کا معاوضہ ایک حد تک انسان کو عطا ہوتا ہے۔ مکمل طور پر نہیں۔

۲۔ برزخ...... جو جزا و سزا کی ایک منزل ہے۔

۳۔ یوم آخرت۔ یعنی قیامت ہے۔ جب مکمل حساب کتاب کے بعد جنت یا جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ ان تینوں قسم کی زندگیوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ دنیاوی زندگی...... اس کا آغاز پیدائش سے ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ موت ہے۔ ہر جاندار کو ایک دن مرنا ہے۔ دنیا میں جو زندگی عطا ہوئی ہے وہ ہمیشگی کی نہیں ہے۔ ''ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

(سورۂ آل عمران)

اس دنیا میں کیے گئے اعمال کا پورا، پورا بدلہ ملے گا۔ دنیاوی زندگی کا خاتمہ موت ہے، اس زندگی کا سخت ترین وقت نزع کا ہے۔ جب جسم کے ہر رگ و ریشہ سے روح کو نکالا جاتا ہے۔ ملک الموت جب کسی کافر کی روح قبض کرتے ہیں تو ان کی شکل انتہائی بھیانک ہوتی ہے اس سے دھواں دھار شعلے نکلتے ہیں۔ شیطان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ آخری وقت بندے سے اس کا ایمان چھین لے۔ اسی لیے تاکید کی گئی ہے کہ جو لوگ مرنے والے کے آس پاس موجود ہیں وہ اسے کلمہ کی ہدایت کریں تاکہ آخری گفتگو کلمہ ہی ہو، یہ زندگی بنیادی طور پر جسم کی زندگی ہے۔

۲۔ برزخی زندگی۔ دنیاوی زندگی اور آخرت میں ملنے والی زندگی کے درمیان کی کیفیت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اور ان کے پیچھے برزخ ہے اس دنیا تک جبکہ وہ قیامت میں اٹھائے جائیں گے۔''

جب گناہ گاروں میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ زندگی کے پس پردہ بعض مناظر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ...... ''اے پروردگار! مجھے دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو مال چھوڑ آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کرلوں۔'' (سورۂ مومنون)

یعنی یہ سزا و جزا موت کے عالم میں شروع ہو جاتی ہے۔ اگر مرنے والا مقرب بندوں میں سے ہے تو وہ خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت میں ہے۔ یعنی برزخ میں ثواب اور عذاب کا ذائقہ چکھا دیا جاتا ہے۔

احادیث میں قبر کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قبر سے مراد وہ مٹی کا ڈھیر نہیں جہاں انسان کے جسم کو دفن کیا گیا ہے بلکہ وہ عالم مراد ہے جہاں مرنے کے

بعد انسان کی روح قیام کرتی ہے۔ احادیث سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض مردوں کو دفنا کر ان کے لیے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی برکت سے میت پر سے عذاب ختم کر دیا۔

برزخ کا عذاب امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد گناہ گاروں کے لیے کفارہ بن جاتا ہے۔ یعنی برزخ کے عذاب سے ہی گناہوں کی تلافی ہو گئی تو درست ورنہ پھر دوسرے عالم کا عذاب بھی برداشت کرنا ہوگا پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا اس سے نجات عطا فرمائے گا۔

۳۔ اُخروی زندگی...... یہ وہ زندگی ہے جو روزِ قیامت عطا کی جائے گی۔

تب پہلا صور پھونکا جائے گا جس سے تمام جاندار مر جائیں گے کائنات کا یہ کارخانہ تباہ ہو جائے گا۔ پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا جس سے تمام مُردے زندہ ہو جائیں گے...... جوق در جوق حاضر ہوں گے...... اللہ تعالیٰ ترازو قائم کرے گا، لوگوں کے اعمال وزن کیے جائیں گے اور ان کے مطابق ہر ایک کے مقدر کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

قیامت کے مختلف نام قرآن پاک میں آئے ہیں۔ مثلاً یوم الدین (جزا کا دن) یوم الجمع (لوگوں کو اکٹھا کرنے کا دن) یوم عسیر (ایک سخت دن) یوم القیامہ (مردوں کے کھڑا ہونے کا دن) یوم الفصل (فیصلے کا دن) یوم الحسرۃ (حسرت کا دن) وغیرہ

اس کے علاوہ یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اس دن اعضائے انسانی اسی کے خلاف شہادت دیں گے کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا آدمی اپنے ماں، باپ بھائی اور اولاد سے بھاگے گا۔ یہ جسم جو روز قیامت عطا ہوگا وہ نئی خلقت ہوگا دنیا میں کوئی شخص کالا یا گورا رہا ہو لیکن آخرت میں اس کا رنگ اس کی نیکیوں اور برائیوں کی وجہ سے ہوگا...... جیسا کہ سورۂ عبس میں بیان کیا گیا ہے کہ

’’کتنے چہرے اس دن روشن، ہنستے اور خوش ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی اور ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔‘‘ جنت میں سب جوان ہو کر داخل ہوں گے اور کسی کو بڑھاپا نہیں آئے گا...... اور ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے جنتی قد کے مطابق ہوگا۔

اس کے برعکس دوزخیوں کے متعلق واضح کیا گیا کہ کسی کا سر پہاڑ کی طرح ہوگا کسی کے ہونٹ لٹک رہے ہوں گے، متکبر لوگ چیونٹیوں کی شکل میں ہوں گے وغیرہ......

غرضیکہ جو کچھ ملے گا یہ دنیاوی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہوگا...... روزِ آخرت جب حساب کا کام مکمل ہو جائے گا تو لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق جنت یا دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ جنت کے دائمی اور ابدی ہونے پر تمام فرقوں کا اتفاق ہے البتہ جہنم کے دوام پر اختلاف پایا جاتا ہے...... بہر حال جمہور کی رائے یہ ہے کہ گناہ گار اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں بھیج دیے جائیں گے...... حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ ’’جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل کر دیے جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرمائے گا...... ’’دیکھو جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہوگا اسے جہنم سے نکال لو......‘‘ تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیے جائیں گے...... جمہور علما کے خیال میں جہنم سے نکالے جانے کے یہ واقعات بدعمل مومنین سے متعلق ہوں گے...... البتہ کفار و مشرکین کی مغفرت نہیں ہے۔

☆☆☆

حضرت براءؓ نے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ ایک جنازے میں شریک ہوئے ابھی قبر کھودی نہیں گئی تھی کہ ہم پہنچ گئے اور ہم سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد بیٹھ گئے...... آپؐ کے دستِ اقدس میں ایک لکڑی تھی۔ جس سے زمین کو کرید رہے تھے۔ پھر دو یا تین مرتبہ ارشاد فرمایا...... ’’یعنی اللہ کی پناہ مانگو عذاب قبر سے۔‘‘ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا...... کہ ’’جو بندہ مومن دنیا سے رخصت ہونے والا ہوتا ہے اس پر سفید چہرے والے فرشتے نازل ہوتے ہیں ان کے چہرے آفتاب کے مانند ہوتے ہیں ان کے پاس جنتی کفن اور خوشبوئیں ہوتی ہیں، وہ حد نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آ کر مرنے والے کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔ ’’اے مطمئن نفس! اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور مغفرت کی طرف نکل......‘‘ تو اس کا نفس اس

طرح بہہ کر نکل جاتا ہے جیسے مشکیزہ سے قطرہ...... جونہی وہ ملک الموت اس کے نفس کو اپنے قبضے میں لیتے ہیں تو فرشتے فوراً ان کے قبضے سے لے لیتے ہیں اور اس کو جنتی کفنوں اور خوشبوؤں میں رکھ لیتے ہیں۔ پھر اسے لے کر ملا اعلیٰ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ ہر آسمان سے گزرتے ہوئے بالآخر ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میرے بندے کی کتاب علیون میں لکھو اور اسے زمین کی طرف واپس لے جاؤ کیونکہ میں نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور مٹی میں لوٹاؤں گا اور اسی مٹی سے دوبارہ اٹھاؤں گا......''

پھر مردے کی روح اس کے جسم میں واپس آتی ہے اور دو فرشتے اس کو آکر بٹھاتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ ''تیرا رب کون ہے؟'' وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ...... پھر وہ پوچھتے ہیں کہ ''تیرا دین کیا ہے؟'' وہ کہتا ہے کہ۔ ''اسلام'' تو وہ پوچھتے ہیں کہ یہ شخص (آقا صلی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تم میں بھیجے گئے کون ہیں؟'' وہ کہتا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ ''تب فرشتے پوچھتے ہیں کہ تمہارا علم کیا ہے؟'' وہ کہتا ہے کہ میں نے اللہ کی کتاب (قرآن) کو پڑھا اس پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی۔ تو آسمان سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا اس کے لیے جنت کا فرش بچھاؤ اور جنت ہی کا لباس پہناؤ اور جنت کا دروازہ کھولو تو جنت کی ہوا اور خوشبو آئے گی اور اس کے لیے حد نگاہ تک قبر میں وسعت کردی جائے گی۔ (قبر میں کیے گئے سوال ...... بحوالہ کتاب شرح الصدور، علامہ جلال الدین سیوطی، ترجمہ علامہ محمد فیض احمد اویسی دامت برکاتہ صفحہ نمبر 93)

اور جب کافر مرنے کے قریب ہوتا ہے تو آسمان سے سیاہ چہروں والے فرشتے کمبل لے کر اترتے ہیں اور حدِ نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتے ہیں۔ ''اے خبیث جان! اللہ کے غضب اور ناراضی کی طرف نکل کر آ...... پس وہ روح جسم میں پھیل جاتی ہے اور وہ فرشتہ اس روح کو جسم سے اس طرح کھینچ لیتا ہے جیسے سیخ کو تر اون سے...... جب وہ روح نکالتا ہے تو فرشتے فوراً ہی اس سے لے لیتے ہیں اسے کمبل میں لپیٹتے ہیں، اس سے بدترین مردار کی بدبو نکلتی ہے۔ پھر فرشتے اسے لے کر ملا اعلیٰ کی طرف پہنچتے ہیں لیکن اس کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اس کی کتاب کو نچلی زمین کے سجین میں لکھو چنانچہ اس کی روح کو سجین میں پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی روح اس کے جسم میں واپس کردی جاتی ہے پھر دو فرشتے اس سے وہی سوال کرتے ہیں لیکن وہ ہر سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ ''ہائے افسوس میں نہیں جانتا۔'' تب آسمان سے آواز دینے والا دیتا ہے کہ ''اس کے لیے جہنم کا بچھونا بچھاؤ...... جہنم کا لباس پہناؤ اور دروازہ اس کی جانب کھول دو'' پس اس کی لپٹیں وہاں تک آئیں گی پھر اس کی قبر اس درجہ تنگ کردی جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں پس کر چور ہوجاتی ہیں۔

☆☆☆

جب مردے کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو نماز اس کی دائیں طرف آتی ہے اور روزے بائیں طرف اور قرآن و ذکر و اذکار اس کے سر کے پاس اور اس کا نمازوں کی طرف چلنا قدموں کی طرف آتا ہے۔ جب عذاب اس کی طرف آتا ہے تو نماز کہتی ہے کہ پیچھے ہٹ، یہ تمام زندگی تکالیف برداشت کرتا رہا اب آرام سے لیٹا ہے۔ اب عذاب بائیں طرف سے آتا ہے تو روزے یہی جواب دیتے ہیں سر کی جانب سے آتا ہے تو یہی جواب ملتا ہے۔ یعنی عذاب جس طرف سے بھی اس کی طرف آنا چاہتا ہے تو اس طرف سے اللہ کے دوست کو محفوظ پاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ دو فرشتوں کو بھیجے گا جن کی نگاہیں اچک لینے والی بجلی کے مانند ہوں گی اور آواز کڑک دار...... دانت سینگوں کے مانند...... سانسیں شعلوں کے مانند اپنے بالوں کو روندتے ہوئے چلیں گے ان دونوں کے کاندھوں کے درمیان عظیم فاصلہ ہوگا...... مومنین کے علاوہ ان کے دل کسی کے لیے مہربانی اور رحم کرنے والے نہ ہوں گے ان کا نام ہے منکر اور نکیر...... ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھوڑا ہوگا پھر مردے سے کہیں گے کہ بیٹھ جاؤ...... قبر کے تین سوال کیے جائیں گے (جو پہلے لکھ چکی ہوں)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا۔'' جب کسی کے مرنے کا وقت قریب آتا ہے تو ملک الموت سے کہا جاتا

ہے کہ اس کے سر کو سونگھو......! تو وہ سونگھ کر بتاتے ہیں کہ اس کے سر میں قرآن کی خوشبو پاتا ہوں...... پھر کہا جاتا ہے کہ اس کے قلب کو سونگھو......! تو وہ اس کے قلب کو سونگھ کر بتاتے ہیں کہ اس کے قلب میں روزوں کی بو ہے...... پھر کہا جاتا ہے کہ اس کے پیروں کو سونگھو...... وہ بتاتے ہیں کہ اس کے قدموں میں قیام کی بو ہے...... پھر کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے نفس کی حفاظت کی تو اللہ نے بھی اس کو محفوظ کر دیا۔

علما نے فرمایا کہ عذابِ قبر دراصل عذابِ برزخ ہی کو کہتے ہیں لیکن قبر کی طرف اضافت اس لیے کی گئی ہے کہ لوگ بالعموم قبر میں مدفون ہوتے ہیں۔ ورنہ خواہ کوئی شخص جل جائے یا ڈوب جائے یا اسے کیڑے مکوڑے کھا جائیں یا ہواؤں میں اڑا دیا جائے سب پر عذابِ برزخ ہوگا...... عذاب و ثواب روح اور جسم دونوں کے لیے ہے۔

وہ اعمال صالح جن کی برکت سے عذابِ قبر سے نجات ملتی ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ نے روایت کی ہے کہ ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ آج رات میں نے خواب دیکھا کہ ایک شخص کی روح قبض کرنے کو ملک الموت تشریف لائے لیکن اس کا ماں، باپ کا اطاعت کرنا سامنے آگیا اور وہ بچ گیا...... ایک شخص پر عذاب چھا گیا لیکن اس کے وضو نے اسے بچالیا...... ایک شخص کو شیاطین نے گھیر لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ذکر نے اسے بچالیا...... اور ایک شخص کو عذاب کے فرشتوں نے گھیر لیا لیکن اسے نماز نے بچالیا۔ ایک شخص نے دیکھا کہ پیاس کی شدت سے زبان نکالے ہوئے تھا اور ایک حوض پر پانی پینے جاتا تھا مگر لوٹا دیا جاتا تھا کہ اتنے میں اس کے روزے آگئے۔ اور اس کو سیراب کر دیا۔

ایک شخص کو دیکھا کہ انبیا علیہم السلام حلقے بنائے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن دھتکار دیا جاتا تھا کہ اتنے میں اس کا غسل جنابت آیا اور اس کو میرے پاس بٹھا دیا۔ ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے ہر طرف تاریکی ہی تھی تو اس کا حج وعمرہ آگیا اور اس کو منور کر دیا۔ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مسلمانوں سے گفتگو کرنا چاہتا ہے لیکن کوئی اس کو منہ نہیں لگاتا تو صلۂ رحمی آکر مومنین سے کہتی ہے کہ تم اس سے کلام کرو...... ایک شخص کے جسم اور چہرے کی طرف آگ بڑھ رہی ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے بچا رہا ہے تو اس کا صدقہ آگیا اور اس کو بچالیا۔ ایک شخص کو زبانیہ نے چاروں سے گھیر لیا لیکن اس کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر آیا اور اسے بچالیا اور رحمت کے فرشتوں کے حوالے کر دیا۔ ایک شخص کو اس کا نامۂ اعمال بائیں طرف سے دیا گیا تو اس کا خدا سے ڈرنا آگیا اور نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ ایک شخص کا وزن ہلکا رہا تو اس کا سخاوت کرنا کام آگیا اور نیکیوں کا وزن بڑھ گیا۔ ایک شخص جہنم میں گر گیا لیکن اس کے وہ آنسو آگے آگئے جو اس نے خشیت الٰہی میں بہائے اور وہ بچ گیا۔ ایک شخص پل صراط پر کھڑا تھا اور ٹہنی کی طرح گزر رہا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن آیا اور اسے بچالیا۔ اور وہ پل صراط سے گزر گیا۔ ایک شخص جنت کے دروازے پر پہنچ گیا لیکن جنت کا دروازہ بند ہوگیا تو توحید کی شہادت آئی اور دروازہ کھل گیا...... کچھ لوگوں کے ہونٹ کاٹے جا رہے تھے میں نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ لوگوں کے درمیان چغل خوری کرنے والے ہیں۔ کچھ لوگوں کو ان کی زبانوں سے لٹکا دیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ بلاوجہ الزام گناہ لگانے والے ہیں...... حضرت قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بہت ہی عظیم ہے اس میں بعض ایسے مخصوص اعمال کا ذکر کیا گیا ہے جو خاص آفات سے محفوظ رکھیں گے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کی ہے کہ جس نے سورۂ تبارک (سورۂ ملک) ہر رات پڑھی اللہ تعالیٰ اسے عذابِ قبر سے محفوظ رکھے گا۔ (الٰہی آمین)

بعض یمنی صالحین سے مروی ہے کہ وہ ایک مردے کو دفن کر کے واپس ہونے لگے تو انہوں نے قبر میں مارنے اور کوٹنے کی آواز سنی پھر قبر سے ایک کالا کتا نمودار ہوا۔ شیخ نے کہا۔ کہ تیری خرابی ہو تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں میت کا عمل ہوں، شیخ نے کہا کہ کیا تیری پٹائی ہو رہی تھی یا اس مردے کی؟

اس نے کہا کہ سورۂ یسین اور دوسری سورتیں اس

کے پاس تھیں وہ میرے اور اس کے درمیان حائل ہوگئیں اور مجھ کو مار بھگایا۔

☆☆☆

یہ تو برزخی معاملات تھے اب سوچیں کہ محشر میں کیا ہوگا۔ مختصراً ذکر کررہی ہوں...... جب مخلوق دوبارہ زندہ کی جائے گی، وہ اپنے متعلق اچھا یا برا فیصلہ سننے کے منتظر ہوں گے...... ان کی عاجزی، رسوائی اور پریشانی کا عالم کیا ہوگا، جب لوگ قبور سے ننگے بدن اور ننگے پاؤں اٹھ کر محشر کے میدان کی طرف روانہ ہوں گے جس میں کوئی اونچ نیچ نہ ہوگی...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن لوگ ایک صاف میدان میں کھڑے ہوں گے جس میں کوئی درخت نہ ٹیلا اور نہ کوئی عمارت ہوگی بظاہر یہ میدان دنیا جیسا ہوگا مگر برائے نام زمین ہوگی۔ زمین کے درخت، پہاڑ، دریا اور وادیاں سب ختم کردی جائیں گی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوگی۔ قیامت کے دن انسان تین حالتوں پر ہوں گے۔ سوار، پیدل، منہ کے بل چلنے والے۔ یہ نہایت سنگین حالت ہوگی مخلوق جمع ہوگی۔ عرصۂ محشر سات آسمانوں، سات زمینوں کے فرشتوں، جنات، شیاطین، انسانوں، جنگلی جانوروں، درندوں اور پرندوں سے بھرا ہوگا۔ سورج سروں کے قریب ہوگا تو اس کی گرمی کیسی ہوگی؟ اب زمین پر عرش الٰہی سایہ فگن ہوگا۔ اس کے سایہ میں مقربین ہوں گے۔ باقی سورج کی گرمی میں ہوں گے حرارت سے غش آتے ہوں گے۔ اللہ کے حضور حاضری کے خیال سے ندامت اور شرمندگی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ خوف وہراس کی آگ ہر بال سے پسینہ بہارہی ہوگی۔ میدان پانی کی طرح بھر جائے گا جسم بقدر گناہ پسینوں میں ڈوبے ہوں گے۔ بعض کے گھٹنوں تک، بعض کی کمر تک اور بعض کے کانوں کی لو تک پسینہ ہوگا۔

جناب مقاتل بنؒ کا ارشاد ہے کہ قیامت کو ایک سو برس مخلوق خاموش کھڑی رہے گی اور بات نہ کرے گی۔ ایک سو برس اندھیرے میں حیرانی میں ایک سو برس اضطراب میں دور قیامت کا پچاس ہزار سال کا ایک دن ایک ایماندار کے لیے چھوٹی فرض نماز کی طرح گزر جائے گا۔ خاتم الانبیاء ﷺ کا ارشاد ہے کہ بندے کے قدم اس وقت تک نہیں ہلیں گے جب تک وہ چار سوالوں کا جواب نہ دے لے۔

1۔ عمر کیسے اور کس کام میں کٹی؟
2۔ جسم کس کام میں بوسیدہ ہوا؟
3۔ علم پر کس قدر عمل کیا؟
4۔ دولت کیسے کمائی؟ اور کہاں خرچ کی؟

☆☆☆

حضرت رابعہ بصریؒ ہر وقت ملول رہا کرتی تھیں۔ ان کی آنکھوں کو شاید ہی کسی نے خشک دیکھا ہو ورنہ آنسو آبشار کے مانند بہتے رہتے۔ جب مجلس میں دوزخ کا ذکر ہوتا تو حضرت رابعہ بصریؒ اس کی دہشت سے بے ہوش ہو جاتیں، آپ کی سجدہ گاہ ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی۔

حضرت رابعہ بصریؒ فرماتی ہیں کہ دنیا میں وہی شخص ہنستا ہے جسے اطمینانِ قلب حاصل ہو اور میں اس نعمت سے محروم ہوں جب آپ سے اس قول کی وضاحت چاہی تو فرمایا...... کہ ”میں نے محبت کے لیے صرف ایک ہی ہستی کا انتخاب کیا ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات پاک...... میں اس خوف سے روتی رہتی ہوں کہ کہیں میری زندگی بھر کی محنت اکارت نہ ہوجائے اور مرتے وقت مجھ سے کہا جائے کہ تو ہمارے لائق نہیں ہے۔“

حضرت رابعہ بصریؒ نے ساری زندگی تجرد کے عالم میں گزاری۔ اس زمانے کے کچھ لوگوں نے آپ کی اس روش پر اعتراض کیا اور کہا کہ آپ خود کو عارفہ کہتی ہیں مگر پیغمبر اسلام ﷺ کی اس معروف سنت پر عمل نہیں کرتیں؟ آپؒ نے فرمایا...... مجھے تین باتوں کا اندیشہ ہے اگر تم مجھے اندیشیوں سے نجات دلادو تو میں آج ہی نکاح کرلوں گی۔ پہلا یہ کہ مرتے وقت ایمان سلامت لے جاؤں گی یا نہیں؟ دوسرا یہ کہ میرا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یا بائیں ہاتھ میں؟ تیسرا یہ کہ قیامت کے دن ایک گروہ کو دائیں طرف سے بہشت میں داخل کیا جائے اور دوسرے گروہ کو بائیں طرف سے دوزخ میں...... تم لوگ بتاؤ کہ میں کس طرف ہوں گی؟ حضرت رابعہ بصریؒ کے تینوں سوالوں کے جواب میں لوگوں نے کہا ہمیں کچھ نہیں

معلوم...... بس اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کا کیا حشر ہوگا؟ تب آپؐ نے پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''تم خود ہی بتاؤ کہ جس عورت کو اس قدر غم ہوں وہ شوہر کی خواہش کس طرح کرسکتی ہے؟''

☆☆☆

حضرت عمر فاروقؓ فرماتے تھے کہ ''اگر مجھے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کیا جائے اور مجھے اختیار دیا جائے کہ چاہوں تو جل کر خاک ہو جاؤں یا چاہوں تو صبر کروں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کہاں جاؤں گا تو میں جل کر خاک ہونا پسند کروں گا، ایک اور مقام پر آپ فرماتے ہیں کہ ''میری خواہش ہے کہ میں ایک درخت ہوتا کاٹ دیا جاتا۔''

حضرت حسن بصریؒ کی یہ حالت تھی کہ ان کو جو کوئی دیکھتا تو ان کے شدید غمزدہ ہونے کی وجہ سے گمان کرتا کہ ان پر ابھی کوئی مصیبت طاری ہوئی ہے۔

وہ دل جو آخرت کے خوف اور اللہ کے ڈر کی وجہ سے غمگین و پریشان رہتا ہے وہ اللہ کا پسندیدہ دل ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ جن کو تقویٰ اور خوفِ الٰہی میں اپنی مثال آپ کہا جاتا ہے۔ آپؒ چالیس سال تک متواتر صبح کی نماز عشا کے وضو سے ادا فرماتے رہے پوری رات خوفِ الٰہی میں روتے رہتے۔ عذابِ الٰہی کے متعلق کوئی آیت سن لیتے تو بے ہوش ہو جاتے اور کبھی اپنی داڑھی پکڑ کر ایک مجرم کی طرح بارگاہ الٰہی میں معافی مانگتے کہ ''الٰہی! اپنے مجرم ابو حنیفہ کو معاف کردے'' اور جب روتے، روتے کہیں آنسو تھمتے تو فرماتے...... ''اگر قیامت کے دن ابو حنیفہ کو معاف کر دیا گیا تو یہ بڑی حیرانی اور تعجب کی بات ہوگی۔''

آج ہمارے معاشرے میں دیگر فسادات ایمانی میں سب سے زیادہ قابلِ افسوس بات مسلمانوں میں خوف الٰہی کی عدم موجودگی ہے۔ آخرت میں اللہ کے سامنے حاضر ہونے کا احساس ختم ہو چکا ہے۔ اگر ہم اپنے اسلاف پر نظر ڈالیں اور ان کی زندگیوں میں خوفِ الٰہی کا مطالعہ کریں تو ہماری حالت بھی غیر ہو جائے اور شرم و ندامت سے پانی، پانی ہو جائیں کہ اس قدر عظیم ہستیاں جن کی زندگی کا ہر، ہر لمحہ یادِ الٰہی اور ذکرِ الٰہی میں گزرتا ہو مگر پھر بھی مخلوق کے سامنے اللہ کے سب سے بڑے مجرم کی طرح رہتے ہیں۔ کتنے گنوار اور بدبخت ہیں کہ ذرہ بھر خوفِ الٰہی نہیں رکھتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم بہت ظالم، غافل اور گناہ گار ہیں ہماری زندگیوں کے شب و روز طلب دنیا جیسے شیطانی پھندوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اپنے نفس کے اسیر ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عقیدۂ آخرت پر پختہ یقین عطا کرے تاکہ اپنی آگے کی منزل کے لیے کچھ زادِ راہ اکٹھا کیا جاسکے...... اور اس دنیا میں رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ نیکیاں اکٹھا کر کے اپنے رب کو راضی کرسکیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی آخرت کی منزلیں آسان کرے، آمین

حرفِ آخر:

اللہ رب العزت کی عظیم بارگاہ میں انتہائی لرزتے دل کے ساتھ دعا گو ہوں کہ وہ اس مضمون میں کوئی غلطی، کوئی کوتاہی اور پیارے آقا کے فرمودات میں کوئی کمی یا کوتاہی ہوگئی ہو تو اے میرے رب مجھ کمزور سی ہستی کو معاف کردے۔ میری کوتاہیوں کو درگذر فرمادے، آمین۔

اس مضمون میں جن عظیم ہستیوں کے کتب سے مضامین لیے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

کتابیات

1۔ مکاشفتہ القلوب، حضرت امام ابو حامد محمد الغزالیؒ
2۔ احیاء العلوم۔ حضرت امام غزالیؒ
3۔ شرح الصدور۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ
4۔ سنی بہشتی زیور۔ علامہ عالم فقری
5۔ اللہ کے سفیر۔ جناب خان آصف مرحوم
6۔ اسلامی تربیتی نصاب جلد دوئم۔ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب
7۔ اسلامیات لازمی۔ پروفیسر مفتی منیب الرحمن صاحب
8۔ دین کامل۔ محترمہ نزہت رئیس

محبت زندگی ہے زندگی کا حسن باطن بھی

شائستہ زریں

محبت اس کائنات کی سب سے اولین اور عظیم سچائی جسے خالقِ کائنات نے اپنے نور کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے نور میں منتقل کر کے ثابت کیا۔

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
(میر)

محبت وہ فطری اور آفاقی جذبہ ہے جو اپنے اندر سمندر کی سی وسعت، گہرائی اور ماں جیسا ظرف رکھتا ہے۔ جذبۂ محبت اگر دلی تسکین کا باعث بنتا ہے تو یہی روح کی آسودگی کی ضمانت بھی ہے۔ محبت جس دل کی مکین بن جاتی ہے اس دل میں دھنک رنگ بکھر جاتے ہیں، اجالوں کا بسیرا ہو جاتا ہے لیکن جب محبت پر ضد اور انا کے منفی جذبات حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ خطا بھی سزا بن جاتی ہے اور محبت میں درگزر کی روایت دم توڑنے لگتی ہے۔ گویا انا محبت کی شکست ہی نہیں موت بھی ہے اور درگزر محبت کی فتح اور طاقت بن کر محبت کو فاتح عالم بنا دیتی ہے۔ جگر نے کہا تھا۔

دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر

اور محبت کا اصل حسن محبّ وحبیب کی باہمی وفا اور درگزر میں ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے محبت کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔

مرحومہ شازیہ چوہدری نے کیا بھلی بات رقم کی تھی۔ ”محبت رشتوں کو توڑنا نہیں جوڑنا سکھاتی ہے، غلط اور ناجائز راستوں پر بھٹکنا نہیں سکھاتی۔“

اللہ اگر توفیق نہ دے انساں کے بس کی بات نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں
(جگر)

حسبِ روایت ہم نے ”محبت نمبر“ کے لیے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور سروے کے شرکاء سے معلوم کیا کہ......

سوال 1 ☆ محبت ایک فطری اور آفاقی جذبہ ہے، یہ جذبہ کب آپ کے لیے دلی تسکین اور خوشی کا باعث بنا؟

سوال 2 ☆

محبتوں میں خطائیں تو ہو ہی جاتی ہیں
محبتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا

کیا آپ شاعر کے اس خیال سے متفق ہیں؟ سبب؟

سوال 3 ☆ محبت کے موضوع پر کوئی دلگداز شعر یا دل لگتی بات؟

تسنیم منیر علوی
(مستقل قاری ولکھاری)

1 ☆ محبت کے لیے ابھی تک کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہوا۔ زندگی میں کئی لمحات ایسے آئے دل پکار اٹھا کہ ہاں یہی وہ جذبہ ہے۔ بقول مفکر ”محبت وہ انمول جذبہ ہے جس کو کسی مقبرے کی ضرورت نہیں“۔ ہمارے دل کی تسکین اور سکون کے لمحات تو زندگی میں بارہا جھلک دکھاتے رہے اور دل مسرور وشاد ہوتا رہا۔ فطری محبت تو خونی رشتوں سے



ہونا ایک لازمی جز ہے لیکن آفاق میں موجود محبت کے کئی جلوے دیکھے تو دل نے کہا اے محبت تیرے کتنے رنگ ہیں۔ شادی کے بعد جب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے

ہمارے شریکِ حیات چار سال کے لیے امریکا جا رہے تھے تو اُن کی روانگی کے وقت دل نے صدا دی...... محبت دکھوں اور محبت کا ہی تسلسل ہے اور اب اس وقت لمحۂ موجود میں ان کی دائمی جدائی کے بعد ہمارے پاس ان کی نشانی بچے ایک طمانیت کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ تو چلے گئے لیکن ہمارے پاس متاعِ حیات چھوڑ گئے۔ ابھی تو حیات ہے، حرکت مسلسل ہے۔ ان شاء اللہ محبت گاہے بگاہے گل کھلاتی رہے گی اور ہم یوں جذبات کے سمندر میں غوطہ زن ابھر ابھر کر اور کبھی تیر کر لکھتے رہیں گے۔

2☆ محبت نام ہی درگزر اور قربانی کا ہے، خامیوں کو نظر انداز کر کے خوبیوں پر نظر رکھنے کا نام محبت ہے۔ شاعر حضرات نے تواتر سے محبت کو موضوعِ سخن بنایا۔ محبت نفع و خسارے کا کھیل نہیں۔

ہم نے دکھوں کو بھی محبت کا تسلسل جانا
ہم کوئی تم تھے کہ زمانے سے شکایت کرتے

محبت کا جذبہ درگزر سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ شاعر کے خیال سے متفق ہونا ہمارے لیے ضروری ہے ورنہ جگر کیوں کہتے "یہ عشق نہیں آساں" اور اس کو آگ کا دریا قرار دیتے۔

ہم سے ایک بار بھی جیتا ہے نہ جیتے گا
وہ تو ہم جان کے کھا لیتے ہیں ماتیں اکثر

مات ہونا محبت ہی کی نشانی ہے جو یہ نہیں تو محبت نہیں۔ یہ ہی وہ جذبہ ہے جو سرنگوں ہو کر پیمانہ بھرا کرتا ہے۔ اس پر فخر کرتا ہے۔ پروین شاکر کہتی ہیں۔

زندگی میں یہ ہنر بھی آزمانا چاہیے
جنگ کسی اپنے سے ہو تو ہار جانا چاہیے

سو دوستو! محبت ایک خطا ہے اور خطا درگزر مانگتی ہے۔

3☆ اس دنیائے رنگ و بو میں محبت پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے اور رہتی دنیا تک ضبطِ تحریر میں لایا جاتا رہے گا۔ یہ انتخاب بہت دشوار ہے۔ اور وہ بھی ایک شعر؟ یہاں تو شعر ہاتھ باندھے قطار اندر قطار رقص کر رہے ہیں۔

تم جو دل کا حال پوچھتے ہو......
کتنا مشکل سوال پوچھتے ہو

☆☆☆

ایک لفظ محبت کا اتنا سا فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

☆☆☆

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

قندیل جعفری
(شاعرہ)



1☆ محبت کسی بھی صورت میں ہو ہمیشہ تسکین اور خوشی کا باعث ہوتی ہے

دراصل میرے نزدیک محبت ایک کیفیت کا نام ہے جو کبھی دیرپا ہوتی ہے، کبھی عارضی۔ میری دیرپا محبت اپنے passion اپنے کام کے ساتھ قائم ہے جو میری تسکین کا باعث ہے۔

2☆ محبت سچی ہو تو خطاؤں کو درگزر کر دیا جاتا ہے لیکن پھر بھی یہ خطاؤں پر منحصر ہے کہ وہ کس نوعیت کی ہیں۔ بے وفائی یا دھوکا دہی کو درگزر نہیں کیا جا سکتا۔

3☆

زندگی کس طرح بسر ہوگی
دل نہیں لگ رہا محبت میں

☆☆☆

کون چاہے گا تمہیں میری طرح
اب کسی سے نہ محبت کرنا

شگفتہ حیا ترمذی
(شاعرہ، کالم نگار)

1- بلاشبہ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات محبت کے پھیلاؤ کے لیے بنائی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے محبت دنیا کی ہر محبت کا آغاز ہے۔ اللہ مہربان ہے ستر ماؤں سے بڑھ کر اپنی مخلوق سے پیار کرتا ہے۔ جس نے خونی رشتوں کی صورت میں ہم کو محبت عطا کی۔ جہاں تک مجازی خدا کا سوال ہے تو قرآن حکیم نے مرد و زن کے مابین سچی محبت کو نکاح کا نام دیا ہے۔ میرے شریک حیات نے مجھے بے انتہا محبت دی، قدم، قدم پر میرا خیال رکھا، میرا دفاع کیا۔ میں خوش قسمت عورت ہوں جسے اللہ نے سچی محبت سے نوازا بلکہ اس محبت کو نکاح سے لے کر آج تک میرے لیے تسکین اور خوشی کا باعث بنایا۔

2- جی بالکل سو فیصد متفق ہوں کیونکہ آج کے دور میں وہ محبت عنقا ہو گئی ہے جو روح کی اولین ضرورت اور دل کی تسکین کا سبب بنتی ہے تو ایسے میں خطائیں بلکہ قناعت نہ ہونے کے سبب محبوب سے.... بے وفائی تک سرزد ہو جاتی ہے کیونکہ انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا تو ایسے میں ہر محبت کرنے والے کو اپنا دل بڑا رکھنا اور درگزر سے کام لینا چاہیے، ورنہ ہم بہت کچھ کھو کر پچھتاوے کا شکار ہو سکتے ہیں۔

3- محبت احساسات کی تفسیر کا نام ہے۔ محبت شخصیت کی تعمیر کرنے والا خوب صورت جذبہ ہے جو انسان کو خوب صورت بنا دیتا ہے بقول شاعر

گلابوں کی طرح دل شبنم میں بھگوتے ہیں
محبت کرنے والے خوب صورت لوگ ہوتے ہیں

ندا جہانگیر
(ریڈیو اناؤنسر)

1- بلاشبہ محبت ایک فطری جذبہ ہے جو کسی بھی اپنائیت رکھنے والے رشتے سے ہو سکتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں محبت کے غلط معنی لیے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے ہم اخلاقی پستی کا شکار ہو رہے ہیں۔ محبت انسان کے حصول تک محدود ہو گئی۔ محبت دل اور روح سے ہوتی ہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہوتی اور یہ جذبہ خوشی کا باعث بنا جب مجھے محبت کے بعد پھر

جواب
(آرمی پبلک اسکول پشاور کے سانحے پر)

کئی ظلم توڑے تم نے ان ننھی سی جانوں پر
کیا مل گیا تم کو یہ ظلم کر کے ان پر
گالوں پہ سرخیاں اور ہاتھوں میں کتاب لیے
آئے تھے پڑھنے وہ ہاتھوں میں قلم، نصاب لیے
وہ بچہ ضد کر رہا تھا ماں آج مجھے نہیں جانا
وہ کہہ رہی تھی آج چلے جاؤ کل پھر نہیں جانا
وہ اپنے آج میں اپنی نشانی چھوڑ گیا
اِک اسکول ہنستے، ہنستے خاموش ہو گیا
یہ کیا ہوا تھا کہ سب سہم سے گئے
اپنا لہو اپنی ذات بھول سے گئے
کتنے معصوموں کو خوں آشام کیا تم نے مگر
وہ اپنا کفن گھر سے پہن کر آئے تھے
یوں چھپ کر پیٹھ پیچھے تو بزدل وار کرتے ہیں
جو سچے ہوتے ہیں وہ بھلا کہاں ڈرتے ہیں
وہ جیت گئے پھر بھی، تم ہار گئے اُن سے
وہ جنگ تھی تمہاری اُن سے یہ جنگ ہماری ان سے
وعدہ ہے جس روز تم سامنے آؤ گے
اس قوم کے نوجوانوں کا جذبہ دیکھ پاؤ گے
اس قوم کے جذبے کی طاقت کو تم جان بھی نہ پاؤ گے
ہو کون یہ خود بھی تم پہچان نہ پاؤ گے

کاوش: اریبہ ارشد، راول پنڈی

محبت نہیں ہوئی۔ محبت کا دوسرا نام قربانی ہے۔ جب اپنے جذبوں کو دوسروں کی خوشی کی خاطر قربان کرتے ہیں تو وہ ہوتی ہے محبت۔ جب آپ کے سینے میں دل تو ہوتا ہے لیکن دھڑکنوں پر آپ کا زور نہیں ہوتا۔

عشق وہ نہیں جو آپ کو میرا کر دے
عشق تو وہ ہے جو آپ کو کسی کا ہونے نہ دے

2- جی ہاں میں متفق ہوں کہ انسان خطا کا پتلا

ہے اور محبت میں بھی خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ کبھی جذبات کی رو میں بہک کر محبوب پر ظلم توڑ دیتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ عاشق پر محبوب ستمگر ہوتے ہیں لیکن عاشق، محبوب کی ہر خطا معاف کر دیتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ بھول جاتا ہے کیونکہ اس کو ہر حال میں محبوب کی خوشی عزیز ہوتی ہے۔



-3

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے، جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

☆☆☆

دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے

شفا سعید
(معلمہ، افسانہ نویس)

1- محبت کا جذبہ تب دلی تسکین اور خوشی کا باعث بنا جب دو محبت کرنے والوں کو مقدس رشتے میں بدلتے دیکھا کہ یہی محبت کی معراج ہے۔

2- ہاں جی! میں متفق ہوں کیونکہ میرا قریبی مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات انسان کے آگے اس کا فرض آجاتا ہے جو اسے خطا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اسی خطا پر لازمی درگزر کرنا چاہیے ورنہ جو خطا جان بوجھ کر یا تکلیف دینے کی غرض سے کی جائے وہ پھر درگزر کرنا مشکل ہوگا۔

3- ''مت جاؤ ہم سے اتنی دور کہ جب لوٹو تو ہمیں سفید لباس میں نہیں سفید کفن میں دیکھو.....''

ہم نے اسے ٹوٹ کے چاہا تھا اسے بھی صرف ہماری خواہش تھی
جدائی ہمارا نصیب نہیں صرف ہماری آزمائش تھی

مریم عرفان
(ٹیکسٹائل ڈیزائنر، قلمکار)

1- میں محبت کے افسانوی معنوں پر یقین نہیں رکھتی۔ میرے لیے محبت کا پہلا احساس ماں بیٹی کے رشتے میں روبرو ہوا اپنی سب سے پاکیزہ شکل میں۔ محبت سب سے پہلے گھر والوں کی صورت میں سامنے آئی اور میں نے اسے ہر رشتے میں ایک انمول نعمت کی طرح محسوس کیا، سیکھا، پایا۔ عمر کے ساتھ، ساتھ محبت کے کئی روپ اور چہروں سے واقف ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی میں محبت کے کئی روپ دیکھے ہیں جو وقتاً فوقتاً خوشی اور تسکین کا سبب بنے، میری زندگی کا اہم حصہ اور جینے کی وجہ بنے۔ پھر چاہے وہ اللہ کی محبت ہو، اپنی ذات سے محبت، دوست احباب سے محبت ہو یا ہمارے گھر میں موجود پالتو جانوروں کی محبت۔ یہ سب کہیں نہ کہیں میرے لیے نہ صرف باعثِ تسکین ہیں بلکہ میرے وجود کا اہم حصہ بھی ہیں جو مجھے مجھ سے جوڑے رکھتے ہیں اور گاہے بگاہے مجھے زندہ رہنے کا احساس دلاتے ہیں۔



2☆ میں سمجھتی ہوں خطاؤں کی معافی ہو سکتی ہے لیکن گناہوں کی معافی ہرگز نہیں۔ اگر انسان واقعی سچے دل سے اپنی غلطی پر شرمندہ ہو تو ہر خطا قابلِ معافی ہوتی ہے۔ ہاں ان خطاؤں کی ہرگز معافی نہیں ملنی چاہیے جو گناہوں جیسی ہوتی ہے جہاں آپ کی عزت، احساس اور قدر نہ ہو تو ایسے رشتے کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے میں شاعر کے اس خیال سے کسی حد تک اتفاق کرتی ہوں۔

-3

حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی
نہ اردو نہ ہندی نہ ہندوستانی

حمنہ نعیم
(قاری پاکیزہ)

-1

محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

محبت ہمیشہ ہی میرے لیے تسکین، خوشی اور مسرت کا باعث رہی ہے۔ ماں باپ کے روپ میں، بہن بھائیوں کی محبت کی صورت میں، دوستوں کی محبت میں اور اب منگیتر کی صورت میں۔



ہر عمر کی محبت کا اپنا مزہ ہے، اپنا روپ ہے اور ہر محبت آفاقی ہے۔ زندگی سے محبت نکال دیں تو شاید زندگی نہ رہے۔

2- بالکل متفق ہوں۔ کیونکہ محبت کا تقاضا ہی درگزر کرنا ہے۔ محبت اگر سچی ہے تو پھر ہر خطا کی سزا نہیں بلکہ نظر انداز کر دینی چاہیے ہر خطا کیونکہ محبت مانگتی ہے اپنی، اپنے ہونے کی گواہی اور غلطیوں کو نظر انداز کرنے ہی سے محبت امر ہوتی ہے۔ اور پھر جب محبت ہے تو پھر خطائیں کیسی؟

-3

محبت جیت ہوتی ہے
محبت مات ہوتی ہے
محبت ذات ہوتی ہے
محبت ذات کی تکمیل ہوتی ہے
محبت خوشبوؤں کی لے
محبت موسموں کی دُھن
محبت آبشاروں کے نکھرتے پانیوں کا من
محبت جنگلوں میں رقص کرتی مورنی کا تن
محبت چلچلاتے گرم صحراؤں میں
ٹھنڈی چھاؤں کے مانند
محبت برف پڑتی سردیوں میں دھوپ بنتی ہے
محبت دل، محبت جاں
محبت روح کا درماں

امجد اسلام امجد کی نظم ''محبت'' محبت کی تفسیر لگتی ہے جو ہر کسی کے دل کو لگتی ہے۔ پتھر دل بھی ہو تو متاثرِ محبت ہو جاتا ہے اور محبت ہر لمحہ میرے ساتھ ہوتی ہے۔

☆☆☆

عزیز قارئین!

سروے کے شرکا کے تجربات، نظریات اور احساسات و جذبات سے ان کے دیے جانے والے ہمارے سوالوں کے جوابات کی صورت میں آپ آگاہ ہوئے سچ تو یہ ہے کہ جذبۂ محبت کی تسکین اور مسرت اس وقت اہلِ دل کے حصے میں آتی ہے جب دلوں میں کشادگی ہو اور بقول امجد اسلام امجد

محبت جس طرف جائے زمانہ ساتھ چلتا ہے

محبت اعلیٰ ظرف بنا دیتی ہے اور درگزر کا عادی بھی۔ مستنصر حسین تارڑ نے کیا خوب لکھا کہ ''ایک فائل دل کی بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی نام ہوتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہو تو وہ کتاب نہیں رہتی بلکہ انسائیکلو پیڈیا بن جاتی ہے۔''

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

محبت روشنی ہے جو پھیل جائے تو چہار جانب اجالے بکھیر دیتی ہے، سو محبت کیجیے، محبت کو فروغ دیجیے اور محبت کو تحفظ دیجیے محبت کی عزت کیجیے کہ یہی محبت انسانیت کی بنیاد ہے۔

آنے والے سال کا استقبال محبت سے کیجیے۔ یہی پیغام ہے قارئین پاکیزہ کے لیے مدیرۂ اعلیٰ، مدیرہ، مدیرہ معاون اور میری جانب سے۔

☆☆☆





اجنبی (اجوؔ بھائی)

آواز کی دنیا کا ساحر، ممتاز براڈکاسٹر، ہردلعزیز اینکر،

منجھا ہوا تھیٹر، ٹی وی اور ڈبنگ آرٹسٹ، اسکرپٹ رائٹر... صحافی

خدا کی اس کے گلے میں عجیب قدرت ہے
وہ بولتا ہے تو اِک روشنی سی ہوتی ہے

کمسنی ہی سے آواز کی دنیا کے اسیر اجنبی نے بزم طلبا سے اپنے ریڈیائی سفر کا آغاز کیا۔ آواز کی دنیا سے رشتہ مستحکم ہوا، مقبولیت بڑھی اور پھر پاکستان اور دیگر ممالک میں اجنبی میڈیا میں چاہنے والوں کے ہر دلعزیز اجوؔ بھائی بن گئے۔ پاکستان میں ایف ایم 101 سے بطور RJ وابستہ رہے، 106.2 ہم ایف ایم کے

نیٹ ورک پروگرامنگ ہیڈ رہے۔ چار سال دبئی میں ریڈیو چینل کے ہیڈ رہے۔ امریکا کے ریڈیو سلام نمستے کے لیے پروڈکشن منیجر کی حیثیت سے فرائض ادا کیے۔ آج کل اپنا کراچی ایف ایم 107 پر پروگرامنگ ہیڈ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ فن اداکاری کا آغاز ۱۹۹۷ء میں تھیٹر سے کیا۔ ڈاکٹر ایس این ایم شہزاد نے آرٹس کونسل کے اسٹریٹ ٹیکنیک تھیٹر فیسٹیول میں اجنبی کی صلاحتیں پہچانتے ہوئے کام کروایا۔ اداکاری کے میدان کی یہ پہلی کامیابی تھی جس نے اجنبی کے لیے مزید کامیابی کے دروازے کشادہ کر دیے۔ مسٹری تھیٹر میں اجنبی نے اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ٹی وی کے کئی سیریلز میں مختلف کردار کیے...... اے آر وائی پر سٹ کام بتاشے لکھا۔ ساتھ ہی ٹی وی ون پر بھٹی اینڈ ڈی ڈی سیزن ۲ کا بھی ایک اسپیل لکھا۔ ۲۰۱۲ء میں سی این بی سی کے شو ''جرم'' کی میزبانی کرتے ہوئے اینکر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ اس کے بعد حادثہ اور سامنے شو ''خطرہ'' کے اینکر بھی رہے۔ کئی ترکی ڈراموں میں ڈبنگ کی لیکن ارتغرل غازی میں نویان کے کردار میں اجنبی کی آواز ان کی پہچان بن گئی۔ کمرشل وائس اوور اور اسکرپٹ نویسی تا حال جاری ہے۔ اپنے قلمی سفر کا آغاز بچوں کی کہانیاں لکھنے سے کیا اور قلمی نام اجنبی اختیار کیا۔ صحافت میں ایم اے کی سند حاصل کی اور بطور صحافی جنگ، ایکسپریس، امت میں کام کیا۔ فیچرز لکھے، تراجم، رپورٹنگ، اسپورٹس آرٹیکلز لکھتے رہے۔ SZABIST، گرینچ یونیورسٹی اور جامعہ کراچی کے شعبۂ ابلاغ عامہ میں بحیثیت استاد ریڈیو کی تدریس کی۔ اپنے وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے سے فنونِ لطیفہ کے کئی محاذوں پر کامیابیاں حاصل کیں۔ اجنبی کے حصے میں آنے والی ہر کامیابی آپ کے اپنے کام سے عشق کی مرہونِ منت ہے۔ سچی لگن کا تیشہ اٹھانے والے آواز کی دنیا کے اس کوہکن کے لیے ہماری دعا ہے کہ کوہکنی کا جذبہ سلامت رہے کامرانی خوابوں کی روشن تعبیر اور محنتِ شاقہ کا ثمر شیریں بن کر سدا اجنبی کے ہم رکاب رہے۔ آمین ۔ ہمارے سوال اجنبی (اجو بھائی) کے اثبات و انکار مع جواز، نذرِ قارئین ہیں۔

❁ بچپن ہی سے مطالعہ میرا شوق ہی نہیں دل کی لگی بھی ہے!

☾ جی ہاں اور دل کی یہ لگی آخر دم تک لگی رہے گی، اپنی امی مرحومہ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مطالعے کی لگن پروان چڑھائی۔

❁ ہمدرد نونہال میں بھیجی جانے والی پہلی تحریر اگلے ہی ماہ شائع ہو گئی تھی!

☾ ارے کہاں! کئی سالوں تک کہانیاں واپس آتی رہیں، شوق بڑھتا رہا اور کئی سال بعد محنت رنگ لائی۔

❁ تعلیم و تربیت میں شائع ہونے والی میری پہلی ہی کہانی مسترد ہو گئی تھی!



دبئی میں جاوید اختر اور شبانہ اعظمی کے لائیو انٹرویو کے بعد کے یادگار لمحات

☾ مسترد تو کئی کہانیاں ہوئیں...... مگر تعلیم و تربیت میں سب سے پہلی جو کہانی چھپی اس کو پہلا انعام بھی ملا۔

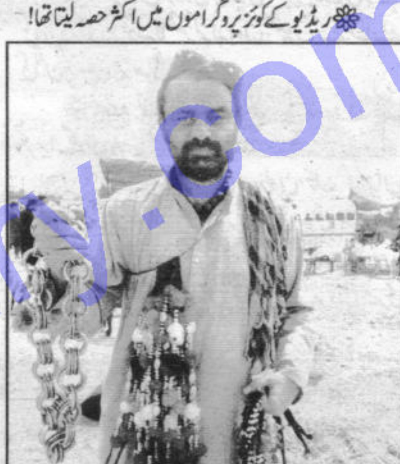
❁ بچوں کا ادب تخلیق کرنے لگا تو قلمی نام اجنبی خود ہی تجویز کرلیا اور پھر یہی نام میری پہچان بن گیا!

☾ جی ! بالکل ایسا ہی ہے۔

❁ ابلاغ عامہ میں ایم اے کی سند لینا میری تعلیمی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی!

☾ جی نہیں، میں آرکیٹیکٹ بننا چاہتا تھا، ابلاغ عامہ دوسرا انتخاب تھا۔

❁ ریڈیو کے کوئز پروگراموں میں اکثر حصہ لیتا تھا!



سما ٹی وی شو خطرہ کی شوٹ پر

☾ پاگلوں کی طرح، اسی کیفیت نے کئی بار فاتح بھی ٹھہرایا۔

❁ آواز کی دنیا کی کشش مجھے اپنی جانب کھینچتی تھی، آج بھی اس کا اسیر ہوں!

☾ سچ ہے۔ کوہِ ندا کے مانند ہے یہ دنیا...... آواز ہی پہچان ہے۔

❁ ریڈیو کے پہلے ہی ڈرامے میں بہت بڑا کردار مل گیا!

☾ دو جملوں کا کیریکٹر واقعی بہت بڑا کردار تھا میرے لیے کیونکہ سب سینئرز کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

❁ میری قلمی اور ریڈیائی تربیت میں بزم طلبا نے اہم کردار ادا کیا!

☾ جی۔ بزم طلبا سے آگے بڑھنے کی راہیں نظر آنے لگیں اور پھر چل پڑے۔

❁ اپنا ایف ایم 107 کراچی سے چینل کے آغاز ہی سے بحیثیت آر جے منسلک ہوں!

☾ جی ہاں، آر جے اور پھر پروگرامنگ ہیڈ!

❁ آر جے کی حیثیت سے چار سال دبئی میں کام کیا!

☾ نہیں۔ آر جے کی حیثیت سے ضرور گیا تھا لیکن جلد ہی ترقی کر کے پروگرامنگ ہیڈ بنا، چار سال سلیبرٹی کی حیثیت سے رہا۔

❁ ریڈیائی زندگی کی سب سے کڑی آزمائش، کامیابی اور اعزاز اپنے شعبے کے لیجنڈز کے لائیو انٹرویو کرنا ہے!

☾ جی ! آسمان کے چمکتے ستاروں تک آپ کی رسائی ہو جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ ریڈیو لیجنڈ امین سیانی صاحب کا لائیو انٹرویو آج بھی یاد ہے!

❁ پروگرامنگ ہیڈ بننے کا تجربہ جتنا خوشگوار رہا اتنا ہی یہ منصب جانکاہی کا متقاضی ہے!

☾ جی ! اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

❁ آواز کے اتار چڑھاؤ میں مہارت محض صداکاری کی نہیں اداکاری کی بھی بہت بڑی کامیابی ہے!

☾ جی ! آواز کا زیرو بم ہی اداکار کے تاثرات میں شدت لاتا ہے ورنہ سب سپاٹ۔

❁ آواز کی دنیا سے منسلک ہر فرد براڈ کاسٹر کہلاتا ہے!

☾ بالکل غلط۔ عمر گزارنی پڑتی ہے اس دشت کی سیاحی میں۔

❁ مختلف جامعات میں ریڈیو کی تدریس کی ذمے داری محنتی استاد کی حیثیت سے نباہی!



اجوّ بھائی اجنبی اپنی پیاری فیملی کے ساتھ

☾ جی! کوشش پوری کی کہ جو سیکھا ہے اس امانت کو صدقِ دل سے منتقل کیا جائے۔

❀ میری پہلی ملازمت کاپی کانسپٹ رائٹر کی تھی!

☾ پہلی باقاعدہ ملازمت، ایورنیو کانسیپٹس ایڈ ایجنسی......

❀ ریڈیو کے لیے اسکرپٹ لکھنا شروع میں کار محال لگتا تھا کئی برسوں کے کامیاب تجربے کے بعد آج بھی کبھی کبھار اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے!

☾ جی۔ ابھی تو ساحل پر سیپیوں کے رنگوں میں کھویا ہوا ہوں، سمندر تو بہت آگے ہے۔

❀ اداکاری کا آغاز ٹی وی ڈراموں سے کیا!

☾ تھیٹر سے کیا۔ اسٹریٹ ٹیکنیک تھیٹر فیسٹول 1997ء......

❀ اجنبی کی آواز کی گمبھیرتا تھیٹر میں کردار کی ادائیگی اور فنی کامیابی کے لیے بہت معاون ثابت ہوئی!

☾ جی! بہت ہی زیادہ۔ آواز زندگی کا ساز ہے۔

❀ مسٹری تھیٹر کرنے کو تو کرلیا لیکن زیادہ دلچسپی سے نہیں کیا!

☾ ارے نہیں۔ یہ کس نے کہہ دیا؟ ایک ڈرامے چاند محل میں، میں تو زندہ دفن ہوا تھا، آج بھی کانپ جاتا ہوں سوچ کر۔

❀ ڈراما "چاند محل" میں اداکاری کر کے بہت لطف آیا!

☾ جی ہاں! موت اور مٹی کا بوجھ کیا ہوتا ہے، ادراک ہوگیا تھا۔

❀ یوں تو ٹی وی ڈراموں میں متنوع کردار ادا کیے لیکن بحیثیت ولن کام کرنے میں مشکل پیش آئی!

☾ جی! منفی کردار مشکل تو ہوتا ہے مگر پرفارمنس مارجن بہت ہوتا ہے۔

❀ سخت محنت کا عادی ہوں "پیا کا گھر پیارا لگے" میں "نکمے داماد" کا کردار زیادہ اچھا نہیں نباہ سکا!

☾ نہیں بھئی! وہ اداکار ہی کیا جو اپنی ذات کی نفی نہ کرسکے۔ نکماترین تھا بھئی۔

❀ ہمارے موجودہ ٹی وی ڈراموں کو موضوعات کے حوالے سے مزید وسعت کی ضرورت ہے!

☾ [illegible] یہ موضوعات کھڑے پانی کی

طرح ہیں، ان میں سے تعفن اٹھ رہا ہے۔
❁ اینکر کے لیے وسیع علم اور متعلقہ شعبے کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ بالخصوص تازہ ترین معلومات بہت اہمیت کی حامل ہے!
☾ جی! اس کے بغیر کسی کو جرأت بھی نہیں کرنی چاہیے اینکر بننے کی۔ مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔
❁ ''حادثہ'' اور ''خطرہ'' میرے وہ ٹی وی شوز ہیں جنہیں عوام وخواص میں یکساں مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی!
☾ بے شک لیکن ان دو شوز سے پہلے سی این بی سی کا شو جرم میری پہچان بنا۔



بچوں کا تھیٹر حاتم طائی کا مشہور جن کے روپ میں

❁ وواکس اوور میں بے حساب کامیابیاں اور ستائشی کلمات نے میرے اعتماد اور شہرت میں خوب، خوب اضافہ کیا!
☾ جی! محنت کا مل جائے صلہ تو پھر کس سے کیا کیجیے گلہ۔
❁ کمرشل وائس اوور اور اسکرپٹ رائٹنگ کا سفر تا حال جاری ہے!
☾ جی! یہ سفر جاری رہے گا، کتھارسز کبھی ختم نہیں ہوتا۔

❁ موجودہ اینکرز اور آرجیز کی زبان و بیان کی غلطیاں بہت کھلتی ہیں!
☾ جی یہی نہیں! تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، خون کھول اٹھتا ہے، بی پی بڑھ جاتا ہے۔
❁ بلاشبہ براڈ کاسٹنگ وقت اور دقت طلب ہنر ہی نہیں سنجیدہ عمل بھی ہے!
☾ بے شک! سنجیدہ عمل ہی ہے۔
❁ بہت جلد گلوکاری کے میدان میں کمالات دکھانا چاہتا ہوں!
☾ نہیں ں......ں...... میں کہاں ہوں؟
❁
جینا بھی ایک الزام ہے مرنا بھی اِک الزام
اے کاش ہم اس ملک کے فنکار نہ ہوتے
☾ بول کرداد کے فقط دو بول
خون تھکوا لو شعبدہ گر سے (اعلیٰ)
❁ میری شریکِ حیات نادرہ نے صحیح معنوں میں ہم سفری کا حق ادا کر دیا!
☾ یقیناً! نادرہ میری خوش نصیبی کا نام ہے۔
❁ شک اور بدگمانی رشتوں کی مٹھاس کو کھٹاس میں تبدیل کر دیتی ہے۔
☾ جی! بلکہ رشتے ختم کر دیتی ہے۔
❁ صرف بیٹیوں کا باپ ہونا میرے لیے آزار نہیں بہت بڑا اعزاز ہے!
☾ ماشاء اللہ...... اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں، فضہ، حفصہ، فروئی! (اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔ آمین)
❁ لاک ڈاؤن میں گھر میں رہتے ہوئے بھی مجھے گھر کے کاموں کی عادت نہ پڑ سکی!
☾ واہ، آپ ہی کی ہے عدالت آپ ہی منصف بھی ہیں، بالکل غلط ہیں جناب آپ......
❁ کورونا وبا میری سوچ میں واضح......تبدیلی لے آئی!
☾ یہ وبا میری پیاری امی کو نگل گئی (اللہ مغفرت فرمائے۔ آمین)۔ سوچ کے ساتھ بہت کچھ تبدیل

ہو گیا۔

❁

مت کرو بحث ہار جاؤ گی
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں

☾

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانا ہے

❁ دماغ کی دلیل کتنی ہی توانا کیوں نہ ہو، دل کی پکار پر لبیک کہتا ہوں!

☾ دل کے سامنے کبھی کبھار ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔ (ہمیشہ نہیں)

❁

بہت ہوشیار ہوں اپنی لڑائی آپ لڑتا ہوں
میں دل کی بات کو دیوار پر لکھا نہیں کرتا

☾ اپنی لڑائی تو خود لڑتا ہوں مگر......
سب کچھ سیکھا ہم نے نہ سیکھی ہوشیاری......
سچ ہے دنیا والوں کہ ہم ہیں اناڑی

❁ میں اگر ضد پر آ جاؤں تو خود سے بھی لڑ جاتا ہوں!

☾ جی! ایسا ہوتا ہے لیکن خود سے ہار بھی جاتا ہوں۔

❁ چپ کی چاپ میں غضب کا شور ہوتا ہے!

☾ آزمانا شروع کیا ہے اور اسے سچ پایا ہے۔ چپ کی مار بہت گہرے زخم لگاتی ہے۔

❁ معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنا کسی حد تک عوام کی انفرادی ذمے داری بھی ہے!

☾ جی ہاں مگر یہ ذمے داری لیتا کوئی نہیں......

❁ ہمارے بیشتر سماجی مسائل ہماری اپنی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہیں!

☾ انتخابات میں جذباتی وابستگی کو مدِ نظر رکھ کر ووٹ کاسٹ کرنا ہی ہماری نااہلی کا ثبوت ہے۔

❁ اپنے وطن کے تعلیمی نظام، تعلیمی معیار بالخصوص تعلیمی نصاب میں مؤثر تبدیلی کو ناگزیر سمجھتا ہوں!

☾ جی! صرف مؤثر نہیں، انقلابی تبدیلی۔

❁ جب بھی آزمائش کی گھڑی آئی نہایت صبر اور ہمت سے کام لیا!

☾ بالکل۔ کیونکہ ایسا نہ کرنا اللہ کی نافرمانی ہے۔

❁ زمانہ عروج کا ہو یا زوال کا انسان کو اپنا ظرف بلند رکھنا چاہیے!

☾ بے شک!

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

❁ خواب دیکھنے سے تعبیر پانے تک کے عمل کا نام زندگی ہے!

☾ اپنے وجود کے مقصد کو پالینا زندگی ہے......

❁ فیچر رائٹنگ بے حد ذمے داری کا لیکن دلچسپ کام ہے!

☾ جی ہاں! دلچسپ ترین۔ میرا پسندیدہ کام ہے۔

❁ "میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا" مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول میرے لیے خداشناسی کا وسیلہ بنا!

☾ جی! حق ہے، سچ ہے۔

❁ میرے اصل مداح میرے نقاد ہیں!

☾ بلا شبہ! لیکن نقاد وہ جو اصلاح بھی کریں، حاسد نقاد نہیں......

❁ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!

☾ کئی سال پہلے سسرال تک تو پہنچ گیا تھا پھر شادی ہو گئی۔

❁ میرے مداح میرا اثاثہ ہیں!

☾ جی! مداحوں کے بغیر سب کچھ صفر ہے۔ مداحوں کے بغیر کوئی بھی شخص exist نہیں کر سکتا چاہے کوئی بھی شعبہ ہو۔

❁ پاکیزہ بہنوں سے بس اتنا کہوں گا کہ......!

☾ اپنا مطالعہ وسیع کریں۔ گھر گرہستی اور بچوں کی پرورش جتنی بہتر انداز سے ہو سکتی ہے وہ ضرور کریں۔

☆☆☆



مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

ڈاکٹر محمد یونس ......مزاح نگاروں میں ایک بڑا نام......باذوق قارئین کے لیے ڈاکٹر صاحب کی کتاب **غل دستہ** سے اقتباس حاضر ہے جسے پڑھ کر یقیناً آپ لطف اندوز ہوں گے۔

بابا جمہورا

بابا جمہورا کو میں بزرگ سیاست دان تو اس لیے نہیں کہتا کہ وہ خود بزرگ ہوں تو ہوں، ان کی سیاست میں تو ابھی لڑکپن ہے۔ اس وقت سے سیاست میں ہیں جب سے انہوں نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سیاست میں نو وارد ہیں۔ اتنے بڑے سیاست دان ہیں کہ اکیلے اپنی پارٹی میں پورے نہیں آسکتے۔ سو دوسری پارٹیوں سے اشتراک کر کے اپنے رہنے کی جگہ بناتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں اقلیتوں کا رہنما مانتے ہیں، ویسے ان کی پارٹی کے ممبروں کی تعداد دیکھ لیں تو آپ بھی مان جائیں گے۔

ہمارے ہاں آج کل اگر آپ اپنا شجرۂ نسب اور سارا خاندانی کچا چھٹا معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی لائبریری میں جانے کی ضرورت نہیں، سیاست میں آجائیں، مخالفین خود ہی بتا دیں گے کہ آپ کے دادا پڑدادا کیا، کیا کرتے رہے۔ فلاں صاحب نے سیاست کو عبادت بنا دیا ہے۔ جس سے یہ پتا چلے نہ چلے کہ وہ سیاست کو کیا سمجھتے ہیں، یہ پتا چلتا ہے کہ وہ عبادت کو کیا سمجھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی میں ان کی پیدائش کے علاوہ کوئی غیر سیاسی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ وہ تو صبح اٹھ کر ایک سیب بھی یوں کھاتے ہیں جیسے اپنی صحت کے لیے نہیں جمہوریت کی صحت بہتر کرنے کے لیے کھا رہے ہوں۔ ان کی چھینک تک غیر سیاسی نہیں ہوتی۔ تشدد کے اس قدر خلاف کہ اسکول میں ضرب سے کنی کتراتے، تقسیم تو کبھی کی ہی نہیں، البتہ جمع ایسی کرتے کہ حساب کا ماسٹر بے حساب داد دیتا۔ ذہین اتنے کہ جس روز ماسٹر شیو بڑھائے، بغیر استری کیے کپڑے پہن کر کلاس روم میں آتا تو انہیں فوراً پتا چل جاتا ہے کہ ماسٹر صاحب اردو شاعری پڑھائیں گے۔ مزاج ایسا جمہوری کہ ایچی سن کالج میں کرکٹ کھیلتے وقت فیلڈنگ کے دوران اسی گیند کو پکڑنے بھاگتے جس کی طرف سب سے زیادہ کھلاڑی بھاگتے۔

ویسے سیاست اور شاعری وہ کام ہیں جو سب

سے زیادہ وقت مانگتے ہیں، دوسروں کا...... انہوں نے اپنی شاعری کی کتاب کا نام ”جمہوریت“ رکھا۔ ایک صاحب کو دکھائی کہ دیکھیں یہ نام ٹھیک ہے یا بدل دوں؟ اس نے ان کی شاعری پڑھ کر کہا ”نام تو ٹھیک ہے، شاعری بدل دیں۔“

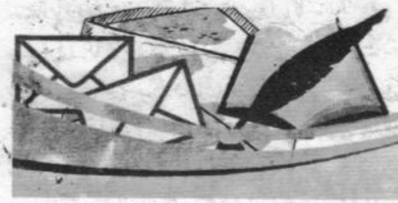
انہیں کھانے میں مچھلی پسند ہے۔ مچھلی اور سیاست دانوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں سانس لینے کے لیے منہ کھولتے ہیں۔ البتہ ایک مچھلی پورے جل کو گندا کر دیتی ہے مگر دو سیاست دان بھی مل کر یہ نہیں کر سکتے ہاں، نہ مل کر کر سکتے ہیں۔ جمہوریت کے لیے کوششیں کرنے والوں کو جو پھل ملتا ہے وہ فلاں صاحب کے باغ کے آم ہوتے ہیں جو عام نہیں ہیں۔ ہمیں تو آم میں یہی خوبی لگتی ہے کہ یہ کھایا بھی جا سکتا ہے اور پیا بھی......

سیاست کو انہوں نے کبھی دو کان نہیں سمجھا۔ ویسے بھی سیاست میں دو کان تو کیا، ایک کان کی بھی ضرورت نہیں...... البتہ زبان چاہیے اور ان کی زبان ایسی ہے کہ اتنی ان کے منہ میں نہیں رہتی جتنی صحافیوں کے کانوں میں رہتی ہے۔ ان کی تقریر بہرے بھی سمجھ جاتے ہیں کیونکہ اتنا منہ سے نہیں جتنا ہاتھوں سے بولتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب سوچ کر دیتے ہیں۔ نام تک پوچھیں تو سوچ میں پڑ جائیں گے۔ گفتگو کا ایسا انداز کہ آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ بندہ بات سننے سے پہلے ہی کنونس ہو جائے، شاید کنونس ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ویسے ہم ایک ایسے سیاست دان کو جانتے ہیں جو روز کنوینسنگ پر نکلتے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد آخر ان سے ایک خاتون کنونس ہو ہی گئی۔ اب وہ ماشاء اللہ ان کے بچوں کی ماں ہے۔ ان صاحب کی تقریر کا آغاز اور انجام تقریر کو دلکش بنا دیتا ہے۔ تقریر اور بھی دلکش بن سکتی ہے، بشرطیکہ اختتام آغاز سے پہلے ہو۔

وہ ان سیاست دانوں میں سے ہیں جو عوام کے نمائندہ نہیں، سیاست دانوں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے سیاست دان جو... کام سب سے زیادہ کرتے ہیں، وہ غور ہے اور یہ پوزیشن بنا کر نہیں اپوزیشن بنا کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ پیدائشی حزب اختلاف ہیں۔ اب تو ان کی اس عادت کی وجہ سے یہ صورت حال ہے کہ اگر وہ کسی بات پر فوراً متفق ہو جائیں تو لوگ پریشان ہو جاتے ہیں کہ اللہ کرے ان کی طبیعت ٹھیک ہو...... گھڑ سواری کرتے رہے، اب بھی کرسی پر بیٹھے باتیں کرتے ہوئے دائیں ٹانگ سے کرسی کو ایڑ لگا رہے ہوتے ہیں۔ ٹانگ اس قدر پسند ہے کہ کھانے میں مچھلی کا بھی لیگ پیس ہی مانگتے ہیں۔ مارک ٹوئن نے کہا ہے کہ صحت مند رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ کھاؤ جو آپ کو پسند نہیں، وہ پیو جو آپ کو نہیں چاہیے اور وہ کرو جو آپ ویسے کبھی نہ کرتے۔ اس حساب سے انہوں نے کبھی صحت مند رہنے کی کوشش نہیں کی۔ اینٹیک چیزیں پسند ہیں اس لیے کمرے میں شیشہ ضرور رکھتے ہیں۔ اپنی چیزیں نہیں بدلتے، ان کا وہ برش جس سے شیو کرتے وقت صابن لگاتے ہیں، اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ اس کے آدھے بال سفید ہو چکے ہیں۔

مزاج ایسا کہ سردیوں میں گرمیاں اور گرمیوں میں سردی چاہتے ہیں۔ صحافی ان کے پاس خبر لینے یوں جاتے ہیں جیسے ان کی خبر لینے جا رہے ہوں۔ بھینسیں پالنے کا شوق ہے، سنا ہے جو بھینس پالتے ہیں وہ اچھے شوہر ہوتے ہیں۔ اس قدر وضع دار کہ جس جگہ پر ایک بار پاؤں پھسل گیا جب بھی وہاں سے گزریں گے پھسل کر گزریں گے۔ ان کی پوری زندگی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سیاست بچوں کا کھیل نہیں بوڑھوں کا ہے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:110

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

تمام حمد و ستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ نہ صرف ہمارے وطن پاکستان بلکہ پوری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کردے، انسانیت کو امان ہو اور ہم بحیثیت مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں حقیقی معنوں میں بخشش و عنایات پائیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

عزیز بہنو! محبت بھرا اسلام اور پُرخلوص دعائیں لیے حاضر ہوں۔ پچھلے ماہ کچھ مصروفیات کی بنا پر آپ سے مخاطب نہ ہوسکی مگر آپ سب کا سلام، احوال پرسی اور دلی دعائیں مجھ تک پہنچتی رہیں۔ جزاک اللہ!

شکر ہے گرمی ختم ہوئی اور موسم خاصا خوشگوار ہوگیا۔ اب موسم کی اس خوشگواریت کا کم از کم میرے موڈ پر تو بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ آپ لوگ اپنی سنائیں...... موسم سرما کی آمد بھی خاصی خوش کن ہوتی ہے۔

نومبر کا شمارہ جو کہ دلہن نمبر تھا، یقیناً سب بہنوں کو پسند آیا ہوگا۔ شیریں حیدر نے ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی بہترین تحریر دی۔ خیال نیا تھا مگر اسے نہایت خوب صورتی کے ساتھ اختتام کیا اور بہت اچھا میسج چھوڑا۔

عالیہ حرا ایک لمبے وقفے کے بعد بہت عمدہ مکمل ناول لے کر آئیں۔ میں نے تو پڑھ کر بہت انجوائے کیا۔

نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناول ''میں عشق ہوں'' کی آخری قسط اس ماہ دی جارہی ہے۔ بہنوں نے اور خاص طور پر میں نے اس ناول کو بہت پسند کیا۔ نایاب نے بہت کامیابی سے اسے انجام تک پہنچایا جو یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ کسی بھی لکھاری کی یہ مہارت قابلِ ستائش ہوتی ہے کہ وہ کہانی کے تسلسل و تجسس کو آخر تک برقرار رکھے۔ اسے نہایت خوب صورتی سے منطقی انجام تک پہنچانے پر نایاب یقینی طور پر مبارک باد کی مستحق ہیں۔

سعدیہ ہاتم بہت ہی اہم موضوع کو نہایت عمدگی سے آگے بڑھا رہی ہو۔ نوجوان نسل یقیناً اس سے بہت کچھ سبق حاصل کرے گی۔

باقی افسانے بھی بہت سبق آموز اور لاجواب تھے۔ تمام تحریروں پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہوتا مگر کچھ خاص چیزیں ہوتی ہیں جن کا ذکر ضرور کردیتی ہوں۔ مراسلہ نگار بہنیں بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی چیزیں بھیج رہی ہیں۔ اسی طرح جاری رکھیں۔

یہاں شائستہ زریں کے کیے گئے سروے اور مختلف شخصیات سے جو وہ انٹرویو لے رہی ہیں اس پر بات کروں گی کہ کافی محنت کررہی ہیں...... مختلف موضوعات پر لوگوں کی آرا پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔

یہ سال بھی مختلف انداز سے غم و خوشی، تکلیف و راحت کے ساتھ گزر رہا ہے۔ بس دعا ہے کہ ہر گزرتا لمحہ ہماری زندگیوں میں مزید بہتری اور مثبت سوچ لائے اور آنے والا سال سب کے لیے ہی خوش آئند ہو۔

اچھا بہنو! ان شاء اللہ اب اگلے سال ہی ملاقات ہوگی......اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو......آمین۔

دعا گو......عذرا رسول

پاکیزہ بہنو جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ اس سال کا آخری شمارہ ہے۔اب ان شاء اللہ نیا سال ماہنامہ پاکیزہ کی گولڈن جوبلی کا سال ہے۔ویسے تو سالگرہ اپریل میں منائی جاتی ہے مگر ہم چاہ رہے ہیں کہ جنوری سے ہی آپ لوگ مخصوص شاعری، مراسلات و دیگر نگارشات بھیجتی رہیں۔اس سلسلے میں آپ سب کے پاکیزہ کے بارے میں خیالات سے آگاہ ہونے کے لیے ایک سلسلہ ”سنہری یادوں کا سفر“ شروع کیا جا رہا ہے۔جس کے سوالات اسی شمارے میں دے دیے گئے ہیں۔آپ زیادہ سے زیادہ اس میں شرکت کریں۔ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ کسی بھی مخصوص نمبر کے لیے جو بھی بھیجنا ہو تین چار ماہ پہلے بھیجا کریں اور مہینے دو مہینے میں یاددہانی بھی کروا دیا کریں۔آپ کے ایک، ایک لفظ کی ہم قدر کرتے ہیں۔بعض مراسلات اور شاعری میں بہت اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے مطالعے پر دھیان دیں۔اسلامی مضامین، تراشے اور معلومات مستند ہوں اور اگر حوالہ جات بھی لکھ دیں تو اچھا رہے گا۔

پاکیزہ پر اپنی رائے، تجویز، مشورے، تنقید، توصیف، اعتراض جو بھی دل و دماغ میں ہے ایک صفحے پر لکھ کر پوسٹ کر دیں۔ ہمارے لیے آپ کا بھیجا ایک، ایک لفظ قابلِ قدر ہے۔

پاکیزہ نہ ملنے کی صورت میں رسالے میں دیے گئے اپنے شہر کے ایجنٹ کے نمبر پر فون کر کے شکایت درج کروائیں پھر بھی مشکل ہو تو چھ ماہی یا سالانہ خریدار بن جائیں تو ماہنامہ آپ کو گھر بیٹھے آسانی سے مل جائے گا۔

حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درودِ ابراہیمؑ اور تین بار آیتِ کریمہ ضرور پڑھ لیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار فریدہ ہاشمی مخفی کراچی کے بچے آج کل بنگلا دیش اور امریکا سے ان سے ملنے آئے ہوئے ہیں تو فریدہ آپا کی طبیعت اب بہتر ہے۔واقعی اپنے بچوں اور ان کے بچوں کی موجودگی بزرگوں کے لیے کسی نعمت اور صحت بخش ٹانک سے کم نہیں۔اللہ پاک ہمیں اپنے بڑوں کی قدر و محبت کرنا سکھائے، آمین......

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ قاری، مصنفہ اور ہماری دوست سلمیٰ غزل اپنے بچوں سے مل کر امریکا سے بخیریت واپس کراچی پہنچ گئیں۔ان کا کہنا ہے بچوں میں دل تو لگا تھا مگر اپنا شہر اور اپنا وطن بہت یاد آتا رہا۔(شکر الحمدللہ)

☆ مصنفہ اور مقبول نعت خواں سویرا فلک آج کل محفلِ میلاد کی بزم سجا رہی ہیں اور نئے ٹیلنٹ کو بھی آگے لا رہی ہیں۔اس کے علاوہ مختلف چینلز پر بھی وہ میلاد شریف کے پروگراموں میں حصہ لے رہی ہیں۔(ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی دیرینہ پرستار شاعرہ، مصنفہ، ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا کو ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبال ادبی دنیا نے گولڈ میڈل سے نوازا ہے، اس پُروقار تقریب کی صدارت علامہ اقبال کے پوتے سینیٹر ولید اقبال نے کی یہ تقریب الحمرا ہال، لاہور میں منعقد ہوئی جس میں شعر و ادب کی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔(مبارک ہو سعدیہ)

☆ مستقل قاری، حدیث اختر، بہاول پور کی لاڈلی نواسی تہنیت فاطمہ نویں کلاس میں نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہوئی ہیں اور تہنیت پاکیزہ رسالے کی بھی بہت دیوانی ہیں۔(اللہ مبارک کرے یہ کامیابی)

☆ سنبل ملک، شاہدرہ، لاہور کو اپنی اور اپنے بھتیجے کی سالگرہ بہت مبارک ہو۔

☆ مستقل قاری ثوبیہ راجپوت، سیالکوٹ آج کل اپنا یو ٹیوب چینل چلا رہی ہیں اور کالم نگاری بھی کر رہی ہیں۔(اچھی بات ہے)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، کالم نگار و مصنفہ نرگس نسیم صابہ موہڑہ، چکوال کی پیاری بیٹی کی شادی محمد بلال سے ہونا قرار پائی ہے۔جو ایک سرکاری محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نرگس کے داماد بھی مطالعے کے بے حد شوقین ہیں اور پاکیزہ رسالہ بھی پڑھتے ہیں۔(بہت مبارک ہو)

☆ ممتاز قلم کار اور پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی ہماری بے حد قابلِ احترام عنیزہ سید کی پیاری بیٹی عینی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی ہیں۔ ماشاء اللہ۔ عنیزہ کے داماد بھی بے حد قابل، وجیہہ اور نیک طبیعت ہیں۔ اللہ پاک دونوں خاندانوں کے لیے یہ رشتہ بے انتہا خوشی اور شادمانی کا باعث ہو۔ الٰہی آمین۔ (بہت مبارک ہو عنیزہ)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار، شاعرہ فریدہ ہاشمی مخفی کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔ سب بہنیں دعا میں یاد رکھیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، شاعرہ و تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری، لاہور کی مکمل صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔ ان کے شوہر بھی اب روبصحت ہیں۔

☆ پاکیزہ قاری حرا، میرپور خاص کی تمام ذہنی و جسمانی تکالیف کے رفع ہونے کے لیے ضرور دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری اور ہم سب کی پیاری امینہ عندلیب کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ مصنفہ عذرا آفتاب، کراچی عرصے سے کمر کی تکلیف کے عارضے میں مبتلا ہیں، ان کے لیے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔

انتقالِ پُرملال

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی، مصنفہ صبیحہ شاہ کا جواں سال بھتیجا ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ مرحوم کی شدید ہیڈ انجری ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اللہ پاک صبیحہ شاہ و دیگر اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین۔

☆ میرے والد محترم سید سبط حسن رضوی کی چوبیسویں برسی اسی ماہ ہے۔

☆ فصیحہ آصف خان، ملتان کے والد محترم کی برسی کے سلسلے میں فاتحہ خوانی ہوئی۔

☆ مستقل قاری شنا مرتضیٰ کے والد ماجد کی برسی اسی ماہ ہے۔

☆☆☆

بہنوں اب آیئے ...... اپنے خطوط کی طرف ......

✉ اختر شجاعت کا خصوصی نامہ۔ ”ڈیئر نزہت السلام علیکم! (وعلیکم السلام) بہت عرصے سے بہنوں کی محفل میں شرکت کرنا چاہ رہی تھی مگر ہر بار کسی نہ کسی مصروفیت کے باعث لکھ نہیں پا رہی تھی۔ آج تہیہ کر لیا کہ خط لکھ لوں ..... پہلی وجہ تو یہ ہے کہ کئی بار جب عذرا سے بات ہوئی تو انہوں نے مجھے اپنی نند صاحبہ کا خصوصی طور پر پیغام دیا کہ وہ میرے مضامین بہت باقاعدگی سے پڑھتی ہیں اور بہت پسند بھی کرتی ہیں۔ تو آج میں آپ کے توسط سے ماہ مبین صاحبہ سے بات کرنا چاہ رہی ہوں کہ آپ کے میسج مجھے عذرا نے دے دیے بس میری نااہلی کہ میں بہت دیر سے آپ کو جواب دے رہی ہوں تو اس کے لیے آپ مجھے معاف کر دیں۔ آپ کی تعریف میرے لیے باعثِ اعزاز ہے۔ بس یہ تو اللہ کا کرم ہے، اس کی عطا اور توفیق ہے، میرا کوئی کمال نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کی تعریف سے توانائی بہت حاصل ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت والی زندگی عطا فرمائے، آپ کی عمر میں برکت ہو، آمین۔ الٰہی آمین۔ بس آپ یونہی میرے مضامین پڑھتی رہیے اور اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیے بہت بہت شکریہ...... جزاک اللہ۔ رخ کے لیے کچھ بھی نہ لکھ سکی۔ قلم پکڑا تھا مگر اس کی اس موت نے مجھے اندر تک سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے تبصرے، اس کی خوب صورت باتیں اس کے وائس میسج ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے...... بس دکھ اتنا ہے کہ کوئی بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں سوائے اس کے کہ وہ میری دعاؤں میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دعا ہے کہ اس کی بے حساب مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ باقی تمام ان بہنوں کا بہت شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کے تبصرے بہت پابندی سے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ وہ ساری میری بہنیں اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے، آپ نے میرے لیے خصوصی طور پر بیماری کے

دوران دعا کی اللہ رب العزت آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے، آمین الٰہی آمین ...... طیبہ مغل صاحبہ، آسیہ عامر، خولہ سعید جاوید، جبینا، فریدہ مخفی، فرخندہ جعفری، ساجدہ ظفر کا خصوصی طور پر بہت شکریہ کہ ان کے تبصرے میرے لیے کسی وٹامن کا کام کرتے ہیں اور مجھے چارج کر دیتے ہیں، خوش رہیں۔ اور جب عذرا سے فون پر بات ہو تو بس دل خوش کر دیتی ہیں ان کو میرا بہت سارا اسلام اور دعائیں۔ آپ کے لیے تو دعائیں ہی دعائیں، خوش رہیں، سلامت رہیں، الٰہی آمین۔'' (اختر بہن خلوص و تشکر کے کلمات لیے آپ کا نامہ گرامی بہت اچھا لگا۔ آپ کے پُرخلوص جذبات آپا ماہ مبین تک پہنچا دیے گئے ہیں وہ دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔ رخ کو اب ہماری دعائے مغفرت کی ضرورت ہے، اللہ پاک اس کی منازل آسان کرے، سب بہنوں کو صحت و سلامتی اور ایمان کی پختگی عطا ہو۔ آپ کے مضامین بلاشبہ بہت کچھ تعمیری کردار ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے، عذرا صاحبہ و دیگران کی طرف سے بھی دعائیں ہیں)

✉ زرتاشیہ نعمان، ملتان سے۔ ''اس بار میرا پیارا پاکیزہ یکم تاریخ کو ہی مل گیا۔ سب سے پہلے نگاہیں بیاد رخ چوہدری پر جا کر رکیں، آہ ...... اچھے لوگ اس دنیا کو کتنی جلدی خیر باد کہہ جاتے ہیں، رخ بھی انہی میں سے ایک تھیں۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ افسانے پڑھے ...... شیریں حیدر صاحبہ، سونے کے انڈے دینے والی مرغی، کا اک نیا ورژن لائیں۔ کمال ہی کر دیا ...... مزہ آیا پڑھ کے۔ قرۃ العین خرم ہاشمی کی کہانی مجلۂ ذات، فنٹاسٹک تحریر ...... بہت عمدہ۔ نگہت اعظمی کی تحریر خبر ہونے تک عورت کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا انکار کرنے والے مرد حضرات کی بھرپور عکاسی کرنے والی کہانی ثابت ہوئی لیکن آج کے دور میں خواتین کسی میدان میں مردوں سے پیچھے نہیں۔ اداس چاندنی، ایک خوب صورت تحریر تھی مگر یہ بتائیں اس کو لکھنے والی خاتون رائٹر ہیں یا کوئی صاحب ہیں؟ (خاتون ہی ہیں ڈیئر) حوریہ بتول، طوق محبت کی صورت میں ایک کڑوا سچ سامنے لائیں۔ اللہ پاک ہماری نئی نسل کو ان خرافات سے دور رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ فیس بک پر کی گئی دوستیاں اور محبتیں ایسا ناسور ہیں جو اندر ہی اندر چاٹ کر بندے کو بالکل کھوکھلا کر دیتا ہے اور جب خبر ہوتی ہے تو کوئی دوا کام نہیں آتی۔ عاصمہ عزیز کی آخری چال کی پہلی قسط پڑھ لی ہے، دوسری کا انتظار ہے۔ فرحت انصاری کی ہم خوابوں کے بیوپاری تھے۔ نہایت عمدگی کے ساتھ اختتام پزیر ہوئی۔ مجھے پسند آیا ان کا ناولٹ۔ نفیسہ سعید، دل پر زور نہیں میں بھنورا صفت مردوں کا قصہ لائیں۔ جن کی نیت کبھی نہیں بھرتی ...... انہیں اپنی پاکباز اور خدمت گزار بیوی میں سو، سو کیڑے نظر آتے ہیں اور دوسری عورت ...... وفاشعار اور محبت کا پیکر دکھائی دیتی ہے۔ سعدیہ ہما شیخ، کا میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں، بھرپور انداز میں آگے بڑھ رہا ہے ...... اس بار والی قسط میں آخر میں انہوں نے جو نظم لکھی اُف کیا بتاؤں بہت بھائی مجھے ...... لاجواب تھی۔ اس بار وہ آئے بزم میں، فرحین سے ملاقات ہوئی، سچ میں مزہ آیا ان کے بارے میں جان کر نزہت آپا ایسے ہی اور بھی انٹرویو کریں ہماری فیورٹ رائٹرز سے۔ (ہاں ضرور یہ سلسلہ تو پچھلے دس بارہ سالوں سے جاری ہے الحمدللہ) بہنوں کی محفل سے سب بہنوں کا احوال معلوم ہوا۔ شیریں حیدر صاحبہ کو دادی بننے کی ڈھیر ساری مبارک باد، شیریں آنٹی ...... اگر میں آپ کو آنٹی کہوں تو آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟ (نہیں، وہ بالکل برا نہیں منائیں گی) اب اجازت لیتی ہوں اگلے ماہ زندگی بخیر تو ملاقات ہوگی ان شاءاللہ۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✉ انابیہ خان، جام پورہ راجن پور سے۔ ''میرا پاکیزہ سے 3 سالہ پرانا رشتہ ہے اور میں باقاعدہ قاری ہوں مگر پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔ اتنا عمدہ اور فن سے بھرپور ایک مکمل ڈائجسٹ پڑھ کر مہینہ بہت اچھا گزرتا ہے اور اگلے شمارے کا بے صبری سے انتظار ہوتا ہے۔ پاکیزہ کی ہر تحریر عمدہ سے عمدہ تر ہوتی ہے۔ سب پروفیشنل اور منجھی ہوئی رائٹرز اپنی تحریروں کو بہت ہی عمدگی سے شروع اور اتنی ہی عمدگی سے اختتام تک پہنچاتی ہیں۔ سلسلے وار تمام ناول بہت ہی عمدگی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ مکمل ناولز اور افسانے بھی ہمیشہ کی طرح سبق آموز اور دلچسپ ہیں۔ نایاب جیلانی، سعدیہ ہما شیخ، نفیسہ سعید ان تینوں لکھاریوں کی میں بہت بڑی فین ہوں۔ لکھنا مجھے بھی بہت پسند ہے میرا ابھی ایک خواب تھا لکھنا تو اب الحمدللہ میں نے بھی ایک ماورائی ناول لکھا ہے میں تم اور وہ، جو کہ کتابی شکل میں بھی پبلش ہو چکا ہے۔ (اچھی بات ہے) میں اکثر گنگناتی میں ساجدہ ظفر، ثوبیہ ظہور، پروین افضل شاہین، ایمن زرناب، صائمہ ڈوگر، نمرہ احسان، زرینہ خان، نازنین آفریدی، رشنا جاوید،

ماہ وش طالب، نیم نیازی اور سمیرا عنایت کی شاعری بے حد پسند آئی۔‘‘ (جزاک اللہ آپ کو پاکیزہ پسند ہے۔ مکمل تبصرہ بھی ضرور لکھیں رسالے میں کسی بھی بہن کا فون نمبر اور پرسنل اکاؤنٹ نہیں چھاپا جاتا)

رخسار احمد، کراچی سے۔ ’’میرا سارا زنگ اتار دو... جتنا آغاز خوب صورت تھا اتنا ہی اختتام شاندار کیا ہے افشاں آفریدی نے، آپی میں نے کہا تھا ناں کہ دُرِ مکنون، سائرہ بیگم کی ہی بیٹی ہے اس پر میرے لیے ایک تھپکی تو بنتی ہے۔ (ہاں، ہاں ضرور...... دو تھپکی لے لو پیاری بیٹی) اس بار کا ٹائٹل پسند آیا۔ پنک کلر کے اسکارف میں فرینہ اعجاز کالج گرل کا تاثر دے رہی تھیں۔ مجھے کچھ کہنا ہے، ہمیشہ کی طرح عمدہ تھا۔ صراط عشق ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا۔ میں عشق ہوں، عمامہ بیچاری پر بے حد ترس آتا ہے اور دادی اور فیقہ پر اتنا ہی غصہ پیر قبر میں لٹک رہے ہیں پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتیں۔ (ہوتی ہیں ایسی عورتیں بھی) نخل سعدی نے اچھا لکھا، ہانیہ نے اچھا طریقہ اختیار کیا جس کے باعث اپنوں کی بدنیتی ان پر واضح ہوگئی۔ نیر فہیم نے بھی سبق آموز افسانہ لکھا۔ ساجدہ حسین کا افسانہ کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔ میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں، یہ ثنا کن راہوں پر چل پڑی ہے، فرحت جیسے گدھ معاشرے میں بھرے پڑے ہیں۔ الٹا اس کے گروپ نے سر عارف جیسے ایمان دار انسان کو بدنام کیا ہوا ہے۔ تحفہ بس ٹھیک تھی۔ آپی میں نے ایک افسانہ بھیجا تھا چار دیواری، آپ کی مبارک زبان سے سن کر کہ افسانہ قابلِ اشاعت ہے اور دو تین ماہ میں لگ جائے گا بے پایاں خوشی سے بے قابو ہو کر جھٹ سارے گھر والوں کو خوش خبری سنا ڈالی۔ (ہاں، جلد ہی لگے گا) آپی آپ کو بے شمار لڑکیاں افسانے بھیجتی ہیں اور ان کے افسانے دو سے تین ماہ میں شائع بھی ہو جاتے ہیں نہ جانے میرا انتظار کب ختم ہوگا۔ (آپ کو کیا پتا بیچاری لڑکیوں کو کتنا انتظار کرنا پڑتا ہے مگر وہ ثابت قدمی دکھاتی ہیں اچھی تحریر ضرور جگہ پاتی ہے) آخری سبق بہت عمدہ، ہمارے معاشرے میں زلیخا جیسی کتنی ہی لڑکیاں ہیں جو جاہلانہ رسم و رواج اور شیر دل جیسے باغیرت مردوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ ذرا نم ہو، اس شمارے کی سب سے بہترین کہانی کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ دادی کا کردار شاندار تھا جس دانش مندی سے انہوں نے عاصمہ کی رہنمائی کی وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس بار کا شمع ہدایت لکھ کر اختر شجاعت نے ہم پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ آپی آپ نے کہا تھا کہ ایک پرانی رائٹر کا ناول آنے والا ہے اور رائٹر کا نام سرپرائز ہے میں تو جب سے ہی بے حد ایکسائٹڈ ہوں۔‘‘ (اب تو ان کا نام پتا چل گیا ناں...... مختصر تبصرے کا شکریہ، آپ کہانیاں ضرور لکھیں کبھی نہ کبھی تو قابلِ اشاعت ہو کر چھپ جائیں گی، ان شاء اللہ)

ناہید نعیم، ملتان سے۔ ’’نومبر کی سرورق کی دلہن بے حد اچھی لگی۔ سب سے پہلے شمع ہدایت کی بات اختر شجاعت بہترین مضمون لکھتی ہیں۔ نبی اکرمؐ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ میری طرف سے ان کو مبارک باد دیجیے۔ (جی ضرور) اس کے بعد بات کریں گے ناول میں عشق ہوں کی، دنیا میں کیا منصور کی طرح ظالم لوگ بھی ہیں؟ آخر تک پڑھتے، پڑھتے میں روہی پڑی۔ اگلے ماہ آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ عائشہ یوسف کی کہانی سزا جزا، بہت اچھی لگی۔ افسانہ سایہ، شفا سعید سبق آموز تھا۔ نایاب جیلانی پہلے سے شادی شدہ ہیں یا اب ان کی شادی ہوئی ہے؟ کیونکہ پاکیزہ کے اوراق میں نایاب جیلانی کی بیٹی بھی انعام لیتے ہوئے دکھائی گئی ہیں۔ (جی نایاب جیلانی کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہوگئی تھی۔ مگر اب الحمدللہ انہیں زندگی کا بہترین ساتھی مل گیا۔ اللہ پاک انہیں سدا خوش آباد رکھے۔ یہی زندگی ہے۔ کسی کے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا ہے مگر اللہ کی رضا میں راضی رہ کر بہترین اجر ملتا ہے۔ اللہ سب بچیوں کے نصیب روشن رکھے، آمین) شادی خانہ آبادی میں دلہنوں کے احوال، ابٹن، مہندی، بارات پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ میری طرف سے رخ چوہدری کے گھر تعزیت کا پیغام دے دینا، عذرا رسول کو میرا سلام۔‘‘ (عذرا رسول بھی آپ کو دعائیں دے رہی ہیں)

فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی سے۔ ’’پچھلے دنوں طبیعت کی خرابی کے باعث رسالہ نہ پڑھ سکی اور نہ کچھ لکھ سکی۔ خدا کے فضل سے اب بہتر ہوں۔ امید ہے آپ سب لوگ بھی بخیر ہوں گے۔ بہن اختر شجاعت کے بہترین مقالے اکتوبر اور نومبر میں پڑھنے کو ملے، جزاک اللہ۔ نومبر میں دونوں ناول اچھے لگے۔ بہت سے حقائق سامنے آئے، میرے دل میں عمامہ کے لیے کبھی برے خیالات نہیں آئے۔ آخر کار سب کچھ پتا چل گیا۔ واہ نایاب آپ نے بہت اچھی طرح سارے راز کھول دیے۔

خاص کر تین چار کہانیاں بہت پسند آئیں جو نوجوان لڑکیوں کے واسطے بہت سبق آموز اور حقیقت پسندانہ ہیں۔ میں جو ہی، سایہ، اگلا گھر اور تعلق کی آبیاری، بہت عمدہ تحریریں ہیں۔ آہ رخ چوہدری بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ ایک چراغ اور گل ہوا۔ خدا مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔'' (اللہ پاک آپ کو صحت عطا کرے، آمین)

✉ مسرت عزت، شبقدر کے پی کے سے۔''سب سے پہلے بہنوں کی محفل میں صائمہ اکرم کی بیماری کا سن کر دل بہت اداس ہوا اُن کے لیے یاسین شریف کا ختم بھی کیا اور دعائیں بھی بہت کیں (جزاک اللہ مسرت) اب آتی ہوں تبصرے کی طرف......صراط عشق، سب سے پہلے پڑھا۔ بہت خوب صورت تحریر ہے حالات بہت گمبھیر ہو گئے ہیں، آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے اب نین تارہ کے ساتھ۔ سونے کے انڈے دینے والی مرغی، واقعی لالچ بری بلا ہے، شیریں حیدر صاحبہ نے سادہ سے انداز میں بہت خوب صورت اور سبق آموز تحریر لکھی۔ جگنو ذات، منفرد موضوع پر لکھی گئی اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔ واقعی ہمارے اردگرد ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جن کو ہم اپنی مصروفیات اور اپنی ذات کے آگے یکسر نظرانداز کر رہے ہوتے ہیں جبکہ وہ ہماری نظرِ کرم اور توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں، سبق آموز تحریر ہے لڑکیوں کے لیے مگر یہ عشق و محبت کو اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرنا سمجھ سے باہر ہے۔ (اصل میں یہی تو دکھایا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے، یہ عشق نہیں وقت گزاری ہے) دل پر زور نہیں، واقعی دل پر اثر کر گئی کہ رو ہیشہ جیت کر بھی ہار گئی اچھی تحریر تھی۔ اب آتے ہیں جناب میں عشق ہوں، واہ، واہ مزہ آ گیا، کیا زبردست تحریر ہے محبت، عشق، نفرت، ایڈونچر ان سب چیزوں نے مکس ہو کر تحریر کو لاجواب کر دیا ہے۔ فرحت انصاری کی تحریر ہم خوابوں کے بیوپاری تھے کا آخری حصہ پڑھا واقعی مائیں بیٹیوں کی دشمن تو نہیں ہوتیں اور ماؤں کو بیٹیوں کے معاملے میں ایسے ہی ایکٹیو رہنا چاہیے بلاشبہ اچھی تحریر تھی مگر فیضی جیسے بیٹوں کی جو مائیں پرورش اور تربیت کرتی ہیں ان پر افسوس ہوتا ہے۔ اداس چاندنی، ہنستی، مسکراتی، ہلکی، پھلکی سبق آموز تحریر تھی۔ واقعی ہمیں کسی کو اس کے ناکردہ گناہ پر گناہ گار نہیں سمجھنا چاہیے۔ طوقِ محبت، گو موضوع پرانا ہے مگر نئے اور منفرد انداز میں لکھی گئی تحریر دل کو بھا گئی، لڑکیوں کے لیے خاص طور پر ٹین ایجرز کے لیے ایسی تحریریں بار، بار لانی چاہئیں کہ سبق حاصل ہو اور عبرت کہ ان سرسبز باغات کے پیچھے کتنے سیاہ خطرناک جنگل بھی ہیں۔ محبت فاتح عالم، سلمٰی غزل صاحبہ نے ایک بچگانہ سی تحریر لکھی ہے گو موضوع اچھا ہے مگر حالات و واقعات اور اینڈ وفلمی سا ہے۔ یعنی حقیقت سے بہت دور۔ (کبھی، کبھی ہلکی پھلکی کہانیاں بھی پڑھنی چاہئیں) آخری چال، اچھی ہے شروع سے ہی نفرتوں اور سازشوں کے اردگرد گھومتی اثر انگیز ہے آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ رومیلہ اب کیا گل کھلاتی ہیں۔ موتیوں میں پروئی ہوئی شمع ہدایت پڑھ کر دل روشن ہو گیا۔ حضور اکرمؐ کے اخلاق مبارکہ واقعی پوری دنیا کے لیے عظیم مثال ہیں۔ فرحین اظفر کا انٹرویو پڑھا، بہت اچھا لگا ان کی سادہ گفتگو پڑھ کر، اس مرتبہ سروے میں بہت اچھا اور بہتر موضوع چنا گیا۔ اس کے علاوہ بہنوں کی محفل، پاکیزہ ڈائری، میں اکثر گنگناتی ہوں، سب سلسلے زبردست رہے۔ خوش ذائقہ میں ذرا آسان، آسان تراکیب بتایا کریں تاکہ ہمارے روزمرہ کھانوں کا حصہ ہوں اور ذرا کم مسالوں میں بن سکیں اب ہر کسی کو تو اوون بھی میسر نہیں ہوتا۔ سادہ چیزوں کی تراکیب بتایا کریں جو جلد بن سکیں۔ بزم پاکیزہ کے سوالات، جوابات زبردست رہے، حسن نکھاریے میں بہت کام کی باتیں تھیں۔ الغرض پورا پاکیزہ سر سے لے کر پاؤں تک سجا ہوا ہے۔ آخر میں رخ چوہدری صاحبہ کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں مقام عطا کرے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین۔'' (تفصیلی اور محبت سے لکھے گئے تبصرے کا شکریہ)

✉ ثمینہ کوکب، جہلم سے۔''پیارے سے ٹائٹل والا پاکیزہ رسالہ پا کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ بہنوں کی محفل میں اپنا نام شامل نہ دیکھ کر دل افسردہ ہو گیا۔ (ارے کبھی دیر سے خط ملتا ہے) نزہت اصغر صاحبہ کا اداریہ اپنے موضوع کے حساب سے بہت خوب صورت و بھرپور تھا۔ (نوازش) دین کی باتیں اور آنحضورؐ کے اسم گرامی پڑھ کر ایمان کو تروتازگی ملی۔ اختر شجاعت صاحبہ کا ایثار، تقرب الٰہی پر مضمون بہت اچھا لگا۔ شمع ہدایت ہمیشہ کی طرح بہت پُراثر و بھرپور لگا۔ اختر شجاعت صاحبہ کو اللہ پاک اجر عظیم عطا فرمائیں، ہمیشہ منفرد موضوع کا انتخاب کرتی ہیں اور اللہ پاک ہم سب کو ایثار جیسے عظیم وصف سے نوازیں، آمین ثم آمین۔ کورونا لاک ڈاؤن اور شادی کی تقریبات شائستہ زریں صاحبہ کا سروے بہت پسند آیا۔ شادی خانہ

آبادی، قارئین بہنیں، بہت ہی اچھا لگا۔ گوشۂ ظرافت میں ابن انشا کی کتاب دنیا گول ہے سے اقتباس پڑھ کر لطف اندوز ہوئے۔ میں عشق ہوں، نایاب جیلانی صاحبہ کی یہ قسط بھی اچھی لگی اور صراط عشق دلشاد نسیم صاحبہ کا دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں، سعدیہ ہما شیخ کی تحریر اچھی ہے اور دونوں ناولٹ بھی اچھے لگے۔ تمام افسانے بھی اپنی، اپنی جگہ پر بہت سبق آموز اور بہترین تھے۔ دردانہ نوشین صاحبہ کا دو ہنسوں کا جوڑا دل کو بری طرح رنجیدہ کر گیا۔ عذرا آپی کے بغیر محفل بہت سونی لگتی ہے۔ عذرا آپی کے لیے دعا ہے اللہ پاک ان کو صحت و زندگی عطا فرمائے اور ان کو سدا اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر بیماری و تکلیف سے بچائے، آمین یارب العالمین۔ طبیعت کی ناسازی کی بنا پر زیادہ تفصیلی تبصرہ نہیں لکھ سکی۔ تمام بیماروں کو اللہ پاک شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ تمام مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کو ان کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں مبارک ہوں۔ بہن فہمیدہ جاوید صاحبہ کی صحت اور ذہنی سکون اور روزگار کے لیے بارگاہ کریمی میں دستِ دعا بلند ہیں کہ اپنی رحمتِ خاص اور نبی کریمؐ کے نام کی برکت سے صحت کاملہ عطا فرمائے اور ذہنی سکون، روزگار کے بہتر سلسلے کے ساتھ عطا فرمائے، باقی تمام سلسلے پاکیزہ ڈائری، میں اکثر گنگناتی ہوں، خوش ذائقہ، بزم پاکیزہ، روحانی سلسلے، حسن نکھاریے ہر سلسلہ بے مثال ہے۔ پاکیزہ رسالہ اسی طرح اپنی خوشبو و روشنیاں بکھیرتا رہے، آمین آخر میں سب پاکیزہ اسٹاف اور پاکیزہ بہنوں کے لیے دعائیں اور خلوص بھرا اسلام۔'' (جزاک اللہ آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں اس طرح محفل کی رونق بڑھاتی رہیں)

✍ افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ ''نومبر 2021ء کا پاکیزہ دلہن نمبر سامنے پڑا ہے دلہن نمبر دیکھ کر خوش تو ہوئے پر اپنا افسانہ اس لسٹ میں شامل نہ ہونے پر افسردہ بھی۔ (ہاں ڈیئر بس رہ گیا ہمیں خود بھی افسوس ہوا) تبصرے کی خاطر پاکیزہ جتنی جلدی پڑھا اس کی مثال ایسے ہے جیسے کھانے کو جلدی، جلدی ٹھونس کر کھایا جائے۔ صراط عشق، دلشاد نسیم نے ارزش کو تو نئے آسمان پر چڑھا دیا اور نین کے لیے دکھ، صدمہ اور ذمے داریوں کا بوجھ، ویسے صراط عشق پڑھ کر ہمیشہ کالج کی اردو کی پروفیسر میڈم نغمانہ خواجہ یاد آتی ہیں۔ جب حاضری لگاتی تھیں تو ایک لڑکی سمیعہ ترین تھی۔ میڈم ہمیشہ کہتیں کہ یا اس کے ساتھ بدترین لگا لو یا بہترین اکیلا ترین اچھا نہیں لگتا۔ (اچھا بھئی) اسی طرح اکیلا صراط عشق عجیب سا لگا۔ میں عشق ہوں، عمامہ کے ساتھ جو ہوا اس پر جتنا رو سکتے تھے روئے۔ کاش بیتے لمحے واپس آ سکتے۔ غالب کی روح کو خوش کرنے کے لیے عشق کی سیریل چل رہی ہے۔ (بس یہی سمجھ لیں) شیریں حیدر کی اچھے میاں کی دلہن آپا، معاشرتی کہانی تھی۔ عورت جس عمر میں پہنچ جائے اسے تحفظ کی ضرورت رہتی ہے۔ میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں سعدیہ ہما شیخ نے نوجوان نسل کا جو نوحہ لکھا ہے اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ سزا جزا، عائشہ یوسف کا موضوع تو گھریلو تھا مگر......... بیمار ہوئے بغیر، فالج یا ہارٹ اٹیک ہوئے بغیر ساس، نندوں، بھابیوں کو عقل کیوں نہیں آتی؟ (ہاں بات تو صحیح ہے) جھلی کلثوم، فہمی فردوس صاحبہ کی متاثر کن تحریر کاش اینڈ یہاں ہوتا کہ بیٹا ماں کی قدر و منزلت بیوی سے کرواتا نا کہ گاؤں چھوڑ آتا۔ پرفیوم، بخدا اب پرفیوم سے بھی بدبو آنا شروع ہو گئی ہے اور تبصرہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آخری چال، عاصمہ عزیز نے بالآخر شاہ زیب کو محبہ خان کے آگے جھکا ہی دیا۔ رومیلہ نے بھی حسد کا انجام دیکھ کر اپنی منزل حاصل کر لی۔ قرۃ العین خرم ہاشمی نے تعلق کی آبیاری، بہت خوب صورت موضوع جو ہماری معاشرتی اساس ہے میاں بیوی کے رشتے کو بھی ہر وقت محبت، احساس اور تائید تازہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ نور انکل اور عائشہ آنٹی جیسے لوگ اور بزرگ ہونے چاہئیں جو رہنمائی اور مصالحت کا کردار ادا کریں۔ (بالکل درست کہا) لائبہ اعوان کا اگلا گھر، کاش ہر لڑکی کو اگلا گھر کسی آزمائش میں ڈالے بغیر گھر ہی لگے۔ عالیہ حرا میں جو ہی تیرے آنگن کی، سبق آموز کہانی پھوہڑ لڑکیاں اسے پڑھ کر سبق حاصل کریں اور بزرگوں کے زیر سایہ اپنی کمی کوتاہیاں دور کریں۔ شفا سعید، سایہ رومانہ کو شبانہ کی دوستی لے ڈوبی۔ میانہ روی اور اعتدال رشتوں، ملاقاتوں میں بھی ضروری ہے۔ مختصر بات لیکن سبق آموز۔ دردانہ نوشین خان نے دو ہنسوں کا جوڑا لکھ کر اپنی بہن کو خراجِ تحسین پیش کیا، بہت خوب۔ ہائے داوے مجھے بات یاد آ گئی۔ آپ کو پہلے بھی بتائی تھی کہ ہم سارے بہن بھائی ساتھ، ساتھ رہتے ہیں فرحت ناہید سسٹر کا گھر بالکل پاس ہے، اب کوئی چیز پکا کے فوراً بھیجے گی میں نے منع بھی کیا کہ ہر وقت بچوں کو تنگ نہ کیا کرو کہ آنٹی کو یہ دے آؤ، وہ دے آؤ۔ ایک دن سہیل (بھانجا) تنگ آ کر ماں سے کہنے لگا کہ آپ کو کہیں سے زہر بھی مل گیا ناں وہ بھی کہو گی کہ بھاگ کر آدھا بہن کو دے آؤ۔

(اُف اللہ یہ کیا بات ......) اختر شجاعت کا مضمون ایثار ......تقرب الٰہی، قرآنی آیات کے حوالے سے مستند اور سب کے لیے توشۂ آخرت۔ سروے میں شادی کی تقریبات اور رسومات پڑھ کر مزہ آ گیا۔ گھر بیٹھے کتنے جوڑوں کو مقدس رشتوں کا امین بنتے دیکھا۔ بہنوں کی محفل سب سے ٹاپ پر، سب کی سرگرمیاں دکھ سکھ میں شاملِ حال۔ آپ کی محنت پاکیزہ کے معیار کو بلند کر رہی ہے۔ ادارہ پاکیزہ کی بے حد ممنون جنہوں نے دکھ کے لمحات میں میرا غم بانٹا اور میری دلجوئی کی۔ میڈم عذرا رسول کو خصوصی دعائیں اور بیٹی کلثوم عباس کو پیار۔" (بہت پیارا تبصرہ اور پُرخلوص دعاؤں بھرا نامہ، میں تو سر دھنتی رہ گئی۔ اللہ پاک آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے، خوشیاں عطا کرے، ہمارے مرحوم بھائی فلک شیر کے درجات بلند ہوں، آمین)

☜ روحی صبا، کراچی سے۔ "بے حد انتظار کے بعد نومبر کا پاکیزہ ملا۔ ویسے تو ہر ماہ مجھے شدت سے انتظار ہوتا ہے مگر اس بار کچھ زیادہ ہی تھا۔ سرورق پر ڈاکٹر وفا اکرم بہت پیاری لگ رہی ہے اللہ نظرِ بد سے بچائے، آمین۔ سب سے پہلے خوشبو کے نکاح کی تفصیل پڑھی، بہت مزہ آیا مگر نزہت آپ نے تصویر نہیں لگائی، پتا نہیں کیوں؟ خیر کوئی وجہ ہوگی کیونکہ آپ کے خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا ہاں ایک تصحیح میں کر لوں کہ پہلے خوشبو سے دستخط لیے گئے تھے بعد میں عمر سے، آپ کی بات صحیح ہے بس مجھ سے لکھنے میں غلطی ہو گئی آخر بوڑھے ہو گئے ناں تو بھول ہو جاتی ہے۔ میری بھیجی شاعری لگانے کا بھی بہت شکریہ، میں نے اپنے بھائی کو بھی دکھائی بہت خوش ہوا۔ ہاں سب کی شادی کے احوال مزے کے تھے۔ کہانیاں اس بار بھی زبردست ہیں خاص کر لائبہ اعوان کا اگلا گھر بہت اچھی لگی، ایک اہم نقطہ اٹھایا ہے مصنفہ نے بس مائیں سیکھیں تو۔ آخری چال کی کیا بات کروں بڑی، عبرت ناک تحریر ہے، انسان پتا نہیں کیوں بھول جاتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں اللہ کی ذات بہت بڑی ہے وہ جب دراز کی ہوئی رسی کھینچتا ہے تو اکڑے تنی گردنیں منہ کے بل گر جاتی ہیں۔ مصنفہ کو بہت شاباش۔ پرفیوم بھی پسند آئی۔ نینا تو بچ گئی مگر بیچاری بینا۔ میں عشق ہوں تو بس دکھوں کے دریا میں دھکیل دیتی ہے، یہ تحریر بہت افسردہ کرتی ہے اب آخری قسط کا انتظار ہے۔ اور اب بات کرتی ہوں اس کہانی کی جس نے مجھے بہت رُلایا۔ جی ہاں۔ فہمی فردوس کی تحریر شاید نئی مصنفہ ہے۔ (نہیں تھوڑا پرانی ہیں) جھلی کلثوم پڑھ کر کیا بتاؤں کیا حالت ہوئی۔ کیسے، کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں اور نزہت مصنفہ نے تو بہو کو دکھایا ہے کہ ساس کو چور کہتی اور مانتی ہے میری ایک بہت گہری دوست ہے پڑھی لکھی اور اپنی زندگی شوہر اور بچوں کی نذر کرنے والی، وہ چند دن پہلے میرے پاس آئی اور بہت زیادہ رو رہی تھی بڑی مشکل سے روتے، روتے بتایا کہ اس کی اعلیٰ تعلیم یافتہ سگی بیٹی کے پرس سے 300 روپے چوری ہوئے یا گم ہو گئے اور اس نے ڈائریکٹ ماں سے کہا کہ یہ آپ نے چوری کیے ہیں، میری دوست لاکھ صفائیاں دیتی رہی کہ میں نے نہیں کیے مگر بیٹی نہیں مان رہی تھی، نزہت وہ کئی دن تک بہت زیادہ رو رہی تھی کہہ رہی تھی میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم بھی اٹھا لوں گی مگر ڈر ہے کہ بیٹی کو نقصان نہ پہنچ جائے اور یہ وہ ماں ہے جس نے ساری زندگی بچوں کو یہ نصیحت کی کہ راستے میں پڑے پیسے یا کوئی اور چیز اس وقت اٹھانا جب اس کے مالک کا پتا لگا کر اس تک پہنچانا آپ کے لیے ممکن ہے ورنہ نہیں اٹھاؤ۔ (اُف کیسے، کیسے واقعات دنیا میں ہوتے ہیں، اللہ رحم کرے) ہاں نزہت آپ کسی، کسی قاری بہن کے بہت مراسلات شائع کرتی ہیں کسی کے بہت کم...... میں نے دو بڑے اچھے لطیفے بھیجے تھے وہ آپ نے نہیں لگائے اس بار میرا سوال بھی نہیں تھا مگر نام تھا۔ (کوشش کرتے ہیں سب بہنوں کی چیزیں لگتی رہیں) بزم پاکیزہ میں اور بہنوں کی محفل میں فہمیدہ کے خط کے اس جملے نے بہت ہنسایا کہ ان رسائل سے تو ہم عورتیں سیکھتی ہیں اور اچھے کھانے بنا، بنا کر مردوں کے منہ میں ٹھنساتی ہیں۔ (ہاہاہا) ویسے بہنیں ایک دوسرے کا نام بھی لیتی ہیں دعا سلام بھی کہتی ہیں۔ کوئی اللہ کی بندی روحی صبا کا نام بھی لے ناں تا کہ میرا بھی خون بڑھے کیونکہ ڈاکٹر خون کی بہت کمی بتاتے ہیں، ہی ہی ہی۔ (چلو بہنوں روحی کی معصوم خواہش کو پورا کر دو) اس بار سوالات بڑے مزے کے تھے پڑھ مزہ آ گیا۔ بس میں بھی ایک بہن سے متفق ہوں کہ سروے اور گوشۂ ظرافت ختم کر دیں ویسے ہی صفحات ضائع ہو رہے ہیں اس کی جگہ ہر ماہ کسی دو، تین قاری بہنوں کی باتیں دیا کریں وہ اپنے بارے میں کچھ بتائے اور کوئی مشورہ کوئی یادگار واقعہ کوئی نصیحت بھی اپنے تعارف کے ساتھ بتائے تو مزہ آئے گا۔" (اس سلسلے میں تو کب سے، مجھ سے ملیے، کا سلسلہ جاری ہے، آپ سب بہنیں ضرور اپنے بارے میں بتائیں، روحی آپ کی بیٹی کے لیے ہم سب دعا گو ہیں کہ اسے اپنی قابلیت کے لحاظ سے جاب مل جائے ویسے بڑے بڑے پرائیویٹ

اسکولز میں بھی ضرور سی وی بھیجیں اب تو ہر جگہ کیمپس ہیں)

☜ عصمت آپا، اوکاڑہ سے۔ ''پچھلے دنوں گھر کی مرمت میں مصروفیت تھی۔ رینوویشن کروائی تھی۔ اسی میں مصروف رہی۔ اب الحمدللہ کام مکمل ہو گیا ہے۔ گھروں کی دیکھ بھال اور مرمت ساتھ ساتھ کروانی پڑتی ہے۔ (جی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہر چیز رینوویشن مانگتی ہے جبھی چلتی ہے۔ ہمیں اپنی صحت کی بھی اسی طرح کیئر کرنی چاہیے) نایاب جیلانی کو زندگی کا یہ نیا سفر بہت، بہت مبارک ہو اللہ ہزاروں خوشیاں نصیب کرے۔ میں ان سے ملی ہوئی ہوں۔ اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے، الٰہی آمین۔ اس دفعہ زارا ہنجرا کی کہانی بہت عمدہ تھی ان کو پاکیزہ میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ہم بھی ہنجرا برادری سے ہیں۔ (اچھا ماشاءاللہ) ..... اختر شجاعت نے ایثار پر بہت بہترین لکھا ہے۔ اب ان سے فرمائش کریں کہ امہات المومنینؓ کی سیرت مطہرہ پر بھی لکھنا شروع کریں۔ (جی بالکل) ان کے مضامین بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ آپ یقین کریں میں ایک عرصے سے پڑھ رہی ہوں ابھی پچھلے دنوں بوری بھر کر میری بھتیجی، بھانجی لے گئی ہیں۔ پڑھنے کی بہت شوقین ہوں۔ پاکیزہ تو میرا گھر ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے سب بہنوں کی باتیں پڑھ کر۔ میرے میاں کو سب بہنیں، دعاؤں میں یاد رکھیں۔ ان کی یادداشت کا مسئلہ ہو گیا ہے۔'' (جی بہنیں ضرور دعا کریں گی۔ اللہ پاک آپ دونوں کو صحت و سلامتی عطا کرے، آمین)

☜ حدیث اختر، بہاول پور سے۔ ''السلام علیکم، سلامتی اور عافیت کی دعاؤں کے ساتھ بہنوں کی محفل میں حاضر ہوں، کیسی ہیں آپ اور باقی پاکیزہ ٹیم؟ (الحمدللہ آپ کی دعائیں ہیں، ویسے تو ماشاءاللہ ہر ماہ شمارہ آپ کی محنتوں کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے لیکن اس دفعہ خصوصاً روحانی مشورے روح کو تازہ کر گئے تو وہیں گوشۂ ظرافت نے باغ و بہار کر دیا ابن انشا کی فارسی کیا کہنے، صراط عشق، دلشاد نسیم ہولے، ہولے کھل رہی ہیں اور میں عشق ہوں، کاش عمامہ کی زندگی میں کوئی اس کی سننے والا ہوتا لیکن پھر داستان کیسے بنتی؟ باقی کچھ پڑھا ہے کچھ رہتا ہے کہ تہنیت فاطمہ ''نواسی'' جب اسکول سے آتی ہے تو سوال ہوتا، نانو جی میں تھوڑی دیر لے لوں۔ دردانہ نوشین کی تحریر، دو ہنسوں کا جوڑا، دل کو دکھی کر گیا اللہ کریم سے دعا ہے جن کے پیارے بچھڑ گئے ہیں ان کو صبر عطا فرمائے اور جانے والوں کے ساتھ شفقت و مغفرت کا معاملہ، الٰہی آمین...... دلہنیں دیکھ کر دل خوش ہوا اللہ سب کو بانصیب بنائے، نزہت، اس دفعہ ذکیہ آپا کی نعت نے بھی بڑا سرور دیا مجموعی طور پر آل دی بیسٹ تحریر فصل گل کی تمنا، زارا ہنجرا نے اچھا سبق دیا ہے اس دعا کے ساتھ۔ ''کہ اللہ پاک اس باغ کی ابتدا کرنے والے کی مغفرت فرمائیں' اور موجودہ ساری ٹیم بشمول عذرا آپی و پیاری نزہت سب کو اپنی حفظ امان رکھے۔ آمین......'' (بہت پیارے سے تبصرے کا شکریہ...... اللہ پاک آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے)

☜ فرزانہ جبیں، کراچی سے۔ ''میرا نام اور میری تحریر آپ کے لیے نئی سہی مگر پاکیزہ سے میرا رشتہ نیا نہیں...... پہلی بار میں نے دس سال کی عمر میں پاکیزہ پڑھا۔ افسانے کا نام ''تمہیں میری قسم'' ہے۔ اور کردار ''شکیب'' آج بھی میرے حافظے میں موجود ہے۔ کالج میں آئی تو باقاعدہ قاری بنی۔ آج 45 سال گزرنے کے بعد بھی پاکیزہ میرے ساتھ ہے۔ اس کی تعریف کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا۔ (ماشاءاللہ پھر تو آپ کا پاکیزہ کا گہرا ساتھ ہے بھئی خوش آمدید) پاکیزہ کے تمام سلسلے اتنے اچھے ہیں کہ ان کی تعریف کرنا...... لوگ تو سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ...... کے مترادف ہے۔ سعدیہ ہما شیخ کا ناولٹ میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں، ایک بہترین موضوع کے ساتھ بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ شاعری کا انتخاب بہت خوب صورت ہے۔ دلشاد نسیم کا صراط عشق ایک عمدہ تحریر ہے۔ افسانوں میں جھلی کلثوم بہترین...... ہر دوسرے گھر کی کہانی...... ہم نے صرف عبادت کو جنت کے حصول کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ حقوق العباد کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ کاش ہم جان لیں کہ والدین چاہے اپنے ہوں یا شوہر کے حقوق ایک جیسے ہیں۔ زاویۂ انعکاس نے بھی متاثر کیا۔ باقی تحریریں ابھی نہیں پڑھیں لہٰذا تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ہر سال دسمبر اسی طور آتا ہے کہ زخم پھر سے رسنے لگتے ہیں۔ 16 دسمبر اپنے ساتھ بہت سی تلخ یادیں لے کر آتا ہے۔ سانحۂ مشرقی پاکستان کے تناظر میں ایک غزل لکھی ہے۔ اگر قابلِ اشاعت ہو تو پلیز دسمبر کے شمارے میں اسے جگہ دیں۔ اگر نا قابلِ اشاعت ہو تو ضرور بتایئے گا۔ نزہت صاحبہ آپ کے جواب کا انتظار رہے

گا۔ بہت ساری پاکیزہ دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ......“ (لیں جی جواب بھی حاضر ہے اور آپ کی غزل بھی اس شمارے کی زینت بنی ہے، بہت دیر کی مہرباں آتے، آتے مطلب محفل میں آمد، بہر حال اب آپ آتی رہیے گا۔)

کھ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”اس بار پاکیزہ جلد ہی مل گیا۔ ڈاکٹر وفا اکرم کے خوب صورت سرورق سے سجا پاکیزہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے درست فرمایا ہے کہ اسلام کا بول تو بالا رہے گا ہی کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے مگر مسلمانوں کے فکری زوال کی داستانیں بڑی تکلیف دہ ہیں۔ جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی وفات پر قوم غمزدہ ہے۔ جی ہاں واقعی پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اللہ پاک انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ دین کی باتیں اور شمع ہدایت پڑھ کر ہم اپنی روح کو سرشار کرتے ہیں۔ دلہن نمبر واقعی دلہن نمبر ہی تھا۔ اکثر کہانیوں میں اور مستقل سلسلوں میں دلہنوں کا ہی ذکر تھا۔ ہمیں بھی اپنی دلہن بننے کی یادیں ستانے لگیں، میں نے اپنے میاں جانی پرنس افضل شاہین سے کہا کہ میں اور آپ آج دلہن دولھا بنتے ہیں۔ آج بھی آپ تحفے میں گولڈ کی رنگ دینا۔ میرے میاں جانی نے جواب دیا۔ بیگم! تمہاری... رنگ کے چکروں میں میری دو ماہ کی سیلری لگ جائے گی۔ معلوم بھی ہے سونا کتنا مہنگا ہے۔ میں پھر اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔ (اوہو پرانی رنگ پر گزارہ کرو) شادی خانہ آبادی میں ہمیں اس بار سعدیہ ہما شیخ کی بہن اور نزہت جبیں ضیا کی بیٹی کی شادیوں کا حال احوال پڑھنے کو ملا۔ اس بار عذرا آپی نے ہم سے دو باتیں نہیں کیں چلیں کوئی بات نہیں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ فہمیدہ جاوید، صبا آصف کو صحت دے۔ حدیث اختر کی بھتیجی کے میاں کو تسنیم کوثر کے چھوٹے بھائی کو جنت میں جگہ دے۔ آمین۔ ساجدہ ظفر اور مسرت عزت کا شکریہ کہ انہیں میرے سوالات پسند آتے ہیں۔ منتخب غزلیں کے سلسلے میں آپ جو شاعروں کا کلام شائع فرماتی ہیں اور ساتھ میں ان کی پیدائش اور وفات کی تاریخ بھی لکھتی ہیں اس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔“ (چلیں اچھی بات ہے)

کھ جبینا، کراچی سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ ستمبر کے آخری ہفتے اور اس سے دو دن پہلے ادارے کی عطا کردہ انعام یافتہ کتاب ملی (بہت شکریہ) امی اسپتال میں داخل تھیں یوں اکتوبر کا پورا ماہ رسالہ پڑھ نہ سکی ابھی کچھ فرصت ہوئی تو پڑھا اور ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ نومبر کا بھی مل گیا۔ رخ چودھری کا دکھ، مزید دکھی کر گیا۔ شیریں حیدر کی کہانی میں تایا جی کی لالچ کے کیا کہنے جبکہ ساری عمر کمانے کے لیے بھی کم پڑ جاتی ہے۔ جلنہ ذات، آنکھیں کھولنے اور گھر کے ملازمین کو نظر میں رکھنے کا بہترین سبق تھا۔ میں نے خوابوں کے رنگ میں کچھ یکسانیت کا احساس ہونے لگا ہے یا پھر صرف میرا خیال ہے۔ دل پر زور نہیں...... میں بالکل اینڈ پر صورت حال چینج ہوگئی جب رومیشہ پھر ایک بار سوتن کے ہاتھوں برباد ہوئی کچھ عجیب سا تھا کہ دانیال ایک وقت میں بیوی کی دو بھابیوں سے گیم کھیل رہا تھا اور اچانک ہی گل نے سارے میچ کی فتح اپنے نام لگالی۔ (اللہ بچائے ایسی عورتوں سے) رومیشہ کا آخری فیصلہ ٹھیک تھا۔ اداس چاندنی، طوق محبت، مہکتا آنگن، محبت فاتح عالم، بس سو سو رہی ہیں۔ فرحین اظفر سے ملاقات میری بھی خواہش تھی جو پوری ہوتی تھینکس...... مستقل سلسلے اچھے رہے۔ محترمہ اختر شجاعت کا مضمون سپر ڈوپر رہا۔ ہمیشہ کی طرح......نومبر کا دلہن نمبر ٹائٹل بہت خوب صورت کلر میچنگ بالکل پرفیکٹ لگ رہی ہے۔ بہنوں کی محفل سے شروع کیا۔ سب کے حالات سے آگاہی ہوتی۔ کہیں افسوس، کہیں دعا اور کہیں خوشی، عجیب زندگی ہے۔ ہیں آنسو مشترک (جی بالکل) پاکیزہ ڈائری میں حمد و نعت کے بعد نظم چپ ہی رہنا بہت پسند آئی۔ آنسوؤں کے ساتھ پڑھی۔ آپی دعاؤں کی درخواست ہے۔ (اللہ پاک آپ کے تمام مسائل حل کرے آمین)۔ بزم پاکیزہ

ضروری اطلاع

عزیز قارئین! چند ماہ پہلے کاغذ کی گرانی کے باعث بادل نخواستہ بڑا کٹھن فیصلہ کیا تھا۔ مگر شائقین پاکیزہ جو کہ نہایت حقیقت پسندانہ طرز فکر رکھتے ہیں۔ انہوں نے اسے بخوشی قبول کیا۔ اب اسی کاغذ کی عدم دستیابی و دیگر اشاعتی و ترسیلی مراحل میں گرانی کے باعث اس ماہ سے ماہنامہ پاکیزہ کی قیمت میں بیس روپے کا اضافہ کیا جارہا ہے۔ یقیناً یہ فیصلہ خود ہمارے لیے بھی مشکل تھا مگر مجبوری ہے۔ پاکیزہ کے ساتھ آپ کا خوب صورت رشتہ ان شاء اللہ فزوں تر ہوگا کہ اب ہم گولڈن جوبلی کی تیاریوں میں ہیں۔ امید ہے قارئین ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔

میں انعام کے حقداروں کو مبارک باد قبول ہو...... فصل گل کی تمنا، میں ایک اچھی سوچ کو بہت اچھے انداز میں ڈھالا گیا۔ آخری چال کا دوسرا اور آخری حصہ کہانی کو اچھے اور مثبت موڑ پر ختم کیا گیا اگر تھوڑا اسا اکڑ و تائی کی گردن کا سریا بھی نکال دیا جاتا تو ویل اینڈ گڈ تھا۔ مگر شاید احساس گناہ یا ندامت اور کفارہ بھی اللہ کی توفیق سے ہی ممکن ہے سارا وقت بیچاری محبہ کو طعنے، طنز ہی سناتی رہیں آخر کو بہو بھی وہی رہی۔ تعلق کی آبیاری، اچھی کہانی تھی اور صرف میاں بیوی کے لیے ہی نہیں ہر اچھے اور جائز تعلق کو آبیاری کی ضرورت رہتی ہے۔ (یہ تو درست کہا) اگلا گھر اور سایہ میں اچھا سبق دیا گیا۔ کاش پانی سر سے گزرنے سے پہلے ہی ہوش آجایا کرے تو کیا کہنے......" (جزاک اللہ اور مختصر تبصرے کا شکریہ)

٭ حمیرا شفیع، صادق آباد سے۔ "اس دن آپ سے فون پر بھی بات ہوئی تھی۔ بہت مزہ آیا۔ آپ کی شگفتہ مزاجی اور بزلہ سنجی کی مزید قائل ہوگئی ہوں۔ میرے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی مدیرہ صاحبہ سے اتنی آسانی سے بھی بات ہوسکتی ہے۔ (ارے کیوں بھئی پاکیزہ کی تو ہمیشہ سے یہ اچھی روایت ہے) اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی سے نوازے اور ہزاروں خوشیاں نصیب فرمائے، آمین (جزاک اللہ) اس بار نومبر کا پاکیزہ خوب رہا۔ ناسازیٔ طبع کے باعث پورا تو نہ پڑھ پائی بہرحال جتنا بھی پڑھا ہے تبصرہ حاضر خدمت ہے۔ سب سے پہلے تو دلشاد نسیم کا ناول صراط عشق کی قسط بے حد پسند آئی بہت خوب صورتی سے ناول آگے بڑھ رہا ہے۔ مزید نئے کرداروں کے اضافے کے ساتھ، ساتھ کہانی کھلتی جارہی ہے۔ افسانے تمام ہی سبق آموز تھے۔ تمام رائٹرز نے خوب انصاف کیا۔ بہن فرحین اظفر کی کمی محسوس ہوئی۔ (جی وہ جلد ہی نئے سلسلے کے ساتھ آئیں گی) اشعار کا چناؤ لاجواب تھا۔ موسم کے پکوانوں سے منہ میں پانی آگیا۔ تمام بہنوں کے خطوط پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر باریک بینی سے پورے پاکیزہ کا مطالعہ کرتی ہیں۔ آپی نزہت! پلیز ان کی تجاویز کو نظرانداز مت کیا کریں۔" (ہم کوشش کرتے ہیں کہ ان کو مدنظر رکھ کر تبدیلی لائیں افسانہ بھی جلد لگ جائے گا)

٭ آسیہ عامر، کراچی سے۔ "چنبیلی کی خوشبو جیسا پیارا پیارا پاکیزہ اور پاکیزہ کی الھڑ مٹیاروں کو دسمبر کا دھند میں لپٹا ہوا محبت سی گرمی والا اسلام، مجھے کچھ کہنا ہے، شروع ہوتی ہوں تو پھر بہنوں کی محفل میں جاکر بریک لگ جاتی ہے سب کے حال احوال کا پتا چلتا ہے کہ تو پھر ادھر ادھر جھانک کر افسانوں کا دیدار کرتی ہوں۔ دانیہ آفرین نے مہکتا آنگن میں اچھا سبق دیا کہانی پڑھنے کا بھی مزہ آیا۔ طوقِ محبت حوریہ بتول جو لڑکیاں ماں باپ کو دھوکا دے کر خود کو بے مول کرتی ہیں ان کا یہی انجام ہونا چاہیے شادی سے پہلے کوئی محبت وحبت نہیں ہوتی۔ نگہت اعظمی کی خبر ہونے تک مختصر مگر پراثر تحریر سب شوہر حضرات پڑھ لیں بعد میں پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نایاب جیلانی کا میں عشق ہوں چوں چوں کا مربہ اپنے اختتام تک پہنچ گیا۔ تقریباً عمامہ کا سیاپا مکا دیے نایاب جی آپ بال کی کھال کیسے کھینچ لیتی ہیں آخر مجھے بھی بتائیں آفٹر آل میں بھی نئی نکور رائٹر ہوں۔ آہم مم ویسے دلہن بنی ہوئی نایاب بہت معصوم لگ رہی ہیں۔ سب دلہنیں پیاری لگ رہی ہیں، پروردگار...... ان کے نصیب اچھے کرے (آمین) نزہت جبین ضیا کی بیٹی کی شادی کا احوال پڑھ کر اچھا لگا کہ اب بھی لوگ مہینوں، مہینوں ڈھولک پر گیت گاتے ہیں رشتے دار شریک ہوکر گھر میں رونق کرتے ہیں۔ شیریں حیدر صاحبہ کا نام ہی کافی ہے۔ چاہے سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہو یا اچھے میاں کی دلہن آپا بہت اچھا لکھتی ہیں۔ دل بہت اداس بھی ہوا پڑھ کر انسان بہت بے بس ہے لوگ کہتے ہیں ماڈرن زمانہ ہے بیٹا یا بیٹی میں کوئی فرق نہیں تو فرق یہ ہے کہ بیٹا پیدا ہوتے ہی کمائی نہیں کرنے لگ جاتا یا اس لیے بڑھاپے کا سہارا نہیں کہتے کہ وہ کمائی کر کے کھلائے گا بلکہ اس کے بیوی بچوں سے گھر میں رونق ہوتی ہے۔ بیٹیاں پرایا دھن ہے زمانہ جتنا مرضی ماڈرن ہوجائے اور بیٹوں کی موجودگی میں ماں یا باپ اگر ایک رہ جائیں تو تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ ویسے مجھے پہلے دن سے پتا چل گیا تھا اچھے میاں کی دلہن بنے گی مریم۔ دلشاد نسیم صاحبہ آپ سے وعدہ ہے صراط عشق پڑھوں گی، اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون آنحضرت ﷺ کے اخلاق مبارکہ نہایت محبت وعقیدت سے پڑھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ...... ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے دلوں کو نرم کردے۔ (آمین) سلمیٰ غزل کا محبت فاتح عالم اچھا افسانہ ہے لیکن سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے یہ رائٹر نے اچھے طریقے سے لکھ دیا۔ میری بھانجی لائبہ ندیم کی پاکیزہ میں نظم چھپی میں نے اسے فون کر کے بتایا تو مجھے فون پر دھڑام سے کچھ گرنے کی آواز آئی خوشی میں اکثر ایسا ہوجاتا ہے۔ عالیہ حرا صاحبہ سچ، سچ بتائیں میری ڈائری آپ کے ہاتھ کیسے لگی میں بھی یہی کہتی تھی جب میری سائیکالوجی کی ٹیچر امی کی دوست بھی تھیں کہتی کھانا پکانا سیکھ لو اگلے گھر جاکر کیا کروگی۔ تو میں کہتی راج کروں گی تو آج دیکھیں پکا لیتے ہیں میں اچھی طرح جان سکتی ہوں انوشہ کی فیلنگز اب اتنا لمبا دسترخوان سجاتے ہوئے خوشی کے ساتھ فخر بھی ہوتا ہے۔ اگلا گھر بہت

اچھی سوچ ہے لائبہ اعوان کی۔ تعلق کی آبیاری ویلڈن قرۃ العین ہر رشتے کو احساس دلائیں کہ وہ آپ کے لیے کتنا اہم ہے۔ آرڈر آگئے تھے کہ 15 تاریخ تک تبصرہ مل جائے لہٰذا بقیہ آئندہ ماہ، سردیوں میں گرما گرم کافی، گاجر، چنے کی دال کا حلوہ میری طرف چکن کارن سوپ سب بہنوں کو میری طرف سے۔ دسمبر کو خوب، خوب انجوائے کریں۔'' (بالکل اور ہاں اس کی ترکیبیں بھی بھیج دینا۔ تبصرے کا شکریہ)

تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''خوبصورت اور مسحور کن کہانیوں سے سجا دلکش پاکیزہ 25 تاریخ کو مل گیا اور حسب عادت دل میں گھر کر گیا۔ مگر معذرت کے ساتھ اس بار پورا پاکیزہ دلجمعی سے نہیں پڑھ سکی کیونکہ بھائی کی وفات کی وجہ سے ابھی دل کو سکون سا نہیں ہے لیکن پاکیزہ سے بھی فیملی ممبر کا سا رشتہ ہے۔ اس لیے اسے بھی اگنور نہیں کر سکتی پاکیزہ کو تو میں اپنی سہیلی اور بہن سمجھتی ہوں۔ سلامت رہو پاکیزہ۔ (اللہ پاک آپ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین) اس بار شیریں حیدر کا ناولٹ اچھے میاں کی دلہن آیا بہت عمدہ لگا۔ یونیک سی اسٹوری نے اودھم مچا دیا شیریں خوش رہیے اور سعدیہ ہما شیخ بھی اپنے ناول میں نے خوابوں کے رنگ دیکھے ہیں بڑے زبردست انداز میں چھا رہی ہیں سعدیہ آپ کو مبارک ہو۔ افسانوں میں عائشہ یوسف کا سزا جزا اچھا لگا اور فصل گل کی تمنا بھی بھلا لگا۔ زارا ہنجرا نے بہترین کوشش کی اور ہاں یہ دلہنوں کی تصویریں بہت دھندلی اور بالکل سیاہ سی رہیں حالانکہ یہ بالکل کلیئر ہونی چاہیے تھیں۔ (ہاں کچھ پرنٹنگ میں مسئلہ ہو گیا تھا) اللہ ان تمام دلہنوں کو شاد آباد رکھے۔ اور بس چند ہی چیزیں پڑھ سکی ہوں اس لیے تبصرہ بھی اتنا ہی عرض ہے۔ آخر میں دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ۔ پھر بھی آپ نے ہمت کر کے لکھ لیا۔ بس زندگی رکتی نہیں اپنے پیاروں کا غم کب بھولتا ہے اللہ ہی مدد کرتا ہے)

مسکان نور، لاڑکانہ سے۔ ''میری پیاری فہمیدہ جاوید آنٹی نے مجھے یاد کیا۔ بہت شکریہ۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ میں نے جو کہانیاں پڑھیں۔ وہ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ مہرین کنول کا افسانہ تعلق کی آبیاری، بہت پیارا افسانہ تھا۔ فرحت جبیں کی کہانی بہت پسند آئی جیسا سوچا تھا اینڈ میں ویسا ہی ہوا۔ افسانہ بڑا تھا مگر بہت اچھا تھا۔ اگلا گھر، بہت خوب صورت افسانہ تھا۔ بالکل سچ لکھا اگر ہر ماں سارہ جیسا سوچے تو گھر کی بیٹیوں، بہوؤں اور ماؤں کو بھی تھوڑا سا آرام آجائے۔ میں جو ہی تیرے آنگن کی پسند آیا۔ آخر میں اپنی دوست شفا سعید کو افسانہ شائع ہونے پر مبارک باد۔ آپ نے ایک بہت اچھے موضوع پر قلم اٹھایا۔ زبردست۔ نایاب آپی کی کہانی کی اگر تین چار قسطیں اور پڑھنے کو مل جاتیں تو اچھا تھا۔ خیر افشاں آفریدی آپی آپ بھی جلد کوئی اور ناول لے کر آئیں۔ شادی کا احوال۔ ماشاء اللہ ہماری پیاری نایاب آپی کتنی پیاری ہیں۔ اللہ پاک نایاب آپی کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ فہمیدہ آنٹی کی پیاری سی نند کی شادی پڑھ کر تو سچ میں مزہ آگیا اور میری پیاری آپی نحل سعدی کی دوسری کہانی کب شائع ہوگی مجھے انتظار ہے ان کی کہانی کا۔ (جی ان شاء اللہ جلد) نحل آپی آپ کا افسانہ، مٹی۔ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ خوش رہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ، تبصرہ اگر لیٹ ہو جائے تو اگلے ماہ شائع ہو جاتا ہے)

اچھا بہنو! اس سال کی یہ آخری محفل اختتام پزیر ہے۔ سال نو میں نئے انداز سے محفل سجائیں گے آپ کے خطوط و تبصروں کے منتظر رہیں گے۔ جو بہنیں اپنی سرگرمیاں لگوانا چاہیں وہ الگ صفحے پر لکھ دیا کریں۔ جو موبائل نمبر رسالے میں دیا گیا ہے اس پر میسج کر سکتی ہیں۔ اپنی کہانیاں ای میل کرنے کے بعد ریسیو ہونے کا بھی پوچھ لیا کریں اور تقریباً ڈیڑھ سے دو ماہ بعد اشاعت کا۔ امید ہے بہنیں ہمیشہ کی طرح تعاون کرتی رہیں گی۔ جاتے سال کی اچھی باتیں اپنے پلو سے باندھیے...... اسی کا پرچار کریں اور سال نو سے اچھی امید اور روشن توقعات رکھیں اپنے آپ کو ہر لمحہ، ہر دن بہتر سے بہتر بنانے میں صرف کریں۔ اللہ پاک کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اے رحمٰن و رحیم! اے غفور الرحیم! اے قادر مطلق! اے ہمارے پالن ہار! ہماری قضا و قدر کے مالک اپنے محبوب پاک ﷺ کے صدقے میں ہم پر اپنا فضل و کرم جود و سخا جاری رکھ۔ ہم سے رحم کا معاملہ فرمانا۔ ہمارے ملک پاک پر اپنی خاص عنایت کر...... گناہ صغیرہ و کبیرہ معاف فرما دے کہ تو ارحم الراحمین ہے۔ یا کریم! یا مجیب! یا رب العالمین! اللہ حافظ

خیر اندیش، نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783, 021-35802552 EXT 110



حمد باری تعالیٰ

صبح پکارو یا اللہ شام پکارو یا اللہ
وہی ہے سب کا رکھوالا دل سے پکارو یا اللہ
تکلیف مری تو کردے دور میں بے بس ہوں اور مجبور
تو ہی شفا کا دینے والا میرا مولیٰ یا اللہ
میرے دل میں تو رہتا ہے تیری یاد ستاتی ہے
اپنی رحمت بھیجتے رہنا میرے مولیٰ یا اللہ
کوئی کسی کا ہوتا نہیں ہے کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہے
تو ہی سب کا ساتھی ہے میرے مولیٰ یا اللہ
تیری عنایت حد سے زیادہ شکر ادا میں کم کرتی ہوں
میری بھلا اوقات ہی کیا ہے میرے مولیٰ یا اللہ

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

حمد

میرے رب کی ہے کیسی شان
اس جیسا کون ہے مہربان
جسے حال سنانے کو کرتا نہیں کوئی انتظار
وہ ایک ہی ہے ساری زمیں و آسمان کا سلطان
بنایا ہے اشرف المخلوقات اس نے
درجہ دیا ہے سب سے افضل ہونے کا انسان
کیا تو اور کیا تیرا کردار ہے
رب نے کروائی ہے تیری پہچان
رب سے بڑھ کر کوئی ہمدرد نہیں
وہی ہے ہم سب پر مہربان
اس کی محبت اور عنایتیں ہیں بے حساب
جس کی حمد کرتے، کرتے نہیں تھکتی زبان
ایک ماں کے پیار کا حق ادا کر سکتا نہیں کوئی
جو ستر ماں جیسا پیار کرے کیا بیاں ہو اس کی شان

کاوش: حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ

نعت رسول مقبولؐ

سب سے اولیٰ و اعلیٰ ہمارا نبیؐ
سب سے ارفع و بالا ہمارا نبیؐ
بزم آخر کا شمع فروزاں ہوا
نور اول کا جلوہ ہمارا نبیؐ
سارے اچھوں میں اچھا سمجھیے جسے
ہے ان سب سے اچھا ہمارا نبیؐ
سب چمک والے اجالوں میں چمکا کیے
اندھے رستوں میں چمکا ہمارا نبیؐ
بجھ گئیں جس کے آگے سبھی مشعلیں
شمع وہ لے کر آیا ہے ہمارا نبیؐ
غمزدوں کو یہ رضا مژدہ سنا دیجیے
بیکسوں کا سہارا ہمارا نبیؐ

شاعر: امام احمد رضا خان
مرسلہ نگار: فہمیدہ جاوید، ملتان

مناجات

حضرت مولانا رومؒ (ترجمہ)

اے خدائے قدوس، عرش اعظم کے بنانے والے اور اے مولائے من، دونوں جہاں کے بادشاہ! سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زلفِ عنبریں عطا کرنے والے۔

اے قدرت رکھنے والے بہ حد کمال! تو ہی میرے لیے کافی ہے اور اے شان و شوکت رکھنے والے! تو ہی میرا رب ہے۔

اے خدائے مہرباں! میں تیرے کمالِ احسان اور انعام پر قربان جاؤں تو جودو احسانات کا مخزن ہے۔ میں تجھ پر قربان جاؤں۔

اے مولا! تو ہمارے جرموں کو دیکھتا ہے اور غصے

کا اظہار نہیں فرماتا کہ میری جاں تجھ پر نثار ہو، تو کس قدر شان والا بادشاہ ہے۔

اے میرے پیارے مولا! تو ہمارے جرموں کو دیکھتا ہے اور انتقام نہیں لیتا بلکہ بندہ پروری اور کرم نوازی سے ہمیشہ پیش آتا ہے۔

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہہ

☆ "پریشانی خاموش رہنے سے کم، صبر کرنے سے ختم اور شکر کرنے سے خوشی میں بدل جاتی ہے۔"

☆ "جو تمہیں خوشی کے موقع پر یاد آئے، سمجھ لو کہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور جو تمہیں غم کی شدت میں یاد آئے تو سمجھ لو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔"

☆ "کبھی کسی کے سامنے اپنی صفائی پیش نہ کرو کیونکہ جسے تم پر یقین ہے، اسے ضرورت نہیں اور جسے تم پر یقین نہیں وہ مانے گا نہیں۔"

☆ "ہمیشہ سچ بولو کہ تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔"

☆ "انسانوں کے دل وحشی ہیں جو انہیں موہ لے، اسی پر جھک جاتے ہیں۔"

☆ "جب عقل پختہ ہو جاتی ہے، باتیں کم ہو جاتی ہیں۔"

☆ "انسان زبان کے پردے میں چھپا ہے۔"

☆ "جو بات کوئی کہے تو اس کے لیے برا خیال اس وقت تک نہ کرو جب تک اس کا کوئی اچھا مطلب نکل سکے۔"

☆ "دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے کہ چھونے میں نرم اور پیٹ میں خطرناک زہر۔"

☆ "کسی کے خلوص اور پیار کو بیوقوفی مت سمجھو ورنہ کسی دن تم خلوص اور پیار تلاش کرو گے اور لوگ تمہیں بیوقوف سمجھیں گے۔"

از: بینا عباس، کراچی

شہر جدہ

روشنیوں کا شہر
ہر طرف روشن ہے یہ شہر
جدھر کیجیے اپنی نظر
ہر طرف بکھرا ہے نور ہی نور
جدھر نظر اٹھائیے آجائے گا سرور
خوب صورت فوارے ہیں یہاں
جو رات میں بڑھاتے ہیں اس کی خوب صورتیاں
خدا کے گھر سے نزدیک ہونے کے سبب
نور کا لگتا ہے اِک انوکھا شہر
دل یہ چاہتا ہے آپ جائیں بار، بار
اور نیا لطف اٹھائیں ہر بار
کاش زندگی دے اتنی مہلت مجھے
کر سکوں خدا کے گھر کی زیارت بار، بار

از: فریدہ فضل ڈیلاس، یو۔ ایس۔ اے

عبادات میں مددگار موسم

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "موسم سرما مومن بندے کے لیے بہار کا موسم ہے۔ اس کی راتیں طولانی ہوتی ہیں جو اس کو عبادت کرنے میں مدد دیتی ہیں اور اس کے دن چھوٹے ہوتے ہیں جو مومن کو روزہ رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔" (فضائل الاشہر الثلاثہ، ص ۱۱۱)

یہودیوں کے ساتھ محشور ہونے والے

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ "جس کسی نے کسی مسلمان کے ساتھ خرید و فروخت میں ملاوٹ یا فریب کاری کی تو وہ ہم میں سے نہیں ہے اور قیامت کے دن یہودیوں کے ساتھ محشور ہوگا۔" (من لایحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۱۴)

مرسلہ: سنبل ملک، شاہدرہ

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات

۱۔ بہت خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آپس میں نرم دلی اور الفت سے پیش آتے ہیں۔ یہ لوگ روزِ قیامت رحمتِ پروردگار کے سائے میں ہوں گے۔

۲۔ کم بولنا بڑی حکمت ہے لہٰذا تم لوگ خاموشی کو

اپناؤ کیونکہ یہ ایک عمدہ خصلت ہے اور اس کا بوجھ بھی بہت ہلکا ہے۔ اور اس سے گناہ بھی کم ہوتے ہیں۔

۳۔ نہایت سعادت مند ہیں وہ لوگ جو بنی نوع انسان کے درمیان اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ قیامت کے دن مقربِ بارگاہ الٰہی ہوں گے۔

۴۔ اگر تم لوگوں سے حسد کیا جائے، نازیبا کلمات کہے جائیں اور ہر قسم کی جھوٹی تہمت تم پر لگائی جائے تو (دل گرفتہ نہ ہونا) خوش ہونا، مسرت کا اظہار کرنا کیونکہ خداوند عالم کے نزدیک تمہارا اجر بڑھے گا۔

۵۔ لوگوں کے عیوب کو اس طرح مت دیکھو گویا تم ان کے آقا و مالک ہو۔ بلکہ اس طرح (چشم پوشی) کرو کہ وہ بھی تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔

مرسلہ: فرحانہ رضا، ملتان

پلاننگ

اگر نمازِ فجر کے لیے بیدار ہونا تمہاری پہلی پلاننگ نہیں تو باقی دن کی پلاننگ کوئی معنی نہیں رکھتی اس لیے کہ تمہارے دن کی شروعات مادیت پسندی سے ہوتی ہے تو روحانی کامیابی کیسے حاصل ہو۔ اللہ پاک ہم سب کو راہِ حق پر چلنے کی توفیق دے، آمین۔

از: دعا، ہنگو، وزیرستان

رشتہ

کچھ رشتے بہت خوب صورت ہوتے ہیں مگر ان کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ ان پر ہمارا حق خود بخود اس طرح ہو جاتا ہے کہ وہ ہمیں ہر حال میں اپنے ساتھ چاہیے ہوتے ہیں بنا کسی لالچ کے، بغیر کسی غرض کے، بس ان کا ہماری زندگی میں ہونا ہی ایک سکون ایک تسلی کا باعث ہوتا ہے۔

از: رفعت مبین رفی، یو ایس اے

امیدِ نو

اس قدر سویا ہے آخر کتنا سونا ہے ابھی
اٹھ کہ ہم سفر تجھے سورج کا ہونا ہے ابھی
زندگی تو ہے مسلسل اِک دکھوں کی آبشار
کون جانے کس کو کتنی دیر رونا ہے ابھی

از: روحی صبا، کراچی

ذہین ترین دانشور

روس میں 60 ویں منزل پر دنیا کے ذہین ترین دانشمند جمع ہو کر کسی مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے۔ ایک ننھی منی چڑیا بار، بار کھڑکی کے راستے اندر آ کر چوں، چوں کر کے ان کی گفتگو میں شامل ہو جاتی۔ تین بار چڑیا کو باہر نکالا۔ چڑیا پھر آ کر چوں، چوں کرنے لگی تو دنیا کا ذہین ترین دانشور اسے مٹھی میں جکڑ کر عمارت کی 60 ویں منزل سے کھڑکی کے راستے یہ کہتا ہوا باہر کود گیا۔

''اب دیکھتا ہوں کیسے واپس آتی ہے یہ۔''

کہانی نگار اور ڈراما نگار

جیسے کے چیسٹرٹن مشہور جاسوسی کہانی نگار تھے اور برنارڈ شا مشہور ڈراما نگار۔ چیسٹرٹن چھوٹے قد کا خاصا موٹا آدمی تھا جبکہ شا لمبے اور بے حد دبلے تھے۔ ایک روز چیسٹرٹن نے مذاقاً ان پر پھبتی کسی۔

''یار شا، تمہیں اگر کوئی غیر ملکی دیکھے تو وہ یہی سمجھے گا کہ برطانیہ میں قحط پڑا ہوا ہے۔''

شا نے اطمینان سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور اگر اس نے تمہیں دیکھ لیا تو یہ بھی سمجھ جائے گا کہ قحط کیوں پڑا ہوگا۔''

فرمائشی چیز

مشہور انگریز ادیب جارج برنارڈ شا ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ ہال میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ موسیقی کے بے ہنگم شور سے تنگ آ کر انہوں نے بیرے کو بلایا اور پوچھا۔

''کیوں میاں، یہ بینڈ والے فرمائشی چیز بھی بجاتے ہیں؟''

''جی ہاں، کیوں نہیں۔'' بیرے نے ادب سے کہا۔

''تو جاؤ ان سے کہو کہ اب بغلیں بجائیں۔''

از: جبیں نیاز، ملتان

غزل

دل نے بس اِک نام بے دھیانی میں
قصہ یوں تمام لکھا بے دھیانی میں
راہ کٹھن تھی چلتے، چلتے عمر مری خاک ہوئی
صبح کو یوں شام لکھا بے دھیانی میں
نارسائی میں ڈھلے جب رشتے جو انمول تھے
ہر خاص کو حرفِ عام لکھا بے دھیانی میں
اپنا بنایا...... اپنایا...... کوئی نہ پھر بھی بن پایا
خود کو پھر ناکام لکھا بے دھیانی میں
اپنی کہانی لکھنے بیٹھی ورق سبھی سادہ ہی رہے
خود کو تب گمنام لکھا بے دھیانی میں

کاوش: حینا، کراچی

تم میرے تھے

جب تک تم میری دسترس میں رہے
تم میرے تھے اور
جب تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے
کسی اور کی زلفوں کے اسیر ہو گئے
پھر تم میرے کس طرح رہے
اور میں کس طرح تمہاری

کلام: فریدہ جاوید فری، لاہور

غزل

یوں ہی تو شاخ سے پتے گرا نہیں کرتے
بچھڑ کے لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے
جو آنے والے ہیں موسم انہیں شمار میں رکھ
جو دن گزر گئے ان کو گنا نہیں کرتے
وہ مل گیا ہے تو کیا قصہ فراق کہیں
خوشی کے لمحوں کو یوں بے مزہ نہیں کرتے
ہمارے قتل پہ محسنؔ یہ پیش وپس کیسی
ہم ایسے لوگ طلب خوں بہا نہیں کرتے

شاعر: محسن نقوی
پسند: فرخندہ جعفری، گجرات

میٹھا بول

کوئی بات سنو کوئی بات کرو
کوئی میٹھی، میٹھی بات کرو
کیا بن بولے سمجھا ہے کوئی
جو سمجھ گیا وہ اپنا ہے
جو نہ سمجھا وہ تیکھا ہے
ہے بات ایک اور بیان الگ
ہیں سب کے ہی انداز جدا
یہ سمجھ، سمجھ کا کھیل ہے سارا
جو سمجھ گیا وہ جیت گیا
جو نہ سمجھا وہ ہار گیا
کوئی مانے یا پھر نہ مانے
تم میٹھا، میٹھا ہی بولو
اور صاف اور سچا ہی بولو
گر کڑوا، کڑوا بولو گے
تو نیا پار کرو گے کیسے!
جو دل کو بس چھو جائے
وہ خوشبو جیسی بات کرو

کاوش: صائمہ صالحہ، شیخوپورہ

غلط فہمی

غلط فہمی کی برفیلی ہوائیں جب بھی چلتی ہیں
محبت کے دریچوں میں دسمبر ٹھہر جاتا ہے

حمیرا...... پنجاب

خوشی کیا ہے

☆ خوشی ایک قلبی کیفیت کا نام ہے...... یہ رب رحیم کی عطا کردہ وہ بے بہا نعمت ہے کہ جس کو میسر آجائے وہ سب سے زیادہ امیر ہے۔ سبحان اللہ......

☆ خوشی...... مادی چیزوں میں نہیں بلکہ روحانی کیفیات میں تلاش کرو۔

☆ اللہ پاک کے حضور خالصتاً اس کے شکر کا سجدہ یقیناً خوشی ہے۔

از: سباس گل، رحیم یار خان

بوڑھی دیہاتی عورت

ایک بوڑھی دیہاتی عورت کافی دیر سے بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ بس نہ آنے کی وجہ سے اسٹاپ پر خاصا رش تھا بالآخر بس آگئی۔ بس کے کنڈیکٹر نے مسافروں سے کہا۔" بھئی پہلے لیڈیز کو چڑھ لینے دیں۔"

"گولی مارو لیڈیز کو پہلے مجھے چڑھنے دو۔" بوڑھی عورت نے غصے سے کہا اور بس میں سوار ہوگئی۔

ہرجانہ

کاروالے نے ایک راہ گیر کا ایک پاؤں کچل ڈالا تھا۔ وہ ایک لاکھ روپے کے ہرجانے کا مطالبہ کررہا تھا۔

"خدا کا خوف کرو بھائی۔" کاروالا بولا۔"ایک پاؤں کچلے جانے کا ہرجانہ ایک لاکھ روپے! میں کوئی کروڑ پتی نہیں ہوں میرے پاس اتنے پیسے فالتو نہیں ہیں۔"

"شاید نہ ہوں......" راہ گیر نے اتفاق کیا۔ "لیکن میں بھی کن کھجورا نہیں ہوں۔ میرے صرف دو ہی پاؤں ہیں۔"

ڈر

ایک ماں کے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے تو ایک بڑی بی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

بڑی بی"۔ آج کل لڑائی جھگڑے اور دہشت گردی اتنی عام ہوگئی ہے کہ بچے بھی اکیلے آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"

از: ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک

پہلے اور بعد میں

"شادی سے پہلے ہم بھی، کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کے گھر ناشتا زبردستی صبح کے سات بجے کرادیا جاتا ہے اور اگر کبھی ہم بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کردیں تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے......ایک دن صبح، صبح ہم نہارہے تھے۔ سردی کا موسم ......ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں خدا جانے کس پُراسرار جذبے کے تحت غسل خانے میں راگ الاپنا شروع کردیا اور پھر گانے لگے کہ......

توری چھل بل ہے نیاری

اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس... بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔"

اقتباس:"پطرس کے مضامین۔" از پطرس بخاری۔

انتخاب: نسرین رانا، لانڈھی، کراچی

محبت

محبت کیا نہیں ہوتی
محبت پھول ہوتی ہے
محبت خار ہوتی ہے
محبت بوند بھر پانی
محبت دھار ہوتی ہے
محبت کونج اکلوتی
محبت ڈار ہوتی ہے
محبت دشمنِ جاں بھی
محبت یار ہوتی ہے
محبت جیت بھی شاید
محبت ہار ہوتی ہے
محبت تخت ہوتی ہے
محبت دار ہوتی ہے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
محبت پاس دکھتی ہے
مگر اس پار ہوتی ہے

شاعر: اختر ملک

پسند: نزہت جبیں ضیا، کراچی

☆☆☆

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ثمینہ کوکب......جہلم
کیوں ہر بات پہ کوستے ہیں لوگ دسمبر کو
کیا دسمبر نے کہا تھا! محبت کرو
☆روحی صبا......لانڈھی، کراچی
میرے بارے میں کوئی رائے تو ہوگی اس کی
اس نے مجھ کو بھی کبھی توڑ کے دیکھا ہوگا
ایک محفل میں کئی محفلیں ہوتی ہیں شریک
جس کو بھی پاس سے دیکھو گے اکیلا ہوگا
☆حدیث اختر......بہاول پور
کبھی پھول تھے ہم کسی باغ کے کبھی راج تھا اپنا کسی قلب پر
پھر دھوپ کا ایسا گذر ہوا کہ اب نہ خس ہیں نہ خاشاک ہیں
☆حمیرا انجم وحید......واہ کینٹ
سرد لہجہ تھا پورے سال میرا
ہم دسمبر کو کس لیے روتے
☆پروین افضل شاہین......بہاول پور
ہم غریب اچھے ہیں دنیادار لوگوں سے وصی
ہم اپنے خواب ضرور توڑتے ہیں کسی کا دل نہیں
☆فرخندہ......گجرات
آج کے دور میں نادار کا جینا یوں ہے
جیسے معذور کا دیوار پہ چڑھنا مشکل
☆عظمیٰ......جہلم
طوفان کے دھاروں رک جاؤ لے جاؤ نہ مجھ کو ساحل پر
ساحل کی قسم موجوں کی قسم ساحل پہ ہمارا کوئی نہیں
☆زرینہ خان......بہارہ کہو
میرے پاس ہی سے گزرے میرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے
☆فہمیدہ جاوید......ملتان
یہ سال بھی اداس رہا، روٹھ کر گیا
دیکھے بغیر تجھ کو دسمبر گزر گیا

☆اریبہ ارشد......راول پنڈی
منزل مشکل تھی یا راستوں نے تھکا دیا
غیروں سے کیا گلہ ہمیں اپنوں نے بھلا دیا
مجھے گئے دنیا سے دو دن بھی نہ ہوئے تھے اریبہ
لوگوں نے اپنی زندگی سے میرا نام تک مٹا دیا
☆سردار ظہیر احمد......راول پنڈی
زخم خود لیتا ہوں لذتیں اٹھاتا ہوں
تجھ کو یاد کرتا ہوں غم کے بہانے سے
☆نرمین سرھیو......حیدرآباد
باعثِ پرسش احوال میں آیا تھا کبھی
اتفاقاً مرے رستے میں ترا گھر آیا
یاں تو دریا بھی کسی طور نہ آتے تھے قریب
اور دن آئے تو قدموں میں سمندر آیا
☆ماہین مسعود......کمالیہ
ترے احساس میں تیرے اقرار میں بے ارادہ تھا میں پھر بھی یوں گھل گیا
جیسے گہرے سمندر کے انجماد میں بادباں کشتیوں کا کھلا میری جاں
☆شاہینہ مبارک......ہالا
کیا سکوں ہے کہ نہ دھڑکن ہے نہ پازیب کا شور
خامشی ایسی کہ مرجانے کو جی چاہتا ہے
رقص تھم جائے جنوں کا تو سرِ آخرِ شب
بزمِ یاراں میں بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
☆کوثر خالد......جڑانوالہ
یہ روح کا اور جسم کا آپس میں تعلق
دو چار دنوں کے لیے اِک ہم سفری ہے
شاید تجھے معلوم نہیں اے گلِ لالہ
تجھ سے بھی زیادہ مجھے خونِ جگری ہے
☆شہناز واجد......راول پنڈی
مجھ کو تو جو ہوا سو ہوا ناروا ہوا
اے دوست! تیری چشم عنایت کو کیا ہوا

☆ کائنات بلال ڈوگر......کمالیہ

آسیب زدہ گھر کا میں وہ در ہوں محسن
دیمک کی طرح کھا گئی جسے دستک کی تمنا

☆ ایمن زرناب......ٹوبہ ٹیک سنگھ

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں پڑھا ہے تم کو
اپنے خوابوں کے جزیروں پہ کھڑا دیکھا ہے
کچھ کو منزل پہ بھی جا کر نہیں ملتی منزل
ہم نے قسمت کو مقدر سے بڑا دیکھا ہے

☆ عاتکہ......تونسہ شریف

جلاؤ گھر میں دیا تو رہے خیال قتیل
اجالا پائیں گلی سے گزرنے والے بھی

☆ ارم کمال......فیصل آباد

ان کے اخلاص پہ زخموں نے گواہی دی ہے
چند کانٹے جو نمایاں مری پوشاک میں ہیں

☆ شگفتہ ناصر......فیصل آباد

لو اس سے لگالی ماہر نے لو جس سے لگانی چاہیے تھی
تو نے جو اکیلا چھوڑ دیا تو کر کے بڑا احسان گیا

☆ نادیہ علی......ملائشیا

جو میسر ہو تو دنیا سے کنارا کرلوں
جو مصیبت بھی پڑے ہنس کے گوارا کرلوں
اس قدر بھی نہ ہوا ے خواہش گریہ بے تاب
کہ میں شاید کسی آنسو کو ستارا کرلوں

☆ علینہ......نارٹوپہ

ہر چند دل کے تار ہیں ڈھیلے پڑے ہوئے
لیکن بجا رہا ہوں میں احساس کا رباب
دامن ترے خیال کا ہر چند ہے حسیں
لیکن جو دیکھتا ہوں تو اے دوست ہے سراب

☆ کرن صدیقی......کمالیہ

اس کی دہلیز پہ صدیوں سے کھڑا ہوں محسن
مجھ سے ملنے کے جو لمحات گنا کرتا تھا

☆ نادیہ......راول پنڈی

سوچتا ہوں کوئی امید جو بر آتی ہے
اب نئی کون سی تہمت مرے سر آتی ہے
غم دوراں، غم جاناں، غم فردا، غم ذات
یہ تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

☆ فصیحہ آصف......ملتان

مدت سے اس امید پہ جلتا رہا ہوں میں
شاید کوئی چراغ جلے اس چراغ سے

☆ کائنات عبدالحلیم......میرپور خاص

زندگی اس کی زندگی ہے اشک
جو پسِ مرگ بھی فنا نہ ہوا

☆ ناظمہ شاہین......واہ کینٹ

ہر شخص دیکھتا ہے مرا نامۂ اعمال
یارب میں یہاں کتنے خداؤں میں گھرا ہوں

☆ مہرین ضیا......کراچی

یاد کا دل کے دریچے سے گزر کیسے ہو
تیری تجسیم مکمل ہے میری آنکھوں میں

☆ ساجدہ غضنفر......کمالیہ

پہلے شکوہ تھا یہاں کوئی رونقِ بازار نہیں
اب جو بازار کھلے ہیں تو خریدار نہیں
سب کے ہاتھوں میں یہاں زہر کا پیالہ ہے مگر
کوئی سچ بولنے کے واسطے تیار نہیں

☆ نسیم نیازی......ملتان

تیری طرف سے تو ہوتی رہی پزیرائی
مگر نکل نہ سکے ذات کے حصار سے ہم

☆ نگینہ ضیا بنگش......کیماڑی

اس کی یاد آئی ہے سانسوں ذرا آہستہ چلو
دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتا ہے

☆ تسنیم قریشی......کوہاٹ

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے

☆ ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

آج اِک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

☆ انجم طاہر......کراچی

تصدق اس کرم کے میں کبھی تنہا نہیں رہتا
کہ جس دن تم نہیں آتے تمہاری یاد آتی ہے

☆ رعنا مشتاق......سرگودھا

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

منتخب غزلیں

باذوق قارئین اس ماہ دو عظیم شعرا مرزا اسد اللہ غالب
اور پروین شاکر کا کلام آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر۔۔۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہِ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گل ہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

مرزا اسد اللہ غالبؔ
27 دسمبر 1797ء تا 15 فروری 1869ء

ٹوٹی ہے میری نیند مگر تم کو اس سے کیا
بجتے رہیں ہواؤں سے در تم کو اس سے کیا

تم موج موج مثلِ صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پر تم کو اس سے کیا

اوروں کا ہاتھ تھامو انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر تم کو اس سے کیا

ابرِ گریز پا کو برسنے سے کیا غرض
سیپی میں بن نہ پائے گہر تم کو اس سے کیا

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا

پروین شاکر
24 نومبر 1952ء تا 26 نومبر 1994ء



خوش ذائقہ

شگفتہ یاسمین

گولڈن چکن

اشیا: چکن، آدھا کلو۔ سفید لوبیا، (ابلے ہوئے) آدھی پیالی۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کالی مرچ پسی ہوئی، آدھا چائے کا چمچ۔ ادرک، لہسن، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ سفید زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ کینو کا رس، ایک پیالی۔ اور چھلکے کرش کرلیں۔ پسا ہوا گرم مسالا، آدھا چائے کا چمچ۔ پیاز، ایک عدد درمیانی۔ تیز پات، دو عدد .... ٹماٹر، ایک عدد درمیانہ۔ کوکنگ آئل، تین سے چار کھانے کے چمچ۔

ترکیب: چکن کو دھو کر اس کی چھوٹی بوٹیاں کرلیں، پیاز اور ٹماٹر کو باریک کاٹ کر رکھ لیں۔ پین میں کوکنگ آئل ڈال کر دو سے تین منٹ درمیانی آنچ پر گرم کریں اور اس میں تیز پات اور ادرک، لہسن ڈال کر ہلکا سا فرائی کرلیں۔ پھر اس میں باریک کٹی ہوئی پیاز ڈال کر نرم ہونے تک فرائی کریں پھر اس میں چکن ڈال کر درمیانی آنچ پر سنہری ہونے تک فرائی کریں۔ اس میں نمک، کالی مرچ اور ٹماٹر ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھک دیں۔ جب ٹماٹر گل جائے اور چکن بھی گلنے پر آجائے تو اس میں بھنا ہوا کٹا ہوا زیرہ اور گرم مسالا شامل کردیں۔ گل جائے تو مزیدار ڈش تیار ہے۔ ہلکا سا بھون کر اس میں کینو کا رس اور چھلکے کا چورا ڈال دیں، تیز پات نکال کر ابلے ہوئے لوبیا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔

استفڈ پیپرونی اور گرلڈ فش

اشیا: پیپرونی مرچیں، دس سے بارہ عدد۔ کالی مرچ، پسی ہوئی، ایک چائے کا چمچ۔ مچھلی، (بغیر کانٹوں والی) آدھا کلو۔ ہری پیاز، ایک سے دو عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ لیموں کا رس، تین کھانے کے چمچ۔ پسا ہوا لہسن، ایک چائے کا چمچ۔ فریش کریم، دو کھانے کے چمچ۔ آلو (ابلے ہوئے) ایک عدد۔ چیڈر چیز، دو کھانے کے چمچ۔ کوکنگ آئل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: مچھلی کے باریک پارچے کاٹیں پھر اس کی ایک انچ چوڑی پٹیاں کاٹ لیں۔ پھیلے ہوئے برتن میں نمک، لہسن، آدھا چائے کا چمچ، کالی مرچ، دو کھانے کے چمچ، لیموں کا رس اور ایک کھانے کا چمچ آئل ڈال کر ملائیں اور مچھلی کو احتیاط سے میرینیٹ کرکے آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ گرل پین کو چولھے پر رکھ کر درمیانی آنچ پر گرم کریں اور اس پر برش کی مدد سے آئل لگالیں۔ اب مچھلی کا پانی نتھار کر اسے اچھی طرح خشک کرلیں اور گرل پین پر رکھ کر ایک طرف سے ہلکا سنہرا ہونے تک الٹ پلٹ کرکے نکال لیں۔ ابلے ہوئے، میش کیے ہوئے آلو میں چیز، کریم، کالی مرچ، لیموں کا رس اور باریک کٹی ہوئی ہری پیاز کی پتیاں ڈال کر اچھی طرح ملالیں۔ مرچوں کو چیرا لگا کر تھوڑے سے بیج نکال لیں تاکہ تھوڑی تیزی کم ہوجائے اور اس میں آلو کا مکسچر بھر دیں۔ اس پر گرل کی ہوئی مچھلی کو لپیٹ کر ٹوتھ پک کی مدد سے بند کردیں، گرل کیے ہوئے حصے کو مرچ کی طرف رکھیں۔ تیار کی ہوئی مرچوں کو دوبارہ سے گرل پین پر رکھیں تاکہ مچھلی بھی دوسری طرف سے پک جائے اور مرچیں بھی تھوڑی سی گرل ہوجائے۔ اس مزیدار اسٹارٹر کو دعوتوں میں کھانے سے پہلے پیش کریں اور مہمانوں سے تعریفیں سمیٹیں۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسیپی کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

زردہ

اشیا: سیلا چاول، ڈیڑھ کلو۔ چینی، ایک کلو سے

تھوڑی سی۔ گھی، ایک کپ۔ چھوٹی الائچی ، چھ عدد۔ پستہ، اخروٹ، کاجو، بادام، حسبِ ضرورت۔ کھویا، ایک پاؤ۔ اشرفیاں لال، پیلی، ہری ایک پاؤ۔ چم، چم، چھوٹی والی رنگین، لال، پیلی، ہری، سفید ،ایک پاؤ۔ زردے کا رنگ، چٹکی بھر۔

ترکیب: سیلا چاول کو آٹھ گھنٹے پہلے بھگو دیں اور زیادہ پرانا ہو تو... نہیں تو تین گھنٹے بھی کافی ہیں۔ زردے کا رنگ ڈال کر چاول ایک کنی رکھ کر ابال لیں۔ (چاولوں میں رنگ تھوڑا سا ڈالیں) چاول نتھار کر آدھے کسی برتن میں نکال لیں۔ پھر باقی چاولوں پر چینی پھیلا دیں چینی کے اوپر باقی نکالے ہوئے چاول پھیلا دیں اور ڈھک کر درمیانی آنچ پر رکھ دیں پانچ منٹ کے لیے۔ اب ایک فرائی پین میں گھی گرم کر کے اس میں الائچیاں ڈال دیں اور چولھے سے ہٹالیں، یہ گھی تھوڑی دیر کے بعد چاولوں پر ڈال دیں اور آنچ دھیمی کردیں پندرہ، بیس منٹ کے بعد چاولوں میں چمچہ چلائیں اور اشرفیاں اور میوے ڈال دیں اور پھر ڈھک دیں۔ پانی خشک ہونے پر چم، چم ڈال دیں۔ اور مکس کردیں۔ آخر میں کھویا ڈال کر چولھا بند کردیں پندرہ منٹ بعد ڈش میں نکال لیں تا کہ کھویا سیٹ ہوجائے۔ چاول مکس کرنے پر ٹکڑوں کی شکل میں ہوجائے۔ چاہیں تو ڈش میں نکال کر مزید ناریل، پستہ، بادام اور چم، چم سے سجاوٹ کریں۔

از: آسیہ عامر، کراچی

کھانسی اور گلے کی سوزش سے نجات دلانے میں مددگار گھریلو ٹوٹکے

دار چینی

دار چینی ایسا مسالا ہے جس میں اینٹی آکسائڈنٹس کی مقدار کافی زیادہ ہوتی ہے اور جب گلا سوج رہا ہو تو یہ بلغم بننے کی مقدار کم کر کے سانس لینا آسان بناتا ہے۔ ایک سے ڈیڑھ کپ پانی کو ابال لیں، جب پانی ابلنے لگے تو اس میں ایک سے دو دار چینی کی اسٹکس ڈال کر تین منٹ تک مزید ابالیں۔ اس کے بعد دار چینی کو نکال کر اس میں سبز چائے کو شامل کردیں اور پھر نیم گرم ہونے پر پی لیں۔

ادرک کا پانی

ادرک نظامِ تنفس کے لیے مددگار بوٹی ہے جو کہ ورم کُش خصوصیات رکھتی ہے جبکہ بیکٹیریا سے مقابلہ کرتی ہے۔ پانی ابالیں اور ابلنے پر ایک چمچ ادرک پیسٹ ڈال دیں۔ اس کے بعد مزید پانچ منٹ تک ابالیں اور پھر چولھا بند کر کے کچھ مقدار میں شہد کا اضافہ کردیں۔ اسے نیم گرم ہی پی لیں۔

لیموں اور گرم پانی

کچھ لوگ لیموں کا عرق گرم پانی میں اس توقع کے ساتھ ملا کر پیتے ہیں کہ اس سے جسمانی وزن میں کمی اور جلد شفاف ہوگی مگر یہ مشروب تکلیف دہ گلے کی سوزش سے تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔ جراثیم کُش اور جسمانی مدافعتی نظام مضبوط کرنے کی صلاحیت رکھنے والا یہ مشروب گلے کے لیے ایسا تیزابی ماحول بناتا ہے کہ جو وائرس اور بیکٹیریا کی نشوونما کو بہت مشکل بنادیتا ہے۔ لیموں میں وٹامن سی کی مقدار کافی زیادہ ہوتی ہے جو کہ موسمی نزلہ زکام کے خلاف لڑنے میں مدد دیتا ہے۔

شہد اور کلونجی

شہد کے متعدد طبی فوائد ہیں، ایک چائے کا چمچ شہد چائے میں ملانا یا ایسے ہی کھالینا بھی گلے کی سوزش میں کمی لاسکتا ہے مگر اس کے اثرات کو بہتر بنانے کے لیے اس میں 2 سے 3 قطرے کلونجی کے تیل کے شامل کرلیں، یہ تیل ورم کُش ہوتا ہے اور گلے کی تکلیف میں فوری سکون پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔

میتھی کے پتے

میتھی کے پتوں کو کسی بھی تیل میں ملا کر گلے کے باہر اور گردن کے ارد گرد مالش کی جائے یا پھر انہیں چائے کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جائے تو اس سے بھی خراش یا سوزش کا باعث بننے والے بیکٹیریاز کا خاتمہ ہوگا۔

میتھی کے پتوں کو گرم پانی میں ابال کر اس کے غرارے بھی کیے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

بزمِ پاکیزہ

پاکیزہ بہنیں



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ فرخندہ جعفری...... گجرات

سوال: لوگوں کے گھروں میں جھانکنے والے لوگ اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے؟

جواب: وہ چھوٹے گلے پہنتے ہیں۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ کرن صدیقی...... کمالیہ

سوال: بچوں کو پالنے اور شوہر کو پالنے میں کتنا فرق ہے؟

جواب: جتنا فرق زیرو سائز اور لارج سائز میں...

☆ کائنات بلال ڈوگر...... کمالیہ

سوال: دنیا اگر ہاتھ سے نکل جائے تو بندہ غریب ہو جاتا ہے۔ یہی دنیا اگر دل سے نکل جائے تو......؟

جواب: پھر تو غنی ہو جاتا ہے۔

سوال: چینی نایاب اور نکتہ چینی عام ہوتی جا رہی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جو چیز میسر ہو وہی غنیمت۔

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

سوال: میرے میاں جانی پرنس افضل شاہین کب مجھے محبت کی نظر سے دیکھیں گے؟

جواب: ارے جاؤ بھئی......اب ہم کیا بتائیں۔

سوال: محبت مسکراہٹ سے شروع ہو کر آنسو پر کیوں ختم ہوتی ہے؟

جواب......قربانی مانگنے پر آنسو ہی نکلتے ہیں۔

سوال: میرے میاں جانی اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ تم میری پہلی محبت ہو، کیا میں ان کی بات پر یقین کرلوں......؟

جواب: کرلو بھئی...... اگر کل کو دوسری، تیسری کہہ دیا تو پھر کیا کرو گی۔

☆ فہمیدہ جاوید...... ملتان

سوال: وہ دسمبر میں باؤلی باتیں کیوں کرنے لگتے ہیں؟

جواب: سر میں برف جو جم جاتی ہے۔

سوال: اُف اتنی ٹھنڈ ہے دل کررہا ہے کہ میں......؟

جواب: رضائی اوڑھ لوں مگر کیا کروں کہ اس سال دُھلوائی ہی نہیں۔

سوال: دسمبر میں کپکپاہٹ اور ٹھٹھرنا کب اچھا لگتا ہے؟

جواب: ارے بہن ٹھٹھرنا کسے اچھا لگتا ہے۔

☆ ساجدہ ظفر...... کمالیہ

سوال: انگارے اگلنے والی زبان سے اگر کبھی پھول جھڑنے لگیں تو کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

جواب: اف...... معجزے بھی تو اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔

سوال: سفر کی گاڑی پٹرول سے چلتی ہے اور دوستی کی گاڑی کیسے چلتی ہے؟

جواب: خلوص و وفا کے فیول سے۔

☆حمیرا انجم وحید......واہ کینٹ
سوال☜تمام ناکام عاشق دسمبر میں ہی کیوں بے وفائی کا رونا روتے ہیں؟
جواب☜سال کے آخر میں ہر چیز کا حساب کتاب جو ہوتا ہے سو بے وفائیوں کا کیوں نہیں۔
☆عرشیہ جنید......کراچی
سوال☜محبت کے گلاب کس رنگ کے ہوتے ہیں؟
جواب☜جس رنگ کے آنکھ دیکھنا چاہے۔
سوال☜شعر کا جواب شعر سے دیں؟

محبت تیرا میرا مسئلہ ہے
زمانے کو شریکِ کار مت کر

جواب☜

ہزار تجھ سے محبت جتانے والے ہیں
زمانے والے بھی لیکن زمانے والے ہیں

سوال☜محبت کے کتنے رنگ ہیں؟
جواب☜جتنے آپ چاہیں......اپنی چاہت سے آزمائیں۔
☆جبیں نیاز......ملتان
سوال: محبت خار ہوتی ہے یا خوار کرتی ہے؟
جواب☜محبت خار ہو جائے تو بہت خوار کرتی ہے۔
سوال☜اگر محبت کرنے پر پابندی لگ جائے تو؟...؟
جواب☜کیا سانس لینے پر پابندی لگا سکتی ہو۔
☆کرن صدیقی......کمالیہ
سوال☜میک اپ خواتین کو چار چاند لگاتا ہے اور مردوں کو؟
جواب☜اندھا کر دیتا ہے۔
☆شہلا نواز، لاہور
سوال☜

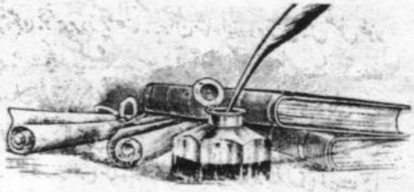
محبتوں میں وہ حساب مانگے
خار دے کر گلاب مانگے

آپ ہی بتائیے کیا کروں؟
جواب☜حساب کھرا اور ستھرا ہو تو خار بھی گلاب بن جاتے ہیں۔
☆تسنیم کوثر......کراچی
سوال☜ذرا جلدی سے بتایئے دل پر چھریاں کب چلتی ہیں؟
جواب☜جب آپ کی بہن آپ کا ہی نیا جوڑا پہن کر شیخیاں مارے۔
سوال☜چپکے سے بتا دیجیے ہمارا سوال کب انعامی فہرست میں آرہا ہے؟
جواب☜کان نزدیک لاؤ......لے جاؤ انعام۔
☆فرخندہ......پنجاب
سوال☜بعض لوگ رائی کا پہاڑ بنانے میں اتنے ماہر کیوں ہوتے ہیں؟
جواب☜ان کے رائی کے ذخائر ہوتے ہیں تو کیوں نہ پہاڑ ہی بنالیں۔
سوال☜اکثر لوگ کہتے ہیں بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ کیا انہیں انسانوں کی مائیں یاد نہیں ہوتیں؟
جواب☜ارے ان کی زندگیاں تو اجیرن کیے رکھتے ہیں۔
سوال☜اندھا تو اندھا ہوتا ہے وہ گر سکتا ہے مگر عقل کا اندھا کیوں گرتا ہے؟
جواب☜وہی تو زیادہ گرتا ہے مگر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔
☆فرخندہ جعفری......گجرات
سوال☜دھوپ کی تپش اور دماغ کی تپش میں کیا فرق ہے؟
جواب☜ایک فائدہ مند دوسری تباہی ہی تباہی۔

☆☆☆

روحانی مشورے

ادارہ



امتحان میں کامیابی کے لیے دعا

عشا کی نماز کے بعد اول و آخر گیارہ، گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ یہ دعا پڑھ کر خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگیں اور نتیجہ آنے تک جاری رکھیں۔

اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ

نافرمان بیٹے کے لیے

نافرمان بیٹے کے لیے اس کے طرزِ عمل میں تبدیلی لانے کے واسطے، سوئے ہوئے پر ایک مرتبہ سورۂ بروج کی یہ درج ذیل آیات گیارہ روز تک پڑھ کر دم کریں۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۲۱ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۲۲ ترجمہ: بلکہ یہ تو قرآن مجید ہے جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

مجرب نسخہ:

دل کے امراض کے لیے

سفید پیاز کا جوس نکال کر نہار منہ تین گھونٹ پندرہ دن پئیں دل کے وال کھل جائیں گے۔ ان شاءاللہ

.........اگر سفید پیاز نہ ملے تو دوسری پیاز استعمال کریں۔

ہر گھونٹ پر اللہ شافی اللہ کافی ضرور پڑھیں۔

نظر کم ہو

گیارہ بادام کی گریاں رات کو دودھ میں بھگو دیں۔ صبح نہار منہ بادام کی گریاں دودھ کے ساتھ کھائیں اور گیارہ مرتبہ درود پڑھیں۔ نظر تیز ہو جائے گی۔

نظر بد کے لیے

جس پر نظرِ بد ہو وہ سورۂ کوثر تین مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کر کے پی لے نظرِ بد یا نحس اثرات ختم ہو جائیں گے۔

نشے کی عادت ختم ہو جائے

ہر قسم کے نشے کو ختم کرنے کے لیے سبز الائچی پر.... یَا مَجِیْدُ ایک تسبیح پڑھ کر دم کریں اور نشے والے مریض کو کھلا دیں۔ ایک مہینے میں ٹھیک ہو جائے گا اور ساری نشے کی عادات ختم ہو جائیں گی۔

وہم کا علاج

روزانہ یَا مُؤْمِنُ پڑھیں جتنا آسانی سے پڑھ سکتے ہیں اور پھر دعا کریں یہ عارضہ ختم ہو جائے گا۔

گم شدہ چیز

کوئی چیز اگر رکھ کر بھول گیا ہو تو یا جامع کا ورد کرتا رہے۔ گم شدہ چیز مل جائے گی۔

شوگر ختم کرنے کے لیے

سبز الائچی اور میتھرے یعنی میتھی کے دانے ہم وزن لے کر سفوف بنالیں۔ چائے کی آدھی چمچ ناشتے کے آدھے گھنٹے بعد دودھ کے ساتھ لیں۔ پانچ دن لگا تار استعمال کریں اور پھر شوگر چیک کریں شرط ہے کہ پہلے چیک کر لیں کتنی تھی اور کتنا فرق پڑا ہے جب نارمل ہو جائے تو یہ دوا کھانا بند کر دیں۔ جب دوبارہ زیادہ ہو جائے تو دوائی پھر شروع کر دیں، یہ عمل کرتے رہیں شوگر ختم ہو جائے گی۔

کسی بھی جائز کام کے لیے

کوئی بھی جائز کام ہو شادی، کاروبار، صحت، میاں، بیوی کی آپس میں ناچاقی... صبح کی نماز سنت و فرض کے درمیان گیارہ مرتبہ اول و آخر درود پاک پڑھیں اور درمیان میں اکتالیس مرتبہ سورۂ حمد پڑھ کر دعا کریں۔

☆☆☆

سورۂ یٰسین کے تین راز

قرآن پاک کے پڑھنے سے ہدایت، شفا، نور، رحمت، حکمت، پاکیزگی، نجات اور بخشش ملتی ہے۔ اس لیے اسے پڑھتے ہوئے تفکر سے کام لیں۔ درود پاک پڑھنے سے دعائیں قبول ہوتی ہیں بہتر یہی ہے کہ کسی سورہ کو کسی مقصد کے لیے اول و آخر درود پاک کے ساتھ ضرور پڑھا جائے لیکن یہ شرط نہیں کیونکہ یہ کلام پاک ہے۔ سورۂ

یٰسین جو ہر روز پڑھتا ہے ان شاء اللہ وہ نزع میں مکمل طور پر جنت کو دیکھے گا۔ یہ سورہ قرآن پاک کا دل ہے اور آیت سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ سورۂ یٰسین کا دل ہے جو پورے کلام پاک کو نہیں پڑھ سکتا تو وہ یہ سلامتی کی تسبیح پڑھتا رہے ان شاء اللہ خاتمہ بالخیر ہوگا۔ اگر کسی آیت کی تکرار کی جائے تو اس کا مقصد ذات باری تعالیٰ جل جلالہ سے اس کی کیفیت سے مستفید ہونا ہے۔

یہ اللہ جل جلالہ ہی ہے جو ہماری دنیا میں، نزع میں، قبر میں، قیامت کے دن اور بعد میں جاری ہونے والے عالم کے لیے سلامتی فرما سکتا ہے۔ یہ تسبیح عرش الٰہی کے نیچے سے اٹھنے والوں کے لیے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کی تسبیح ہے جو اس سے اس کا جلوہ مانگتے ہیں۔ یہ ہر بیماری کے لیے شفا ہے بالخصوص شوگر کے مریضوں کے لیے پڑھتے ہوئے جب یہ آیت نمبر ۵۸ آئے تو اسے گیارہ مرتبہ تکرار کریں۔

حاجت روائی اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔آیت ۸۲ بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ اس آیت کو سات مرتبہ دہرائیں۔ اللہ جل جلالہ نے کن کہہ کر آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے جسے کوئی گن نہیں سکتا بنا دیا اللہ سے دعا مانگیں تو میرے لیے بھی کن کہہ دے تاکہ میری بھی حاجت روائی ہو جائے، آمین......

دنیا سے واپسی پر رحم و کرم مانگنا

فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ، آیت نمبر ۸۳ "پس پاک ذات ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے۔"

سورۂ یٰسین کی اس آخری آیت کو تین مرتبہ اس یقین کے ساتھ پڑھیں کہ تیری واپسی اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور دل سے التجا کریں کہ اے اللہ جل جلالہ، دنیا سے واپسی پر رحم و کرم فرمانا پھر اپنے جسم پر تین پھونکیں ماریں اور ایک گلاس پانی پر بھی تین پھونکیں ماریں یہ پانی ہر قسم کی شفا کے لیے ہے۔

مصائب و مشکلات سے نجات کے اعمال و دعائیں

جو شخص سچے دل سے دعا مانگتا ہے رب کریم اس کی حاجت روائی فرماتا ہے اور مصائب و مشکلات دور فرماتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۔پارہ ۲۴ سورۂ مومن آیت ۶۰ کا پہلا حصہ۔

شادی میں رکاوٹیں دور کرنے کا عمل

مناسب رشتے آنے بند ہو جائیں، شادی کی بات چلائی جائے مگر بات نہ بنے، رشتہ کہیں طے نہ ہو رہا ہو تو لڑکا یا لڑکی جس کی شادی کا مسئلہ ہو باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز پڑھے۔ روزانہ نماز عشا کے بعد ۱۴ مرتبہ درود ابراہیمیؑ پڑھ کر دس تسبیح سورۂ ناس پڑھ کر سادہ پانی پر دم کر کے یہ پانی روزانہ پی لیا کرے اور کاغذ پر زعفران سے چاروں قل لکھ کر تعویذ بنا کر گلے میں پہن لے۔ یہ تمام عمل خاموشی سے کریں۔ ان شاء اللہ کسی مناسب جگہ رشتہ طے ہو جائے گا۔

جادو

ہر نماز کے بعد ۳ مرتبہ بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ پڑھ کر ہاتھوں میں پھونک کر چہرے پر مل لیں چہرے پر پھونک دیا کریں اور کسی مٹی کے نئے پیالے میں پانی لے کر اس پر نہار منہ تین مرتبہ سورۂ فلق، تین مرتبہ سورۂ ناس پڑھ کر پانی پر دم کر کے پی لیا کریں۔

گھر میں نا اتفاقی

گھر میں نا اتفاقی ختم کرنے کے لیے بروز جمعہ تین مرتبہ سورۂ جمعہ پانی پر دم کر کے خود بھی پئیں اور سارے گھر والوں کو بھی پلائیں۔

پرانی کھانسی

ایسی کھانسی جو کسی دوا سے نہ جا رہی ہو اس کے لیے دکنی مرچ پسی ہوئی ایک بڑی چٹکی شہد میں ملا کر اس پر سات دفعہ سورۂ حمد پڑھیں۔ نہار منہ کھانے سے ان شاء اللہ پرانی سے پرانی کھانسی سے شفا نصیب ہوگی۔



موسم سرما میں بھی

تروتازگی و شادابی برقرار رکھیے

سردیاں، جاڑا، سرمائی ہوائیں اور خشکی، جلد کا چٹخنا یہ سب تو اس موسم کی سوغاتیں ہیں، ایسے میں اپنے چہرے اور ہاتھ پاؤں کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی مہنگی کریمیں خریدنے کی ضرورت نہیں، روزمرہ کی گھریلو اشیا سے بنے نسخے کام میں لائیں۔

☆ جلد چمک دار اور ملائم کرنے کے لیے شہد کا ماسک...... ایک چمچ شہد لے کر اس میں چند قطرے لیموں کا عرق ڈال کر مکس کر کے اچھی طرح چہرے پر لگائیں اور بیس منٹ کے بعد روئی یا کاٹن پیڈز بنے ہوئے جو بازار میں ملتے ہیں گرم پانی میں بھگو کر اس سے آہستہ آہستہ چہرہ صاف کریں۔

☆ کیلے کے چھلکے کی اندرونی سطح کو چہرے، ہاتھ، پیر، کہنیوں اور ٹخنوں پر رگڑیں...... اس سے میل بھی صاف ہوتا ہے اور چمک بھی آجاتی ہے۔

☆ اصلی روغنِ بادام دو چمچ لیں اور اس میں دو چمچ ہی پانی ڈال کر خوب پھینٹ لیں۔ اور اسے چہرے پر ملیں۔ اس سے چہرہ شاداب اور چمکدار ہوتا ہے۔

☆ زیتون کا خالص تیل بھی جلد کے لیے مفید ہے۔ رات میں آدھا کپ گرم دودھ میں ایک چائے کا چمچ زیتون کا تیل ڈالیں اور پی لیں۔ اس سے گردن، چہرے اور ہاتھ پیروں کی مالش کریں۔

☆ بالائی میں چند قطرے لیموں ملا کر دن میں کئی مرتبہ چہرے اور ہاتھوں پر لگائیں اس سے جلد نرم اور چمپئی ہو جاتی ہے۔

☆ ہونٹوں پر اس موسم میں پپڑیاں سی جمنے لگتی ہیں ایک چمچ بالائی لے کر اگر زعفران (کیسر) ہو تو ایک پتی ڈال لیں خالص عرق گلاب بھی ڈال سکتے ہیں اسے ہونٹ پر ہلکی پوروں سے لگائیں۔

☆ ایک انڈے کی زردی...... ایک چمچ زیتون کا تیل اور ایک چمچ شہد اچھی طرح پھینٹ لیں۔ نہانے سے آدھا گھنٹا پہلے گردن اور چہرے پر اس کا مساج کریں پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔

☆ خشک جلد کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے۔ فریش کریم یا تازہ دودھ کی بالائی، ایک چمچ، دہی ایک چمچ، ایک انڈے کی سفیدی، شہد ایک چمچ، روغن بادام، 5 قطرے ان تمام اشیا کو خوب اچھی طرح پھینٹ لیں اور اس کی موٹی سی تہ چہرے اور گردن اور ہاتھوں پر لگائیں دس سے پندرہ منٹ بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔

احتیاط

چہرے کی جلد کو ہمیشہ ہلکے ہاتھ سے تھپتھپا کر خشک کریں، تولیے کو جلد پر رگڑنے سے پرہیز کریں...... صاف ستھرا ململ کا کپڑا استعمال کریں۔ آج کل ململ نہیں ہوتی تو لان کا کپڑا اس مقصد کے لیے رکھ لیں۔ سفید ہو تو اچھا ہے۔ اپنی ذاتی صفائی کا خاص خیال رکھیں جس طرح فیشن کا دھیان رکھتی ہیں۔

آج کل سر کور کرنا مطلب اسکارف، اسٹالر یا دوپٹے سے یا عبایا پہننا خاصا عام ہے۔ مگر اس کی دھلائی، صفائی، نفاست کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے، عبایا، چادروں کو فیشن زدہ نہیں بلکہ سہولت سے آراستہ آرام دہ اور صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے اس کی دھلائی کا خیال رکھیں، روز دھو نہیں سکتیں تو دھوپ میں ضرور پھیلائیں۔

یہ سب ہدایات یقیناً آپ کا حسن مزید نکھاریں گی۔

☆☆☆



برسوں سے قائم، اعلیٰ ترین معیار---
شوابے ہومیوپیتھی
میں بے مثل
SCHWABE
Dr. Willmar Schwabe
Germany
From Nature. For Health.
شوابے ہومیو پیتھک سنگل ریمیڈیز
ہومیوپیتھی میں بہترین
ہومیوپیتھی میں دوا کا مستقل اعلیٰ معیار ان کی غیر معمولی افادیت کا سبب بنتا ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے، جرمنی کے برسوں سے قائم اعلیٰ ترین معیار کی وجہ سے اس کے قائدانہ مقام کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں۔
شوابے اپنے تمام ادویاتی پودے جرمنی میں واقع اپنے نباتاتی باغات میں 100% قدرتی طریقے سے کاشت کرتا ہے۔ اعلیٰ ترین معیار یقینی بنانے کے لیے غیر معمولی تحقیق کی بنیاد پر جدید طریقہ کار کے ذریعے دنیا کی بہترین ہومیوپیتھک دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔
دواسازی کا تمام تر عمل جی ایم پی معیارات اور ہانیمن کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق انجام دیا جاتا ہے اور اس طرح تیار کردہ دوائیں جرمنی سے تمام دنیا بشمول پاکستان کو برآمد کی جاتی ہیں۔
Tablets
Dilutions
Mother Tinctures
German Imported in Origianal Pack
Importer:
Dr. Hamid
General Homoeo (Pvt.) Ltd.
Karachi, Phone: 021-32211895
www.drhamid-schwabe.com
Lahore, Phone: 042-36291603

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں... تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

بڑی عمر کے مسائل

سلطانہ......کراچی

۱) صبح سو کر اٹھتی ہوں تو حلق میں بلغم اٹکتا ہے، نکالنے سے بہتر ہو جاتا ہے۔
۲) گیس بہت ستا رہی ہے۔
۳) رات کو نیند نہیں آتی ہے۔
۴) قبض ہو گیا ہے، ناف میں بھی تکلیف ہوتی ہے اور پوٹی کی جگہ بھی۔
۵) طبیعت میں بے چینی رہتی ہے۔

جواب: ٹھنڈے کے بعد گرم اور گرم کے بعد ٹھنڈا نہ کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Bismutum Pentarkan Ptk16 ایک گولی سادہ پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں اور Eupatorium Pentarkan Ptk 43 کے 15 قطرے ½ کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔

بہت سارے مسائل

روزینہ فاطمہ......راولپنڈی

ڈاکٹر صاحب میں ہاؤس وائف ہوں۔ میں بیماریوں کا مجموعہ ہوں۔ پانچ بچے ہیں آنکھیں پیلی ہیں ٹانگوں میں درد ہوتا ہے یا بازو اور کندھے درد کرتے ہیں، دل بہت تیز دھڑکتا ہے۔ دماغی کمزوری ہے، یادداشت بہت کمزور ہے۔ ذرا سا وزن اٹھانا مشکل ہے، پیٹ باہر نکلا ہوا ہے، 81 کلو میرا وزن اور قد 5 فٹ 4 انچ ہے۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

جنوری 2022ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ______

پتا: ______

______

معدے میں بہت تیزابیت رہتی ہے۔ بلڈ پریشر لو رہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں سن ہوتے ہیں کپڑوں سے بدبو آتی ہے۔ مینسز ہر مہینے 2 دن پہلے آتے ہیں وہ بھی 3 دن صرف، لیکوریا بہت زیادہ ہے اور بہت پرانا ہے۔ بھوک بہت لگتی ہے 3 یا 4 روٹیاں کھا جاتی ہوں ایک ٹائم، ہر وقت کوئی نہ کوئی ڈر خوف لگا رہتا ہے۔

حلق اور ناک میں غدود کی وجہ سے سانس لینا بھی مشکل ہے، نزلہ زکام رہتا ہے اور بلغم رہتا ہے کانوں اور حلق میں خراش رہتی ہے۔ ناک کے لیے ہومیو دوائی استعمال کر رہی ہوں پیتی رہوں تو ٹھیک چھوڑ دوں تو نزلہ زکام بلغم پھر سے بہت ہو جاتا ہے۔

جواب: اپنے آپ کو پُرسکون رکھیں۔ کھانا اپنے وقت پر کھائیں آہستہ آہستہ چبا کر۔ کھانے کے ساتھ اور فوراً بعد پانی نہ پئیں۔ کھانے کے 3 گھنٹے بعد پانی پیا کریں۔ ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کریں ٹھنڈا گرم اور گرم ٹھنڈا ہرگز نہ کریں۔ میٹھی اور مرغن چیزوں سے پرہیز کریں۔ غذا متوازن لیں سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Sulphur1M کی (ایک خوراک 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں صبح نہار منہ) اس کے دو دن بعد Bismutum Pentarkan-Ptk 16 کی ایک گولی دن میں تین مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں Viscum Pentarkan Ptk89 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

Cinnabaris Pentarkan Ptk 31 کی دو گولیاں دن میں 3 مرتبہ چبا کر کھائیں۔

چہرے پہ داغ

مسرت عزیز......شبقدر

ڈاکٹر صاحب کچھ باتیں تحریر کر رہی ہوں تاکہ آپ کو دوا تشخیص کرنے میں آسانی ہو۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میں نے چہرے کے داغ پر بہت کچھ لگایا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، میں ایک مرتبہ اسکن کے ڈاکٹر کے پاس بھی گئی تھی، انہوں نے کچھ کریم وغیرہ تجویز کی تھی اور وٹامن کی گولیاں بھی، وہ میں نے 2 مہینے استعمال کی مگر 10 فیصد بھی افاقہ نہیں ہوا۔ اب امید آپ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تجویز کردہ دوا سے مجھے فائدہ دے اور میری پریشانی ختم ہو، آمین!

جواب: چہرے پر داغ کئی طرح کے ہوتے ہیں اور کئی وجہ سے ہو سکتے ہیں جن کی تفصیل آپ نے نہیں لکھی۔ نشان سفید ہیں یا کالے، براؤن، سائز کیا ہے، کب کیسے ہو گئے۔ ماہواری کی کوئی خرابی تو نہیں ہے۔ تمام تفصیلات کے بعد ہی دوا تجویز کی جا سکے گی۔

ہارمونز کا مسئلہ

شاہینہ......اوکاڑہ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے 12 سال کی عمر سے سر درد کی بیماری لاحق ہے۔ نظر کمزور ہے لیکن اس کے لیے پونے 3 نمبر کا چشمہ لگاتی ہوں۔ مسلسل دوائیاں کھا کھا کر معدہ خراب ہو چکا ہے۔ کھانے کے بعد اپھارا ہو جاتا ہے۔ پیٹ میں، آنتوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ پیٹ اور کولھے بڑھتے جا رہے ہیں۔ چہرے اور پورے جسم پر کالے، کالے موٹے بال آ گئے ہیں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ کیونکہ چہرہ بدنما لگتا ہے۔ یادداشت بہت کمزور ہے جو بھی یاد کرتی ہوں پیپر میں سب بھول جاتا ہے۔ سر کے بال جڑ سے نکل رہے ہیں۔ چہرے پر پھنسیاں بنتی ہیں اور رنگ روز بروز کالا ہوتا جا رہا ہے۔ دونوں گردوں میں درد رہتا ہے اور ہلکا کھنچاؤ تو ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ماہانہ نظام بھی خراب ہے۔ اس کی وجہ سے ٹانگوں میں درد رہتا ہے۔ ہر وقت سستی، گھبراہٹ ہوتی رہتی ہے۔ نسوانی حُسن بالکل نہیں ہے۔ ہڈیوں میں درد رہتا ہے جو اچانک کرنٹ کی طرح دوڑتا ہے۔

جواب: مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں، صبح کی تازہ ہوا اور دھوپ لیں، متوازن غذا لیں، ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ 10 Spigelia Pentarkan Ptk 81 قطرے سادہ پانی میں دن میں 3 مرتبہ، Magnesium phos Ptk 60 ,Bismutum Pentarkan Ptk 16 کی ایک، ایک گولی سادہ پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں 3 ماہ بعد کیفیت بتائیں۔

ڈینگی وائرس سے نجات کے لیے ہومیوپیتھک علاج ضروری ہے!

ڈینگی ایک وائرس ہے، جو مادہ مچھر Aedes aegypti کے کاٹنے سے پھیلتا ہے۔ یہ مچھر صاف پانی اور زیادہ تر گھروں میں افزائش پاتا ہے۔ اس مچھر کی ایک مخصوص پہچان ہے، اس کے جسم پر سیاہ اور سفید دھبے ہوتے ہیں۔ اس مچھر کے کاٹنے کی وجہ سے انسان ڈینگی بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بارشوں کے بعد ان مچھروں کی افزائش میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے کاٹنے سے ڈینگی بخار کے کیسز بھی دگنا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک متعدی بیماری ہے اور ایک مخصوص وائرس سے پھیلتی ہے۔ یہ وائرس استوائی خطے میں پایا جاتا ہے اور تقریباً 110 ممالک اس سے متاثر ہیں۔ اس وائرس کی چار مختلف اقسام ہیں۔ اس کی ایک قسم سے متاثرہ شخص میں زندگی بھر کے لیے صرف اسی قسم کے وائرس کے خلاف مدافعت پیدا ہو سکتی ہے لیکن دوسری قسموں سے وہ پھر بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ ڈینگی پھیلانے والا مچھر انسانوں کو طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت کاٹتا ہے۔ اگر اس کا بروقت علاج نہ کروایا جائے تو یہ جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ پاکستان میں ہر سال سیکڑوں افراد اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا کی ڈھائی کروڑ سے زائد آبادی اس موذی اور جان لیوا مرض کا شکار ہے۔

ڈینگی کی علامات Symptoms

متاثرہ شخص میں ڈینگی بخار کی ابتدائی علامات کچھ اس طرح سے ظاہر ہوتی ہیں۔ 1 اچانک تیز بخار جو F 104 تک جا سکتا ہے، 2- سر میں درد، 3 ... جوڑوں ہڈیوں میں درد، 4- آنکھوں کے پیچھے درد، 5- جسم میں درد، 6- جسم پر سرخ دھبے - 7 بے ہوشی، 8- پیشاب کے رنگ کا گہرا ہو جانا اور کم آنا- 9 دھڑکن کا تیز ہونا، 10- پیٹ میں درد، 11- قے ہونا ... شامل ہے۔

ڈینگی کی تشخیص Diagnosis

ڈینگی کی علامات ظاہر ہوتے ہی، سب سے پہلا کام یہ کرنا چاہیے کہ تصدیق کے لیے فوری طور پر ڈینگی کی تشخیص کروائی جائے۔ تشخیص کے لیے متاثرہ شخص کے خون کا نمونہ لے کر کسی بھی معیاری لیبارٹری سے ٹیسٹ کروایا جا سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل ٹیسٹ کے ذریعے تصدیق ممکن ہوتی ہے۔

۱۔ ڈینگی وائرس کی موجودگی کی تصدیق کے لیے مالیکولر ٹیسٹ (PCR) یا NSI ٹیسٹ، ڈینگی کی علامات ظاہر ہونے کے بعد لیا جا سکتا ہے، جس سے اس بات کا بھی پتا لگایا جاتا ہے کہ کس قسم کا ڈینگی وائرس متاثرہ شخص میں انفیکشن کی وجہ بنا ہے۔

۲۔ اینٹی باڈی ٹیسٹ IgM اور IgG کے ذریعے متاثرہ شخص کے مدافعتی نظام سے خارج ہونے والی اینٹی باڈیز کی مدد سے ڈینگی کی تشخیص کی جاتی ہے۔

۳۔ کمپلیٹ بلڈ کاؤنٹ (CBC) متاثرہ شخص میں پلیٹی لیٹس کی تعداد کا پتا لگایا جاتا ہے، کیونکہ ڈینگی سے متاثرہ شخص میں فوری طور پر پلیٹی لیٹس کی تعداد کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس ٹیسٹ کے ذریعے مریض میں ہیموگلوبن اور ریڈ بلڈ سیل (RBC) کی مقدار کا بھی پتا لگایا جاتا ہے۔

۴۔ بیسک میٹابولک پینل (BMP) کے ذریعے

مریض کے گردے کی حالت کا پتا چلایا جاتا ہے کہ آیا گردہ ٹھیک کام کر رہا ہے یا نہیں۔

عمومی طور پر ایک شخص میں پلیٹی لیٹس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے ساڑھے چار لاکھ فی مائکرو لٹر بلڈ ہوتی ہے۔ موسمی بخار میں یہ کم ہو کر نوے ہزار سے ایک لاکھ ہو سکتی ہے۔ ڈینگی وائرس کی صورت میں پلیٹی لیٹس شدید کم ہو جاتے ہیں اور اس کا کاؤنٹ بیس ہزار یا اس سے بھی کم رہ جاتا ہے۔

ڈینگی سے متاثرہ شخص کی غذا اور احتیاط

ڈینگی سے متاثرہ شخص کو ایسی غذائیں استعمال کرنی چاہئیں جو اس کی قوتِ مدافعت میں اضافے کا باعث بنیں۔ پھلوں میں سیب، انار، میٹھا اور ٹماٹر قدرتی طور پر بیماریوں کے خلاف جنگی سپاہیوں کا کام کرتے ہیں۔ سبزیوں میں گاجر، چقندر، ادرک، لہسن اور پیاز اینٹی وائرل اور اینٹی بائیوٹک خصوصیات کی حامل ہیں۔ زود ہضم اور ہلکی غذائیں کھائی جائیں اس کے علاوہ سبزیاں پکاتے وقت سرخ مرچ کا کم سے کم استعمال کریں۔ ہری مرچ اور ہلدی کا مناسب استعمال کریں، کیونکہ ہلدی بھی بدنی مدافعاتی نظام میں بہتری کا ذریعہ بنتی ہے۔ ڈینگی کے مریض کے لیے شہد کا استعمال بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ سیب، ناشپاتی اور انار کے جوس میں چند قطرے لیموں کے ڈال کر پینے سے بھی ڈینگی بخار میں آرام ملتا ہے۔ چائے، کافی، شربت، کولڈ ڈرنکس سے مکمل پرہیز کریں۔ ہر قسم کی ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کریں اور ٹھنڈ سے بچیں۔ نمونیہ ہو سکتا ہے۔ مریض کو پپیتے کے پتے کا... جوس بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کو پینا آسان نہیں، بے انتہا کڑوا ہوتا ہے، الٹیاں لگ جاتی ہیں۔

حفاظتی اقدامات

کہاوت ہے کہ احتیاط علاج سے بہتر ہے کے مصداق اس مرض سے احتیاط کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ڈینگی کا مچھر خاص طور پر صبح 5 بجے سے 8 بجے تک اور شام 5 سے 8 بجے کے وقت کاٹتا ہے۔ صبح اور شام میں اپنا جسم ڈھانپنے، پانی کا صحیح نکاس، اس مچھر کو بیماری پھیلانے اور افزائشِ نسل سے روکنے میں خاصا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ حفاظتی اقدامات ہی اس وائرس سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔

1- گھروں میں مکمل طور پر صفائی کا اہتمام کیا جائے بالخصوص پودوں اور بیلوں کی کیاریوں میں مچھر مار ادویات کا... اسپرے کرایا جائے۔

2- گھروں کے آس پاس پانی بالکل نہ کھڑا ہونے دیں۔

3- ڈینگی وائرس کا حامل مچھر گندے جوہڑوں اور تالابوں کے بجائے صاف پانی میں پرورش پاتا ہے لہٰذا گھروں میں استعمال ہونے والی ٹنکیوں کو اچھی طرح صاف کیا جائے اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ پانی اسٹور کرنے والے برتنوں کو ڈھانپ کر رکھا جائے۔

4- بطور احتیاط پانی ابال کر استعمال کریں تو اچھا ہے۔

5- گھروں کی سجاوٹ کے لیے رکھے گئے پودوں کے گملوں میں پانی کھڑا نہ ہونے دیں اور ان پودوں پر مچھر مار ادویات اسپرے تواتر سے کرتے رہیں۔

6- طبّی ماہرین کے مطابق یہ مچھر رات کے بجائے طلوع وغروبِ آفتاب اور دن کے اجالے میں حملہ آور ہوتا ہے لہٰذا مذکورہ اوقات میں مچھر کے حملوں سے بچاؤ کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔

7- جسم کے کھلے حصوں پر لوشن وغیرہ لگائیں، بچوں کے جسم پر لوشن ضرور لگائیں کیونکہ بچوں میں بڑوں کی نسبت قوتِ مدافعت کمزور ہوتی ہے یوں بچے ڈینگی وائرس کی زد میں جلد آجاتے ہیں۔

8- کمروں میں مچھر مار کوائلز استعمال کریں۔ رات کو دیگر حفاظتی تدابیر کے ساتھ ساتھ مچھر دانی لگا کر

سوگئیں۔

9- چھتوں کے اوپر رکھے گئے ساز و سامان میں بھی مچھروں کی پرورش ہوتی ہے لہٰذا ایسی تمام جگہوں کی صفائی کی جائے۔

اسٹور رومز میں پڑے سامان کو خصوصی طور پر نکال کر اس پر اسپرے کیا جائے اور کمرے کی چھت اور دیگر الماریوں کو بھی صاف کر کے اسپرے کیا جائے۔

10- گھر میں ہرمل اور گوگل کی دھونی دینے سے ہر قسم کے کیڑے مکوڑے مچھر لال بیگ اور چھپکلی وغیرہ ختم ہوجاتے ہیں۔

11- اگر جسم کے کھلے حصوں پر روغنِ تلخ (تارامیرا کا تیل) لگایا جائے تو مچھر کاٹنے سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔

12- ایک عدد پیاز کو درمیان سے کاٹیں اور چھلکے اتار کر دھاگا پرو کر کمرے میں لٹکا دیں، جب تک پیاز کی باس رہے گی، مچھروں سے بچے رہیں گے۔

13- ہومیو پیتھک دوا Ledum Pal 30 صبح اور شام استعمال کریں۔ ان شاء اللہ مچھر قریب نہیں آئے گا۔

ڈینگی کا علاج

اس مرض سے تحفظ کے لیے اب تک کوئی مخصوص ویکسین دریافت نہیں ہوئی۔ اس مرض سے بچنے کے لیے عالمی ادارۂ صحت نے بھی جو تجاویز دی ہیں وہ سب حفاظتی نوعیت کی ہیں۔ تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ ڈینگی کا مرض تشویشناک ہونے کے باوجود ایسا مرض نہیں ہے کہ انسان اس سے خوف زدہ ہو جائے۔ یہ مرض ٹائیفائیڈ سے زیادہ نقصان دہ نہیں بشرطیکہ اس کا علاج بروقت شروع کر دیا جائے۔

اس وائرس سے متاثرہ افراد میں 90 فیصد مریض عام علاج معالجے اور غذائی ردو بدل سے روبہ صحت ہوجاتے ہیں۔ ایسے مریض جو ڈینگی وائرس کی زیادہ مقدار خون میں سرایت کر جانے سے نازک صورتِ حال تک جا پہنچیں ان کو صاف خون دے کر اس وائرس سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن انتقالِ خون کے وقت تسلی کر لی جائے کہ خون دیگر تمام متعدی امراض کے وائرس، جراثیم اور بیکٹیریا سے پاک ہو۔

ڈینگی میں اینٹی بائیوٹیکس

ڈینگی میں اینٹی بائیوٹکس ادویات کا استعمال کسی صورت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اینٹی بائیوٹکس کے استعمال سے پلیٹی لیٹس کی تعداد مزید کم ہو جاتی ہے جس سے مریض کی حالت مزید بگڑ سکتی ہے۔ ہمیشہ یاد رکھیں وائرل انفیکشن میں اینٹی بائیوٹک کا استعمال انتہائی نقصان دہ بلکہ جان لیوا ہوا کرتا ہے۔ اس کے لیے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے علاج شروع کرنے سے پہلے اس کی تشخیص کروانا ضروری ہے۔

مؤثر اور فوری ہومیو پیتھک علاج

یہ بات میرے ذاتی تجربات و مشاہدات میں مسلسل کئی بار آچکی ہے کہ ہومیو پیتھک دوا Eupatoriumperf شوابے جرمنی مرض کے کسی بھی درجے میں خواہ پلیٹی لیٹس کتنے ہی کم کیوں نہ ہوگئے ہوں مریض کا بخار 24 سے 48 گھنٹوں میں ختم ہوجاتا ہے اور مریض اپنی نارمل زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے اور 3 سے 5 دن میں مکمل تندرست ہوجاتا ہے۔ آزمائش شرط ہے!

☆☆☆